چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 16 شمارہ نمبر 11 اگست 2015ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

قیمت -/60 روپے
سالانہ قیمت -/1080 روپے

ایڈیٹر وپبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

قرآن کی باتیں

☆ مومنوں تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔ روزوں کے دن گنتی کے چند روز ہیں تو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کرلے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں لیکن رکھیں نہیں وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں۔ اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے اور اگر سمجھو تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اول اول نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل الگ الگ کرنے والا ہے تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں رکھ کران کا شمار پورا کرے اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔ اور یہ آسانی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ تم روزوں کا شمار پورا کرلو اور اس احسان کے بدلے کہ اللہ نے تم کو ہدایت بخشی ہے تم اس کو بزرگی سے یاد کرو اور اس کا شکر کرو۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 183 سے 185)

☆ اللہ تمہارے بے ارادہ قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن پختہ قسموں پر جن کے خلاف کرو گے، مواخذہ کرے گا تو اسکا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا۔ اور جس کو یہ میسر نہ ہو تو وہ تین روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھالو اور اسے توڑ دو اور تم کو چاہیئے کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو اس طرح اللہ تمہارے سمجھانے کے لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 89)

☆ مومنوں جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارنا۔ اور جو تم میں سے جان بوجھ کر اسے مارے تو یا تو اس کا بدلہ دے اور وہ یہ ہے کہ اسی طرح کا چارپایہ جسے تم میں سے دو معتبر شخص مقرر کردیں، کرے اور یہ قربانی کعبے پہنچائی جائے یا کفارہ دے اور وہ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ اپنے کام کی سزا کا مزا چکھے اور جو پہلے ہو چکا وہ اللہ نے معاف کردیا اور جو پھر ایسا کام کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 95)

☆ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوۃ ادا کریں اور نیک کام

کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ (سورۃ حج 22 آیت 41)

☆ بیٹا نماز کی پابندی رکھنا اور (لوگوں کو) اچھے کاموں کے کرنے کا امر اور بری باتوں سے منع کرتے رہنا اور جو مصیبت تجھ پر واقع ہو اس پر صبر کرنا۔ بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔ (سورۃ لقمان 31۔ آیت 17)

☆ اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا اور حکم دیا کہ جس مقام پر ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنالو۔ اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو کہا کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 125)

☆ اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں بیٹھے ہو تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جانا اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے سمجھانے کے لے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بنیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 187)

☆ اور دن کے دونوں سروں یعنی صبح اور شام کے اوقات میں اور رات کی چند پہلی ساعات میں نماز پڑھا کرو۔ کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ان کے لئے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں۔ (سورۃ ھود 11 آیت 114)

☆ اور عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنادو یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر مصیبت پڑتی ہے تو صبر کرتے ہیں اور نماز آداب سے پڑھتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ (سورۃ حج 22 آیت 34 سے 35)

☆ جو بات کو سنتے اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی اور یہی عقل والے ہیں۔ (سورۃ زمر 39 آیت 18)

☆ جن لوگوں کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو ایسا پڑھتے ہیں جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے یہی لوگ اس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اور جو اس کو نہیں مانتے وہ خسارے پانے والے ہیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 121)

☆ اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 204)

☆ مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں۔ (سورۃ انفال 8 آیت 2)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

قارئین کرام! السلام علیکم! اگست 2016ء کا ڈر ڈائجسٹ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگست کا مہینہ ویسے بھی جشن آزادی کا مہینہ ہے اور ہم پاکستانیوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسی ماہ یعنی 14 اگست 1947ء کو ہمارا ملک دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ ہمارے آباؤ اجداد نے سب کچھ لٹا کر بلکہ اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر یہ وطن حاصل کیا۔ آپ ذرا سنجیدگی سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اندازہ لگائیں کہ نیا وطن حاصل کرنے کے لئے ہمارے آباؤ اجداد کن جان لیوا اور کٹھن مراحل سے گزرے ہوں گے۔ بے شمار بلکہ لاکھوں لوگ خون میں لت پت ہوئے، خواتین کی عزتیں پامال ہوئیں، بچوں کو نیزوں پر لٹکایا گیا۔ لوگوں نے سینکڑوں سال سے اپنے بسے بسائے گھر کو چھوڑ چھاڑ کر خالی ہاتھ پہنے ہوئے جوڑے یا پھر چند جوڑوں کی گٹھری لے کر سسکتے دل اور بہتی آنکھوں کے ساتھ خونی سفر پر روانہ ہوگئے۔ اور پھر بہت سارے لوگ جوش و ولولے اور نئی لگن کے ساتھ نئے وطن کے لئے نکلے تھے انہیں نیا وطن دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا، اور وہ راستے میں ہی ظلم و بربریت کا شکار ہوگئے ان لوگوں کا خون زمین پر گرا اور زمین کی مٹی میں جذب ہوگیا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب پھلدار درخت کا پودا لگایا جاتا ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ اس کا پھل کھایا جائے گا تو جو لوگ درخت لگاتے ہیں کوئی ان کے اس دل سے پوچھے کہ وہ کس قدر جانفشانی اور محنت سے اس درخت کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور کتنی محنت کرتے ہیں کہ یہ درخت ایک وقت پر پھل دے گا تو ہم نہ سہی ہماری آنے والی نسلیں اس پھل کو کھائیں گی۔ اور جب وہ درخت پھل دینے لگتا ہے تو کھانے والے کس مزے سے وہ پھل کھاتے ہیں اور کاش کہ پھل کھانے والے ان لوگوں کے متعلق بھی سوچیں کہ وہ لوگ کس محنت و تمہ ودو سے یہ درخت لگا گئے تھے۔ بالکل یہی بات ہمارے ذہن میں آتی ہے کہ واقعی وطن بنانے والے اپنے آپ کو تباہ برباد کرکے اپنی جان نچھاور کرکے یہ وطن حاصل کیا۔ تو اس طرح درخت لگانے والے لوگ اس درخت کی دیکھ بھال کرتے ہیں درخت میں میں پانی ڈالتے ہیں تو اسی طرح ہم پر فرض ہے کہ ہم بھی اپنے ملک اور وطن کی دیکھ بھال کریں اس کی بھلائی کے لئے اپنے آپ کو کوشاں رکھیں، ہماری ہر کوشش ہر خواہش اور ہر سوچ وطن کی بھلائی و خوشحالی کے لئے ہونا چاہئے تو اسی صورت میں ملک خوشحال ہوگا تو ہم بھی خوشحال ہوں گے۔ ہم بھی سکون سے زندگی گزاریں گے اور ہماری آنے والی نسلیں بھی ہماری حق میں دعا گو ہوں گی کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیں خوشحال ملک دیا۔ قارئین کرام اگست ہماری آزادی کا مہینہ ہے، اور اسی ماہ میں میرے والد صاحب اور میرے بڑے بھائی ہم لوگوں کو بلکتا چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے اور جب بھی اگست کا مہینہ شروع ہوتا ہے تو ہمارا غم تازہ ہو جاتا ہے کہ پھر ہم ان کے ساتھ ساتھ وطن حاصل کرنے والوں کے غم کو بھی محسوس کرتے ہیں اور سب کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں، آپ لوگوں سے بھی التماس ہے کہ آپ بھی ہمارے غم کو محسوس کرتے ہوئے ہمارے والد اور بھائی صاحب اور آزادی حاصل کرنے والوں کے لئے بھی دعائے مغفرت کریں اور ساتھ ہی اپنے وطن کی خوشحالی کے لئے نیا عزم کریں، شکریہ

دعا گو: خالد علی (منیجنگ ایڈیٹر)

سحرش حنیف کراچی سے۔ طویل مدت کے بعد آمد کے لئے معذرت، دراصل امتحانات اور پریکٹیکلز کی تاریخوں میں اضافہ ہوگیا تھا، جو کہ پچھلے سال دسمبر میں ہونے تھے، لیکن وہ اس سال فروری میں شروع ہوئے اور اپریل تک اختتام پذیر ہوئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمام پیپرز عمدہ ہوئے اور اب اسی ماہ نتیجہ آجائے گا۔ آپ سے اور تمام قارئین سے التماس ہے کہ میرے اچھے رزلٹ کے لئے دعا کریں۔ تمام قارئین کو میری طرف سے "عید کی خوشیاں" مبارک ہو۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام امت مسلمہ کے روزے قبول فرمائے اور سب کو بہت اجر عطا فرمائے۔ آمین مصروفیات کے باوجود، ڈر کے تمام شمارے زیر مطالعہ رہے۔ تمام کہانیاں عمدہ تھیں۔ وجیہہ سحر کی تخلیق "خناس" کا اختتام بہت اچھا رہا۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ تمام شماروں کے سرورق اچھے تھے۔ خیر دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ترقی کی نئی راہوں کو چھوئے۔ معذرت قبول فرمایئے گا۔ اب ہر ماہ آپ کی محفل میں میری شرکت ضرور ہوگی۔

☆☆ سحرش صاحبہ: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبروں سے پاس کرے اور مزید جائز خوشیوں سے نوازے۔ حسب وعدہ امید ہے کہ آپ ہر ماہ اپنی رائے ارسال کیا کریں گی۔ Thanks۔

وجیہہ سحر جوہرآباد سے، السلام علیکم، جون کا ڈر ڈائجسٹ ملا، اپنے ناول خناس کا اشتہار دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ناول خناس کے متعلق قارئین کی رائے پڑھی تو خوشی میں اضافہ ہوگیا۔ تمام مصنفین کو ان کی بہترین کاوشوں پر مبارکباد پیش کرتی ہوں جن کی بدولت ڈر ڈائجسٹ کو منفرد نوعیت کا ڈائجسٹ بنا دیا۔ اپنی غزلوں کی پسندیدگی کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں ان قارئین کا جنہوں نے میرے احساسات کو اپنی سوچ کے انداز میں پرکھا۔ ایک نظم اور ایک غزل بھیج رہی ہوں، امید ہے کہ آپ کو پسند آئیں گی۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔

☆☆وجیہہ سحر صاحبہ: خط لکھنے اور غزل ارسال کرنے کے لئے شکریہ۔ مشورہ ہے کہ اگر آپ ہر ماہ چھوٹی کہانی ارسال کر دیا کریں تو اچھا ہوگا کیونکہ بہت سے قارئین آپ کی تحریر کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح قارئین کے ذہن میں آپ کا نام جگمگاتا رہے گا۔

مریم فاطمہ حیدرآباد سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب۔ آپ نے مئی کے شمارے میں میری کہانی ''موت کا بدلہ'' شائع کی۔ اس بات کی مجھے بے حد خوشی ہے۔ میں آپ کی شکرگزار ہوں جو میری اتنی حوصلہ افزائی ہوئی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ میں آئندہ بھی ڈر ڈائجسٹ کے لئے کہانیاں لکھتی رہوں گی۔ ایک کہانی میں نے لکھنی شروع بھی کر دی ہے۔ جیسے ہی پوری ہو جائے گی۔ بھیج دوں گی۔ میں اپنی ایک اور کہانی ''ویمپائر کالونی'' لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ کیا یہ شائع ہو جائے گی؟ میرے خط کا جواب ضرور دیجئے گا۔ میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرتا چلا جائے۔

☆☆مریم صاحبہ: نئی کہانی مل گئی ہے۔ اور وقت مقررہ پر ضرور شائع ہوگی۔ آپ ایک لائن چھوڑ کر کہانی لکھا کریں تاکہ اصلاح میں پریشانی نہ ہو۔ آئندہ ماہ بھی اپنا تجزیہ ارسال کرنا بھولئے گا مت شکریہ۔

آمنہ سحر اٹک سے، السلام علیکم، ڈر کے تمام لکھنے پڑھنے اور شائع کرنے والوں کو میری طرف سے سلام پہنچے۔ جون 2015ء کا ڈر ڈائجسٹ راولپنڈی سے آتے وقت خریدا۔ پہلے بھی کئی دفعہ پڑھ چکی ہوں اس بار خیال آیا کیوں نہ ڈر کی محفل میں شرکت کی جائے سو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ مختصر تجزیہ پیش کرنے جا رہی ہوں اس یقین کے ساتھ کہ آپ سب اسے کھلے دل کے ساتھ قبول کریں گے۔ ٹائٹل نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ قرآن کی باتیں بہت بہترین سلسلہ ہے۔ خطوط اور ان کے جوابات پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آتما کا انتظار اچھی کہانی تھی۔ ناشمراد، طاہر محمود صاحب بہت معذرت کے ساتھ کہ آپ کی کہانی مجھے متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ شیطانی سحر، آپ قاری کو مطمئن کرنے میں ناکام رہے یا شاید، دوسری مخلوق کے بارے میں میری وہی رائے ہے جو ناشمراد کے بارے میں۔ چمکدار آنکھیں، سیدہ عطیہ ظاہرہ آپ کی تحریر کے بارے میں رائے نہ ہی دوں تو میرے خیال میں مناسب رہے گا۔ آسیبی گھر، شروعات اچھی رہی انجام کچھ نہ نکلا۔ بوگی مین، آپ بھی بس رہنے دیں۔ زندہ صدیاں، ایم اے راحت صاحب آخر میں جاکر معلوم ہوگا کہ آپ قاری کو کس حد تک مطمئن کر پاتے ہیں۔ خونی مخلوق، محترم آپ افسانہ لکھا کریں اچھا نام کمائیں گے۔ انتہائی قدم، ساحل دعا بخاری صاحبہ یہ آپ کا انتہائی قدم ہی ہے۔ خبیث روح، خونی کہانی، بوسیدہ ڈائری، انوکھی دوستی اچھی تحریریں تھیں۔ تمام قسط وار کہانیاں بہت اچھی تھیں، مگر ''رولوکا'' اور ''خناس'' نے زیادہ متاثر کیا۔ اب آتے ہیں ''قوس قزح'' کی طرف۔ قارئین کے بھیجے گئے اشعار میں سے سنبل ماہین، احساس سحر، فائزہ، شاہد رفیق سہو، اور قاسم رحمان کے اشعار بہترین رہے۔ ''غزلوں'' میں حکیم خان حکیم، شاہد رفیق سہو، فلک زاہد، قدیر رانا، عثمان غنی اور انیس امتیاز احمد ان کا کلام بہت اچھا تھا اتنا عمدہ کلام پر میری طرف سے داد قبول کیجئے۔ کاشف عبید کاوش کا انتخاب بہترین رہا۔ شاید آپ کو ہمارا لہجہ پسند نہ آیا ہو مگر ہم کسی کی جھوٹی تعریف کر کے اس کا مستقبل تاریک نہیں کر سکتے۔ آپ میں سے وہی لوگ نام کمائیں گے جو محنت کریں گے اور انسانیت کا احترام کریں گے۔ اپنی ایک غزل ارسال کر رہی ہوں اس یقین کے ساتھ کہ قریبی شمارے میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع جلد دیں گے۔ آخر میں تمام پڑھنے لکھنے اور انتظامیہ کے لئے ڈھیروں دعائیں۔

☆☆آمنہ سحر صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم ڈر ڈائجسٹ اور اس میں شامل کہانیاں آپ کو اچھی لگیں۔ اس لئے Thanks آپ نے اپنی رائے دی اور امید ہے کہ رائٹر حضرات ضرور سنجیدگی سے سوچیں گے۔ ہر کسی کو پسند اور ناپسند کا حق ہے۔ اور اب قوی امید ہے کہ آپ ہر ماہ اپنے قیمتی وقت میں سے چند منٹ ڈر ڈائجسٹ کے لئے نکال کر خلوص نامہ ارسال کریں Thanks۔

سیدہ عطیہ زاہرہ لاہور سے، امید کرتی ہوں کہ سارے لوگ خیریت سے ہوں گے۔ محترم میں ایک نئی کہانی پیش کر رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ پسند آئے گی۔ جناب مجھے گزشتہ ماہ ڈر ڈائجسٹ کی اعزازی کاپی نہیں ملی تھی۔ اور نہ اس ماہ ملی ہے، جب کہ گزشتہ ماہ میری کہانی بھی شامل اشاعت تھی۔ لیکن اس ماہ میری کہانی کو جگہ نہ ملی، اور وجہ کہانی کا لیٹ پوسٹ کرنا تھا۔ اسی لئے اس ماہ جلد کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ اور آپ کو اور قارئین ڈر کو عید کی خوشیاں مبارک۔

☆☆ عطیہ صاحبہ: کہانی شامل اشاعت ہے۔ اعزازی کاپی ہر ماہ جارہی ہے، آپ ڈاکیہ سے معلوم کریں، امید ہے آپ نئی کہانی جلد ارسال کریں گی۔

آمستر کراچی سے، السلام علیکم جولائی کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ تمام کی تمام کہانیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ اور خاص کر زندہ صدیاں کے بارے میں کہوں گی کہ اس کہانی کے رائٹر صاحب قارئین کو بار بار کہانی کے بجائے تاریخ اور وہ بھی سکندری تاریخ پڑھا رہے ہیں۔ آگے آگے دیکھئے اور کیا ہوتا ہے، میں اپنی ایک کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے

☆☆ آمستر صاحبہ: ارسال کردہ کہانی مل گئی ہے۔ ابھی پڑھی نہیں۔ زندہ صدیاں میں اب نیا موضوع پڑھنے کو ملے گا، پھر آپ اپنی رائے دیجئے گا۔ اور ہاں آئندہ ماہ بھی خط بھیجنا نہ بھولئے گا نہیں۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے، چاہنے والوں کو جن کے دم سے ڈر کی حسین محفلیں سجتی ہیں۔ جن کی محبتیں ایسی کہ ہر ماہ بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے۔ جون جولائی کے روزے غریب بندوں کے امتحان ہوں گے، خطوط میں آپ نے خوب لکھا ہم نے 1988 میں دکان سنبھالی آج تک غریبوں کو نہ بھولے نیکی ہم چھپ چھپ کر کرتے ہیں، آپ کے خیالات پر عمل پیرا ہیں۔ درد دل رکھنے والوں سے گزارش ہے خالد صاحب کے خیالات پر عمل کریں شکریہ۔ عشق ناگن، زندہ صدیاں، کے بارے میں رضیہ عارف کے تبصرے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ بلقیس خان ساحل دعا برادرزا اچھا لکھتی ہیں پیش منظر کم کریں کہانی کو آگے بڑھائیں ریلو کار کی طرح۔ خالد صاحب ہم سالوں سال سے دیکھ اور پڑھ رہے ہیں نہ جانے ڈر کی زندگی میں کتنے ہی لکھنے والے گم ہوں گئے اور کتنے ہی نئے لکھنے والے آئیں گے جانے والوں نے پلٹ کر بھی ڈر کے چاہنے والوں کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

☆☆ شرف الدین صاحب: چند باتیں آپ تحریر کرتے ہیں اور بہت خوب قلبی لگاؤ کے ساتھ، اس کے لئے شکریہ نیکی وہی ہوتی ہے کہ ایک ہاتھ سے کرو تو دوسرے ہاتھ کو پتہ نہ چلے، میں تمام قارئین اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ سب ڈر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ شکریہ

اسلم جاوید فیصل آباد سے، خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں۔ ماہ جون کا تازہ پرچہ بہت ہی اچھا تھا سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ قارئین کی دعاؤں اور آپ کی انتھک محنت سے خدا پرچے کو چار چاند لگائے پرچے کی تمام تحریریں اپنی اپنی جگہ پر بہتر تھیں۔ خط، غزلیں اور شعر شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ، آپ کا تعاون ہی ہمارے لیے کافی ہے آج کل موسم بہت گرم ہے معاشی حالات پہلے سے بدتر ہیں۔ ہر انسان حالات اور زندگی سے خفا ہے قوس قزح کے اشعار اچھے تھے غزلیں بہت خوب تھیں۔ ساری کہانیاں بہتر نظر آئیں آتما کا انتظار۔ دوسری مخلوقات، خونی کہانی، انوکھی دوستی، عشق ناگن، وغیرہ سے بہت متاثر ہوا۔ جولائی کا پرچہ آنے تک ماہ رمضان اور رحمتوں والی لمحات اور گھڑیوں کی آمد آمد ہوگی ہم ماہ صیام سے اپنے دلوں کو منور ضرور کریں گے۔ زندگی چند دنوں کا میلہ ہے چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں بشرطیکہ آپ کا تعاون ہو کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں۔

☆☆ اسلم صاحب: غزل اور اشعار شامل اشاعت ہیں۔ آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوتی ہے انسان دنیا سے کیا لے کر جاتا ہے سب کچھ یہیں رہ جاتا ہے بس نیک عمل اور خلوص ہی ساتھ جاتا ہے۔ آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔

قاسم رحمان ہری پور سے، ڈر سے وابستہ ہر انسان کو دل کی گہرائیوں سے سلام آج 28 جون ہے اور جولائی کا ڈر اب تک نہیں ملا ایسا کیوں ہوتا ہے۔ باقی شہروں میں ڈر 21,22 تک آجاتا ہے مگر ہری پور میں اتنی تاخیر کیوں۔ پتہ نہیں کہانی چھپی ہوگی یا نہیں۔ علاوہ ازیں نئی کہانی شروع کر دی ہے۔ بہت جلد ارسال بھی کر دوں گا۔ میری تحریریں کالی طاقتوں کا انتظار اور پراسرار درخت جلدی شائع کر دیں۔ پلیز اب اجازت سب دوستوں کو خصوصاً کاشف عبید اینڈ نادر شاہ کو اسپیشل سلام۔

☆☆ قاسم صاحب: آپ کی کہانی جولائی کے شمارے میں چھپ چکی ہے۔ آپ بک اسٹال والے سے کہیں کہ وہ وقت مقررہ پر ڈر

منگوایا کرے۔ خیر خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ساحل ابڑو ڈیرہ اللہ یار بلوچستان سے، ماہ جولائی کا تازہ شمارہ ڈرڈائجسٹ ادارہ کی طرف سے بھیجا گیا۔ اعزازی کاپی 18 تاریخ کو ملی۔ بہت بہت شکریہ آپ لوگوں نے اس ناچیز کو اتنی بڑی عزت دی۔ تو بندہ ناچیز اس کے قابل نہیں۔ کیونکہ ہم نے تو ادب ابھی تک دیکھا بھی نہیں۔ ادب کیا ہے اس کو سیکھنے کی کوشش کی۔ ڈرڈائجسٹ دیکھا پڑھا اس کو سمجھنے کی کوشش کی تو من کے اندر ادبی محبت مہک اٹھی۔ آپ کا یہ انداز مجھے بہت اچھا لگا جو ہر اک رائٹر کے ساتھ ایک ہی سلوک۔ ایک کہانی بھیجی ہے دوسری کہانی کب ملے گی۔ تو میں اپنی طرف سے بھرپور کوشش کروں گا ہر مہینے آپ کو کہانی مل جائے گی۔ اور ہاں جو دوسری ذمہ داری سونپ دی ہے کہانی طویل لکھنے کی میں اپنی طرف سے کوشش کروں گا آپ کی یہ شکایت بھی دور ہو جائے گی۔ انشاء اللہ۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی دنیا میں جو یہاں رائٹر حضرات ہمارے انتظار میں ہیں۔ تو سب سے پہلے میں ذکر کروں گا۔ طاہرہ آصف کی کہانی ''تماشہ فطرت'' اچھی لگی۔ ایس امتیاز احمد ارے بھائی آپ تو ہمارے بہت پرانے ساتھیوں میں سے ہیں۔ خوبصورت کہانی لکھنے پر مبارک باد وایم اے راحت، ایم الیاس، اے وحید صاحب کی پچھلی قسطیں تو میں نے نہیں پڑھی۔ کیونکہ یہاں ڈرڈائجسٹ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ یہ تینوں رائٹر میرے فیورٹ تخلیق کار ہیں عامر ملک ''روحوں کا مٹن'' ویلڈن زبردست کہانی تھی۔ عامر بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ، کہ آپ ہر مہینے ڈرڈائجسٹ رجسٹری بھیج دیتے ہیں۔ یہ آپ کی ادبی محبت ہے۔ اب یہ ڈیوٹی ایڈیٹر صاحب کے اوپر لگادی گئی ہے۔ ورنہ میں بھوک ہڑتال کیمپ لگادوں گا۔ کیسے قارئین کرام آپ سب میرے ساتھ ہیں نا۔ رضوان علی سومرو، گل حیات بھی اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ ملک فہیم ارشاد، ظالم آتما، اور محمد قاسم رحمان، روح کی صدا، یہ دونوں کہانی مجھے بہت اچھی لگیں۔ باقی کہانیاں پر تو میں تبصرہ نہیں کرسکتا کیونکہ میں نے ابھی تک پڑھی نہیں۔ البتہ وہ کہانیاں بھی دل کو بھانے والی کہانیاں ہوں گی۔ قوس قزح یہ سلسلہ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے کیونکہ شاعری وہ لطف اندوز ذائقہ ہے جو درس بھی دیتی ہے اور رہنمائی بھی۔ اللہ کرے ڈرڈائجسٹ بہت زیادہ ترقی کرے۔ زندگی باقی رہی تو آئندہ ماہ بھی ضرور حاضری دوں گا۔

☆☆ ساحل صاحب: خط لکھنے کہانی بھیجنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، آپ کی کہانی اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی۔ آپ کے پر خلوص تجزیہ کا آئندہ ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ جولائی 2015 کا شمارہ سامنے ہے دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ ہمارے آرٹیکلز اور تجزیہ لگانے کا شکریہ۔ اور ہمارے لئے نیک جذبات رکھنے کا بہت تھینکس۔ میٹرز آپ کے پاس ہیں۔ مزید ایڈوانس میں آسیب، مراسلہ۔ غزل ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ڈرڈائجسٹ کے تمام خوبصورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوبصورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام پلیز اپنا خیال رکھیے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: اور سنائیں اپنے مزاج کے بارے میں، ہماری دعا ہے کہ اللہ کے فضل وکرم سے مکمل صحت یابی کی طرف گامزن ہوں گے آئندہ ماہ پھر ملیں گے۔ اللہ حافظ

منعم اصغر ڈیرہ غازی خان سے، ڈیئر ایڈیٹر، ڈر کے تمام لکھاری اور قاری کو میرا محبتوں بھرا سلام۔ اس بار ڈرڈائجسٹ بڑی بے تابی کے بعد 26 جولائی کو ملا۔ ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی دل خوش ہوگیا ٹائٹل بے حد شاندار تھا۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے اس بار خطوط کافی زیادہ تھے مزہ آگیا۔ اس کے بعد سب سے پہلے تماشۂ فطرت پڑھا۔ شروع سے لے کر آخر تک کہانی نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا بہت خوبصورت لکھا طاہرہ آصف صاحبہ نے۔ اس کے بعد زندہ روح پڑھی۔ ایس امتیاز احمد کمال ہی کردیتے ہیں۔ ہر دفعہ ویلڈن، ظالم آتما، ملک فہیم ارشاد کی بہت اچھی تحریر تھی۔ نہلے پہ دہلا، ضرغام محمود کی دل دہلاتی تحریر تھی۔ خوف میں مبتلا کرگئی۔ روح کی صدا، محمد قاسم رحمان کی ایک ہلکی پھلکی سی خوشگوار تحریر تھی۔ احساس سحر کی روشن آنکھیں ڈر کے معیار کے مطابق تو نہیں تھی مگر بہت ہی دلچسپ تھی۔ مورکھ، ملک این اے کاوش کی دل میں اتر جانے والی کہانی تھی اتنی اچھی کہانی لکھنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔ بے بس روح، سفید موت بھی ٹھیک تھیں۔ رولو کا اور عشق ناگن خوبصورتی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔ خناس کی آخری قسط اچھا اینڈ تھا۔ اس ماہ کی ہر رائٹر کی کہانیاں بے مثال لاجواب تھیں۔ میں ہر ماہ آپ سب کو پڑھنا چاہوں گا۔ اور ہاں ایک

بات کہنا تو بھول ہی گیا۔ آپ نے میری تحریر کو جگہ دی بہت ہی خوشی ہوئی اور حیرانی بھی کہ اتنی جلدی جگہ مل گئی سچ میں آپ ڈر میں نئے آنے والوں کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں، دل میں کئی گنا آپ کی عزت بڑھ گئی دل چاہا کہ آپ کو کال کر کے Thanks کہوں مگر نمبر نہیں تھا سو خط لکھ کر شکریہ کہہ رہا ہوں۔ اللہ خوش رکھے آپ کو۔ اگست کے شمارے کا بے صبری سے انتظار رہے گا۔ ڈر دن بدن نکھرتا جا رہا ہے اللہ مزید ترقی دے۔ ہر ماہ کی طرح اس ماہ بھی "ہری آنکھیں" ارسال کر رہا ہوں۔ اب اجازت دیں اگلے ماہ حاضر ہوں گا ایک نئے تبصرے کے ساتھ خدا حافظ۔

☆☆ منعم صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ کہانی اگر اچھی ہوئی اور زیادہ اصلاح نہ ہو تو کہانی خود بخود اپنا مقام بنا لیتی ہے، اب امید ہے کہ آپ ہر ماہ اپنا خلوص نامہ ارسال کرنا بھولیں گے نہیں اور ہاں کہانی بھی ضرور بھیجنا۔

نعیم اللہ ہڈالی سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ ڈر کا تمام اسٹاف، رائٹرز اور ڈر پڑھنے والے بخیر و عافیت سے ہوں گے۔ میں کچھ ماہ بعد ڈر ڈائجسٹ کے لیے خط لکھ رہا ہوں۔ محترم ایڈیٹر صاحب میں نے کچھ کہانیاں ارسال کی تھیں۔ پلیز...... پلیز یہ بتا دیں کہ وہ کب یعنی کس ماہ شائع ہوں گی۔ پلیز...... جلد شائع کر کے حوصلہ افزائی کریں۔ مہربانی فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ عین نوازش ہو گی۔ امید کرتا ہوں کہ آپ حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔

☆☆ نعیم صاحب: ہم تو ہر رائٹر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، کہانی میں اگر زیادہ اصلاح ہو تو کہانی التوا کا شکار ہو جاتی ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں آپ کی کہانی بھی ضرور شائع ہو گی۔

طارق محمود لاہور سے، السلام علیکم سب کے لئے صحت و برکت اور ہمیشہ خوش رہنے کی دل سے دعا رمضان کا بابرکت مہینہ ہے اور گرمی کا کچھ زور بھی ہے دعا ہے اللہ سے کہ وہ اس ماہ کے تمام روزے برکتیں اور فضیلتیں حاصل کرنے کی توفیق دے آمین۔ 20 جون کو بذریعہ ڈاک آپ کی طرف سے ڈر ملا جس کے لئے بہت شکریہ تماشہ فطرت لے کر آئیں طاہرہ آصف صاحبہ پہلی ہی کہانی اچھی لگی کہ فطرت نے کیسے رشتے بنائے پھر اپنا کی آتشی مخلوق سے رغبت لیکن اللہ نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں اور وہ آپس میں ہی جچتے ہیں کہانی کا اختتام بھی پسند آیا۔ ایس امتیاز صاحب کی زندہ روح ٹونی نے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ انوکھے طریقے سے لیا ایک دلچسپ کہانی تھی، ایس امتیاز صاحب نئے نئے انداز سے کہانی لے کر آتے ہیں۔ اماوس کی رات پر اسرار اور ہارر ٹائپ اچھی کوشش تھی۔ رضوان علی سومرو کی گل حیات طویل عمر کا راز جو کہ رمیش کو آخر مل ہی گیا۔ ظالم آتما ملک فہیم ارشاد اچھی تحریر تھی۔ نہلے پہ دہلا، ضرغام محمود صاحب، کیسے اک بھوت نے چڑیل اور بھوت بننے والے انسانوں کو حیران دشش شدہ کر دیا۔ روح کی مدد قاسم رحمان ہری پور سے لائے اچھی کہانی تھی۔ روشن آنکھیں احسان سحر کہانی اچھی تھی خاص طور پر اس کا اختتام بہت ہی اچھا تھا۔ عامر ملک روحوں کا ملن دو چاہنے والے دنیا میں تو نہ مل سکے لیکن ان کی روحیں مل گئیں کہانی اچھی تھی۔ مورکھ ملک این اے کاوش بہت ہی اچھے الفاظ تحریر کا انداز بہترین نیکی اور بدی پہ لکھی گئی کہانی دل کو بھا گئی۔ نعیم بخاری آکاش بے بس روح بہت عمدہ طریقہ سے لکھی گئی کہانی بے شک بھٹکے ہوئے کو جب تک ٹھوکر نہ لگے وہ سنبھلتا نہیں۔ ضرغام کو بھی اندھیر نگری کی زبردست ٹھوکر نے آخر اچھا انسان بننے کی طرف لے ہی آئی۔ موت کا بدلہ منعم اصغر کی چھوٹی سی لیکن اچھی تحریر تھی۔ سفید موت سنسنی بھری کہانی ساجدہ راجہ صاحبہ بہت اچھے، قسط وار کہانیاں بہت اچھی جا رہی ہیں خاص طور پر رولوکا۔ آخر میں ڈر سے تعلق رکھنے والوں رائٹرز پڑھنے والوں اور ادارہ کے لوگوں کو محبت بھرا اسلام۔ اور امتیاز صاحب کے لئے خصوصی دعا کے اللہ انہیں صحت دے۔ آمین۔

☆☆ طارق صاحب: کہانی انوکھا آئیڈیا شامل اشاعت ہے خوش ہو جائیں۔ آئندہ ماہ بھی تجزیہ ارسال کرنا بھولنا نہیں اور کہانی بھی ضرور ارسال کرنا۔ Thanks

محمد ابو ہریرہ بلوچ بہاولنگر سے، محترم ایڈیٹر صاحب امید کرتا ہوں کہ آپ سب اور قارئین حضرات خیر و عافیت سے ہوں گے۔ جون 2015ء کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ میرے سامنے جلوہ گر ہے۔ خطوط کی محفل میں حاضری ہوئی تمام پیغامات ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اس بار حسنین حیدر شاہین، مدثر بخاری اور میڈیم رضیہ عارف صاحبہ کا تبصرہ پسند آیا۔ شاہد رفیق بھائی بہت بہت شکریہ کہ آپ ہمیں یاد رکھتے ہیں آپ کی اس محبت اور عنایت کا ایک بار پھر سے شکریہ، اس ماہ کے رسالے میں ساری اسٹوریاں ہٹ تھیں۔ سب نے خوب محنت سے لکھا خصوصاً ضرغام محمود صاحب کی اسٹوری خونی مخلوق زبردست

رہی۔ پہلے پہل کہانی پڑھ کر لگا جیسے کسی چڑیل کی کہانی ہوگی لیکن آخر میں حقیقت کے انکشاف پر حد سے زیادہ حیرت ہوئی۔ ایس امتیاز صاحب کی آسیبی گھر بھی اچھی اسٹوری تھی۔ لگا جیسے کسی انگلش فلم ہو، سیدہ عطیہ زاہرہ صاحبہ کی چمکدار آنکھیں، بشریٰ بلوچ جکانی کی دوسری مخلوقات، طارق محمود صاحب کی ناشکرا بھی عمدہ اسٹوری تھی۔ قسط وار کہانیوں میں عشق ناگن، ردلوکا، زبردست جارہی ہیں۔ زندہ صدیاں پڑھ کر لگتا ہے جیسے ہندی اسٹوری پڑھ رہا ہوں۔ قوس قزح میں منتخب اشعار اور غزلیں بھی لاجواب تھیں۔ ایک کہانی وعدہ کے مطابق ایک لائن چھوڑ کر لکھی ہے۔ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کسی مناسب عنوان کے ساتھ شائع کرکے بندہ کی محنت کا بھرم رکھیں گے۔ انشاء اللہ ہمیشہ آپ کی بزم کا حصہ رہوں گا۔ امید ہے اگلے ماہ خط کے ساتھ کہانی شائع کرکے خوشی کو دوبالا کریں گے۔ کچھ اشعار بھی پیش خدمت ہیں دوستوں میں بھائی شاہد رفیق سہو، ندیم عباس میواتی، علی شیر اور ابوذر غفاری، ابوطلحہ، عبداللہ بلوچ برادز اور والد محترم پروفیسر محمد اختر علی بلوچ کو سلام۔ رسالے کی ترقی اور ہردل عزیزی کے لئے دعا گو۔

☆☆ ابوہریرہ صاحب: کہانی اصلاح طلب ہے وقت ملتے ہی شائع کردی جائے گی۔ اور ویسے بھی ایک کہانی ارسال کرکے ریسٹ نہ کیا کریں، زیادہ کہانیاں زیادہ مواقع، امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے اور یہ بات تمام نئے رائٹروں کے لئے اٹل ہے، تجزیہ اور دلی کیفیت ہر ماہ ارسال کیا کریں Thanks۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، سوچ رہا ہوں اس تبصرے میں کیا کیا لکھوں؟ عید مبارک لکھوں یا ان دوستوں کے دکھوں کو احاطہ تحریر میں لاؤں جن کے بہت پیارے اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور گھروں کو ویران کر گئے۔ جہاں زندگی کی رونق ہوگی وہاں دکھوں کا گہرا ساگر بھی سینوں کی گہرائی میں وقت کے ساتھ وسعت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے ناں کہ خوشی جتنی بھی بڑی ہو، چھوٹی محسوس ہوتی ہے جب کہ غم جتنا بھی چھوٹا ہو، اتنا ہی بڑا محسوس ہوتا ہے۔ والد کا غم کتنا بڑا اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس غم کو میں نے بھی 14 جون 2012 صبح 9:15 بجے محسوس کیا جب میرے والد گرامی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ آفس روانہ ہوئے تھے اور آدھے گھنٹے بعد اتنا خاموش واپس آئے کہ یقین تک نہ آیا۔ یہ غم ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ ان کا مسکراتا چہرہ، ان کی خوبصورت باتیں، ہمیشہ مجھے یاد رہیں گی۔ مگر جینا پڑتا ہے، پیچھے رہ جانے والے اگر رخصت ہوجانے والے کے لئے کچھ نہ کریں تو مرجانے والے قبر میں بھی مایوس ہوجائیں گے۔ محترم صبا محمد اسلم، آصفہ سراج، اور قیصر جمیل پروانہ میں آپ کے دکھ کو دل سے محسوس کرسکتا ہوں ۔اور آپ کے دکھوں میں برابر کا شریک ہوں۔ اللہ بزرگ و برتر آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور میرے ابوجان سمیت آپ کے ابو کو غریق رحمت فرمائے۔ جولائی کا ڈر ڈائجسٹ 18 جون کو موصول ہوا پہلے کی طرح خوبصورت ٹائٹل کو مس کیا۔ خطوط دل کی گہرائیوں سے پڑھا۔ امتیاز صاحب کا سپرہٹ تجزیہ شامل تھا۔ ان کا آپریشن ہے، دعا ہے آپریشن خدا کی رحمت سے بہتر ہوجائے دعا گو اور ان تمام دوستوں کا دلی شکریہ جنہوں نے میری کہانی شیطانی سحر، کو پسند کیا۔ ایک خاص بات جناب مجھے ڈر سے دلی لگاؤ ہے۔ اس کے بغیر سب ادھورا سا لگتا ہے۔ لیکن آپ پلیز اسٹوری شائع نہ کرنے پر معذرت نہ کیا کریں۔ ہم تو آپ کے مشکور ہیں کہ آپ ہمیں لکھنے کا بھرپور موقع دے رہے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے اسٹوری شائع نہ ہو تو کیا میں ڈر سے ناراض ہوجاؤ، بالکل نہیں ڈر سے ہمیں عزت اور نام ملا ہے اور محسن کو معذرت نہیں کرنی چاہیے سر! کہانیاں سبھی لاجواب تھیں۔ ضرغام صاحب کی نہلے پہ دہلا، طاہرہ آصف کی تماشۂ فطرت ، عام ملک کی روحوں کا طلبن، اور محمد قاسم رحمان کی روح کی مدد قابل ستائش رہی۔ دعا گو ہوں ڈر کی ترقی کی بلندی پر جگمگائے۔

☆☆ مدثر صاحب: ویری ویری تھینکس کہ آپ ہر ماہ قلبی لگاؤ کے ساتھ کئی کہانیاں بھیج رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آپ کی ہر ماہ بلاناغہ کہانی شائع ہورہی ہے۔ امید ہے یہ تعاون اور انسیت ہمیشہ جاری رہے گا۔ اور ہاں یاد آیا آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجنا بھول لے گا مت۔

☆☆

> نئے رائٹر حضرات سے گزارش ہے کہ ایک کہانی بھیج کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے گریز کریں۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ آپ کی ارسال کردہ کہانی ہر طرح سے مکمل ہو بلکہ جو لوگ نئی نئی کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اصلاحی پہلو زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کہانی التوا کا شکار ہو جاتی ہے۔ سب سے بہتر ہے کہ آپ بار بار کہانی لکھ کر ارسال کریں اور اسی طرح ایک دن آپ بھی بڑے رائٹروں میں شمار ہونے لگیں گیں۔ شکریہ

بھیانک موت

محمد خالد شاہان۔ صادق آباد

رات کا گھنگھور اندھیرا اور سناٹا پورے قبرستان پر مسلط تھا کہ اچانک کان پھاڑ دینے والی گڑ گڑاہٹ سے قبریں شق ہونے لگیں اور پھر تمام قبروں میں گاڑھی روشنی پھیل گئی۔ پھر قبروں سے مردے نکل کر.........

کرب و اذیت سے دوچار ایک دلخراش دل فگار، عبرتناک دل کو پارہ پارہ کرتی روداد

بھینٹ چڑھائے جانے والے جسموں کے پنجروں کے ایک ڈھیر چٹان کے قریب پڑا تھا اور جب نیم تاریک غار میں مشعلوں کی روشنی ان ڈھانچوں پر پڑتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے بھیانک بلائیں رقص کر رہی ہوں موت کا رقص۔۔

قربان گاہ کی چٹان پر جابجا خون کی جمی ہوئی دھاریاں گزرے ہوئے برسوں کے ساتھ سیاہی مائل ہو چکی تھیں۔ غار کی نیچی چھت مشعلوں کے دھوئیں سے سیاہ ہو چکی تھی۔ قربانی کی رسم کے مطابق دو آدمی قربان گاہ تک گئے، ان کے گرد ڈھول بجانے والوں کا ایک چھوٹا سا گروہ تھا۔ جن کے پسینے میں نہائے ہوئے سیاہ جسم چمک رہے تھے۔ ڈھول کی آواز آہستہ آہستہ تیز ہوتی چلی جارہی تھی۔ اس آواز کو سن کر ایک عجیب سی وحشت اور دیوانگی کا احساس ہونے لگا۔ ایک آدمی سفید چغہ پہنے ہوئے تھا۔ جب کہ دوسرے نے بھڑکیلے رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جو مشعلوں کی روشنی میں آگ کی طرح دہک رہا تھا۔

جونہی وہ بھینٹ دینے والی چٹان کے نزدیک پہنچے۔ دوسرے آدمی نے ایک چھوٹا سا بکس جو ریشم کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے وہ بکس ایک ہاتھ سے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے اس پر پڑا ہوا کپڑا ہٹا دیا۔ اس بکس میں کپڑے کی بنی ہوئی ایک گڑیا رکھی تھی۔ یہ ایک عورت کا پتلا تھا۔

پہلا آدمی بکس پر جھکا اور پھر اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں اوپر اٹھا کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اشلوک پڑھ رہا ہو۔ ڈھول کی آواز مدھم ہوتے ہوتے آہستہ آہستہ معدوم ہوگئی لیکن فضا میں بدروحوں کا خوف بدستور چھایا رہا۔ ''کاواسترا کاواسترا'' جادو کے بول ابھی تک غار میں گونج رہے تھے۔ قربان گاہ سے ڈیڑھ میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک مکان میں ایک نوخیز دوشیزہ جو محوخواب تھی۔ اچانک سوتے میں بڑبڑانے لگی۔ اس کے لبوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کے لب وا ہوئے۔ اور اس نے خواب آلود آواز میں گنگنانا شروع کر دیا۔ ''کاواسترا کاواسترا۔''

سفید چغہ والے آدمی نے بڑی احتیاط سے بکس کو قربان گاہ کے چبوترے پر رکھ دیا اور اپنے لباس سے شیشے کی ایک چھوٹی سی نلکی نکالی۔ پھر نلکی میں جیسے ایک سرخ شعلہ سا بھڑکا۔

سرخ خون۔ جو مشعلوں کی روشنی میں بہت

بھیانک نظر آرہا تھا۔ ہر طرف ایک روح فرسا خاموشی چھا گئی۔ جادوگر نے اس تھیلی کو آسمان کی طرف بلند کیا اور پھر آہستہ سے اسے اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ اس نے بڑی تیزی سے خون کا ایک بڑا سا گھونٹ اپنے منہ میں بھر لیا اور بجلی کی سی سرعت سے عورت کے سینے پر اگل دیا۔

ادھر دور گاؤں میں بے چینی سے کروٹیں بدلتی ہوئی نوخیز دوشیزہ نے ایک دلخراش چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔ اور اس کے بازو پر بندھی ہوئی پٹی کے زخم سے خون رس رس کر اس کی کہنی کو تر کرنے لگا تھا

☆☆☆☆

ذیشان ان دنوں محض تفریح کے موڈ میں تھے۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنی چھٹیوں کو ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے پہلے ہی اپنا سارا پروگرام مرتب کر لیا تھا۔ اور اب وہ تیزی سے مزید اپنی تیاریاں مکمل کر رہے تھے۔ وہ تصور ہی تصور میں خود کو مصروف ترین زندگی اور ہنگاموں سے دور سوات کی خاموش اور پرسکون فضا میں گنگناتی ندی کے کنارے مچھلی پکڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ لیکن برا ہوا اس لمحے کا جب خیالوں میں ذیشان کے سارے پروگرام چوپٹ ہو کر رہ گئے۔ ان کی بیٹی انم روم میں آئی اور ڈاک کے لفافوں کا ایک پلندہ میز پر لا کر جیسے پٹخ دیا۔ ذیشان جان بوجھ کر ان لفافوں سے نظریں چرانے لگے۔

انم میز کے قریب کھڑی ان کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ ذیشان اس کی طرف دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے کہہ رہے ہوں۔ ”میں بہت مصروف ہوں۔“ وہ ان کی عادتوں سے اچھی طرح واقف تھی لیکن پھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ ذیشان نے ایک جمائی لی اور بولے۔ ”اچھا بھئی بتاؤ کیا معاملہ ہے؟“

انم نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔ اس کی آنکھیں سبزی مائل سرخ تھیں۔ اسے ہرنی جیسی یہ خوبصورت آنکھیں اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھیں۔

ذیشان ایک بار پھر ماضی کے ان ایوانوں میں کھو گئے جہاں انہیں اپنی دلنشیں بیوی کی یادیں رقصاں نظر آتی تھیں۔

یہ صحیح تھا کہ ان کی شریک حیات کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ان سے چھین لیا تھا۔ لیکن وہ خوش تھے کہ انم کے روپ میں ان کی زندگی کا یہ خلا پر ہو گیا تھا۔ وہ بالکل اپنی ماں کی طرح باوقار اور دلکش خدوخال کی مالک تھی۔ وہ ہر مرحلے پر اپنے باپ کا ساتھ دینے کے لیے بخوشی تیار رہتی اور ان کا ہر کام اپنا اولین فرض سمجھ کر کرتی۔ وہ کسی طرح بھی اپنی ماں سے کم نہیں تھی۔

ذیشان اپنی زندگی کا انم کے بغیر کوئی تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دونوں یونہی ہنستے کھیلتے روٹھتے ہنستے اپنی زندگی میں خوشیاں بکھیرتے رہتے۔

انم نے خطوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک خط شاہ پور کی طرف سے آیا ہے۔“

”شاہ پور یہ کون ہے؟“ ذیشان کے لہجے سے حیرت ظاہر تھی۔

انم مسکرائی۔ ”یہ کسی آدمی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک گاؤں کا نام ہے۔“

”لیکن میں تو وہاں کے کسی آدمی سے واقف نہیں ہوں۔“ ذیشان نے کہا۔ انم نے اپنے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے یاقوتی ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ کہ ذیشان جان بوجھ کر تنگ کر رہے ہیں۔ ذیشان نے کچھ دیر ایسے ہی رہے۔ پھر نیم دلی سے خط انم کے ہاتھ سے لے کر کھولا۔ یہ خط ان کے ہونہار شاگرد ڈاکٹر منیر خان نے لکھا تھا۔ ڈاکٹر منیر خان، انم کی عزیز ترین سہیلی زرینہ کا شوہر تھا۔ اور دو برس پہلے زرینہ اور منیر خان شاہ پور گاؤں میں جا بسے تھے

ذیشان بک شیلف کے قریب کھڑے ہو کر خط کو بغور پڑھنے لگے انہوں نے کئی بار خط کو پڑھا لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ آخر ان کو یہ ذہین وفطین

شاگرد اس قدر مبہم ساخط کس حساب میں لکھ رہا تھا۔ انم بڑے غور سے ذیشان کی پیشانی پر فکر و تردد کی لکیریں دیکھ رہی تھی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ آخر کار وہ بولی۔

''کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان ہیں۔ شاہ پور میں سب خیر تو ہے۔؟''

''خیریت......'' ذیشان نے کہا۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے۔'' ذیشان نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور انم کی موجودگی نظر انداز کرتے ہوئے پھر خط پڑھنا شروع کردیا۔

انہیں یوں لگا جیسے خط ایک ایک لفظ ہمدردی رحم اور خوف کے علاوہ مدد کی درخواست کرتا ہوا کمرے کی خاموشی میں گونج رہا ہو۔ یہ ایک مایوس اور بے آس آدمی کی اپیل تھی۔ لیکن ذیشان کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ کہ یہ ان کے بہترین شاگرد ڈاکٹر منیر خان کی تحریر ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف سے مایوس ہوجانے کے بعد منیر نے یہ چند سطریں گھسیٹی ہیں تو جوان ڈاکٹر نے لکھا تھا ''اس کا گاؤں پر اسرار اور مہلک قسم کی بیماری کی زد میں ہے۔ لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔''

''لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔'' ذیشان بڑبڑائے۔

''کم از کم منیر سے اس مایوسی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔'' انہوں نے آگے پڑھا۔ منیر نے ان سے مدد کی درخواست کی تھی۔ ان سے مشورہ طلب کیا تھا۔ لیکن اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔ کہ آخر وہ ان سے کس قسم کی اور کس نوعیت کی امداد یا مشورے کا خواہاں ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی کی رمق اس تحریر سے رخصت ہوچکی ہو۔ جیسے زندہ رہنے کی خواہش سلب کرلی گئی ہو۔ ایک بے نام سی آس، بے آسرا سی امید لئے اس نے یہ خط ذیشان کو لکھا تھا۔

ذیشان کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ایسے جاں بلب انسان کی درخواست پڑھ رہے ہوں جس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہو، اور اب وہ موت کی دہلیز پر اپنے آخری مسیحا کا منتظر ہو۔

''پاپا آخر آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ بات کیا ہے؟'' انم نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

ذیشان نے خط کا کچھ حصہ انم کو پڑھ کر سنایا۔ لکھائی اس قدر خراب تھی کہ تحریر کی روانی جابجا بے معنی ہوکر رہ گئی تھی۔ آخر پریشان ہوکر ذیشان نے خط انم کے حوالے کردیا۔ جب تک انم خط پڑھتی رہی ذیشان بے چینی کے عالم میں بار بار اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے رہے۔

ذیشان کے ذہین ترین شاگردوں میں ڈاکٹر منیر خان کا نام سرفہرست آتا تھا وہ ایک بے حد ذہین طالب علم تھا جس نے گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ یہ بات واقعی بڑی عجیب سی تھی کہ اس نے اسپیشلسٹ بن کر شہر میں روپیہ بٹورنے کی بجائے دور دراز دیہاتی علاقوں میں جاکر پریکٹس کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ منیر کا خیال تھا کہ غریب دیہاتیوں کو علاج کی بہتر سہولتیں صرف اس صورت میں مل سکتی تھیں جب اچھے ڈاکٹر شہری زندگی کو خیرباد کہہ کر ان کی خبر گیری کے لیے دیہات میں سکونت اختیار کرلیں۔

ذیشان حیران تھے کہ دیہات میں دو برس گزارنے کے بعد منیر کی ذہانت کیوں جواب دے گئی تھی۔ جو اس نے اس قدر غیر واضح اور مبہم ساخط انہیں لکھا۔ اس خط کی بے سروپا باتوں نے انہیں بری طرح الجھا کر رکھ دیا۔ انم بھی اس صورتحال سے خاصی پریشان نظر آتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر خود بھی بری طرح بیمار ہے۔''

''یقیناً۔'' ذیشان نے اس کی تائید کی۔ ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔ میں کس طرح اس کی مدد کرسکتا ہوں، مجھے رہ رہ کر اس بیچاری زرینہ کا خیال بری طرح ستا رہا ہے۔''

انم نے کہا۔ ''خدا جانے وہ کس حال میں ہوگی؟''

ذیشان نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ظاہر

ہے کہ اگر منیر اس قدر پریشان ہے تو زرینہ بھی ضرور پریشان ہوگی۔"

لیکن ان سب باتوں کے باوجود ابھی تک ذیشان کے دل ودماغ پر سوات کے مناظر بری طرح چھائے ہوئے تھے۔ اور وہ اب بھی اپنی تفریح کے پروگراموں سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں تھے لیکن انم نے اس قدر اصرار کیا کہ انہیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ انہیں ایسے لگا جیسے کہ انم کی آنکھوں نے انہیں مسحور کرلیا ہو اور وہ بے بس ہو کر رہ گئے ہوں۔

ذیشان نے فیصلہ کیا کہ وہ شاہ پور کا سفر ریل کی بجائے بگھی سے کریں گے۔ اس لئے انہوں نے ایک بگھی کرائے پر حاصل کی اور شاہ پور کی طرف چل دیئے۔ راستے میں انم قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے وہ یکا یک چیخی۔ "ڈیڈی۔ وہ دیکھئے۔ وہ ایک خوبصورت لومڑی کس تیزی سے بھاگتی چلی جارہی ہے۔"

"ہاں۔" ذیشان نے بے نیازی سے کہا۔ پھر یکا یک باہر زور زور سے کسی کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ انم نے کھڑکی سے جھانکا تو اس نے دیکھا کہ نوجوان شکاری تنومند گھوڑوں پر سوار بگھی کے ساتھ ساتھ چلے آرہے ہیں شکاری کتوں کی ایک ٹولی بھی سڑک کے کنارے جمع ہوگئی تھی۔

پھر ایک کرخت آواز ابھری۔ "کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"

"کسے جناب؟" بگھی والے کی آواز متحیر تھی۔

"احمق کیا تم نے یہاں سے جاتے ہوئے کسی لومڑی کو تو نہیں دیکھا؟" نوجوان شکاری نے کوچوان کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس اثنا میں انم نے بگھی کی کھڑکی سے جھانک کر اس خوبرو نوجوان شکاری کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں نے اسے دیکھا ہے تم جس لومڑی کے بارے میں پوچھ رہے ہو وہ اس طرف گئی ہے۔ اگر تم اسے پکڑنا چاہتے ہو تو جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اسے پکڑ نہ سکو۔"

نوجوان نے ایک پرجوش قہقہہ لگایا۔ "تم فکر نہ کرو ہم اسے ضرور پکڑ لیں گے۔" اس نے چابک ہوا میں لہرایا۔ اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اور اس کے تعاقب میں دوسرے شکاری اور ان کے شکاری کتے بھی تیر کی مانند زن سے چل دیئے۔

ذیشان نے مشکوک انداز میں انم کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے انم کہ تم نے انہیں صحیح راستہ نہیں بتایا۔"

"ڈیڈی۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔" انم نے ان کی تائید کی۔ ذیشان مسکرائے اور بولے۔ "چلو کم از کم وہ لومڑی تو تمہاری ممنون ہوگی۔ خدا کرے اب اس شکاری سے ہمارا ٹکراؤ نہ ہو۔"

پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ شاہ پور گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے۔ سامنے سے آتے ہوئے جنازے نے جیسے ان کا راستہ روک لیا۔ چھ آدمی جنازہ اٹھائے آہستہ آہستہ اپنے سر جھکائے چلے جارہے تھے۔ گاؤں کا مولوی ان کی رہبری کر رہا تھا۔ فضا میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور کافور کی تیز بو ہوا میں تیر رہی تھی۔ یکا یک اس خاموشی میں گھوڑوں کی تیز ٹاپوں کی آوازیں ابھرنی شروع ہوگئیں۔ شکاری قریب آرہے تھے۔ وہ لوگ سڑک کے کنارے آکر رک گئے۔ پھر اس نوجوان نے جس کو انم نے غلط پتا بتایا تھا بگھی کی کھڑکی کے قریب آکر جھانکا اور چبھتی ہوئی تیز آواز میں بولا۔

اس کے چہرے سے شیطانیت اور خباثت کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ "لومڑی اس طرف گئی تھی۔ میرا خیال ہے۔ تمہیں بھی اسی طرف جانا چاہیے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا چابک لہرایا اور بگھی میں جتے ہوئے گھوڑوں پر برسانا شروع کردیا۔ بگھی تیزی سے سامنے سے آتے ہوئے جنازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جنازے میں شریک لوگوں میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ ان لوگوں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن اس

افراتفری میں ان کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ اور جنازہ سڑک کے کنارے زمین پر جا گرا تو ایک بھاری آواز سے گرا اور ایک مسخ شدہ لاش لڑھک کر سڑک کے کنارے جا گری اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھی۔ جیسے وہ خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ کوچوان نے گھوڑوں پر قابو پا لیا تھا۔ ذیشان سخت غیض وغضب کے عالم میں بگھی سے اترے جبکہ شکاری نوجوان استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

یکا یک اس بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک آدمی آگے بڑھا۔ اس کا چہرہ زرد اور بری طرح ستا ہوا تھا جیسے اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا ہو۔ اس کے اور لاش کے چہرے میں بے حد مشابہت تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور چاہتا یہ تھا کہ اس نوجوان کو اس کی گستاخی کی سزا دے کہ اچانک مولوی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''نہیں بیٹا نہیں۔''

ذیشان نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟''

نوجوان نے بے اعتنائی سے کندھے اچکائے۔ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر وہ لوگ قہقہے لگاتے اپنے گھوڑے بھگاتے چلے گئے۔ ذیشان آگے بڑھے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر لاش کو دوبارہ تابوت میں رکھوانے لگے۔ ذیشان نے کہا۔ ''مجھے آپ لوگوں کے جذبات کا پوری طرح احساس ہے لیکن آپ لوگوں نے خود دیکھا ہوگا کہ یہ افسوس ناک حادثہ ہماری وجہ سے نہیں ہوا۔''

مولوی نے ذیشان کے قریب آ کر سرگوشی کی۔ ''خیال نہ کیجئے گا کیونکہ یہ بات ویسے بھی کسی المیے یا سانحے سے کم نہیں۔ کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟''

ذیشان نے کہا۔ ''آپ ہمیں ڈاکٹر اور مسز منیر کا گھر بتا دیجئے۔''

مولوی نے چوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''منیر کا مکان وہ سامنے ہے۔ وہ وہی مکان جس پر لوہے کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ آپ آخری بار اس سے کب ملے تھے؟''

ذیشان نے کہا۔ ''دو برس پہلے۔''

اس پر مولوی نے اپنے سینے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بخدا اب آپ اس کو بمشکل پہچان سکیں گے۔ بستی میں ہونے والی ہولناک اموات کی بھیانک تعداد نے ڈاکٹر منیر کی تو دنیا ہی بدل کر رکھ دی ہے۔'' یہ کہہ کر مولوی نے جنازے کے آگے اپنی جگہ سنبھالی اور وہ سب لوگ تھکے تھکے بوجھل قدموں سے قبرستان کی طرف چل پڑے۔

ڈاکٹر منیر کے چھوٹے سے مکان کا دروازہ بے رنگ و روغن تھا۔ کھڑکیاں بڑی مضبوطی سے بند کی گئی تھیں۔ کھڑکیوں پر جمی مٹی کو دیکھ کر ذیشان کو بالکل یقین نہیں آیا کہ وہ زرینہ جیسی نفاست پسند اور سلیقہ شعار لڑکی کے گھر کے سامنے کھڑے ہیں۔ ہر چیز پر ایک ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ کوچوان نے صدر دروازے پر دستک دی اور پھر انتظار کرنے لگا۔ اس نے پھر دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس بار دروازہ ہلا ضرور لیکن اندر سے کوئی باہر نہیں آیا۔ کوچوان نے ذیشان کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ اب کیا کروں؟

ذیشان کے کہنے پر اس نے ایک بار پھر دستک دی۔ دروازہ پھر سختی سے پیٹا گیا۔ ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا بلکہ نیم وا ہوا۔ دروازے کی درز سے ایک دبلی پتلی، زرد رو اور بیمار سی عورت کو دیکھا جو اندر نیم تاریکی میں کھڑی تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھے عورت نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں۔'' عورت کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ وہ دروازہ بند کرنا ہی چاہتی تھی۔ کہ انم نے غیر یقینی انداز میں تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''زرینہ۔''

''کون ہے۔'' زرینہ کی آواز جیسے دور کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

انم نے پوچھا۔ ''زرینہ کیا یہ تم ہو۔'' اس بار

دوروازہ پوری طرح کھل گیا۔

جونہی باہر کی تیز روشنی زرینہ کے چہرے پر پڑی تو ذیشان ششدر رہ گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ پریشان حال اور وحشت زدہ عورت وہی زرینہ ہے جو ان کی بیٹی انم کی سب سے زیادہ دلکش، زندگی سے بھرپور، پرجوش اور شاندار سہیلی تھی۔ دونوں لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ خوشی کے مارے زرینہ کے آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے ذیشان کو اندر آنے کے لئے کہا۔

''زرینہ مجھے تم سے دوبارہ مل کر بے حد مسرت ہوئی۔'' ذیشان نے کہا۔

مکان بے حد مختصر تھا۔ ذیشان مصر تھے کہ وہ اور انم گاؤں کے سرائے میں ٹھہریں گے۔ لیکن شب باشی کے علاوہ اپنا زیادہ تر وقت منیر اور زرینہ کے ہمراہ گزاریں گے۔ ذیشان نے محسوس کیا کہ تمام مکان پر عجیب سی ویرانی اور وحشت برس رہی تھی۔ ہر چیز اس طرح گرد آلود تھی جیسے اسے برسوں سے صاف ہی نہ کیا گیا ہو۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ گلدانوں کے پھول جانے کتنے مہینوں سے مرجھا چکے تھے۔ ایک دردناک سی بے کیفی اور مردنی کا احساس دل کو پژمردہ کئے دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ زرینہ کے گالوں کے گلاب بھی گلدان کے گلابوں کی طرح مرجھا کر زرد ہو چکے تھے۔ ذیشان اس بات کو اچھی طرح بھانپ چکے تھے کہ پورے مکان پر بے حد ویرانی اور وحشت کا راج ہے۔ ہر چیز سے بے زاری اور بے نیازی ٹپک رہی تھی۔ یکا یک ان کی نظر زرینہ کی کلائی پر بندھی ہوئی پٹی پر پڑی اور وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔

''زرینہ یہ سب کیا ہے۔ کیا تمہیں چوٹ لگی ہے۔''

زرینہ نے ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے ایک معمولی زخم قرار دیا۔ اور ذیشان کو یوں لگا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

انہوں نے اصرار کیا کہ وہ ایک نظر زرینہ کے زخم کا دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن زرینہ نے یہ کہہ کر ان کی تجویز مسترد کر دی کہ منیر یعنی اس کا شوہر ایک اچھا ڈاکٹر ہے ذیشان نے خشک لہجے میں زرینہ کی تائید کی اور بولے۔ ہاں سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔'' ان کی آواز میں طنز کا عنصر جھلک رہا تھا۔'' انم نے اپنے والد کو روکا اور بولی۔

''چھوڑیے بھی ڈیڈی۔ اس تذکرے سے کوئی فائدہ نہیں ذرا میں ایک نظر بھر کر پھر اپنی زرینہ کو تو دیکھ لوں۔ پھر وہ پورنگاہوں سے زرینہ کا جائزہ لینے لگی۔ زرینہ کے زرد گالوں پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ الجھے ہوئے بالوں سے کھیلنے لگا۔ وہ بولی۔'' آپ لوگ اتنے غیر متوقع طور پر آ گئے کہ میں تیار بھی نہ ہو سکی۔''

ذیشان یہ محسوس کئے بغیر رہ سکے کہ اس لڑکی کو بے حد توجہ اور تیمارداری کی اشد ضرورت ہے ان کا خیال تھا کہ گاؤں کی پر فضا آب و ہوا میں تندرستی مضمر ہوتی ہے لیکن زرینہ تو برسوں کی بیمار نظر آتی تھی۔

'' کوچوان نے سامان اتار کر صدر دروازے کے باہر کمپاؤنڈ میں رکھ دیا تھا۔ ذیشان اب بھی کسی ہوٹل یا سرائے میں قیام کرنے پر مصر تھے۔ انہیں یقین تھا کہ زرینہ کا مکان بے حد مختصر ہے اور اتنے چھوٹے سے مکان میں دو مہمانوں کی گنجائش میزبانوں کے لے خاصا دردسر بن سکتی ہے۔ لیکن انم کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اس نے ان حالات میں زرینہ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے زرینہ کا بازو تھاما اور اسے کشاں کشاں مکان کے اندر لے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد مکان کی صفائی کر ڈالے اور تمام کمروں کو ایک نئی صورت دے سکے۔ اس کا دل گھر کی حالت کو دیکھ کر بری طرح متلا رہا تھا۔ ذیشان اپنی بیٹی کی رائے سے اختلاف نہ کر سکے۔ وہ خود بھی یہی سوچ رہے تھے کہ انہیں بہر حال منیر اور زرینہ کے ہاں ہی قیام کرنا چاہے۔

انم اندر کمرے میں زرینہ کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ اور اسے خوش کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ ذیشان نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر انہوں نے باہر صدر دروازے پر منتظر کوچوان کو کرائے کی ادائیگی کر کے رخصت کر دیا۔ ذیشان سوچ رہے تھے کہ جب ڈاکٹر اور اس کی بیوی نئے نئے اس مکان میں آئے ہوں گے تو وہ اسے بے حد صاف ستھرا اور خوبصورت بنائے رکھتے ہوں گے۔ اس وقت بھی جبکہ انم گھر کی صفائی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے زرینہ کے احتجاج کے باوجود بھی انم اپنے کام میں بڑی جانفشانی اور تندہی سے مگن ہے اور مکان کے ہر گوشے کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر رہی ہے۔ چند لمحوں بعد انم چائے کی ٹرے سنبھالتی کمرے میں داخل ہوئی اور ذیشان کو چائے کی تیز مہک نے مسحور کر دیا۔ زرینہ، انم کی رفتار کو دیکھ کر خاصی خفیف سے نظر آ رہی تھی۔ ذیشان نے باتوں کا موضوع بدلنے کی خاطر زرینہ سے ڈاکٹر کے بارے میں پوچھا تو زرینہ کے چہرے خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔

''وہ اپنے راؤنڈ پر ہوں گے۔''

ذیشان کو اس کے لہجے کی بے یقینی سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ ''کیا یہاں مریض بہت زیادہ ہوتے ہیں؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، کچھ دنوں سے لوگ پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔'' زرینہ نے دل کی بات کہہ دی۔

ابھی وہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کچن میں کچھ جلنے کی تیز بو نے زرینہ کو مزید سوالات سے نجات دلا دی۔ وہ اندر کی طرف لپکی اور انم بھی اس کے پیچھے اندر چلی گئی۔

ذیشان نے صدر دروازے کا رخ کیا اور چوک کے قریب باہر کی طرف دیکھنے میں محو ہو گئے۔

گاؤں میں اکثر مکانات بڑے خوبصورت فن تعمیر کا نمونہ تھے اور اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ کہ یہ ایک خوبصورت گاؤں تھا لیکن جانے کیوں گاؤں کے در و دیوار پر حزن و ملال کی کیفیت طاری تھی اور فضا میں سوگواری رچی ہوئی تھی۔ ذیشان نے دیکھا کہ قبر ستان میں جنازہ کو دفن کرنے کے بعد لوگ واپس جا رہے تھے۔ اب وہ لوگ آہستہ آہستہ سر جھکائے ہوٹل کی طرف بڑھے اور پھر ایک ایک کر کے سب ہوٹل میں غائب ہو گئے۔ ذیشان نے سڑک پار کی اور تیزی سے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

اندر کا ماحول باہر کی نسبت خاصا خنک تھا۔ ذیشان نے شانی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''شانی کیا تم کچھ پینا پسند کرو گے؟''

شانی نے نخوت سے کندھے اچکا اور بولا۔ ''جی نہیں شکریہ میں اپنے لئے خود کوئی چیز منگا لوں گا۔

اسی دوران کسی کی بے بس اور مایوس آواز ابھری۔ ''میں نے اپنی پوری کوشش کی۔ بخدا مجھے بہت حد دکھ ہے کہ میں اسے نہیں بچا سکا۔''

ذیشان نے چشم زدن میں اس لہجے کو پہچان لیا۔ یہ وہی لہجہ تھا جس کی بازگشت وہ گذشتہ روز منیر کے خط میں سن اور پڑھ چکے تھے۔ اس شخص نے بڑے دھیمے لہجے میں منیر سے بولا۔ ''ڈاکٹر، تمہارا کیا خیال ہے اس کی موت کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟''

''موت کا سبب۔'' شانی غرایا۔ ''اس کی موت کا سبب یا ان کی موت کا سبب جو اس سے پہلے مر چکے ہیں۔''

یہ سن کر ڈاکٹر بولا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا مجھے کچھ نہیں معلوم۔'' ''تمہیں کیوں کچھ معلوم نہیں، تم خود کو ڈاکٹر کہلواتے ہو۔'' مجمع میں سے ایک طنزیہ آواز ابھری۔ ''ہاں میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' منیر ہذیانی انداز میں چیخا۔

''کاش تم لوگوں نے اب تک مجھے ایک بھی لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کی اجازت دی ہوتی تو

نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔''

ایک آدمی آگے بڑھا اور بولا۔ ''فضول ہے یہ ایک احمقانہ فعل ہے۔ پوسٹ مارٹم سے مردے کے لواحقین کو اذیت دینے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔''

ڈاکٹر منیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ تم سب جاہل ہو۔''

شانی اپنی جگہ سے اٹھ کر منیر کے قریب ہوا۔ اور چیخ کر بولا۔

''اس قبرستان میں میرا بھائی اور بارہ دوسرے آدمی مرے پڑے ہیں۔'' وقت بے وقت آدمی مر جاتا ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ تمہارا ریکارڈ اچھا ہے تم آخر اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟ ہم باز آئے ایسے مسیحا سے۔''

اس کے بعد منیر نے غصے سے کہا۔ ''تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو۔ کیا میرے یہاں آنے سے قبل کسی شخص کی موت نہیں ہوئی۔ کیا ان سب اموات کا ذمہ دار میں ہوں؟''

شانی نے غصے سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہمیں کم از کم ان کی موت کا سبب تو معلوم ہونا چاہئے۔''

منیر نے شانی کی طرف توجہ دیئے بغیر کہا۔ ''تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟ اگر میں جھوٹ بولوں یہ لوگ جو مرے ہیں۔ طاعون دلدلی بخار یا کسی اور بیماری سے مر گئے ہیں۔ تو یہ ٹھیک ہوگا؟ میں آخر تم لوگوں کو کب تک جھوٹے دلاسے دے سکوں گا کب تک اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھ سکتا ہوں؟''

معاملہ اب خاصا طول پکڑ گیا تھا۔ اس مرحلے پر ذیشان نے مداخلت کرنا مناسب سمجھا۔ وہ آگے بڑھے اور زور سے بولے۔ ''ڈاکٹر تم یہاں ہو اور ہم تمہیں پورے گاؤں میں تلاش کر آئے۔''

منیر نے پلکیں جھپکائیں اور بے یقینی کے عالم میں ذیشان کو دیکھنے لگا۔ ذیشان سمجھ گئے کہ ڈاکٹر بہت زیادہ غصہ میں ہے اسی لئے وہ انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس دوران وہ سب لوگ جن سے تابوت گر گیا تھا۔ ذیشان کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے چہروں سے خشونت اور ناراضگی نمایاں تھی۔ ذیشان مسکرائے۔ ان سب کو معذرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور کاؤنٹر پر ایک نوٹ رکھتے ہوئے ہوٹل کے مالک سے کہا۔ ''ان سب کو دودھ پتی چائے پلایئے۔'' پھر وہ ڈاکٹر منیر کا ہاتھ تھامے وہاں سے چلے آئے۔

شام کے سائے آہستہ آہستہ گاؤں میں اتر رہے تھے اور ذیشان مضبوطی سے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑے اس کے گھر کی طرف رواں تھے۔

''تم بہت کمزور ہو گئے ہو کیا زرینہ تمہاری خوراک کا خیال نہیں رکھتی؟''

ذیشان نے منیر سے پوچھا۔

ڈاکٹر نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''خدا کے واسطے ذیشان مجھے بتایئے آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟''

''کیوں؟ کیا تمہیں مجھے دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی۔؟'' ذیشان بولے۔ ''اور خود تم نے ہی تو خط لکھ کر مجھے بلایا ہے۔''

''میں نے؟ اوہ اچھا۔ خوب یاد آیا۔ ہاں میں نے ہی تو لکھا تھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ خط اس قدر پیچیدہ تھا کہ آپ کے کچھ پلے نہ پڑا ہوگا۔''

خیر وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ ذیشان نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''میں نے زرینہ کو دیکھا ہے۔ بخدا وہ تو تم سے بھی کہیں زیادہ کمزور ہو گئی ہے۔'' ذیشان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر منیر اور زرینہ دونوں کو سخت آرام کی ضرورت ہے۔ پھر وہ بولے۔ ''میرا خیال ہے کہ رات کے کھانے کے بعد محفل جمے گی اور اس موضوع پر تم سے تفصیلی گفتگو رہے گی۔ کہ آخر تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے۔''

ڈاکٹر منیر نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہو گیا کیونکہ وہ ذیشان کی عادت سے بخوبی واقف تھا کہ وہ

بار بار اپنے فیصلوں میں ترمیم نہیں کیا کرتے وہ دونوں اندر چلے آئے راہداری میں لیمپ روشن تھے۔ اور شام کی بڑھتی ہوئی۔ تاریکی میں مکان کا اندرونی حصہ اب پہلے سے زیادہ نفیس اور جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا۔

خیر رات کے کھانے کے لئے میز پر بیٹھے۔ کھانا سادہ تھا لیکن بے حد لذیذ تھا۔ ذیشان کو یقین ہو چلا تھا کہ ان کی بیٹی انم نے بڑی حد تک اپنی سہیلی زرینہ کے دکھ اور کرب میں کمی کر دی ہے۔ کیونکہ اب وہ خاصی پر سکون اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ لیکن دن بھر کے کام کاج کے بعد تھکن کے آثار انم کے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔

تاریکی نے گاؤں کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور رات کا سناٹا گاؤں کی کچی پکی گلیوں میں اتر چکا تھا۔ ذیشان نے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا اور بولے۔ میرا خیال ہے تم دونوں جاؤ اور جا کر لیٹ جاؤ۔ میں اور منیر ابھی کچھ دیر گپ شپ کریں گے۔''

انم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اس نے زرینہ کا بازو تھاما اور اسے اپنے ہمراہ لئے کر بیڈروم کی طرف چل پڑی۔ ان کے جانے کے بعد منیر نے پانی کی ایک بوتل نکالی ایک گلاس میں پانی ڈالا تو ذیشان کی پر وقار اور گمبھیر آواز کمرے میں گونجی۔ ''منیر کیا حالات کا مقابلہ اسی طرح بزدلی سے کیا جاتا ہے۔؟''

منیر کے چہرے سے مایوسی اور بیزاری عیاں تھی۔ اس نے گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

ذیشان نے منیر کا لکھا ہوا خط نکالا اور اسے پڑھتے ہوئے ''لوگ یہاں مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ میں نے تمہیں کبھی اس قدر مایوس اور الجھی الجھی باتیں کرتے نہیں دیکھا۔'' انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور کیا تم نے اس پر اسرار بیماری کی علامتیں معلوم کرنے کی کوشش کی۔ آخر تمہارے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

منیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ذیشان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔ ''بظاہر اس بیماری کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ میں نے مریضوں کا خون کا ٹیسٹ کرنا چاہا تو ایسا نہیں کر سکا۔ یہ لوگ بڑے وہمی ہیں مرنے والوں نے یہی کہا کہ وہ سوئی کی چبھن بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ ایک بڑی عجیب سی بات ہے۔ لیکن یہاں کے لوگ بے حد توہم پرست ہیں اتنی اموات کے باوجود میں ایک بھی پوسٹ مارٹم نہیں کر سکا۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ ویسے بھی یہ شہر تو ہے نہیں، یہ تو ایک معمولی گاؤں ہے جہاں جاگیردار کی حکمرانی ہے۔ وہ جو بھی کرتا ہے۔ محض اپنے مفاد اور خوشی کی خاطر کرتا ہے۔ اسے گاؤں کی خوشحالی یا سی ترقی سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

ذیشان نے افسوس سے سر ہلایا۔ انہیں یہ احساس ہونے لگا کہ رات اب بہت بیت چکی ہے۔ اس لیے سو رہنا ہی بہتر ہوگا۔ منیر بڑی امید بھری نظروں سے ذیشان کی طرف دیکھ رہا تھا، ذیشان نے ایک بار پھر ذہن سے نیند کو جھٹکا اور قطعی فیصلہ سناتے ہوئے بولے۔

میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمیں پوسٹ مارٹم کے لے ایک لاش ہر قیمت پر حاصل کرنا ہوگی۔ اور اس سلسلے میں شانی کے بھائی کی لاش جو ابھی حال ہی میں مرا ہے زیادہ مناسب رہے گی۔ اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتے ہمیں جلد از جلد یہ اقدام کرنا ہوگا۔''

منیر بڑے غیر یقینی انداز میں ذیشان کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ پھر بولے۔ ''آج رات چودھویں کی رات ہے۔ اس سے بہتر موقعہ ہمیں پھر نہیں مل سکے گا۔ ہمیں آج رات ہی یہ لاش حاصل کرنا ہوگی۔ تمہارا کیا خیال ہے کوئی حرج تو نہیں ہوگا؟''

منیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ''خوب۔'' ذیشان نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے

اس پوسٹ مارٹم سے کیا نتائج ظاہر ہوں گے۔''

اس گفتگو کے بعد وہ دونوں اوپر بیڈ روم میں چلے آئے اور کچھ دیر تک وہاں بیٹھنے کے بعد سوچ کر کہ وہ لڑکیوں کی تنہائی میں مخل ہو رہے ہیں۔ پھر نیچے ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔

ان دونوں کے جاتے ہی زرینہ کسمسانے لگی۔

اور انم اس کے بستر پر آ بیٹھی دونوں سہیلیاں دھیمی دھیمی آوازوں میں باتیں کرنے لگیں انم نے محسوس کیا کہ زرینہ کی ہنسی میں شادابی اور تازگی غائب تھی۔ اس کی مسکراہٹ بھی بڑی مردہ اور اداس تھی۔ اس نے زرینہ سے صبح کے واقعے کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ ''وہ اب تک ان گھڑسواروں کی ہولناک نگاہوں کو نہیں بھلا سکی ہے۔''

زرینہ نے کہا۔ ''ہاں وہ لوگ یقیناً شادو کے دوست ہو سکتے ہیں۔''

انم کے استفسار پر زرینہ نے بتایا کہ ''شادو ایک بے حد وجیہہ اور امیر آدمی ہے وہ ابھی تک کنوارا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اکثر لڑکیاں اس کی دیوانی ہیں۔''

انم کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اور وہ بولی۔ ''غالباً تم میرے ساتھ دل لگی کرنے کے موڈ میں ہو۔ بہر حال میری جان تم اپنی کہو۔ تمہارا کیا حال ہے؟''

یہ سن کر زرینہ کے چہرے پر یکا یک مردنی چھا گئی۔ اور انم کو احساس ہوا کہ اسے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی۔ ''کہیں ڈاکٹر منیر اور زرینہ کے درمیان یہ تیسرا آدمی تو اختلاف کا سبب نہیں بن گیا۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انم کھوکھلی سی ہنسی ہنسنے لگی اور انم کو اس طرح ہنستے دیکھ کر زرینہ بھی اس کے ساتھ دینے لگی۔ اب وہ دونوں گزرے ہوئے دنوں کی باتیں کر رہی تھیں اور رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ خیر دونوں اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئیں اور انم کی آنکھ لگ گئی۔

اچانک کسی کھٹکے سے انم کی آنکھ کھل گئی اور دیکھا تو زرینہ اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔

ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ آسمان پر چھوٹے چھوٹے سیاہ اور بھورے بادلوں کے ٹکڑے ہوا میں تیر رہے تھے۔ اور چاند کی زرد چاندنی ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔

چاند کی روشنی میں یکا یک اس کی نظر باہر کی جانب ایک سائے پر پڑی۔ یہ یقیناً زرینہ تھی جو مکان سے دبے پاؤں نکل کر باہر جا رہی تھی۔

''زرینہ......'' انم نے ہلکی آواز دی۔ لیکن اس کی آواز پر توجہ دیئے بغیر زرینہ آگے بڑھتی رہی۔

انم قدرے جھجکی۔ پھر اس نے تیزی سے اپنا نائٹ گاؤن پہنا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے چلی آئی۔ اندر ڈرائنگ روم میں ذیشان اور منیر محو خواب تھے۔ اس نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور تنہا زرینہ کے تعاقب میں چل پڑی۔ اس نے باہر نکلنے کے لیے کچن کا عقبی دروازہ ہی استعمال کیا۔

زرینہ غائب ہو چکی تھی۔ آخری بار انم نے اسے ایک تنگ سی گلی کے موڑ پر مڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ انم نے دوڑ کر چوک پار کیا اور گلی میں داخل ہو گئی۔ گلی کے آخر میں پہنچ کر انم رک گئی۔ یہاں اس نے دیکھا کہ زرینہ تیز تیز قدم اٹھاتی جھاڑیوں کی طرف چلی جا رہی ہے انم نے تیزی سے زرینہ کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ وہ اب اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ کچھ دور جا کر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں زرینہ غائب ہو گئی۔ اور انم حیران پریشان اس ویرانے میں کھڑی رہ گئی۔

سامنے ہر طرف دور دور تک سنسان کھیت نظر آ رہے تھے اور ان پر وحشت برس رہی تھی۔ یکا یک اس کو خوف سے جھرجھری سی آ گئی۔ وہ اس ویرانے میں اکیلی کھڑی تھی۔ اور راستہ بھول چکی تھی۔

چاند کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا قطعی ناممکن تھا کہ زرینہ کس طرف گئی ہوگی؟ انم کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ لیکن اس نے پھر اپنی ہمت یکجا

کی اور تیزی سے آگے کی طرف چل دی۔ رات کے اس ہولناک سناٹے میں اس نے آواز دی۔ اور پھر اسے احساس ہوا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس ویرانے میں کسی الو کی کرخت اور دلخراش چیخ نے انم کا دل دہلا دیا اور انم کے قریب ہی ایک گھنی جھاڑی سے ایک سایہ سا نمودار ہوا۔

چاند کی روشنی میں انم نے دیکھا کہ وہ شانی تھا۔ ایسا لگتا تھا نشے میں دھت اور بدمست۔ اس نے فوراً انم کو دیکھ لیا اور اپنے بازو وا کیے وہ اسے اپنی گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھنے لگا۔ درختوں کی خشک ٹہنیاں، سوکھے پتے اور گھاس پونس اس کے بوجھل قدموں کے نیچے چرمرا رہے تھے۔

انم تیزی سے مڑی اور دوڑنے لگی۔ اس کے سامنے وسیع سبزہ زار تاحد نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں بس ایک ہی دھن تھی کہ وہ کسی طرح جلد از جلد گھر واپس پہنچ جائے۔ وہ بے تحاشا بھاگ رہی تھی۔ لیکن اس افراتفری میں اسے صحیح راستہ یاد نہیں رہا تھا۔ اسی اثناء میں اس نے دیکھا کہ تین آدمی گھوڑوں پر سوار اسی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں ان کے جسمانی خطوط اب چاند کی روشنی میں واضح ہوتے جا رہے تھے۔ اور ان کی وحشت انگیز ہنسی اس بات کی غمازی کر رہی تھی۔ کہ اب وحشت، درندگی اور بربریت کا ایک نیا کھیل شروع ہونے کو ہے۔ انم تن تنہا میدان کے بیچ میں چاندنی میں نہائی کھڑی تھی۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ کہ اس کی حالت اس وقت اس لومڑی سے قطعی مختلف نہیں ہے جس کی جان کے درپے شکاری اور شکاری کتے ہوا کرتے ہیں، اس کے چاروں طرف کھلا میدان تھا اور فرار کی سب راہیں مسدود تھیں۔

جونہی انم ایک طرف دوڑی تو ایک گھڑسوار تیزی سے اس طرف آ گیا۔ اور جب وہ پلٹ کر دوسری سمت میں لپکی تو وہاں سے اس نے دوسرے کو پہلے ہی موجود پایا۔ وہ لوگ ہذیانی انداز میں چیخ رہے تھے۔ اور ان کے چہروں سے سفاکی اور درندگی عیاں تھی۔ وہ سب اس کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انم نے اس بار پلٹ کر جنگل کا رخ کیا اب وہ تینوں تیزی سے اپنے گھوڑے دوڑاتے اور اچانک لہراتے اس کے تعاقب میں چل پڑے۔ جنگل میں درختوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا اس لئے انم کے لیے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تھی اور فرار کا راستہ بھی قطعی بند تھا۔ شکاری اپنے شکار کو دبوچ لینے کے لیے برسر پیکار تھے۔ یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب سے کسی صورت کم نہیں تھا۔

انم سانس لینے کے لیے رکی۔ اس کا دل چاہا کہ اپنا گریبان چاک کر ڈالے اپنی ریشمی زلفوں میں خاک ڈال لے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ اس ایک لمحے میں وہ تینوں اس کے قریب آ رہے تھے۔ حتی کہ ان میں سے ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا خوشی سے چیختا ہوا انم کے بالکل قریب آ گیا۔ وہ جھکا اور انم کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچ کر اوپر اٹھا کر گھوڑے کی کمر پر لاد لیا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا اور پھر سرپٹ کھلے میدان میں دوڑنے لگا۔

انم کا سر زمین کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ اسکی آنکھوں میں خون کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

کافی دیر بعد وہ گھڑسوار نے گھوڑے سے اتر کر انم کی کلائی مضبوطی سے جکڑلی اور اسے بڑے ظالمانہ انداز میں گھسیٹتا ہوا ایک پرانے سالخوردہ صدر دروازے کی طرف لے چلا۔ یہ ایک پرانی سی عمارت تھی۔ عمارت میں ایک ہال تھا۔ جس میں بڑی بڑی موم بتیوں کی تیز روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ انم ابھی تک بری طرح خوفزدہ تھی۔ لیکن وہ اپنا خوف بدطینت اور درندہ صفت شیطانوں پر ہرگز ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں یہ احساس تھا کہ وہ لوگ اس کے ساتھ زیادتی کرنے والے تھے۔ اس کی رگوں میں خون برف کی طرح منجمد ہو رہا تھا۔

اسے اغوا کرنے والے آدمی نے اسے فرش پر گرا دیا۔ اور حقارت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ ''بالی تمہارا کیا خیال ہے۔''

لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ بالی نے کہا۔ ''اس کا خیال رکھنا اور ہاں دیکھو شراب کا انتظام کر لو تاکہ اس دو آتشہ نشہ اور تیز ہو جائے۔ اس کے لہجے میں رعب اور تحکم عیاں تھا۔

وہ لوگ تعداد میں تین تھے۔ لیکن اب ان میں ایک چوتھے فرد کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے انم کے گرد گھیرا سا ڈال لیا اور غٹاغٹ جام پینے لگے۔ بالی شراب سے لطف اندوز ہونے کے بجائے بالکل الگ تھلگ، خاموش سا نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ہنٹر تھامے ہوئے غصیلی نظروں سے انم کو دیکھ رہا تھا۔

بالی انم کے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا ہنٹر موم بتیوں کی تیز روشنیوں میں لہرایا اور اس نے بڑی نرمی سے کہا۔ ''خیریت چاہتی ہو تو چپ چاپ پڑی رہو۔ ورنہ مار مار کر کھال ادھیڑ دوں گا۔ خاموشی میں ہی تمہاری بھلائی ہے۔''

☆......☆......☆

ذیشان اور منیر دبے قدموں آگے بڑھ رہے تھے۔ ذیشان نے ہاتھ میں لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ اور دونوں تازہ بنی ہوئی قبر کے سرہانے پہنچ گئے۔ قبر پر مرجھائے ہوئے ننھے ننھے پھول پڑے ہوئے تھے۔ دونوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بڑی خاموشی سے اپنے کام میں جت گئے۔ منیر نے قبر کو کھودنا شروع کر دیا۔ اس دوران ذیشان بار بار قبرستان سے باہر جا کر دیکھ لیتے کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔ لیکن کسی قسم کی مداخلت کا امکان فی الوقت انہیں نظر نہیں آیا۔ قبر کی مٹی ابھی بھربھری تھی۔ جلدی ہی تابوت نظر آنے لگا۔ منیر نے تابوت پر پڑی ہوئی مٹی ہٹائی اور تابوت کا ڈھکنا کھولنے لگا۔

ذیشان کو کسی غیر متوقع نتیجے کا انتظار نہیں تھا۔ لیکن خوف اور تجسس کی ایک سرد لہر منیر کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ تابوت کی آخر کیل بھی نکال دی گئی۔ منیر نے سیدھے کھڑے ہو کر سانس لی۔

''اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔'' ذیشان نے کہا۔

''ہاں اب دیکھو کیا ہوگا۔'' ذیشان کے پیچھے سے ایک آواز ابھری انہیں جھرجھری سی آ گئی۔ وہ سنبھلے اور یہ دیکھنے کے لیے مڑے کہ یہ تیسری آواز کس کی تھی۔

اور منیر جست لگا کر قبر کے گڑھے سے باہر آ گیا۔ یہ انسپکٹر تھا، ذیشان اور منیر کے فرار ناممکن تھا۔ وہ دونوں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ انکار کی گنجائش ہرگز نہیں تھی۔ اس مرحلے پر ذیشان نے انسپکٹر سے کہا۔ ''اب ہم جبکہ اپنے کام کے آخری مرحلے پر پہنچ چکے ہیں کیا آپ کو اس بات پر کوئی اعتراض ہوگا۔ اگر ہم تابوت کا ڈھکنا اٹھا دیں تو؟''

''یقیناً۔'' جواب ملا۔ ''مجھے اعتراض ضرور ہوگا۔ خدا کے واسطے مردوں کو ان کی آخری آرام گاہوں میں آرام سے سونے دیجیے۔ اگر آپ میں سے کسی نے تابوت کو ہاتھ لگایا تو......''

لیکن ذیشان نے انسپکٹر کی بات سنی ان سنی کر دی اور یہ کوشش کرنے لگے کہ اسے باتوں میں الجھائے رکھیں۔ منیر نے یہ موقع غنیمت جانا اور تیزی سے تابوت کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ خوف اور حیرت سے ملی جلی ایک چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

انسپکٹر اور ذیشان تیزی سے قبر کی طرف لپکے۔ خوف اور دہشت سے ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ تابوت خالی تھا۔

ان تینوں کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ خود ذیشان کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی۔ ان کی سمجھ میں یہ ناقابل یقین بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر لاش کہاں غائب ہو گئی۔

بہر حال یہ بات طے تھی کہ اب قانون کا ہاتھ ان کی گریبان تک نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ زیادہ سے زیادہ ان پر لاش چرانے کا الزام عائد کیا جا سکتا تھا۔

لیکن یہاں تو لاش کا وجود ہی سرے سے نہیں تھا۔ ذیشان نے انسپکٹر سے درخواست کی کہ وہ اس پراسرار بیماری کا سراغ لگانے کے لیے ان کی مدد کرے کیونکہ یہ ایک ایسا کام تھا جس میں پورے گاؤں کی فلاح اور بھلائی تھی۔ انسپکٹر نے پہلے تو ان کی بات ماننے سے انکار کردیا۔

پھر بولا۔ ''ذیشان آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ اس بھیانک بیماری کی بھینٹ چڑھنے والوں میں خود میرا بیٹا سرفہرست آتا ہے۔''

تمہیں اپنے بچے کی قسم تم ہماری مدد کرو۔ خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے بیٹے کی روح سکون سے سو سکے گی۔'' ذیشان نے اس کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی جو خاصی کامیاب رہی لیکن منیر نے محسوس کیا کہ ذیشان کی آواز کانپ رہی تھی۔

آخر کار انسپکٹر نے ان کا ساتھ دینے کی حامی بھر لی اور کہا۔ ''اچھا ذیشان میں آپ کو مزید اڑتالیس گھنٹے کی چھوٹ دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن خیال رہے اس بات کی خبر کسی کو نہیں ہونی چاہے اور ہاں یہاں سے جانے سے پہلے آپ دونوں اس قبر کو بالکل پہلے کی طرح پاٹ دیں تاکہ کسی کو یہ شبہ بھی نہ ہو سکے کہ کسی نے قبر کو چھیڑا ہے یا اسے کھودنے کی کوشش کی ہے۔''

ذیشان اور منیر نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کام میں مگن ہوگئے۔ جونہی وہ اس کام سے فارغ ہوئے انہوں نے گھر کا رخ کیا۔ اور وہ سوچ رہے تھے کہ دن بھر کی تھکی ماندی انم اور زرینہ نیند کی وادیوں میں گم ہوچکی ہوں گی۔

☆......☆......☆

اسے تنہا چھوڑ دو۔ ہال میں ایک بارعب اور پاٹ دار آواز گونجی بالی کا آگے بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا اور اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہوگیا۔ اس کی ہوسناک نگاہیں ابھی تک انم کے آتشیں بدن کے نشیب و فراز میں الجھی ہوئی تھیں۔ سیڑھیوں پر ایک باوقار آدمی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر شہوت اور ہوس کے سائے رقص کر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس امر کی غمازی کررہے تھے کہ وہ ایک ماہر شکاری ہے، انم کے دل میں اس کے لیے بھی نفرت کا لاوا ابل پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتے نیچے آیا۔ انم اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ظہیر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آگے بڑھا اور الٹے ہاتھ کا ایک بھرپور تھپڑ بالی کے چہرے پر رسید کیا۔ ضرب اس قدر شدید تھی کہ بالی لڑھکتا ہوا دور فرش پر جا کر گرا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا تاکہ اپنا دفاع کرسکے لیکن اجنبی نے تابڑتوڑ کئی گھونسے رسید کئے۔ بالی کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اس خوفناک ٹھکائی سے بچنے کے لیے ناکام کوشش کررہا تھا۔ ''اٹھو اور دفع ہوجاؤ حرامزدے دور ہوجاؤ بدبختو میری نظروں سے دور ہوجاؤ میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔'' اجنبی دھاڑا تو وہ چاروں بوکھلا کر دروازے کی طرف بڑھے

اجنبی انم کے قریب آیا اور بڑے نرم لہجے میں بولا۔ ''مس انم مجھے دلی افسوس ہے کہ آپ کو پریشانی اٹھانی پڑی۔ میں اپنے دوستوں کی اس ذلالت کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ میں جانتا ہوں ان کا یہ اقدام ناقابل معافی ہے لیکن میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ انہیں معاف کردیجئے، یقین کیجئے یہ سب کچھ میری لاعلمی میں ہوا۔''

''تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟'' انم نے خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

''یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مجھے آپ کے محترم والد اور آپ کی آمد کی خبر مل گئی تھی۔ آپ جیسی حسین خاتون کے نام سے بھلا کون واقف نہ ہوگا وہ احتراماً جھکا۔ ''میرا نام ظہیر اور عرف شادو ہے۔''

''خوب تو یہ وہی شادو ہے جس کا تذکرہ کرتے ہوئے زرینہ کی آنکھوں میں تابناک سی چمک آجاتی ہے۔'' انم نے سوچا۔

''شادو صاحب کیا آپ مجھے میرے گھر پہنچا سکتے ہیں؟'' انم نے کہا۔

شادو نے عیاری سے کہا۔ ''میرا خیال ہے آپ نے اب تک مجھے معاف نہیں کیا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ براہ کرم مجھے میرے گھر پہنچادو یا پھر مجھے خود ہی پیدل جانا ہوگا۔'' انم نے کہا۔

''کیا میں اپنی ذاتی معصومیت کا کسی صورت آپ کو یقین نہیں دلاسکتا۔'' شادو نے دھیمے لہجے میں کہا۔ بظاہر شادو کے لہجے سے خلوص اور معصومیت ٹپک رہی تھی۔ اور وہ خود کو مہذب ظاہر کرنے پر مصر تھا لیکن خدا معلوم کیوں انم کے دل میں اس کی ہر بات پھانس کی طرح اترتی چلی جارہی تھی، خوف وہم شک اور وحشت کے جذبات نے اس کے سوچنے کی تمام تر قوتیں سلب کرلی تھیں۔ وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے مجھے پیدل ہی جانا پڑے گا۔''

شادو نے جھک کر کہا۔ ''میری بگھی آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے، بدقسمتی سے میں اس وقت آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔ لیکن میں اپنے ایک نوجوان کو ہدایات دے کر......''

''جی نہیں شکریہ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔'' انم نے بدمزگی سے کہا۔

''میں پیدل چلنے کو ترجیح دوں گی۔'' انم تیزی سے دروازے کی طرف مڑی تاکہ باہر جاسکے۔

شادو شانہ بشانہ چلتا ہوا صدر دروازے تک آیا اور اسے رات کے اس پرہول سناٹے میں تنہا باہر جانے سے منع کرنے لگا۔ لیکن انم نے سختی سے اس کی ہر پیشکش اور درخواست رد کردی اور باہر نکل آئی۔

''میں کل صبح سب سے پہلے اس بھیانک واقعے کی اطلاع پولیس کو دوں گی۔''

''خدا کے لیے مس ایسا نہ کیجئے گا میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' شادو نے کہا۔ ''آپ نہیں جانتیں اس گاؤں میں میری اچھی ساکھ داغدار ہوجائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی قسم کا کوئی اسکینڈل میری ذات سے منسوب کیا جائے۔

''اور تمہارا اپنے تہذیب یافتہ مہمانوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' انم نے طنزیہ کہا۔

''آپ ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں انہیں ایسی عبرتناک سزا دوں گا کہ وہ پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہیں ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

انم نے شادو کی بات مان لی اور شادو انم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ سے صرف اتنی سی التجا کروں گا کہ آپ شال کی طرف مت جایئے گا۔ وہ جگہ بے مخدوش ہے اور کسی وقت بھی وہاں کی زمین دھنس سکتی ہے۔''

انم نے بے چینی سے اپنے ہونٹ کاٹے اور چاند کی روشنی میں باہر سڑک پر نکل آئی۔ چاروں طرف روح فرسا سناٹے نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ ہر طرف بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر بھی انم کا دل بری طرف لرزنے لگتا۔ خوف اور وسوسوں نے اسے تیز چلنے پر مجبور کردیا تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ عمارت کی حالت بے حد مخدوش اور خطرناک تھی۔ ہر طرف موت کا سناٹا طاری تھا انم اندر جانے سے پہلے ذرا جھجکی۔ پھر آہستہ سے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی۔ کچھ فاصلے پر اسے دو سائے حرکت کرتے نظر آئے۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں آنکھیں مل کر دیکھا۔ چاندنی کی زرد روشنی ذرا دیر کو مدھم ہوگئی۔ چاند ایک بادل کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ پھر جب چاند نے بادل سے جھانکا تو اس کی روشنی میں انم نے ایک دلدوز منظر دیکھا۔ اس کی ہڈیوں میں یخ بستہ لہر دوڑ گئی اور رگوں میں خون جمنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی ہو۔ وہ تیزی سے پلٹی اور واپس سڑک کی طرف دوڑی۔ اس

نے سنا جیسے فضا میں کسی کی سسکی کی آواز گونجی ہو۔ وہ پھر مڑی پن چکی کے پر ساکت تھے۔ دونوں سائے اب واضح ہوتے جارہے تھے۔ انم کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

دونوں مردے کفن پہنے ہوئے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے ان کے خشک بال لہرا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں بے نور اور ساکت تھیں جیسے وہ کہیں خلاؤں میں گھور رہے ہوں۔ ایک مردے نے اپنے ہاتھوں پر ایک عورت کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ چاندنی کی صاف روشنی میں انم نے غور سے دیکھا۔ وہ لاش اس کی عزیز سہیلی زرینہ کی تھی۔ جو خون میں نہائی ہوئی تھی

کفن پوش مردہ اپنے ہاتھوں پر زرینہ کی لاش اٹھائے ہوئے آہستہ سے آگے بڑھا۔ انم نے ایک دلدوز چیخ ماری اور پیچھے ہٹی۔ اس بھیانک عفریت نے اپنا منہ کھولا انم کو یوں لگا جیسے وہ ہنس رہا ہو۔

''زرینہ۔'' انم بے اختیار زور سے چیخی اور اپنے تمام تر خوف کے باوجود غیر ارادی طور پر مردے کی طرف بڑھنے لگی، اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ یکا یک مردے نے زرینہ کی لاش زمین پر پھینک دی اور تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا انم دوزانو ہو کر زرینہ کی لاش کے قریب بیٹھ گئی۔

''زرینہ زرینہ'' انم بری طرح سسکنے لگی۔ اس نے زرینہ کا بے جان چہرہ اپنی طرف گھمایا لیکن زرینہ اس سے بہت دور جا چکی تھی اور انم کے تمام کپڑے زرینہ کے خون سے تر بتر ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

منیر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر آیا۔ اس نے قبرستان کی بوٹوں پر جمی ہوئی مٹی جھاڑی اندر ذیشان اس کے منتظر تھے۔ ان کا چہرہ کشیدہ تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے دن بھر کی تھکن اور پریشانی نے انہیں نڈھال کر دیا ہو۔ ذیشان اپنی جگہ سے اٹھے اور اسے یہ بھیانک خبر سنائی کہ زرینہ اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے۔ منیر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ''میں کہتا ہوں زرینہ اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے۔

ذیشان پھر چیخے۔ یکا یک ان کے چہرے سے تاسف اور درد چھلکنے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں پر قابو رکھے ہوئے تھے۔

''نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔'' منیر ہذیانی انداز میں چیخا۔ ''زرینہ مجھے یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔

ذیشان نے کہا۔ ''انم کو اس کی لاش مل گئی ہے۔''

''نہیں......نہیں۔'' منیر خود پر قابو نہ رکھ سکا وہ پاگل سا ہو کر چیخ رہا تھا۔ منیر کو شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا۔ کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی غفلت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے زرینہ کی بیماری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ دوسرے مریضوں میں گھرے رہنے کی وجہ سے وہ اپنی شریک حیات کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ اب یہ سب کچھ اس کے لئے۔ ایک بھیانک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ اس نے زرینہ کی کس قدر حق تلفی کی ہے۔ وہ بے اختیار چیخا۔

''میں نے اسے مار ڈالا۔ میں اس کا قاتل ہوں۔''

ذیشان نے اس کے شانے تھپتھپاتے اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''صبر کرو۔''

''کیا تم مجھے لاش کے پوسٹ مارٹم کی اجازت دو گے؟'' ذیشان نے کہا ان کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ چونک پڑا۔ ''نہیں نہیں...... میں تمہیں اس کے دلکش بدن کو چیر پھاڑ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا لیکن ذیشان کے سمجھانے بجھانے اور اصرار کرنے پر آخر کار وہ رضامند ہو گیا۔ اسے مختلف خدشوں اور اندیشوں نے نیم جان کر رکھا تھا۔ وہ بڑبڑایا۔ ''زرینہ کہاں ہے۔؟''

اسی اثنا میں انم کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بے حد کمزور نظر آ رہی تھی۔ ذیشان نے اسے آرام کرنے کی تاکید کی۔ ''نہیں میں ہرگز آرام نہیں کر سکتی، ہم میں سے کوئی بھی آرام نہیں کر سکتا اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ سب کیا معاملہ ہے؟''

وہ بڑی ہمدردی سے اور ترس کھانے والے انداز میں ڈاکٹر منیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ ڈاکٹر منیر نے محسوس کیا کہ انم بڑی مشکل سے آنسو روکے ہوئے تھی۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر منیر احساس سے عاری چہرہ لئے زرینہ کے بے جان جسم کو گھور رہا تھا۔ زمین پر زرینہ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا جسم اینٹھ گیا تھا اور شکل مسخ ہو چکی تھی۔ منیر باوجود کوشش کے زرینہ کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

ذیشان خاصے مطمئن نظر آ رہے تھے۔ غالباً اب وہ اپنے پروفیشن کے اس مرحلے میں پہنچ چکے تھے جہاں جذبات اور رشتوں کی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ اور اسی لئے وہ بڑے پرسکون انداز میں لاش کا معائنہ کر رہے تھے۔ ذیشان نے سوئی اٹھائی اور زرینہ کی لاش پر چبھوتے ہوئے کہا۔

''منیر تم اس بارے میں کیا کہتے ہو، یہ بڑا غیر معمولی سا واقعہ ہے۔''

منیر کے چہرے پر خوف اور تردد کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ذیشان نے تیزی سے زرینہ کے بازو پر بندھی ہوئی پٹی کھولی۔ خون کے بلبلے ابل ابل کر فرش پر گرنے لگے۔

یکایک ذیشان نے انگلیوں میں خون کو ملا اور پھر کونے میں رکھی ہوئی خوردبین کی طرف بڑھے۔ انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے ایک شیشے کی سلائیڈ پر خون ملا اور خوردبین کے نیچے رکھ کر اس کا مشاہدہ کرنے لگے۔ پھر وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے اور جیسے چیخے۔

''منیر، یہاں آؤ...... تم نے اب تک ایسی ناقابل یقین چیز کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔''

منیر نے فوراً آگے بڑھ کر خوردبین سنبھالی اور وہ بھی تیورا کر پیچھے ہٹا۔ یہ کسی درندے کا خون تھا۔

''یہ خون ہرگز زرینہ کا نہیں ہو سکتا۔'' منیر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور کرسی پر گر پڑا۔

ذیشان نے اسے بازو سے تھام کر اٹھایا اور میز کے قریب رکھے ہوئے جراحی کے آلات کی طرف لے جاتے ہوئے بولے۔ ''میرا خیال ہے اب ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔''

منیر کے حلق میں آواز پھنس گئی اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ذیشان نے بڑی نرمی سے نشتر اٹھایا اور زرینہ کے پیٹ پر ایک گہرا شگاف لگایا۔ خون پھر ابل کر باہر گرنے لگا۔ وہ یکے بعد دیگرے مختلف جگہوں پر نشتر زنی کرتے رہے۔ ایک گھنٹے کی مسلسل محنت اور عرق ریزی بھی لاحاصل رہی۔ جگہ جگہ جسم پر شگاف ڈالنے کے باوجود ان کو زرینہ کے جسم سے کوئی ایسی چیز دستیاب نہیں ہو سکی جو اس کی پراسرار ہلاکت یا اس بیماری پر کوئی روشنی ڈال سکتی۔ آخر ذیشان نے ایک بڑی سی سفید چادر اٹھائی اور لاش پر ڈال دی۔

منیر کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے زرینہ ابھی ابھی اٹھ کر بیٹھے گی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر لپٹ جائے گی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ''کاش میں نے اپنی بیوی کو اس المناک موت سے ہمکنار ہونے سے پہلے ہی بچا لیا ہوتا۔'' اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک معمولی سا زخم جو زرینہ کے بازو میں شیشہ لگ جانے کی وجہ سے آیا تھا۔ اس کی موت کا باعث بن جائے گا۔ اب وہ رہ رہ کر خود کو کوس رہا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ اب بے معنی اور لاحاصل تھا۔

☆......☆......☆

انسپکٹر نے منیر کے ہونق سے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن میں بہت سے سوال آ رہے

تھے۔ لیکن وقت اور مصلحت کے تقاضوں کے پیش نظر اس نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی منیر بہت جذباتی ہورہا تھا۔ انسپکٹر جو ایک عام دیہاتی اور سیدھا سادھا سا پولیس والا تھا۔ ذیشان کے پاس گیا اور بولا۔ ''سر مجھے شانی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔''

ذیشان چونک کر بولے۔ ''شانی کو کیا ہوا ہے۔ کیا کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟''

''جی ہاں سر۔ وہ بڑی بے سروپا باتیں کررہا ہے۔ لیکن اس کی باتوں کا خالی تابوت سے یقیناً کوئی تعلق ہے اس کی باتیں بڑی بھیانک ہیں۔'' انسپکٹر نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

ذیشان نے انسپکٹر کے پریشان چہرے پر ایک نظر ڈالی اور بولے۔ ''ٹھیک ہے تم ذرا ایک منٹ ٹھہرو میں تمہارے ساتھ پولیس سٹیشن چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ڈاکٹر کی لیبارٹری میں گئے جہاں زرینہ کی پوسٹ مارٹم کی ہوئی لاش پڑی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹر کا کمرہ لاک کردیا تاکہ اگر تھکن اور پریشانی کے ہاتھوں ستائی ہوئی انم غلطی سے اس کمرے میں چلی جائے تو وہاں دہشت ناک منظر کو دیکھ کر ہوش نہ کھو بیٹھے۔ پھر وہ انسپکٹر کے ہمراہ پولیس اسٹیشن چلے گئے۔ یہاں کانسٹیبل بدستور شانی پر تشدد کرنے پر آمادہ نظر آرہا تھا۔ شانی ذیشان کو دیکھتے ہی گڑگڑانے لگا۔

''جناب۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ بخدا آپ میری بات پر یقین کیجئے میں جو کچھ بتا چکا ہوں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا اور آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔''

انسپکٹر نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''تم اس وقت وہاں لاش کے قریب موجود تھے۔ میں تو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا تمام گواہیاں تمہارے خلاف ہیں۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ میں اس لاش کے قریب ہی پڑا ہوا تھا لیکن بخدا میں نے اسے ہرگز ہرگز قتل نہیں کیا۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔ میں نے اسے نہیں مارا۔''

''لیکن میں نے جو کچھ دیکھا۔ اوہ میرے خدا ۔'' (اس کا جسم ایک بار پھر خوف سے تھرتھر کانپنے لگا)

''میں آپ کو بتا چکا ہوں میں نے کیا دیکھا؟''

انسپکٹر نے کہا۔ ''سب لوگ اس واقعے کے عینی شاہد ہیں کہ بار میں ڈاکٹر منیر سے تمہارا جھگڑا ہوا تھا۔ کل رات تم ویسے بھی اس قدر شراب پی چکے تھے کہ تمہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ تم بھلا کیا کہہ سکتے ہو کہ تم نے کچھ دیکھا بھی تھا یا نہیں؟''

اس مرحلے پر ذیشان نے مداخلت کی۔ ''میں پوچھتا ہوں۔ آخر تم نے کیا دیکھا تھا؟''

شانی ذیشان کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے نجات دہندہ ہوں پھر وہ بولا۔ ''میں نے اپنے بھائی کو دیکھا۔ بخدا وہ وہی تھا۔ وہی جو مرچکا تھا۔ وہی جسے ہم قبرستان میں دفنا کر آئے تھے۔ میں نے اسے بالکل اسی طرح واضح اور عیاں دیکھا جس طرح اس وقت میں آپ لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔''

''دیکھا آپ نے اس کا دماغ بالکل خراب ہو چکا ہے۔'' انسپکٹر نے تاسف سے گردن ہلائی۔ لیکن شانی نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں پاگل نہیں ہوں۔ باخدا وہ میرا بھائی ہی تھا۔ سرمئی لباس میں ملبوس اس کے کفن سے تازہ مٹی کی سوندھی سوندھی مہک آرہی تھی۔ اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ چاہے وہ اس وقت اپنے تابوت میں ہی موجود ہوگا لیکن اس وقت وہ وہاں تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' شانی کی باتیں سن کر ذیشان کے دل میں ایک انجانے خوف نے سر اٹھایا۔

وہ سوچنے لگے کہ بدروحوں بھوتوں چڑیلوں اور بھیانک عفریتوں نے ہمیشہ ہی پرسکون انسانی زندگی میں تہلکے مچائے ہیں۔ پھر کچھ لمحے بعد بولے۔ ''شانی تمہارا بھائی مرچکا ہے اور اسے دفن کر دیا گیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے میں نے اسے خود اپنے

ہاتھوں سے دفن کیا تھا۔ لیکن میں حلفیہ کہتا ہوں کہ اس رات وہ میرا بھائی ہی تھا۔ اپنی سرد اور بے نور آنکھوں سے وحشت خیز انداز میں میری طرف دیکھے جارہا تھا۔ کفن میں لپٹا ہوا جیسے وہ ابھی ابھی تابوت سے اٹھ کر چلا آیا ہو۔" شانی اپنی بات پر اڑا رہا۔

"سر اب آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" انسپکٹر نے امید بھری نظروں سے ذیشان کی طرف دیکھا۔

ذیشان کے دل و دماغ میں سرد جنگ جاری تھی۔ شانی نے کندھے اچکائے اور مایوسی سے بولا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا؟"

ذیشان بولے۔ مجھے تمہارے ایک ایک لفظ کا یقین ہے۔" ذیشان کی بات سن کر باقی تینوں آدمی حیرت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے انہوں نے کوئی انہونی بات کہہ دی۔ شانی کی باتیں سن کر انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ان کی نظروں کے آگے ایک بھیانک فلم چل رہی ہو۔ جس میں ہر طرف مردے اور لاشیں گھوم رہی ہوں۔

☆......☆......☆

ذیشان نے بڑے محتاط انداز میں کہا۔ "انم کیا تم اس آدمی کی صورت بھی بھول گئی ہو جسے تم نے جنازے کے ہمراہ دیکھا تھا؟" ان کا اشارہ واضح طور پر شانی کی طرف تھا۔ "پولیس اسے گرفتار کر چکی ہے۔ اور تمہاری ذرا سی غفلت سے ایک بے گناہ کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا جائے گا۔ کیا وہ شانی تھا؟"

"میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ شانی ہو ہی نہیں سکتا۔" انم نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"لیکن تم تو کہتی ہو کہ تم اس رات والے آدمی کو نہیں پہچان سکی تھیں۔" ذیشان نے جرح کی۔

انم نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی وہ کچھ کہتے ہوئے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ ذیشان اس کی بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔ انم کی آنکھوں میں دہشت اور خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔

ذیشان نے پھر کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ اس رات تم نے جس مردے کو دیکھا وہ اس شخص کی لاش تھی جو سڑک کے کنارے گرے ہوئے تابوت سے باہر جا گری تھی کیا یہ وہی تھا؟" ذیشان نے بار بار کہا۔

تب انم نے کہا۔ "ہاں یہ وہی تھا۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس صدمے نے تمہارے دماغ کو متاثر نہیں کیا۔"

ذیشان نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر انہوں نے انم کا کندھا تھپتھپایا اور اسے آرام سے بستر پر لٹا دیا۔

"اب تم سو جاؤ لیکن صرف ایک بات کا جواب اور دو وہ یہ کہ کیا زرینہ واقعی اسی جگہ تھی جہاں تم نے اسے اس لاش کے ہاتھوں میں دیکھا تھا؟"

انم بولی۔ "جی نہیں میں نے اسے پرانی کان کے نزدیک دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب بھی اس جگہ کی نشاندہی کر سکتی ہوں۔"

ذیشان نے سختی سے کہا۔ "لیکن میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ تم گھر پر ہی رہو گی۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آئے۔ جہاں منیر اپنا زرد چہرہ لیے ان کا منتظر تھا۔ "سب انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔" وہ سرد مہری سے بولا۔

"منیر آؤ کچھ دیر کے لیے باہر چلیں۔ ہم راستے میں سے انسپکٹر کو اپنے ہمراہ لے چلیں گے۔" ذیشان نے اس کی توجہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

انہیں ٹین کی کان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ ہو کچھ دیر بعد ایک ویران اور شکستہ عمارت کے دروازے پر کھڑے تھے اس جگہ کی وحشت اور ویرانی دیدنی تھی۔ ہر طرف روح فرسا خاموشی طاری تھی۔ انسپکٹر نے زمین پر بوٹ سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ "سنا گیا ہے یہاں ٹین کے ذخائر موجود ہیں۔ بات یہ ہے جناب کہ کان کن مارے گئے۔ بہت سے ایسے عجیب واقعات ہوئے ہیں کہ لوگ اس

خواب ہے یا سراب ہے
سعدیہ لیاقت
آٹھ گھنٹے کی یہ فلائیٹ ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ پاکستان سے ڈنمارک کا سفر جوزیانے پہلی بار کتنی خوشی سے گزارا تھا آج اس سے کتنا مختلف تھا۔ پچھلی بار جہاں اپنوں سے بچھڑنے کا غم تھا تو دوسری طرف اپنے گھر جانے اور جیون ساتھی سے ملنے کی خوشی تھی۔ پر اب تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رات میں گم ہو جانے والا ایک پرندہ ہو جو بے سمت اڑے جا رہا ہے جسے نہ منزل کا پتہ ہے اور نہ ہی راستے کی خبر۔
قیمت
-/400 روپے
دُعا بک کارنر
نئی محلہ گلی نمبر 5
امین پور بازار
فیصل آباد

کان کے بارے میں مشکوک ہوگئے ہیں۔ یہ کان بھی آسیب زدہ مشہور ہوگئی ہے۔ اور لوگ دن میں بھی اس کے قریب آنے سے گریز کرنے لگے ہیں۔ یہ کان شادو کی ملکیت ہے۔ ظاہر ہے اسے سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہوگا۔؟"

ذیشان نے پوچھا۔ "اس کان کو دوبارہ شروع نہیں کیا گیا؟"

انسپکٹر نے شانے اچکائے۔ "دراصل شادو کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس کے پاس بہت مال ہے جناب۔"

ذیشان کان کے اسٹیئرنگ وہیل کے قریب گئے۔ اس پر تیل لگا ہوا تھا وہ سوچ رہے تھے۔ "اگر برسوں سے اس کان کو استعمال ہی نہیں کیا گیا تو پھر وہیل پر یہ تیل کہاں سے آ گیا۔ اور یہ اتنا روپیہ شادو کے پاس کہاں سے آتا ہے؟" انہوں نے انسپکٹر سے پوچھا۔ "جناب سنا ہے کہ جب شادو کا باپ مرا تھا تو ہزاروں کا مقروض تھا، شادو گاؤں کے نزدیک ہی اپنے مکان میں تالا لگا کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور کئی کئی دن باہر نہیں آتا تھا۔

"ہاں یہ بھی حقیقت ہے اور اب اس کے مکان میں اس کے دوست رہتے ہیں۔ اور ہر وقت محفل گرم رہتی ہے۔ سنا ہے کہ یہ لوگ روپیہ پانی کی طرف بہاتے ہیں اور دل کھول کر عیش و عشرت میں ڈوبے رہتے ہیں۔" انسپکٹر نے احمقانہ انداز میں کہا۔

ذیشان نے طنز کیا۔ "اور ان لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ کان آسیب زدہ ہے۔ یہاں بھوت رہتے ہیں۔" انسپکٹر نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "جی ہاں بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔"

پھر ذیشان بولے۔ "اس وہیل پر لگے ہوئے تازہ تیل کو دیکھنے کے بعد یہ بات بعید از قیاس ہے کہ عرصہ دراز سے کسی نے اس کان میں قدم ہی نہیں رکھا۔" ذیشان سوچ رہے تھے۔ "کیا یہ ممکن ہے ہوسکتا ہے کہ ایک ایسی کان جس میں ٹین کے ذخائر موجود ہوں اور جہاں لوگ دن میں آتے وقت خوفزدہ ہوجاتے ہوں۔ وہاں رات کی تاریکی میں مردوں اور لاشوں کا کام لیا جاتا ہو۔

☆......☆......☆

قبرستان میں بالکل خاموشی تھی۔ زرینہ کی تازہ قبر پر پھولوں کا انبار نظر آرہا تھا۔ قبر کے سرہانے ایک بڑا سا پھولوں کا گلدستہ بھی رکھا تھا۔ منیر نے گلدستہ اٹھایا۔ اس پر ایک کارڈ موجود تھا۔ جس پر شادو کے دستخط موجود تھے۔ منیر نے دل ہی دل میں شادو کو ڈھیر ساری گالیاں دیں۔ اس لئے نہیں کہ اس نے اس کو کبھی کوئی گزند پہنچائی تھی۔ بلکہ اس لئے کہ اسے نہ معلوم کیوں شادو سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ اس سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اسے زرینہ کا خیال آیا اور اس کے دماغ میں گزرے ہوئے دن فلم کی طرح چلنے لگے۔ اسے رہ رہ کر اپنے مریضوں کا خیال آرہا تھا۔ گاؤں کے ایک مکان میں کوئی بیمار بچہ یا بوڑھی عورت یا کوئی حاملہ عورت اس کے آمد کے منتظر تھے۔ لیکن اس نے ان سب خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے ہر قیمت پر یہاں رہنا تھا اور یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔ ذیشان نے ایک قبر کے کتبے سے ٹیک لگائی اور پاؤں پسار کر بیٹھ گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت چلتے چلتے رک گیا ہو۔

رات کے دو بجے تھے ہر سو خاموشی کا راج ہوگیا۔ ذیشان منیر کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بدستور زرینہ کی قبر پر جمی ہوئی تھیں۔ ذیشان نے کئی بار منیر سے کہا کہ وہ گھر جا کر آرام کر لے لیکن وہ ان کے قریب ہی بیٹھے رہنے پر راضی رہا۔ "مولوی صاحب میرا خیال ہے۔ رات بہت بیت چکی ہے اب آپ کچھ دیر کے لیے گھر جا کر آرام کر لیجئے آپ کی عمر کے لحاظ سے یہ ڈیوٹی خاصی مشکل ہے۔" ذیشان نے تجویز پیش کی

مولوی جو خود بھی بری طرح تھک چکا تھا۔ اپنی

جگہ سے اٹھا اور یہ کہتا ہوا کہ ”اگر ایسی ویسی کوئی بات ہو جائے تو وہ اسے فوراً جگا دیں۔“ اور وہ گھر کی طرف بوجھل قدموں سے چل پڑا اور پھر مولوی چلتا ہوا قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ دور اندھیرے میں گم ہو گیا۔

رات کی تاریکی میں یکا یک دور ایک چیخ ابھری جس نے ذیشان اور منیر کو بری طرح خوف زدہ کر دیا۔ چیخ ایک بار پھر ابھری۔ اس بار ذیشان نے کہا۔ ”یہ تو مولوی کی چیخ ہے وہ ہمیں مدد کے لیے پکار رہا ہے۔“ یہ سن کر منیر بھی اٹھ کھڑا ہوا وہ دونوں تیزی سے بھاگتے ہوئے اس طرف گئے۔ تھوڑی دور جا کر انہوں نے دیکھا کہ مولوی زمین پر پڑا ہوا کراہ رہا ہے۔ پھر دور تاریکی میں کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔

”مجھ پر اچانک کسی نے حملہ کر دیا تھا۔“ مولوی نے کراہتے ہوئے کہا۔

”کون تھا؟ کیا تم نے اس کی صورت دیکھی تھی۔“ ذیشان نے پوچھا۔

جواب نفی میں تھا۔ ذیشان اور منیر نے سہارا دے کر مولوی کو سنبھالا اور اسے لے کر آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل پڑے۔ پھر مولوی نے کہا۔ ”خدا کے لئے تم میری فکر چھوڑ دو۔ جاؤ وہاں جا کر زرینہ کی نگہداشت کرو۔ کہیں یہ سب کوئی چال نہ ہو۔“

منیر کے دل میں بھیانک وسوسے جنم لینے لگے۔ اسے اچانک خیال آیا کہ ان کے آنے کے بعد زرینہ کی قبر کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے قبر کی طرف واپس دوڑے۔ قبر کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے دیکھا کہ دور نیالی روشنی میں ایک لمبا آدمی قبر پر جھکا ہوا تھا۔ رات کی پراسرار اور ہولناک تاریکی میں اس ہیولے کی جسامت کو دیکھ کر ان کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ان کی غیر موجودگی میں کسی نے بری طرح افراتفری میں قبر کو کھود ڈالا تھا۔ ہر طرف مٹی اور پھول بکھرے ہوئے تھے۔ اور تابوت قبر کے باہر پڑا ہوا تھا۔ ایک آدمی تابوت پر جھکا ہوا تابوت کا ڈھکنا کھولنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

منیر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ نفرت غم و غصے سے وہ چیخا اور تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ آدمی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ چاند کی زرد روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ ریشمی لبادہ پہنے ہوئے تھا۔ اور چہرے پر سیاہ رنگ کی نقاب اوڑھ رکھی تھی۔ وہ کوئی اور نہیں شادو تھا۔

اور پھر شادو تیزی سے جھاڑیوں میں جا کر غائب ہو گیا۔

زرینہ کا چہرہ سیدھا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کے سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں بند تھیں۔

پھر یکا یک زرینہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ منیر بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ پھر جیسے اس کی ساری جان کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئی۔۔ زرینہ کے چہرے سے تمام دلکشی اور رونق رخصت ہو چکی تھی۔ اور اس کی جگہ ویرانی اور ہولناک وحشت نے لے لی تھیں۔

یکا یک منیر کو احساس ہوا کہ زرینہ کی وہ آنکھیں نہیں تھیں بلکہ کسی بھیانک عفریت کی آنکھیں تھیں۔ منیر کی نگاہوں میں جیسے سوئیاں سے چبھنے لگیں۔ وہ ہپناٹائز ہو چکا تھا۔ وہ کسی صورت اپنی آنکھیں زرینہ کی آنکھوں سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔

یکا یک ذیشان چیخے۔ ”ہٹ جاؤ، خدا کے وسطے اس سے دور رہو۔“ پھر ذیشان نے منیر کو زور سے دھکا دیا منیر گرتے گرتے بچا۔

زرینہ کی لاش آہستہ آہستہ اٹھ کر اپنے تابوت سے باہر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے بھیانک بازو پھیلا رکھے تھے۔ اس کی استخوانی کلائیاں منیر کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے بیتاب نظر آ رہی تھیں۔ وہ بدستور منیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب منیر بے حس و حرکت ایک قبر کے کتبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ زرینہ کے پاؤں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہے

تھے۔ جیسے کوئی بلی دبے پاؤں اپنے بے بس شکار کی طرف بڑھتی ہے۔ ذیشان ہذیانی انداز میں چیخے۔

زرینہ نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت عود کر آئی۔ پھر وہ منیر کی طرف دیکھ کر بے حد مکروہ انداز میں مسکرائی۔ منیر کا دم گھٹنے لگا۔ خوف کی شدت کے باعث اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ کسی نے ایک پھاوڑا قبر کے کنارے چھوڑ دیا تھا۔ ذیشان جھکے اور اپنی پوری قوت سے وہ پھاوڑا اوپر اٹھالیا۔ وہ اپنی مدافعت کے لیے پوری طرح تیار تھے۔

زرینہ اب آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ انہیں دبوچ لینے کے لیے بے چین نظر آ رہی تھی۔ جونہی وہ اپنے بازو پھیلائے آگے بڑھی منیر چیخا۔ ''نہیں نہیں۔'' اس نے دیکھ لیا تھا کہ ذیشان پھاوڑا اٹھا زرینہ پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار کھڑے ہیں۔

زرینہ ایک بار پھر مسکرائی۔ ذیشان نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ قابل نفرت مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ان کے جسم میں سردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے زرینہ ان کا تمسخر اڑا رہی ہو۔

ذیشان بے ربط انداز میں چیخے اور پھاوڑا پوری قوت سے گھما کر زرینہ کی گردن پر دے مارا۔

منیر نے ایک دلخراش چیخ ماری۔ وہ اپنی آنکھیں بند کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں پھر بھی کھلی رہیں۔ پھاوڑا تلوار کی طرح زرینہ کی گردن میں اتر گیا۔ زرینہ کی گردن کٹ گئی۔ اور سر کٹ کر شانوں پر جھولنے لگا۔

ذیشان نے ایک بار پھر پھاوڑا گھمایا۔ اور اس بار زرینہ کی گردن کٹ گئی اس کا سر کافی دور تک قبروں کے پتھروں سے ٹکراتا لڑھکتا رہا۔ پھر دور ایک قبر کے گڑھے میں جا گرا۔ ذیشان اپنی جگہ کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے پھاوڑا مٹی میں گاڑ دیا اور تھر تھر کانپنے لگے۔

منیر نے دیکھا کہ زرینہ کا بغیر سر کا دھڑ چند لمحے زمین پر کھڑا رہا۔ پھر دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ خون کا فوارہ ابل ابل کر ارد گرد کی گھاس کو سرخ کرنے لگا۔

پھر وہ زرینہ کا سر تلاش کرنے لگا۔ وہ جلد سے جلد زرینہ کا سر تلاش کر کے اسے اس کے دھڑ کے ساتھ جوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ذرا سی بھی دیر ہو گئی۔ تو کام خراب ہو جائے گا۔ اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ ''کہیں وہ سر غلط نہ جوڑ دے۔ اگر ایسا ہوا تو میڈیکل سائنس اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ زرینہ کا سر تلاس کرتے کرتے وہ بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ یکایک اس کی نظر سامنے ایک قبر پر پڑی۔ قبر کا منہ کھل رہا تھا۔ ایک استخوانی ہاتھ قبر کے کنارے پر نمودار ہوا۔ پھر ایک لاش باہر نکل آئی۔

یکے بعد دیگرے قبروں کے دہانے کھلتے گئے۔ اور قبروں سے مردے باہر آنے لگے۔ یہ منظر اس قدر ہولناک تھا جیسے۔ قیامت آ گئی ہو۔ ہر طرف کفن میں ملبوس زندہ لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ان کا ہجوم بڑھنے لگا۔ پھر وہ سب ایک مردے کی قیادت میں ذیشان اور منیر کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ سب گرتے پڑتے، ادھر ادھر قدم رکھتے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے شکار کی تلاش میں قبروں سے باہر آ گئے تھے۔ اور اب دندناتے پھر رہے تھے۔ یکایک ان میں سے ایک مردے نے جھک کر زمین پر سے کوئی چیز اٹھائی۔ یہ زرینہ کا سر تھا۔

ابھی تک زرینہ کی گردن سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں خوفناک انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک طویل القامت مردے نے سر اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ وہ زرینہ کے سر کی طرف دیکھ کر ہولناک انداز میں مسکرایا۔ اس کی خوفناک مسکراہٹ کا دہشت خیز ردعمل ہوا۔ جواب میں زرینہ کا کٹا ہوا سر بھی قہقہے لگانے لگا۔

منیر نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ اب یہ سب

کچھ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا کلیجہ خوف کی شدت سے پھٹا جارہا ہو۔ وہ چاہتا تھا۔ اس قدر چیخے اس قدر شور مچائے کہ اس کا کلیجہ خوف کی شدت سے باہر آجائے۔ مردے بڑے کھوکھلے انداز میں ہنس رہے تھے ان کے شور سے کان پھٹے جارہے تھے۔ وہ پھر زور سے چیخا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے لالٹین کی زرد روشنی کا ہالہ لہراتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے پہلے تو آنکھیں بند کرلیں۔ پھر ذیشان کی سکون بخش آواز سن کر آنکھیں کھول دیں۔ ''منیر خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔ تم ایک بھیانک خواب دیکھ رہے ہو تم ٹھیک ہو ذیشان۔''

''پھر اچانک چیختے ہوئے ذیشان بستر پر اٹھ بیٹھا۔ وہ اپنے گھر پر ہی تھا۔ اوہ خدایا تو گویا یہ سب کچھ ایک خوفناک خواب تھا۔'' اس نے اطمینان کی سانس لی۔'' اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اگر یہ محض ایک ہولناک خواب تھا تو زرینہ کا کیا ہوا، میں نے اسے خود اپنی گناہگار آنکھوں سے قبر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اوہ میرے خدایا۔ وہ کس قدر خوفناک لگ رہی تھی۔

اس نے ذیشان کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں جھنجوڑتا ہوا بولا۔ ''کیا آپ نے واقعی اسے مار ڈالا؟''

ذیشان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ تمہارے خواب کا یہ حصہ بالکل سچ ہے۔ واقعی زرینہ اپنے تابوت سے باہر آگئی تھی اور میں نے اسے مار ڈالا۔ لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں اب وہ ہمیشہ کے لئے پرسکون نیند سو چکی ہے۔ اسے مولوی نے اس کی روح کو آسیب کے اثر سے پاک کردیا تھا۔ اور اب تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب کوئی بدروح زرینہ کو پریشان نہیں کرسکے گی۔''

☆......☆......☆

انسپکٹر اور اس کے ساتھی حیران کن نگاہوں سے خالی قبروں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اب تک دس قبریں کھود دیکھ چکے تھے۔ لیکن وہ سب خالی تھیں۔'' جناب آخر یہ سب کہاں چلے گئے۔ یہ عفریت خدا معلوم اب گاؤں والوں پر اور کیا ستم ڈھائیں گے۔'' انسپکٹر نے لجاجت سے کہا۔

ذیشان نے تباہ شدہ حصہ کی طرف دیکھا اور پھر انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں کو قبریں بھرنے کا حکم دے کر وہاں سے چلنے کا ارادہ کرنے لگے۔ پھر انہوں نے انسپکٹر سے کہا کہ ''وہ ہر قیمت پر شانی سے گفتگو کرنے کے خواہشمند ہیں ان کا خیال تھا کہ ان مردوں کو کسی اور جگہ تلاش کرنے سے قبل شانی سے ان کی منزل کے بارے میں یقیناً کوئی امید افزا بات معلوم ہوسکتی تھی۔ وہ لوگ واپس پولیس سٹیشن چلے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ تھکن دور کرنے کے لیے ایک پیالی چائے سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی۔ لیکن آرام یا تازہ دم ہونے کی ساری توقعات دھری کی دھری رہ گئیں کیونکہ جب یہ لوگ پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئے تو وہاں کا حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ میز اور کرسیاں الٹی پڑی تھیں۔ عجیب افراتفری کا سماں تھا۔ حوالات کا تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ اور راہداری کا فرش ادھڑا پڑا تھا۔ کانسٹیبل چیخا۔ وہ فرار ہوگیا ہے۔''

ذیشان بولے۔ ''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ آخر کہاں چلا گیا۔ کیا وہ بھی دوسرے مردوں میں شامل ہوگیا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''آپ کا خیال ہے کہ وہ بھی۔''

ذیشان نے اس کی بات کاٹی۔ ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن جلد بدیر اس کا انجام بھی ان زندہ لاشوں سے مختلف نہیں ہوگا۔

ذیشان نے کانسٹیبل سے دریافت کیا کہ ''آیا ان کی غیر موجودگی میں کوئی شخص قیدی سے ملنے تو نہیں آیا تھا۔'' کانسٹیبل نے انہیں بتایا کہ ''ایسی کوئی قابل ذکر بات تو نہیں۔ ہاں البتہ شادو ضرور اس سے یعنی شانی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کہا کہ شانی نے اس کا کوئی کام کیا تھا۔ اور وہ اسے اس کا معاوضہ

دینے آیا تھا۔''

''کیا وہ دونوں صرف باتیں ہی کرتے رہے تھے؟'' ذیشان نے پوچھا۔

''میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ کوئی بات کررہے تھے۔'' کانسٹیبل بولا۔

''پھر شادو نے ایک گلاس پانی مانگا۔''

''وہ گلاس کہاں ہے؟'' ذیشان چیخے۔

''وہ تو پھینک دیا گیا۔'' جواب ملا۔

''میں پوچھتا ہوں اسے پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟'' ذیشان کے دل میں وسوسے سر اٹھانے لگے۔

''جناب گلاس شادو کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ کانسٹیبل نے سرد مہری سے کہا۔

''شانی ضرور اس ٹوٹے ہوئے گلاس سے زخمی ہوا ہوگا۔'' ذیشان نے قطعی طور پر کہا۔

کانسٹیبل کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''لیکن سر۔ آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟''

ذیشان اب کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ اور وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ اب سب باتیں واضح طور پر سامنے آرہی تھیں۔ لوگوں کا زخمی ہونا پھر خبیث روحوں کی شیطانیاں۔ شادو ایک چلتا پھرتا بھیانک کردار بن کر سامنے آرہا تھا۔ اب کسی نتیجے پر پہنچنا دشوار نہیں تھا۔ ذیشان سوچ رہے تھے کہ اس ذلیل انسان نے نہ معلوم زرینہ کو کس طرح زخمی کیا ہوگا۔'' زرینہ کا خیال آتے ہی انہیں انم کی فکر نے بے چین کردیا۔ انہوں نے تمام کام فوری طور پر منسوخ کردیئے اور بغیر کچھ کہے بڑی تیزی سے چوک پار کرکے ڈاکٹر منیر کے گھر کی طرف لپکے۔ وہ پاگلوں کی طرح راہداری میں داخل ہوئے جو ویران پڑی تھی۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انم کی خواب گاہ تک جا پہنچے اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

انم کا بستر خالی تھا۔ وہ کبھی اپنی زندگی میں اس قدر خوفزدہ نہیں ہوئے تھے۔ جس قدر وہ اس وقت تھے۔ تھکے تھکے مایوس قدموں سے وہ زرینہ اتر کر نیچے آگئے۔

یکا یک باورچی خانے سے انم نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ایک پیالی تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرانے لگی تو ذیشان نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور اس سے منیر کے بارے میں پوچھا تو انہیں یہ سن کر صدمہ ہوا کہ منیر بے حد پریشان ہے اور آب و ہوا کی تبدیلی کی خاطر یہاں واپس جانا چاہتا ہے۔

وہ بولی۔ ''ڈیڈی ہمیں منیر کی دلجوئی کی خاطر کچھ کرنا چاہیے۔ وہ اب اس جگہ سے بالکل بیزار ہوچکا ہے۔

ذیشان کو یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کہ ان کی بیٹی ایک دوسرے آدمی کی بھلائی اور بہبود کے بارے میں متفکر تھی۔ وہ بڑے مطمئن نظر آنے لگے۔ انہوں نے انم سے پوچھا کہ ''اب اس کی انگلی کیسی ہے۔''

''انم نے انہیں بتایا کہ پہلے سے بہتر ہے۔''

ذیشان باہر جانا چاہتے تھے لیکن وہ انم کو کسی حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ایک انجانا سا خوف ان کے دل پر مسلط تھا۔

منیر کے آتے ہی وہ اس سے مخاطب ہوئے۔ ''منیر میں چاہتا ہوں تم میرے لئے ایک ذرا سی زحمت کرو۔ میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ وعدہ کرو کہ تم کبھی انم کو اکیلا نہیں چھوڑو گے۔ بتاؤ کیا تم وعدہ کرتے ہو؟'' ان کے لہجے میں رقت آمیز لجاجت تھی۔

منیر نے وعدہ کیا کہ وہ ذیشان کی بات کبھی نہیں ٹالے گا۔ ذیشان اسے انتظار کرنے کا کہہ کر باہر چلے گئے۔ وہ واپس پولیس اسٹیشن گئے۔ وہاں چند پرانے نقشوں کا مطالعہ کیا کراچی میں ان کے بہت سے بارسوخ اور با اثر دوست تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ اس تہذیب یافتہ دور میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

پھر وہ لائبریری میں جا پہنچے اور وہاں انہوں نے مزید چند کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جب وہ ان کاموں سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ وہ جنگل کی طرف چل پڑے۔

دور پہاڑی پر واقع شادو کا مکان بڑا پر اسرار دکھائی دے رہا تھا۔ انہیں یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ شادو جیسا باوقار آدمی ایسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھا۔ واقعی شادو کی وجہ سے پورا گاؤں دکھ اور اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا اور ان کے خیال میں شادو کی سزکم از کم سنگساری تھی۔ جونہی انہوں نے صدر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ ایک تندمند نوجوان نے دروازہ کھولا۔ یہ وہی آدمی تھا۔ جس دن لومڑی کے شکار کے معاملے میں گاؤں میں آتے ہی ان کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے ہم اس سے پہلے بھی مل چکے ہیں۔'' بہر حال اب اس کا تذکرہ لاحاصل ہے۔ ''میرا نام ذیشان ہے اور میں شادو سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ میرا پیغام ان تک پہنچا دیں۔ ان سے کہیں کہ میں ان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا چاہے وہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں۔''

دروازے پر آنے والا نوجوان عیاری سے مسکرایا اور ذیشان کو اندر آنے کا اشارہ کیا، ذیشان نے دیکھا کہ وہ اندر ایک وسیع و عریض شاندار ہال میں کھڑے ہیں۔ نوجوان کے اندر جاتے ہی انہوں نے لپک کر ایک کھڑکی کی چٹخنی کھول دی تا کہ اگر کوئی خطرے والی بات ہو تو وہ آسانی سے فرار ہو سکیں یہ قدم انہوں نے اپنی ڈھلتی ہوئی عمر اور حفظ ماتقدم کے تقاضوں کے پیش نظر اٹھایا تھا۔ وہ ہر قسم کے غیر متوقع حالات کے لئے خود کو تیار کر چکے تھے۔

چند لمحوں بعد شادو ہال میں داخل ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بہت جلدی میں ہو اور جلد از جلد ذیشان سے پیچھا چھڑا کر بھاگ جانا چاہتا ہو۔ ''جی آپ مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟ جلدی کہئے

سالگرہ نمبر

قارئین کرام ہر سال کی طرح ڈر ڈائجسٹ اکتوبر 2015ء کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا، لہٰذا آپ لوگ اپنی خود نویست کہانیاں اور دیگر کاوشیں جلد از جلد ارسال کریں تا کہ آپ کی اچھی تحریریں سالگرہ نمبر میں جلوہ گر ہو سکیں۔ شکریہ۔

ادارہ، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ

میرا وقت بے حد قیمتی ہے۔'' شادو نے کہا۔

ذیشان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''شادو۔ فارغ تو میں بھی نہیں ہوں۔ خود مجھے بھی بہت سے کام کرنے ہیں اور میرا وقت تم سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ بہر حال میں تم سے زرینہ اور نوجوان شانی کے بارے میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔ کہ میری بیٹی کے بازو کے زخم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

شادو کی آنکھ کے قریب ایک رگ پھڑکنے لگی۔ اس نے سپاٹ انداز میں ذیشان کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے آپ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

ذیشان نے خونخوار نگاہوں سے شادو کو دیکھا۔ ''کاش! میں واقعی پاگل ہوتا۔ لیکن میں جانتا ہوں یہ سب کچھ تمہارا کیا دھرا ہے۔'' ذیشان جانتے تھے کہ انہیں کسی قیمت پر بھی شادو کو مدافعت کا موقعہ نہیں دینا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''شادو تم ایک طویل عرصے تک مختلف ملکوں میں رہے ہو۔ تم غرب الہند بھی گئے تھے۔ اور وہاں تم نے مشہور کالے جادو ٹونے کے متعلق بھی بہت کچھ دیکھا اور سیکھا ہے۔؟''

شادو غصے سے چیخا۔ ''آپ جا سکتے ہیں۔ آپ

فوراً یہاں سے چلے جائیں۔'' ذیشان نے بے نیازی سے کندھے اچکائے اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر صدر دروازے کی طرف چل دیئے۔

''شب بخیر مسٹر شادو، یقیناً آپ سے بہت جلد ملاقات ہوگی۔ ذیشان نے چلتے چلتے کہا اور دروازہ کھول کر باہر سڑک پر نکل آئے۔ باہر آکر وہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف چلے گئے جہاں انہوں نے کھڑکی کی کنڈی کھول دی تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ بڑی خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ عمارت کے اندر سے اب کوئی آواز نہیں آرہی تھی اور کسی کے قدموں کی چاپ یا کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں تھی۔ انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے کھڑکی کھولی اور چپکے سے دوبارہ اندر داخل ہوگئے۔ اس وقت ہال میں چاندنی روشنی کھڑکی کے دریچوں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔ ذیشان نے دیکھا کہ کوئی سیڑھیوں کے بالائی دروازے سے اتر رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کی آڑ میں ہوگئے۔

شادو آہستہ آہستہ نیچے اترا اور سامنے کا دروازہ کھول کر کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کے آتشدان میں آگ روشن تھی۔ جس کی ایک جھلک ذیشان کو دکھائی دی۔ اس وقت ذیشان کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں حالات کا شکار ہوکر بالکل ہی بے بس ہوجانا پڑے اس طرح ان کا مشن نامکمل رہ جاتا۔ دروازے کی ادھ کھلی روشنی میں ذیشان نے اندر کا منظر دیکھا۔

شادو ایک بار پھر آگ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے سفید کفن سا لباس پہن لیا تھا۔ اور اب وہ اپنے چہرے پر ایک بھیانک سا ماسک چڑھا رہا تھا۔ آتشدان سے لپکتے ہوئے آگ کے شعلے زہریلے سانپوں کی زبانوں کی طرح اس کی طرف کوندرہے تھے۔ شادو ایک بوسیدہ سی میز کے قریب گیا اور ایک دراز کھول کر کپڑے کی ایک چھوٹی سی گڑیا نکالی۔ گڑیا اپنے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے وہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ پھر اس نے دروازہ بند کردیا اور کمرے میں بیتابی سے ٹہلنے لگا۔

ذیشان کا خیال تھا کہ وہ پھر دروازے سے باہر آئے گا لیکن وہ نہ معلوم کہاں چلا گیا تھا۔ ذیشان نے کافی دیر انتظار کیا۔ لیکن طویل انتظار اب ان کے اعصاب کے لیے جان لیوا ثابت ہورہا تھا۔ آخر ان سے نہ رہا گیا۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر نتائج کی پرواہ کیے بغیر کمرے میں داخل ہوگئے شادو کمرے میں نہیں تھا۔

ذیشان دبے پاؤں کے قریب گئے اور اوپر کا دراز کھولا۔ دراز خالی تھا، لیکن دوسرا دراز بھرا ہوا تھا۔ اس میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے تابوت رکھے ہوئے تھے۔ اور ہر تابوت میں ایک خون آلود گڑیا کا پتلا رکھا ہوا تھا۔ انہیں گننے کی ضرورت اور فرصت نہیں تھی۔ یہ پتلے یقیناً گاؤں کے ان مردہ لوگوں کے تھے جن کی بے چین روحیں اب گاؤں والوں کے لیے عذاب بن کر رہ گئی تھیں یہ سب اب شادو کے رحم و کرم پر تھے۔ اس کے شکنجے میں تھے اور وہ ان سے جس طرح اور جب جی چاہے کام لے سکتا تھا۔ یہ سب لاشیں اب اسکی غلام تھی۔ اس نے روحوں کو اپنا غلام بنالیا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں انہیں ایک پرانا سا بیگ نظر آیا۔ انہوں نے وہ بیگ اٹھا کر میز پر رکھا اور دراز کھول کر تمام پتلے جلدی جلدی بیگ میں بھر لیے۔ دروازہ چرچرایا تو وہ رک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ آگ کی روشنی میں پورا کمرہ سرخ ہورہا تھا۔ اور ماحول بے حد پراسرار نظر آرہا تھا۔

یکایک دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے کھلا اور دروازے میں انہیں ایک نوجوان نظر آیا۔ جو بڑی سنگدلی اور مکاری سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سرخ رنگ کا بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اور اس کا چہرہ شعلوں کی روشنی میں بھیانک انداز میں نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوفناک تیز دھار تلوار تھی اور اس کے ارادے ہولناک نظر آرہے تھے۔

ذیشان تیزی سے ایک طرف ہٹ گئے۔ نوجوان بجلی کی طرح ان کے قریب آیا۔ اس کی تلوار لکڑی کی میز کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ وہ پھر پلٹا اور دوبارہ حملہ کیا۔ ذیشان اس دوران خود کو اس خوفناک حملے سے بچانے کے لیے مستعد کرچکے تھے۔ تلوار آگ کے شعلوں میں ایک بار پھر چمکی اور نوجوان بڑی درندگی اور سفاکی سے مسکراتے ہوئے پھر آگے بڑھا۔ اس بار ذیشان نے پینترا بدلا اور اسے جھکائی دے کر صاف وار بچالیا۔

زندگی اور موت کی اس کشمکش میں ذیشان کو اپنی پوری طاقت اور ذہانت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ وہ برق رفتاری سے خود کو بچانے کی کوشش میں مصروف تھے انہوں نے اس بار پوری قوت سے اچھل کر اپنی دونوں ٹانگیں نوجوان کے سینے پر ماریں تو نوجوان اپنا توازن کھو بیٹھا اور تیورا کر فرش پر گرا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگری۔ وہ دونوں اب فرش پر گتھم گتھا ہوئے پڑے تھے۔ اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھے۔ ذیشان تابڑتوڑ انداز میں نوجوان کے جبڑوں پر گھونسے مار رہے تھے لیکن وہ بے حد سخت جان اور طاقتور تھا۔ جونہی وہ ذیشان کی گرفت سے آزاد ہوا تو تیزی سے تلوار کی طرف لپکا۔ ذیشان نے اس کی ٹانگیں پکڑلیں اور وہ ایک بار پھر اوندھے منہ فرش پر جاگرا۔

یہ خونی کھیل ابھی جاری تھا کہ کمرے کا دروازہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ بند ہوگیا۔ ذیشان نوجوان کے سینے پر سوار ہوگئے۔ اب ان کی آنکھوں میں بھی خون اتر آیا تھا۔ اور وہ مدافعت کے بجائے ہر قیمت پر اسے ہلاک کردینا چاہتے تھے انہوں نے بمشکل ہاتھ بڑھا کر تلوار اٹھائی اور اپنی پوری قوت سے وار کیا۔ ان کا وار بے حد مہلک اور موثر ثابت ہوا۔ نوجوان کی گردن سے خون کا ایک فوارہ ابل پڑا اور وہ فرش پر بری طرح تڑپنے لگا۔ اس کے نرخرے سے عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔ ذیشان نے تلوار ایک بار پھر اٹھائی اور ایک وار اور کیا۔ اس بار نوجوان زور سے تڑپا اور خون کے سمندر میں لوٹتا ہوا لڑھک کر آتشدان کے قریب جاگرا۔

ذیشان نے بیگ سنبھالا اور دروازے کی طرف بڑھے دروازہ باہر سے بند ہوچکا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح تمام دیواریں ٹٹولنے لگے۔ انہیں کہیں کوئی چور دروازہ نظر نہ آیا۔ کسی طرف کوئی چٹخنی یا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ذیشان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یکایک کمرے میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کوئی چیز جل رہی تھی۔ اور پھر گوشت جلنے کی تیز بو نے ذیشان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ یہ نوجوان کی لاش جل رہی تھی۔ جو لڑھک کر آگ کے بالکل قریب چلی گئی تھی۔

ذیشان کو اب ایک نئی آفت کا سامنا تھا۔ کمرے میں کوئی روشندان بھی نہیں تھا اور کھڑکیوں پر دبیز پردے لٹکے ہوئے تھے۔ انہوں نے پریشانی کے عالم میں ایک پردہ کھینچا اور اسے پھاڑ کر علیحدہ کردیا۔ کمرے میں گرد اڑنے لگی۔ پھر انہوں نے پردہ اٹھا کر آگ پر ڈال دیا۔ لیکن آگ بجائے سرد ہونے کے اور بھڑک اٹھی اور پردے دھڑا دھڑ جلنے لگے۔ آگ کے شعلے اور بلند ہوگئے اور کمرے میں حبس اور گرمی بڑھنے لگی۔ ذیشان دیوانوں کی طرح باہر نکلنے کا راستہ تلاش کررہے تھے۔ لیکن ابھی تک انہیں مایوسی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ایک چوہے دان میں بند ہوگئے ہوں۔ موت منہ کھولے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور وہ بے بسی سے لاچاری کے عالم میں دروازہ کھولنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یکایک انہیں ایک گھنٹی نظر آئی۔ انہوں نے نتائج کی پروا کیے بغیر گھنٹی بجادی۔

دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ انہوں نے ایک بار پھر زور سے گھنٹی بجائی۔ وہ جانتے تھے کہ اس تپش اور گرمی میں وہ زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ

منٹ تک زندہ رہ سکتے تھے، آخر وہ دروازہ کھل گیا۔ وہ دروازے کی اوٹ میں ہوگئے۔ ایک حبشی نژاد ملازم نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ ذیشان نے بڑی سرعت سے اس کے دونوں بازو اس کی پشت کی جانب جکڑ لئے اور چیخے شادو کہاں ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چلو۔''

ملازم خود کو ان کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ بڑی مشکلوں کے بعد آخر اس نے زبان کھولی اور ذیشان کو بتایا کہ ''شادو نیچے تہہ خانے میں موجود ہے اور اسے اس تہہ خانے کے راستے کا کوئی علم نہیں کیونکہ صرف شادو کو ہی اس راستے کا پتہ ہے۔ ہاں ایک راستہ اور اس تہہ خانے کو جاتا ہے۔ لیکن وہ راستہ کان سے ہوکر گزرتا ہے۔''

ذیشان اس آدمی کو دھکیلتے ہوئے ہال میں آ گئے۔ ادھر کمرے میں آگ کے شعلوں نے اب قالین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ نوجوان کی لاش بری طرح جل کر سیاہ اور مسخ ہو چکی تھی۔ اور آگ کے شعلے بڑی تیزی سے میز اور کمرے کی دوسری چیزوں کو جلا رہے تھے۔ پتلوں سے بھرے ہوئے بیگ کے اردگرد بھی آگ ہی آگ تھی۔ ذیشان کو شادو کے خلاف شہادتوں کی ضرورت تھی۔ لیکن آگ کی حدت ناقابل برداشت تھی۔ آگ کی تمازت سے ہال کمرے میں بھی کھڑا ہونا دشوار تھا۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اب ذیشان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بیگ حاصل کر سکیں۔ وہ تیزی سے پلٹے اور ملازم کو سکتے کے عالم میں چھوڑ کر عمارت سے باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

غار میں قربان گاہ کا چبوترا مزید قربانیوں کا منتظر تھا۔ خون کی دھاریاں چبوترے کے پتھر پر جم کر سیاہی مائل ہو چکی تھیں۔ چیخنے میں ملبوس شادو غار میں سے ہوتا ہوا قربان گاہ تک گیا۔ راستے میں جگہ جگہ مردے بڑے مودب انداز میں کھڑے تھے۔ یہ سب ٹین کی اس کان میں کام کرنے پر مامور تھے۔ وہ ٹین کو لکڑی کی ٹرالیوں میں بھرتے اور غار سے باہر لے جاتے تھے غار کے دہانے پر ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔ اگر کسی مردے کو ذرا سی بھی دیر ہوجاتی تو وہ کوڑے مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دیتا تھا۔ ان مردوں کے کفن پھٹ چکے تھے۔ اور کھال جگہ جگہ سے لٹک گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ جانے کتنی صدیوں سے اس بدترین غلامی میں گرفتار ہوں۔ وہ بے بس اور لاچار لاشوں کی طرح چل پھر رہے تھے۔ انہیں میں ایک اور نئی لاش کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ تازہ ترین شکار نوجوان شانی تھا۔ جس کے چہرے پر مردنی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ان سب بے جان لاشوں کی طرح بھیانک اور پراسرار نظر آ رہا تھا۔

شادو نے اپنے ہاتھوں میں سنبھالی ہوئی کپڑے کی گڑیا اٹھائی اور اسے لے کر قربان گاہ کے چبوترے کی طرف چل پڑا۔ تمام مردے اس کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے چل رہے تھے۔ فضا میں ڈھول کی آواز ابھرنے لگی۔ ایک پہرے دار اپنے ہاتھ میں چابک سنبھالے اپنے آقا کے ساتھ ساتھ تھا۔ شادو جلد از جلد اس کام کو سرانجام دینا چاہتا تھا موت کا رقص شروع ہوا چاہتا تھا۔ شادو نے زیر لب جادو کے فقرے بولنے شروع کئے۔ ''کاوا سترا کاوا سترا۔''

دور گاؤں کے اک مکان میں لیمپ کے قریب بیٹھی ہوئی انم نے جھرجھری سی لی اور اسکے سارے بدن میں جیسے آگ سی بھر گئی۔ اس کی پیشانی اور بازو پسینے میں تر ہوگئے۔ وہ جھکی اور آہستہ آہستہ سحر انگیز بول دہرانے لگی۔ ''کاوا۔ تو سترا کاوا سترا۔''

منیر جو اس کے قریب بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ یکا یک رک گیا۔ اور پوچھا۔ ''انم کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

انم چونک پڑی اور بولی۔ ''نہیں کوئی بات نہیں۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرہ بری طرح گھوم رہا تھا۔ انم کا سر چکرا رہا تھا اسے منیر کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت اور پریشانی دیکھ کر بری طرح

ہنسی آرہی تھی۔ نہ معلوم کیوں اس کی کیفیت بڑی عجیب سی ہورہی تھی۔ وہ کبھی ہنستی اور کبھی روتی۔ منیر اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ اور کوئی دوالانے کے لیے فوراً سیڑھیاں اتر کر اپنی لیبارٹری میں چلا گیا۔

جانے سے پہلے اس نے انم کو اپنے بازوؤں میں سنبھالا اور اسے بڑے آرام سے بستر پر لٹادیا۔ انم نے آنکھیں بند کرلیں اور اسے یوں لگا جیسے خود اس کے جسم سے ایک عورت نکل کر کے سامنے آکھڑی ہوئی ہو۔ خبیث روحوں کا بلاوا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ ہر قیمت پر اپنے آقا کے پاس جانا چاہتی تھی۔

منیر کے باہر جاتے ہی وہ اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ یہ راستہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ وہ اس راستے پر پہلے بھی آچکی تھی۔ شادو سے ملنے کی خواہش نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ تیزی سے رات کی تاریکی میں آگے ہی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ اس کا رخ ٹین کی کان کی سمت تھا۔ وہ جلد از جلد شادو کی آغوش میں کھوجانا چاہتی تھی۔ اس کا آقا اس کا منتظر تھا۔ کچھ دیر بعد جیسے وہ راستہ بھول گئی ہو۔ وہ ایک لمحے کو رکی۔ پھر دور کھڑے شادو نے بازو پھیلائے اور تیزی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ شادو کی آغوش سرد اور بے جان تھی۔ ٹھنڈے گوشت کے لمس نے انم کو ایک عجیب سا سکون بخش دیا۔ شادو اسے اپنے بازوؤں میں سنبھالے ہوئے کان کے دروازے سے گزر کر نیم تاریک عمارت میں لے گیا۔ یہاں ایک لفٹ ان کی منتظر تھی۔ وہ دونوں لفٹ میں بیٹھ کر جلد ہی کان کے تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ کان کے تہہ خانے میں بہت سے مردے ان کے گرد جمع ہوگئے۔ شادو کے مکروہ لبوں پر ایک خبیث مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ انم کو ایسا لگا جیسے آخر کار وہ اپنی منزل تک آگئی ہو۔ اچانک شادو نے اپنا بھیانک ماسک اتار دیا اور انم کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ وحشت زدہ ہوکر زور سے چیخی اس کی چیخ پورے غار میں دیر تک گونجتی رہی۔

جادو کا کھیل یکایک ختم ہوچکا تھا۔ وہ قابل نفرت انداز میں شادو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی، کئی استخوانی ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ فضا میں شادو اور پہرے دار کے ہولناک قہقہے گونجنے لگے اور وہ سب اسے کشاں کشاں قربان گاہ کے چبوترے کی طرف لے چلے۔ ان مردوں نے اپنے آقا کے حکم پر اسے چبوترے پر لٹا دیا۔ اور اسے بے بس کردیا۔ شادو نے ایک برتن میں موجود خون سے اپنے ہاتھ دھوئے۔ ایک مخملی طشت پر سے جواہرات سے مرصع ایک آبدار خنجر اٹھا یا۔ اس دوران ایک مردے نے آگے بڑھ کر انم کے دونوں بازو ریشم کی ایک ڈوری سے اس کی پشت پر باندھ دیئے۔ انم نے خود کو آزاد کرنے کی جدوجہد شروع کردی لیکن اس کی یہ کوشش بیکار تھی۔

شادو نے خنجر اپنے دونوں ہاتھوں میں تولتا ہوا اس کے قریب آرہا تھا۔

''نہیں ...... نہیں ......'' انم دردناک لہجے میں چیخی۔ دکھ اور کرب سے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا، وہ موت کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ اور زندگی دور کھڑی حیرت سے اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

''رک جاؤ۔'' ایک گرج دار آواز غار میں گونجی۔ یہ منیر کی آواز تھی۔

شادو کا فسوں ٹوٹ گیا۔ وہ غصے سے اپنے ہاتھ ملنے لگا۔ اس نے مردوں کی طرف ایک مبہم سا اشارہ کیا تو چاروں طرف سے مردے منیر پر ٹوٹ پڑے اور اسے جکڑ لیا۔ وہ خود کو ان کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ شادو چند لمحے تک منیر کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتا رہا پھر انم کی طرف مڑا۔ یکایک غار میں تیز روشنی پھیل گئی۔ یہ قربانی کی رسم کا ایک حصہ نہیں تھا۔

اوپر کمرے میں بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں نے تہہ خانے کی چھت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور آگ کے شعلے نیچے غار میں اتر رہے تھے۔ ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ مردوں کے جسموں پر جیسے کسی نے پٹرول چھڑک دیا ہو۔ ان کے جسم دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ غار میں ہر طرف جلتے ہوئے گوشت کی تیز بو پھیل گئی۔ آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ہر طرف قیامت کا سماں تھا۔

منیر نے اس افراتفری سے فائدہ اٹھایا۔ اس دوران تمام مردے شادو کے گرد گھیرا ڈال چکے تھے۔ منیر تیزی سے قربان گاہ کے چبوترے کی طرف آیا اور جلدی سے انم کو رہا کرلیا۔ پھر اس روتی اور سسکتی انم کو سہارا دے کر قربان گاہ کے چبوترے سے نیچے اتارا اور اسے سہارا دے کر آگے چل پڑا۔

غار میں آگ کے شعلے تیزی سے پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ شادو نے خود کو مردوں کے جھرمٹ سے نکالا اور منیر اور انم کے تعاقب میں بھاگا۔ اس نے راستے میں پڑی ہوئی ایک دہکتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔

منیر، انم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہوگیا۔ شادو ایک لمحے کے لیے رکا پھر آگے بڑھنے لگا۔

انم دل ہی دل میں منیر کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

یکا یک لفٹ رکنے کی آواز آئی اور ذیشان ایک فرشتے کی طرح نمودار ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر انم کو اپنی جانب کھینچا اور اسے لفٹ میں دھکیل دیا۔ پھر وہ شادو کی طرف متوجہ ہوئے اور ابھی آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے۔ کہ دو تین مردوں نے پیچھے سے آ کر شادو پر حملہ کردیا۔ شادو نے خود کو ان گرفت سے آزاد کرانے کی جدوجہد شروع کردی اور اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ذیشان نے بجلی کی سی سرعت سے آگے بڑھ کر منیر کو اپنی طرف گھسیٹ لیا اور اسے لے کر لفٹ میں داخل ہوگئے۔

پورا غار اس وقت جلتے ہوئے جسموں کا ایک انبار نظر آتا تھا۔ ان کے کانوں نے شادو کی آواز کو غار میں گونجتے ہوئے سنا۔ شادو نے ایک روح فرسا چیخ ماری۔ غالباً اب مردوں نے اسے مکمل طور پر اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اور وہ ان کی گرفت سے ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ لفٹ تیزی سے اوپر اٹھنے لگی۔

انم منیر کے کندھے سے سر ٹکائے سسک اور بری طرح کانپ رہی تھی۔ ذیشان نے انم کے شانے تھپتھپائے اور محبت سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے لبوں پر ایک مطمئن اور شفیق مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

پھر انم کی کمزور آواز ابھری۔ ''ڈیڈی۔'' میں اب تک نہیں سمجھ سکی کہ آخر ان مردوں کو آگ کیسے لگ گئی؟ آخر یہ سب کیا معمہ تھا؟''

ذیشان دھیرے سے مسکرائے اور بولے۔ ''انم یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ جب اوپر کمرے میں آگ بھڑکی تو اس آگ نے اس بیگ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جس میں، میں نے تمام پتلے اور چھوٹے تابوت جمع کیے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب ان پتلوں کو آگ لگی تو مردوں کے جسم بھی آگ کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے اور یہ طلسماتی سلسلہ ختم ہوگیا۔ خدا کا شکر ہے کہ شادو بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔''

باہر آ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پورے آسمان پر دور دور تک سرخی پھیلی ہوئی تھی اور ایک نئی روشن اور خوبصورت صبح اس گاؤں پر طلوع ہونے کو تھی۔

ذیشان بولے۔ ''آخرکار مردوں کو دائمی موت نصیب ہوگئی، اب یہ زندہ لاشیں یہ بے چین روحیں قیامت تک سکون سے رہ سکیں گی اور شادو کو بھی اپنے کیے کی سزا مل ہی گئی۔'' اور پھر وہ تینوں تھکے تھکے قدموں سے گاؤں کی طرف چل دیے۔

روح کا فریب

ایس امتیاز احمد۔کراچی

اچانک رات کے نیم اندھیرے میں ایک ہیولہ نمودار ہوا جسے دیکھتے ہی عمر رسیدہ خاتون لرزنے لگی کہ پھر ہیولہ کے ہونٹ ہلے اور آواز سنائی دی۔ "تم گھبرائو نہیں میں تو تمہیں لینے آیا ہوں۔" اور پھر......

خودغرض مطلب پرست اور حرص کے دلدادہ اکثر نشان عبرت بن جاتے ہیں۔ثبوت کہانی میں ہے

"آپ! کے لئے نہایت ضروری ہے کہ آپ کو غم اور غصے سے محفوظ رکھا جائے۔" ڈاکٹر مینل نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

مسز ہارٹر کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا اس قسم کی باتوں سے اطمینان کے بجائے اس کے شک وشبے میں اضافہ ہورہا ہے۔

"آپ کا دل بے شک کمزور ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔" "ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔" بہرحال آپ اپنے مکان میں لفٹ ضرور لگوائیں...... کیوں؟ آپ کا خیال ہے؟

ڈاکٹر مینل غریبوں کے بجائے امیروں کا علاج کرنا پسند کرتا تھا شاید اسی لئے کہ امیر لوگ اس کی ہدایت پر فوراً عمل کرتے۔

''ہاں تو لفٹ ضروری ہے ......'' ڈاکٹر نے اپنا سامان لپیٹتے ہوئے کہا۔ اس طرح آپ محنت اور تھکاوٹ سے بچ سکیں گی ...... تھوڑی سی ورزش بری نہیں لیکن سیڑھیاں چڑھنے سے اجتناب کریں اور سب سے اہم یہ کہ اپنے دل ودماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈالیں بس یہی طریقہ ہے اپنی صحت کو زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھنے کا۔''

مسز ہارٹر کے بھتیجے کو ڈاکٹر ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا۔ ''گو کہ آپ کی آنٹی کی صحت بہت خراب ہے اور دل کمزور ہو چکا ہے، لیکن پرہیز اور ہدایات پر عمل کر کے خاصے عرصے تک زندہ رہ سکتی ہیں! انہیں پرسکون زندگی گزارنی چاہئے ہر وقت مصروف رہنا چاہئے اور زیادہ سوچ بچار نہ کریں زیادہ سے زیادہ خوش رہیں تاکہ خیالات بٹے رہیں ...... آخر میں ایک بات یاد رہے کہ کوئی معمولی سا صدمہ بھی جان لیوا ہوسکتا ہے۔''

چارلس بہت ہی سلجھے ہوئے دماغ کا انسان تھا، خدا نے اسے عقل وہمت کی بے پناہ قوتیں دی تھیں۔ ڈاکٹر کے الفاظ سے اس کے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیاں امڈ آئیں۔

اسی شام چارلس نے گھر میں ریڈیو سیٹ لگوانے کی تجویز پیش کی تاکہ آنٹی کا دل بہلا رہے، مسز ہارٹر نے مخالفت کی۔ وہ پہلے ہی فکر مند تھیں کہ لفٹ پر خاصے اخراجات اٹھیں گے۔ لیکن چارلس بضد رہا۔

''مجھے نئے زمانے کی چیزیں بالکل پسند نہیں ......'' مسز ہارٹر نے کہا۔ ''ممکن ہے برقی لہریں میرے دل ودماغ پر اثر انداز ہوں۔''

''آنٹی! آپ کا خیال غلط ہے ریڈیو دل ودماغ پر کوئی اثر نہیں ڈالتا، بلکہ اس کی موجودگی آپ کے لئے تفریح مہیا کرے گی۔'' چارلس نے جواب دیا۔

مسز ہارٹر کو بالآخر رضامند ہونا پڑا اور لفٹ کے ساتھ ہی ایک ریڈیو سیٹ بھی گھر میں آ گیا۔ چارلس نے آنٹی کو ریڈیو کے تمام رموز اچھی طرح سمجھا دیئے، وہ بے حد خوش تھیں کہ سعادت مند بھتیجا ان کا بے حد خیال رکھتا ہے، چنانچہ وہ بھی چارلس سے بے پناہ محبت کرتی تھیں، قبل ازیں مسز ہارٹر نے اپنی ایک بھتیجی میری کو اپنے پاس رکھا، وہ اسے وارث بنانا چاہتی تھیں، لیکن میری نے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت نہ کیا۔

وہ اپنی آنٹی کو خوش نہ رکھ سکی ...... چچی سے محبت کرنے میں وہ ہمیشہ بخل سے کام لیتی اور اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتی بعد ازاں اس نے ایک ایسے نوجوان سے شادی کرلی جس کو مسز ہارٹر ناپسند کرتی تھیں نتیجہ یہ کہ مسز ہارٹر نے اسے ماں کے پاس بھیج دیا۔ چارلس کو وہ پہلے ہی سے پسند کرتی تھیں وہ بھی اس کا بے حد احترام کرتا تھا گزرے ہوئے دور کے تذکرے بڑی دلچسپی سے سنتا اور ہمیشہ ان کو آرام پہنچانے کی فکر میں رہتا ...... مسز ہارٹر بھی اس کی سعادت مندی پر خوش ہوتیں۔

جب وہ پوری طرح مطمئن ہوگئیں تو انہوں نے اپنے وکیل کو نیا وصیت نامہ تیار کرنے کو کہا، تھوڑے دنوں میں وصیت نامہ تیار ہو گیا اور مسز ہارٹر نے دستخط کرنے کے بعد اسے وکیل کی تحویل میں دے دیا۔

ریڈیو کی بدولت مسز ہارٹر بے حد خوش رہنے لگیں۔ وہ جب بھی تنہا ہوتیں ریڈیو کے آس پاس آ بیٹھتیں اور دنیا بھر کے اسٹیشن سنتیں، یہ خوشی بھی چارلس کی مرہون منت تھی اس لئے ان کے دل میں اپنے بھتیجے کی محبت گویا گھر کر گئی۔

گھر میں ریڈیو آئے تقریباً 3 ماہ گزر گئے تھے کہ ایک دن بڑا حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ چارلس کسی پارٹی میں گیا ہوا تھا۔ مسز ہارٹر کمرے میں اکیلی تھیں اور ریڈیو کے سامنے بیٹھی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

اچانک موسیقی کا پروگرام بند ہو گیا اور کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی، پھر کسی مرد کی صاف اور شستہ آواز سنائی دی۔

"میری! کیا تم میری آواز سن رہی ہو میں ہارٹر بول رہا ہوں...... میں بہت جلد تمہیں لینے آرہا ہوں...... تیار رہنا...... تیار رہو گی نا......"

اس کے بعد موسیقی کا پروگرام دوبارہ شروع ہوگیا۔ مسز ہارٹر کرسی پر حیران و ششدر بت بنی بیٹھی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ کرسی کے بازوؤں پر تھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ "یہ آواز کیسی ہے، کہیں میں نے بھیانک خواب تو نہیں دیکھا۔ ریڈیو سے ہارٹر کی آواز کیسے آسکتی ہے؟ اس کو مرے تو عرصہ گزر گیا۔" وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔ پھر خیال آیا۔ "یہ میرے کمزور دل کا نتیجہ ہے یا ممکن ہے بڑھاپے کی اعصابی کمزوری کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔" تاہم انہوں نے اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کیا اور اسے بھلا دینا چاہا، لیکن یہ واقعہ تھا اس نوعیت کا کہ لاکھ کوشش کے باوجود ذہن سے محو نہ ہوسکا۔ ان کے دل و دماغ میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔

کچھ عرصہ بعد اسی قسم کا دوسرا واقعہ پیش آیا۔ اب کے بھی وہ کمرے میں تنہا تھیں۔ ریڈیو پر آرکسٹرا بج رہا تھا، اچانک خاموشی چھاگئی اور دور سے آتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہارٹر تم سے مخاطب ہے میں تمہیں لینے کے لئے اب بہت جلد آنے والا ہوں۔"

آرکسٹرا پھر پہلے کی طرح پورے زور شور سے بجنے لگا۔ مسز ہارٹر نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ رات کے 12 بج رہے تھے انہوں نے اپنے بازو پر چٹکی لی، تو یقین ہوا کہ وہ بیدار ہیں، جو کچھ انہوں نے سنا ہے بیداری کے عالم میں سنا ہے اور ان کے مرحوم شوہر نے ان کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ چارلس نے خلائی لہروں کے متعلق جو لیکچر دیا تھا اس کے الفاظ ان کے ذہن میں گونجنے لگے۔ انہوں نے سوچا ممکن ہے کوئی بھٹکی ہوئی لہر آسمان تک پہنچ گئی اور ہارٹر کی روح نے اس کے ذریعے مجھ سے رابطہ قائم کرکے ہونے والے واقعہ کی اطلاع دی ہو، مسز ہارٹر نے گھنٹی بجائی۔ ان کی خادمہ الزبتھ حاضر ہوگئی۔

"الزبتھ...... میری الماری کی بائیں ہاتھ والی دراز میں سب سامان تیار ہے اس کی چابی اپنے پاس رکھو۔" مسز ہارٹر نے آہستہ سے کہا۔

"کون سا سامان تیار ہے مادام؟" الزبتھ نے دریافت کیا۔

"میری تجہیز و تکفین کا......" مسز ہارٹر نے کہا......" کیا تمہیں یاد نہیں سامان ٹھیک کرنے میں تم نے میری مدد کی تھی۔"

"مادام! ایسا خیال دل میں نہ لائیں، اب تو آپ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے۔" الزبتھ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہر شخص کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔" مسز ہارٹر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ میری عمر 60 سال سے اوپر ہوچکی ہے تم بے وقوف ہو کہ آنسو بہاتی ہو، بھلا بڑھاپے کے بعد بھی کسی پر جوانی کے دن آئے ہیں؟ زندگی کا تو فقط یہی انجام ہے...... اور وہ ہے موت...... اس منزل تک سب کو جانا ہے؟"

الزبتھ روتی ہوئی کمرے سے چلی گئی، مسز ہارٹر نے محبت سے اس کو جاتے ہوئے دیکھا۔ "بہت خدمت گزار اور مخلص عورت ہے اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔" مسز ہارٹر نے دل میں سوچا۔ "وصیت میں اس کے لئے میں نے کتنے پونڈ چھوڑے ہیں، اسے تقریباً 10 ہزار پونڈ تک ملنے چاہئیں یہ میرے پاس ایک عرصے سے کام کررہی ہے......" انہوں نے دل میں سوچا۔

دوسرے دن، مسز ہارٹر نے اپنے وکیل کو فون کیا کہ وصیت نامہ بھیج دو میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں اور الزبتھ کے لئے زیادہ رقم درج کرنا چاہتی ہوں۔

اسی دن! دوپہر کھانے کے دوران چارلس نے ایک حیرت انگیز بات کہی۔

"آنٹی!" چارلس بولا...... "کونے والے کمرے میں آتشدان پر کسی شخص کی تصویر رکھی ہے بڑی

بڑی مونچھوں والا یہ آدمی بالکل مسخرہ لگتا ہے۔"
"وہ تمہارے انکل ہارٹر کی جوانی کی تصویر ہے۔" مسز ہارٹر نے جواب دیا۔
"آنٹی مجھے معاف کر دیجئے میں نے انکل کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے دراصل مجھے اس بات پر حیرت ہے۔" چارلس ایک دم کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"چارلس تمہیں کس بات پر حیرت ہے؟ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" مسز ہارٹر نے کہا۔
"کوئی بات نہیں آنٹی، میرا خیال ہے مجھے دھوکا ہوا ہے۔" چارلس نے مبہم سا جواب دیا۔
"چارلس میری خواہش ہے جو بات تم کہتے کہتے رک گئے ہو وہ مجھے بتاؤ......" مادام نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔
"آنٹی! ایسی کوئی بات نہیں آپ کو بالکل فکر مند نہیں ہونا چاہئے میرا خیال ہے کہ یہ میری نظر کا دھوکا ہے۔" چارلس نے تجسس بھرے لہجے میں کہا۔
"چارلس میں حکم دیتی ہوں کہ میری بات کا جواب دو۔" مادام نے قدرے غصے سے کہا۔
"آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہونے لگیں آنٹی، دراصل بات یہ ہے کہ میں نے تصویر والے آدمی کو پچھلی رات دیکھا ہے وہ کونے والا کمرہ ہے نا، اس کی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا، صبح میری نظر تصویر پر پڑی تو میں نے فوراً پہچان لیا، وہ شخص اس آتشدان والی تصویر سے حیران کن مشابہت رکھتا تھا...... ممکن ہے یہ سب نظر کا دھوکا ہو، لیکن آنٹی پہلے تو مجھے ایسا دھوکا کبھی نہیں ہوا۔"
"تم نے انہیں کونے والے کمرے میں دیکھا تھا؟" مسز ہارٹر نے دوبارہ دریافت کیا۔
وہ بے حد حیران تھیں کیونکہ کونے والا کمرہ ان کے شوہر کا ڈریسنگ روم تھا۔ انہوں نے سوچا شاید ان کے شوہر کی روح ابھی تک ڈریسنگ روم میں موجود ہے۔
شام کے وقت چارلس گھر میں نہ تھا مسز ہارٹر بے چینی کے عالم میں ریڈیو کے پاس بیٹھی پراسرار آواز کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا تیسری بار بھی وہی آواز آئی تو اس بات میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ اب وہ دنیا میں چند روز کی مہمان ہیں ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور جب ریڈیو کا پروگرام بند ہو گیا، تو انہیں ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد آرٹش لہجے میں بہت دور سے آتی ہوئی مخصوص آواز سنائی دی۔
"میری، میرا خیال ہے تم بالکل تیار ہو...... میں جمعہ کو آؤں گا...... رات کے 12 بجے...... ڈرنا مت ......تم کو کوئی تکلیف نہ ہوگی بس تیار رہنا؟"
پھر فوراً ریڈیو پروگرام شروع ہو گیا...... مسز ہارٹر کرسی پر بے حس وحرکت بیٹھی رہیں...... ان کا رنگ سفید پڑ گیا...... بڑی مشکل سے وہ اٹھیں اور لکھنے کی میز پر جا بیٹھیں...... انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا۔
"آج رات پھر میں نے صاف طور پر اپنے مرحوم شوہر کی آواز سنی ہے انہوں نے کہا ہے کہ وہ جمعہ کی رات مجھے لینے آئیں گے۔ اگر اس روز میں مرجاؤں۔ تو میری خواہش ہے کہ تمام لوگوں کو یہ بتایا جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ روحوں کی دنیا سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔"
انہوں نے ایک بار پھر تحریر کو غور سے پڑھا۔ اسے لفافے میں رکھ کر اسے بند کیا اور گھنٹی بجائی تھوڑی دیر بعد الزبتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ مسز ہارٹر کرسی سے اٹھیں اور لفافہ الزبتھ کے ہاتھ میں دے کر بولیں۔
"الزبتھ! اگر جمعہ کی رات کو میں مرجاؤں تو یہ لفافہ ڈاکٹر مینل کو دے دینا...... اس سلسلے میں مجھ سے کسی بحث کی ضرورت نہیں، میں اپنے معاملات کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہوں...... ہاں! میں نے اپنی وصیت کے مطابق تمہارے لئے 10 ہزار پونڈ چھوڑے ہیں۔ اگر میں مرنے سے پہلے بینک نہ جاسکی تو چارلس میرے مرنے کے بعد انتظام کر دے گا۔"
دوسرے دن! مسز ہارٹر نے چارلس سے کہا

۔''اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے تو الزبتھ کو 10 ہزار پونڈ دے دیئے جائیں۔''

''آنٹی آپ کو وہم ہو گیا ہے......'' چارلس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ بالکل صحت مند ہیں میری دعا ہے کہ ہم آپ کی 100 ویں سالگرہ منائیں۔''

مسز ہارٹر نے چارلس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف مسکراتی رہیں......تھوڑی دیر بعد بولیں۔ ''چارلس، جمعہ کی شام کو تمہارا کیا پروگرام ہے۔''

''میرے ایک دوست نے برج کھیلنے کی دعوت دی ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں گھر پر رہوں تو میں نہیں جاؤں گا۔'' چارلس بولا۔

مسز ہارٹر بولیں......''نہیں نہیں میری یہ خواہش نہیں مگر میں اس رات بالکل تنہا رہنا چاہتی ہوں۔''

جمعہ کی شام! گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی، مسز ہارٹر معمول کے مطابق کرسی آتشدان کے قریب کر کے بیٹھی تھیں وہ اپنے کوچ کی تیاری مکمل کر چکی تھیں، صبح بینک بھی گئیں اور 10 ہزار پونڈ نکلوا کر الزبتھ کو دے دیئے۔ انہوں نے اپنی تمام چیزیں ٹھیک کر کے رکھ دی تھیں......انہوں نے ایک بڑا سا لفافہ کھولا اور اندر سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا، یہ وصیت نامہ تھا جو ان کے وکیل نے ہدایت کے مطابق بھیجا تھا۔

ایک بار پڑھ لینے کے بعد اس پر دوبارہ نظر ڈالی یہ ایک مختصری تحریر تھی، انہوں نے 10 ہزار پونڈ کا ذکر الزبتھ کے نام کیا تھا اور 5 ہزار پونڈ کے 2 ترکے دو بہنوں کے نام چھوڑے تھے اور باقی سب کچھ اپنے پیارے بھتیجے چارلس کے نام لکھ دیا تھا، انہوں نے وصیت پڑھ کر اپنا سر کئی بار ہلایا......وہ سوچ رہی تھیں ان کی دفات کے بعد چارلس بہت امیر آدمی بن جائے گا۔

انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا...... 12 بجنے میں 3 منٹ باقی تھے وہ بالکل تیار تھیں، ان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ آخر 12 بج گئے انہوں نے بے چینی سے ریڈیو کا بٹن دبا دیا، وہ آج پھر اسی خصوصی آواز کی منتظر تھیں لیکن کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ایک سرد لہر ان کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی تھوڑی دیر بعد پھر وہی آواز آئی اور قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر آنے والا چلتے چلتے رک گیا اور دروازہ آہستہ سے کھلا خوف سے مسز ہارٹر کا جسم کانپنے لگا...... ان کی آنکھیں ادھر کھلے دروازے پر جم گئیں...... دفعتاً ان کا ہاتھ لڑکھڑایا اور وصیت نامہ سامنے جلتے ہوئے آتشدان میں جا گرا...... ان کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ کمرے کی مدھم روشنی میں ایک جانی پہچانی صورت کھڑی تھی۔

''آخر ہارٹر، ان کو لینے کے لئے آ ہی گیا۔'' ان کا دل ڈوبنے لگا اور وہ کرسی سے نیچے گر پڑیں۔

ڈاکٹر مینل کو بلایا گیا...... چارلس کو بھی برج پارٹی پر اطلاع دی گئی لیکن دوا اور دعا کرنے سے پہلے مسز ہارٹر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، آنٹی کی موت چارلس کے لئے بہت بڑا صدمہ تھی۔

دوسرے دن الزبتھ نے مسز ہارٹر کا خط ڈاکٹر مینل کو دیا...... ڈاکٹر نے بڑی دلچسپی سے اسے پڑھا اور کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے تمہاری مالکہ اپنے شوہر کو تصور میں دیکھا کرتی تھیں اور ان سے باتیں کیا کرتی تھیں، اسی وجہ سے ان کی موت واقع ہوئی۔''

اگلی رات جب گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور سب لوگ بے خبر سو رہے تھے، چارلس آہستہ سے اٹھا اور چوری چھپے اپنی آنٹی کے کمرے میں گیا اور ایک تار جو ریڈیو کے بکس سے اس کے کمرے تک چلا گیا تھا، الگ کر دیا۔

شام سخت سردی تھی، چارلس نے اپنے کمرے میں آگ روشن کی اور اپنی مصنوعی داڑھی اور مونچھیں اس میں پھینک دیں اور اپنے انکل کے کچھ پرانے کپڑے ایک صندوق میں چھپا دیئے، ریڈیو کی اسکیم چارلس کے زرخیز ذہن کی پیداوار تھی۔

جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ کوئی معمولی واقعہ

بھی مسز ہارٹر کی جان لے سکتا ہے...... بہرحال اس کا منصوبہ کامیاب رہا۔ مسز ہارٹر کی تجہیز و تکفین بخیروخوبی ہوگئی اور چارلس پر کسی کو شک بھی نہ ہوا۔

چند روز بعد الزبتھ نے چارلس کو اطلاع دی کہ مسز ہارٹر کا وکیل آیا ہے۔ چارلس تو اس وقت کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں پہنچا...... اس نے وکیل کو خوش آمدید کہا، وکیل ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

''مسٹر چارلس، آپ نے جو خط میرے نام لکھا میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا، آپ کو شاید یہ خیال ہے کہ مسز ہارٹر کا وصیت نامہ میرے پاس ہے۔''

''ہاں، میرا تو یہی خیال ہے۔'' چارلس نے کہا۔ ''آنٹی نے مجھے یہی بتایا تھا۔''

''انہوں نے بالکل ٹھیک کہا تھا ان کا وصیت نامہ پہلے میرے پاس ہی تھا۔'' وکیل نے جواب دیا۔

چارلس نے بے چینی سے کہا۔ ''کیا مطلب؟ پہلے پاس تھا اور اب نہیں؟''

''جی ہاں......!'' وکیل نے جواب دیا۔ ''مسز ہارٹر نے مجھے لکھا تھا کہ وصیت نامہ ان کو واپس بھیج دیا جائے۔'' یہ سن کر چارلس بے چین ہوگیا۔

وکیل نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے ان کی ذاتی چیزوں میں وصیت نامہ تلاش کیا ہے؟''

چارلس نے جواب دیا! ''جی ہاں! الزبتھ نے ان کی ذاتی چیزوں میں کافی تلاش کیا مگر نہیں ملا۔''

وکیل نے الزبتھ کو بلایا...... الزبتھ نے بتایا کہ ''مسز ہارٹر کی وفات کے بعد اس نے آتشدان میں جلے ہوئے کاغذات اور لفافے کی راکھ دیکھی تھی۔''

چارلس کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

وکیل کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ ''میرا خیال ہے، آخری دنوں میں مادام آپ سے ناراض ہوگئی ہوں گی، چنانچہ انہوں نے وصیت نامہ نذر آتش کرنے کے لئے واپس منگوالیا۔''

''جی نہیں، وہ آخر تک مجھ سے بے حد خوش تھیں۔'' چارلس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

دفعتاً چارلس کی آنکھوں میں آنٹی ہارٹر کی موت کا منظر گھوم گیا...... مسز ہارٹر ایک ہاتھ سے اپنا دل پکڑے بیٹھی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے کچھ کاغذ پھسل کر دہکتی ہوئی آگ میں جا گرے۔ چارلس کا چہرہ بالکل سفید پڑ چکا تھا...... اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں وکیل سے پوچھا۔ ''اگر وصیت نامہ نہ ملا تو کیا ہوگا؟''

وکیل نے جواب دیا۔ ''ان کے پرانے وصیت نامے پر عمل درآمد کیا جائے گا جس کی رو سے ان کی تمام جائیداد کی وارث ان کی بھتیجی میری ہے۔''

وکیل کے جانے کے بعد چارلس بے حد پریشان نظر آتا تھا وہ سوچ رہا تھا، اس کی تمام ہوشیاری اور چالاکی میری کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔ وہ خیالات میں غرق تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ڈاکٹر مینل کا فون تھا، وہ کہہ رہا تھا۔ ''مسز ہارٹر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے پتہ چلا ہے کہ ان کا دل بے حد کمزور ہو چکا تھا اور وہ اس ناکارہ دل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ صرف 2 ماہ تک زندہ رہ سکتی تھیں۔''

چارلس نے سر پیٹ لیا...... کاش! اس نے دو ماہ انتظار کر لیا ہوتا اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ اس نے سوچا۔ ''اپنی آنٹی کو ریڈیو کے ذریعے قتل کر کے میں نے بھیانک گناہ کیا ہے۔''

اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی...... ذہن پر ہر وقت خیالات کا دباؤ رہنے لگا، رفتہ رفتہ وہ اعصابی بیماری کا شکار ہوگیا۔

ایک روز ایسی ہی پریشانی کے عالم میں اس نے ایک تحریر تیار کی جس میں اس نے ایک کاغذ پر لکھا ''میری آنٹی اپنی موت نہیں مری تھیں بلکہ میں نے انہیں قتل کیا تھا۔'' پھر پوٹاشیم سائنائڈ ''مہلک زہر'' کا ایک چمچ حلق میں انڈیل لیا۔

☠

نشانات ماضی

سیدہ عطیہ زاہرہ۔لاہور

دنیا کب آباد ہوئی کیسے آباد ہوئی یہ جاننا انسان کے بس سے باہر ہے لیکن آج بھی دنیا کے مختلف ممالک میں ایسے آثار ملتے ہیں اور ان سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ قدرت کے راز جاننا ممکن نہیں۔

نظام قدرت اور احکام الٰہی سے چشم پوشی باعث ہلاکت ہے۔ایک سبق آموز حقیقت

قصے کہانیاں بھی کسی نہ کسی حقیقت سے جنم لیتی ہیں۔

میں نے آپ سب نے بہت سی ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی جن میں دیو ہیکل مخلوق کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہم سب ایسے کرداروں کو پڑھتے ہیں اور پھر فراموش کر دیتے ہیں یہ سب کردار کسی نہ کسی حقیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں بطور قاری اور بطور لکھاری چاہوں گی کہ آپ سب بھی تاریخ کے ان کرداروں کے بارے میں پڑھیں اور ورطہ حیرت میں پڑ جائیں بلکہ اسی طرح جس طرح میں ورطہ حیرت کا شکار ہوئی تھی جب میں اس بارے میں تحقیق کر رہی تھی۔

مورخین اور محققین صدیوں سے زمین پر انسان کی آفرینش وارتقاء کے حوالے سے تحقیق جاری رکھے ہوئے ہیں اس زمین پر انسانی آبادکاری کیونکر ہوئی اور انسان روز

اول سے کس ہیت، قد وقامت کا مالک تھا۔ اور وقت کے ساتھ اس میں کتنی اور کیسی تبدیلی آئی؟ علم بشریات کے ماہرین اس بارے میں مختلف قیاس آرائیاں اور مفروضات رکھتے ہیں اس سلسلے میں جو مفروضہ سب سے زیادہ سائنسدان کی دل چسپی کا مرکز بنا اور اپنی تمام تر متنازعہ تھیوری کے باوجود آج تک زیر بحث لایا جاتا ہے

انگریز ماہر حیاتیات چارلس ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہے جسے اس نے اپنی 1859ء میں شائع ہونے والی کتاب مبداء انواع (On The Origin Of species) میں پیش کیا تھا۔ اس نظریے کی وجہ سے اس کرۂ زمین کے تمام جاندار ماحولیاتی تبدیلیوں میں اپنی بقاء کی خاطر اپنی ہیت میں تبدیلی لاتے ہیں اور یہ عین فطری عمل ہے گویا اس نظریے میں فطرت ہی کو خالق قرار دے دیا جاتا ہے۔

ڈارون نے اگرچہ اپنے اس نظریے میں انسانی ارتقاء کی بات نہیں کی تھی۔ لیکن اس کا یہ نظریہ ہر جاندار شے بشمول بنی نوع انسان پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

بظاہر تو یہ نظریہ دل چسپ ہے لیکن اسے کئی برسوں کی تحقیق کے باوجود اب تک ثابت نہیں کیا جاسکا، اور اب جدید سائنس بھی اسے مسترد کر چکی ہے مگر ایسے افراد کی کمی نہیں۔ جو اس مفروضے کی بنیاد پر انسان کا تعلق بن مانس یا چیمپنزی کی نسل سے جوڑ دیتے ہیں اس سلسلے میں ایک نیا نڈر تھل نامی مخلوق کو اہم ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

1856ء میں مشرقی جرمنی کے دریائے دوسل کے قریب واقع نیانڈر وادی میں واقع ایک غار سے ایسے ڈھانچے برآمد ہوئے جن کی ہیت موجودہ انسان سے قریبی مشابہت کے باوجود بڑی اور قدرے مختلف تھی، وادی کے نام پر انہیں نیانڈر تھل کا نام دیا گیا۔ دنیا کے کئی دوسرے مقامات کی مانند ہونے کے باوجود انسانی نہیں لگتے تاہم ماہرین اسے نوع انسانی کی ہی شاخ قرار دیتے ہیں ان کے مطابق آج سے تقریباً سات لاکھ برس قبل اس زمین پر نیانڈر تھلو آباد تھے اور 30 ہزار برس قبل یہ نوع نامعلوم وجوہات کی وجہ سے اس دنیا سے نابود ہوگئی۔

محققین کا ماننا ہے کہ انسان سے مشابہت کے باوجود یہ لوگ حیوانی معاشرت سے ہی تعلق رکھتے تھے کچھ کا خیال ہے کہ آج کا انسان ماضی کی اس نوع کی بدلی ہوئی جون ہے۔ جو وقت کے ساتھ شعور اور ہیت میں بہتر ہوگئی، نا صرف سائنس اس نظریے کو سختی سے رد کرتی ہے بلکہ دنیا کی تاریخ اور اہمیت کو سمجھنے کا اہم ترین ماخذ سمجھے جانے والے دنیا کے تمام بڑے مذاہب بھی اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں البتہ قدیم صحائف، روایتوں اور تاریخ میں ایسے انسانوں کا ذکر ملتا ہے۔ جو انتہائی بلند قامت رکھتے تھے۔ مگر ان کا تعلق کسی اور نوع سے ثابت نہیں۔

اس بات کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ماحولیاتی تبدیلی کا اثر انسان کے قد وقامت، صحت اور اوسط عمر پر تو پڑ سکتا ہے مگر اس کی اس ہیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جس میں خالق کائنات نے اسے تخلیق کیا بعض انسانوں کو ایک دوسرے پر کچھ معاملات مثلاً طاقت، قد وقامت اور صلاحیتوں میں فوقیت حاصل رہی اور دنیا کے مختلف خطوں میں آباد انسان قد وقامت، طاقت، جلد اور بالوں کے رنگ اور نین نقش میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔

تاہم آثار قدیمہ نے کئی ایسی چیزیں دریافت کی ہیں جنہیں دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا کبھی اس زمین پر غیر معمولی جسامت اور بلند قامت کے لوگ رہتے تھے؟ اور اس سوال کا ابھرنا عین فطری امر ہے کیونکہ بہت سے قدیم آثار اور صحائف، روائتیں اور تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دس بارہ فٹ یا اس سے بھی بلند قامت انسان ماضی میں موجود تھے۔

آج بھی دنیا میں آٹھ فٹ قد رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں مگر ایک تو ایسے افراد کی تعداد بے حد کم ہے دوسرا ان کا یہ جثہ کسی بیماری یا غیر معمولی حیاتیاتی گڑبڑ کا نتیجہ ہوتا ہے وہ زندگی کے عام معمولات بخوبی انجام دینے سے قاصر ہوتے ہیں جبکہ ماضی کی دیوہیکل اقوام طاقت میں اپنی مثال آپ تھیں۔ یونانی، ہندی، اسرائیلی اور مسلم روایات میں ہمیں کئی دیوہیکل انسانوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

تاریخی دستاویزات میں عوج بن عنق نامی

دیوہیکل شخص کا ذکر ملتا ہے اسی طرح حضرت داؤدؑ نے جالوت نامی ایک قوی جثہ و بلند قامت شخص کو قتل کیا۔ طوفان نوح سے قبل دیو قامت قوم نیفلیثم کا تذکرہ حضرت ادریسؑ سے منسوب کتاب (Book of Enoch) اور بک آف جوبلی میں بھی ملتا ہے۔ ان کتابوں کے متعلق یہودیوں کا خیال ہے کہ یہ منسوخ ہوچکی ہیں توریت میں نیفلیثم کو جبار (Giant) اور طاغوت (Tyrant) سے تشبیہ دی ہے۔ توریت میں تو عام انسانوں کو آدم کی اولاد اور ان دیو قامت یا عجیب الخلقت اقوام کو خدا کے بیٹوں کا نام دیا گیا، جنہوں نے زمین پر آکر انسانوں میں شادیاں کیں، اور اس کے نتیجے میں دیوہیکل قوم میں وجود میں آئیں۔

توریت کے موجودہ نسخوں میں موجود باب پیدائش جس میں کائنات کی تخلیق آفرینش کی بات کی گئی ہے اس میں دیو قیامت انسانوں کا ذکر ملتا ہے۔ جنہیں جبار کے نام سے پکارا گیا ہے۔

ترجمہ: ”ان دنوں میں زمین پر جبار بستے تھے۔ یہ ہی قدیم زمانے کے سورما ہیں جو بڑے نامور ہوئے۔“ (توریت، کتاب پیدائش باب 6 آیت 4)

اس قوم کا تذکرہ قرآن مجید کی سورۃ مائدہ: آیت 22 میں بھی بیان ہوا ہے، اور توجہ کی بات یہ ہے، کہ توریت کی طرح انہیں قوم جبار کے نام سے ہی پکارا گیا ہے۔ دینی تفاسیر میں ہے، کہ فرعون سے رہائی پانے کے بعد جب بنی اسرائیل مصر سے واپس بیت المقدس میں اپنے باپ دادا حضرت یعقوبؑ کی سرزمین پر پہنچے تو دیکھا کہ یہاں عالقہ نامی دیوہیکل قوم قبضہ جمائے بیٹھی ہے وہ بڑے مضبوط ہاتھ پیروں کی تھی۔ جب بحکم خداوندی حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا، کہ ان سے مقابلہ کرو اور اپنی سرزمین واپس لو تو بنی اسرائیل عمالقیوں کے دیو کی مانند بلند قد کاٹھ دیکھ کر بری طرح گھبرا گئے، اور ان سے مقابلہ کرنے سے انکار کردیا۔ اس نافرمانی کی پاداش میں وہ چالیس برس صحرائے سینا میں سرگرداں رہے۔

قوم ثمود کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ انتہائی طاقتور لوگ تھے۔ جو چٹانوں کو کاٹ کر ان میں اپنا گھر بنا لیتے تھے اس قوم کے آثار آج بھی کافی حد تک درست حالت میں موجود ہیں۔

قدیم مصر کے دریافت ہونے والے آثار بھی کئی مقبروں کی دیواروں پر ایسی شبیہیں ملی ہیں جن میں اوسط قد و قامت کے ساتھ دیوہیکل انسانوں کو بھی دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اہرام مصر سمیت دنیا کے کئی انوکھے طرز تعمیر اور بھاری پتھروں سے بنی عمارات کے بارے میں جہاں کئی نظریات موجود ہیں وہیں یہ قیاس بھی کیا جاتا ہے کہ ان کی تعمیر دیوہیکل اقوام کے ہاتھوں انجام پائی ہوں گی۔

قدیم صحائف اور آثار سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ آج کی طرح اوسط قد کے اور یہ دیوہیکل انسان ایک ہی وقت میں دنیا میں موجود تھے مگر یہ دیو قامت لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر عام انسانوں کی طرح اپنی بقاء قائم نہ رکھ سکے اور ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ آج ان کا ذکر تاریخ کے اوراق یا دریافت شدہ قدیم آثار میں ہی ملتا ہے اس سلسلے میں سب سے اہم ثبوت کوہ آدم پر موجود ایک بہت بڑے انسانی پاؤں کا نقش ہے۔ جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اس دنیا میں آنے والے پہلے انسان کے پاؤں کا نشان ہے۔

سری لنکا کے ضلع رتناپور میں پہاڑیوں کا ایک سرسبز وشاداب سلسلہ ہے یہاں آج ایک بلندترین پہاڑی جسے مقامی لوگ سری پدا (مقدس قدم) کا نام دیتے ہیں اور دنیا بھر میں یہ کوہ آدم سے مشہور ہے دنیا بھر کے سیاحوں اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے لئے یہ جگہ بڑی کشش رکھتی ہے۔ سات ہزار تین سوفٹ بلند اس چوٹی پر بنی ایک خانقاہ میں ایک گڑھا بنا ہوا ہے جو پانچ فٹ سات انچ لمبا اور دو فٹ سات انچ چوڑا ہے۔ اس گڑھے میں دائیں پاؤں کا نقش ہے۔ اس پاؤں کے نقش کی لمبائی اور چوڑائی سے کسی بھی انسان کے جسم کے قد کا اندازہ 35 فٹ لگایا گیا ہے۔

مسلمانوں کی اور اہل کتاب کی اکثریت کا ماننا ہے کہ یہ نقش پا حضرت آدم علیہ السلام کا ہے۔ اس حوالے سے یہ قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ حضرت آدمؑ کو جب

جنت سے زمین پر بھیجا گیا۔ تو وہ خطہ ارضی کے اسی مقام پر اترے تھے، بدھ مت کے مقامی باشندوں کے مطابق یہ نشان بدھا کے پاؤں کا ہے، اور ہندو لوگ اس نقش پا کو اپنے بھگوان شیو سے منسوب کرتے ہیں۔

اسی طرح سواز لینڈ (جنوبی افریقہ) کی سرحد پر آباد مپلوزی (Mpaluzi) نامی شہر کے قریب ماہر ارضیات کو ایک گرینائٹ کی چٹان پر دیو قامت انسان کے پیر کا نشان ثبت ملا جس کی لمبائی تقریباً 4 فٹ ہے۔ ماہر ارضیات اس کی قدامت کا اندازہ 20 کروڑ سال سے زیادہ لگاتے ہیں۔

ہندوستان کی ریاست آندھرا پردیش اور کرناٹک کے درمیان بنگلور سے 122 کلومیٹر کے فاصلے پر لکشمی نامی ایک گاؤں میں بھی دیو قامت انسان کے پیروں کے نشان دریافت ہوئے جنہیں اب وہاں کے مقامی باشندے کسی مقدس ہستی کا قدم مان کر پوجتے ہیں۔

2002ء میں امریکی ریاست کیلیفورنیا کے کلو لینڈ نیشنل پارک میں بھی دیو قامت انسان کے پیروں کے نشان دریافت ہوئے۔

1908ء میں امریکی ریاست ٹیکساس میں گلین روز کے مقام پر انسان اور ڈائنا ساز دونوں کے دیو ہیکل پیروں کے نشان ملے، انسانی قدموں کے نشان کے حجم سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ یہ انسان 4 میٹر (13 فٹ) قد و قامت رکھتا ہوگا۔ 1958ء میں اٹلی میں کوئلے کی ایک کان میں کھدائی کے دوران ایک چٹان کو توڑا گیا تو اس کی اندرونی پرتوں میں ایک انسانی ڈھانچہ ملا۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہ پرتیں ایک کروڑ دس لاکھ سال پرانی تھیں۔ اس ڈھانچے کی دریافت اس بات کا ثبوت تھی، کہ اس قدر قدیم دور میں بھی انسان کا وجود تھا۔

1926ء میں بیئر کریک، مونٹانا میں وائیگل کول مائن (کوئلے کی کانیں) میں کھدائی کے دوران دو بڑے انسانی دانت برآمد ہوئے تھے ان دانتوں کو دیکھ کر ماہرین یہ اندازہ قائم کرتے ہیں۔ کہ اس دور کا انسان بڑے حیوانات کا گوشت کھاتا ہوگا۔ کیلی فورنیا کے ساحلی علاقے

لوبوک رینج میں 1833ء میں کھدائی کے دوران ایک انسانی ڈھانچہ ملا جو 12 فٹ لمبا تھا۔ یہ ڈھانچہ مکمل طور پر پتھروں میں مدفون تھا، اور وہ پتھر چٹانوں کی شکل میں کم از کم ایک کروڑ سال پرانے تھے۔ اس سے بھی ہم اس سیارے پر انسان کی قدامت کا اندازہ لگا سکتے ہیں یہ ڈھانچہ ایک قبائلی علاقے میں ملا تھا، اور اس کے ساتھ چند اوزار اور ہتھیاروں کے علاوہ ایسے پتھر بھی تھے۔ جن پر سمجھ میں نہ آنے والی علامات بنائی گئی تھیں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اس ڈھانچے کو لوگوں نے اپنے کمزور مذہبی عقائد کی بنا پر پوجنا شروع کردیا یہ حالت دیکھ کر حکام نے فوری طور پر اس ڈھانچے کو اس کے ساتھ ملنے والی تمام اشیاء کے ساتھ کسی خفیہ مقام پر دفن کرنے کا حکم دیا اور یوں ماہرین ماضی کے دیو ہیکل انسان سے متعلق ایک اہم کڑی پر تحقیق کرنے سے محروم رہ گئے۔

☆......☆......☆

کیلیفورنیا کے ساحلی علاقے میں سانتا روز آئی لینڈ پر ایک ایسے دیو قامت انسان کا ڈھانچہ ملا تھا۔ جس کے دانتوں کی اوپری اور نچلی دو دو قطاریں تھیں۔ ان دانتوں کی ساخت سے یہ دلچسپ اندازہ لگایا گیا، کہ یہ دیو قامت انسان اس دور کے چھوٹے ہاتھیوں کو کھا کر گزارا کرتے ہوں گے۔ اور غالباً اسی لئے اس علاقے میں چھوٹے ہاتھیوں کی نسل ختم ہوئی ہوگی۔

1891ء میں ایریزونا میں ایک تجارتی عمارت کی تعمیر کے لئے کھدائی کے دوران پتھر کا بنا ہوا ایسا تابوت ملا۔ جو حنوط شدہ لاشوں کو رکھنے کے لئے استعمال ہونے والے تابوتوں سے مشابہ تھا۔ اس میں ایک دیو قامت انسان کے پورے جسم کے بہت واضح آثار تھے، مگر لاکھوں سال کے قدرتی عمل میں وہ اب راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔

دریائے ٹینیسی (Tennessee) کے دہانے کے نزدیک برائٹن (Brayton) کے مقام پر ایک چٹان پر بھی ایک دیو قامت انسان کے پیر کے نشان ملے۔ اس پاؤں کی ایڑی کی چوڑائی 13 انچ تھی۔ جبکہ اس کی انگلیاں 6 تھیں۔ انہی چٹانوں میں زمانہ قدیم کے گھوڑے

کے سم کے نشانات بھی ملے، جو 8 تا 10 انچ تھے ماہرین اسے معلوم تاریخ سے بہت پہلے کے دور میں انسان کے گھوڑے کو تالف کرنے کا اہم ثبوت فراہم قرار دیتے ہیں۔

ایک برطانوی اخبار "سٹرانڈ" کے مطابق 1895ء میں اینٹرم کاؤنٹی، آئرلینڈ میں کھدائی کے دوران ایک دیوقامت انسان کا پتھر نما ڈھانچہ ملا جس کا پورا جسم رکاز (فوسل) میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اس کا قد 12 فٹ تھا۔ اس رکاز کو تحقیق کے لئے لندن لایا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ فوسل کہاں غائب ہوگیا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

1950ء کی دہائی میں جنوب مشرقی ترکی میں وادی فرات کے قریب قدیم مقبروں میں کھدائی سے ایک فوسل شدہ انسانی ران کی ہڈی برآمد ہوئی جس کی لمبائی 47 انچ تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اس انسان کا قد 14 سے 16 فٹ بلند ہوگا۔ یہ فوسل (ران کی ہڈی) ماؤنٹ بلانکو فوسل میوزیم ٹیکساس میں موجود ہے۔

نارتھ ویلس میں لانڈڈنو (Liandudno) کے ساحلی قصبے کے قریب ایک قدیم تانبے کی کان دریافت ہوئی یہ علاقہ آرٹش سطح سمندر سے 220 میٹر بلند ہے۔ ماہرین نے اس کان سے 2500 ہتھوڑے برآمد ہوئے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اکثر ہتھوڑوں کا وزن 60 پونڈ (30 کلو) اور ان کا دستہ 9 فٹ لمبا ہے موجودہ دور میں استعمال ہونے والے ہتھوڑوں کا وزن 10 یا زیادہ سے زیادہ 200 پونڈ ہوتا ہے، 60 پونڈ (30 کلو) وزنی اور 9 فٹ لمبے ہتھوڑوں سے کام کرنا ایک عام قد کاٹھ کے آدمی کے لئے بے حد مشکل ہے۔ اس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کان میں غیر معمولی قد کاٹھ اور طاقت رکھنے والے لوگ کام کیا کرتے تھے۔

اس تانبے کی کان کے بارے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ آج سے 3500 سال پہلے کانسی کے عہد میں اس کان میں مزدور کام کیا کرتے تھے۔

یہی صورتحال یونان کی قدیم تہذیب کے ملنے والے آثاروں کے متعلق بھی ہے۔ بحر ایجین کے جزیرہ کریٹ کے ہیراکلین میوزیم میں گریٹ پر بسنے والی یونان کی مینون (Minoan) تہذیب کے آثار سے ملنے والی کلہاڑیوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ ان کو استعمال کرنے والے انسان غیر معمولی طاقت اور بلند قد وقامت کے حامل ہوں گے۔

یہ بات واضح رہے کہ دنیا کے ہر خطے کی تاریخ میں ہی ایسے دیوقامت انسانوں کا تذکرہ ملتا ہے تاہم سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے روایات میں دیوقامت انسانوں کے بارے میں زیادہ تر باتیں مبالغے کی آمیزش لئے ہوتی ہیں لیکن انہیں جنات کی کوئی نسل یا انہیں کوہ قاف کے دیو قرار دیا جاتا ہے۔

جدید سائنسی بنیادوں پر کی جانے والی تحقیق سے ان روایات کی پرکھ ان افسانوی باتوں کی پرتیں ہٹائی جارہی ہے علم الحیاتیات کے ماہرین کا ماننا ہے کہ جس طرح آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف رنگ ونسل کے لوگ پائے جاتے ہیں اور ان میں نا صرف رنگ اور نین نقش کا واضح فرق موجود ہے بلکہ ان کی جسمانی ساخت اور قد میں بھی تفریق پائی جاتی ہے اس کی وجہ کسی جگہ کے موسمی یا جغرافیائی حالات بھی ہوسکتے ہیں اور جینیاتی طور پر بھی انسان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ماضی میں بھی مختلف خطوں کے انسانوں کی قد وقامت میں فرق رہا ہوگا۔

لیکن ماہرین ایسے تمام تر مفروضوں کے باوجود ابھی تک اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرپائے کہ ماضی کی یہ دیوقامت اور طاقت سے بھرپور اقوام کیوں کر نابود ہوگئیں۔ جبکہ ان کے مقابل عام قد کاٹھ کے انسان آج تک اپنی بقاء قائم رکھے ہوئے ہیں۔

مذہبی اسکالرز کے مطابق ماضی کے دیوہیکل لوگ اپنی طاقت کے نشے میں چور اس زمین پر شر اور فساد پھیلانے لگے تھے اور اس وجہ سے یہ عذاب الٰہی کا شکار ہوگئے جبکہ سائنس ابھی اس سوال کا جواب ڈھونڈ رہی ہے۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 123

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

''گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے'' رولوکا کے یہ الفاظ سنتے ہی خلیق الزماں اپنی جگہ دہل کر رہ گئے۔ ان کا حلق خشک ہونے لگا، انہوں نے خود کو سنبھالا اور رولوکا سے مخاطب ہوئے۔ عامل صاحب میں ان الفاظ کو سمجھ نہیں پایا۔ یہ سن کر رولوکا نے جواب دیا۔ حویلی میں خونی کھیل کھیلنے والا حویلی میں ہی موجود ہے، ابھی چند منٹ بعد آپ کے سامنے ساری حقیقت کھل کر آ جائے گی۔ پھر رولوکا نے کچھ پڑھ کر دیوار کی جانب پھونک ماری تو دیوار ٹی وی کی طرح روشن ہوگئی اور ایک ہیولہ نظر آیا، اس ہیولے نے ساری پول پٹی کھول دی اور پھر یہ بات سامنے آئی کی خلیق الزماں کے چھوٹے بھائی نے حویلی میں یہ خونی کھیل کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنی خود غرضی اور مطلب پرستی کے ذریعہ یہ کھیل کھیلا کہ خلیق الزماں کہ سارے بچے اور خود خلیق الزماں میاں بیوی ختم ہو جائیں گے تو پوری حویلی پر سلیم الزماں کا قبضہ ہو جائے گا اور ان پر کوئی حکم چلانے والا نہیں ہو گا۔ یہ جان کر خلیق الزماں بہت دل برداشتہ ہوئے۔ خیر رولوکا کے سمجھانے پر وہ کچھ پرسکون ہوئے۔ پھر رولوکا نے ایک روز شام کے وقت حویلی میں آیا اور ہال کمرے میں خاندان کے سارے افراد کو جمع کیا اور بولا۔ '' ہر آدمی اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھیں اور جو بھی نظر آئے اس پر دھیان رکھیں۔ پورے ہال میں موت کی خاموشی طاری ہوگئی تو رولوکا نے کچھ پڑھ کر روشندان کی طرف پھونک ماری تو چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ ایک ہیولہ روشندان سے اندر آتا نظر آیا اور پھر اس ہیولہ نے اپنا نام فہیم الزماں بتایا جو کہ خلیق الزماں کا بڑا بیٹا تھا۔ یہ سنتے ہی سارے دہل کر رہ گئے پھر اس ہیولہ نے ساری حقیقت کھول کر رکھ دی۔ کہ میرے چچا سلیم الزماں نے یہ سارا خونی کھیل حویلی میں کھیلا۔ اور پھر بولا اچھا اب میں چلتا ہوں میری سب سے التجا ہے کہ میرے حق میں دعائے مغفرت کیا کریں اور جب ہال میں روشنی ہوئی تو سب نے دیکھا کہ سلیم الزماں اور ان کی بیوی اپنی اپنی جگہ بے سدھ پڑے ہیں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ اور پھر اس میں کسی کا بھی جانی نقصان نہ ہوا۔ اس کے بعد رولوکا واپس آ گیا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پینے کے بعد بستر پر لیٹ کر گزرے حالات اور واقعات کے متعلق سوچنے لگا۔

(اب آگے پڑھیں)

وہ ایک سرد ٹھٹھرتی ہوئی شام تھی، میں جگت خان کریمن کا بہت دیر سے پیچھا کر رہا تھا جو مجھے سارے شہر میں گھماتی پھر رہی تھیں، اگرچہ خالہ کریمن لوگوں کے خیال میں پاگل ہو چکی تھیں، مگر خدا جانے کیوں میرا دل یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ اکثر اتنے پتے کی باتیں کہہ جاتی تھیں کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی، دوسرے لوگ تو ہنس کر ٹال دیتے یا ان کے پاگل پن پر افسوس کرتے، مگر میں سنجیدگی سے سوچتا اور فائدہ اٹھاتا یہی وجہ ہے کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔

خالہ کریمن ہمارے محلے ہی میں رہتی تھیں اور اکثر ہمارے ہاں آیا کرتی تھیں محلے والوں کو ان کے پاگل ہو جانے کا بہت صدمہ ہوا تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ وہ ہر شخص کے دکھ درد کی ساتھی تھیں، ان کے شوہر کی وفات کو کافی دن گزر چکے تھے، ان کا ایک ہی لڑکا تھا امجد جو اپنی ماں کی طرح خوش اخلاق اور ملنسار تھا، امجد کی شادی میں خالہ نے سرخ رنگ کا لباس پہنا تھا، جیسے خود ان کی شادی

ہو، اور پورے محلے میں لہرالہرا کر گاتی پھرتی تھیں، خالہ کو تو خیر اپنا ہوش نہ تھا لوگوں نے امجد کی تنہائی کو دیکھتے ہوئے اس کی شادی کرادی تھی خالہ کا کام تو تمام دن شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرنا تھا۔ کسی نے کچھ دے دیا تو کھالیا، ورنہ یوں ہی کھائے پیے بغیر پھرتی رہتیں اور رات کو کسی وقت یا تو گھر آ پڑتیں یا قبرستان میں ایک ٹوٹی پھوٹی تاریک کوٹھری میں بسیرا کرلیتیں۔

ایک دن میں کام سے بازار کی طرف جارہا تھا تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ سامنے سے ایک جنازہ آتا ہوا دکھائی دیا میں خاموشی سے ایک طرف ہوگیا، جنازہ گزرجانے کے بعد میں نے اچانک پیچھے کی طرف دیکھا، جنازہ نامعلوم کیوں بیچ سڑک پر روک لیا گیا تھا۔ میں نے سوچا چلو چل کر دیکھنا تو چاہئے آخر بات کیا ہے؟ کئی راہ گیر بھی چلتے چلتے رک گئے تھے۔ میں جو وہاں پہنچا تو خالہ کریمن کو کھڑے دیکھا، جو بچوں کی طرح میت کا منہ دیکھنے پر مچل رہی تھیں، آخر کسی نے کہا۔ "بھئی دکھادو منہ، جانے بے چاری کس دکھ میں پاگل ہوگئی ہے۔"

آخر میت کا منہ کھول دیا گیا، اف خدایا جس نے بھی دیکھا کانپ کررہ گیا اور توبہ توبہ کرتا پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ میت کا چہرہ بری طرح بگڑ گیا تھا، آنکھیں خوف ناک حد تک باہر نکل آئی تھیں، زبان دانتوں کے اندر پھنسی ہوئی آدھی باہر لٹک رہی تھی، میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی، میں ہٹنے ہی والا تھا کہ خالہ کریم آپ ہی آپ بڑبڑائیں...... "ہاں یہ بات ہے...... میں جان گئی...... خلق خدا پر اتنا بڑا ظلم...... تو آج رات......" یہ الفاظ دھیمے لہجے میں ان کے منہ سے نکلے تھے، مگر میں نے نزدیک ہونے کی وجہ سے سن لئے۔

لوگ جنازہ اٹھا کر آگے بڑھ گئے، خالہ کے بے ربط سے جملے میرے کانوں میں گونجتے رہے اور ان ہی جملوں کا راز جاننے کے لئے میں خالہ کا پیچھا کررہا تھا، شاید آج رات خالہ کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔

شام ڈھلے میں نے انہیں ڈھونڈ لیا اور اب وہ مجھے اپنے پیچھے لگائے سارے شہر میں گھما رہی تھیں جیسے انہیں علم ہوگیا ہو اور مجھے تھکا دینا چاہتی ہوں کہ آپ ہی تنگ آکر لوٹ جائے گا، مگر میں تو ان کے جملوں کا راز جاننے کے لئے بے چین تھا......

اچانک خالہ میری طرف مڑیں اور میں ان کو مڑتا دیکھ کر جلدی سے خود بھی مڑ گیا، اب حالت یہ تھی کہ میں ان کے آگے تھا اور وہ میرے پیچھے۔ میں کچھ دور بے تعلقی کے سے انداز میں چلتا رہا اور پھر پیچھے کی طرف دیکھا کہ خالہ اور کسی طرف نہ نکل گئی ہوں، لیکن میں ٹھٹھک کر رہ گیا، خالہ مجھ سے ایک قدم پیچھے کھڑی ہوئی عجیب انداز میں کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "آج شاید زیادہ کھانا کھالیا ہے ہمارے بیٹے نے تب ہی تو سارے شہر کا چکر لگاتا پھر رہا ہے۔"

میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں خالہ بس گھر میں دل نہیں لگا، گھومنے نکل آیا تھا کہ تم مل گئیں۔"

خالہ پھر ہنسنے لگیں اور پھر ڈانٹنے کے سے انداز میں بولیں۔ "جھوٹ نہیں بولا کرتے اور اپنی خالہ کے منہ پر جھوٹ بول رہا ہے۔ میں سب جانتی ہوں۔" میں نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "خالہ نہ جانے تم کیا سوچ رہی ہو، مجھے نہیں معلوم کہ آخر تم کیا جانتی ہو۔"

وہ بولیں۔ "آ میرے ساتھ تجھے بتاؤں، خبردار زبان بند رکھنا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس شہر میں رہنے کی اجازت لی ہے۔ کہیں تو وقت سے پہلے ہی مجھے یہاں سے نکلوادے۔"

میں حیران حیران خالہ کی باتیں سنتا رہا، مگر سمجھ میں کچھ نہ آیا، ہاں میں نے یہ قسم ضرور کھائی کہ "جو کچھ دیکھوں گا جو کچھ تم کہوگی اس کا کسی سے بھی ذکر نہیں کروں گا۔"

اس پر خالہ نے کہا کہ "اچھا تو میرے پیچھے پیچھے آ، مگر مجھ سے دور دور رہنا۔"

ہم دو تین گلیوں سے ہوکر ایک تاریک گلی میں داخل ہوگئے، خالہ مجھے اس گلی کے ایک مکان کے دروازے کے سامنے کھڑی نظر آئیں۔ گلی بالکل سنسان پڑی تھی، دراصل یہ مکانوں کی پشت تھی گلی میں ایک ملگجا

سا بلب جل رہا تھا، اس کی زرد زرد مدھم روشنی گلی کے اندھیرے کو دور کرنے میں بری طرح ناکام ہوگئی تھی۔ میں احتیاط سے چلتا ہوا خالہ کے پاس پہنچ گیا۔ اچانک انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ دستک کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس مکان کے مکینوں سے واقف ہیں، پھر بھی کئی سوال میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

اچانک دروازہ کھل گیا۔ اندر تاریکی ہی تاریکی تھی۔ خالہ جلدی سے اندر چلی گئیں۔ میں بھی ان کے پیچھے اندر چلا گیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہوگیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دروازہ بند کرنے والے کو دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے کچھ نظر نہ آسکا۔ خالہ اندر جا کر غائب ہوگئی تھیں مجھے وحشت سی ہونے لگی اور میں ہڑبڑا کر تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔ کمرے سے نکلتے ہی میں اس کے صحن میں کھڑا تھا، مکان پر عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کیا یہاں کوئی نہیں رہتا۔ محسوس تو یہی ہورہا تھا۔ "دروازہ کس نے کھولا اور پھر کس نے بند کیا؟"

اتنے میں مجھے اپنے پیچھے کسی کے کود کود کر چلنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ میں خالہ کو آواز دینے ہی والا تھا کہ اس وقت ایک کمرے میں روشنی نظر آئی اور میں بادل ناخواستہ اسی طرف دوڑتا چلا گیا، اب مجھے اس مکان سے سخت وحشت ہورہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی خالہ مجھے ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھی نظر آئیں اور میں بوکھلایا ہوا سا ان کے پاس بیٹھ گیا۔ سامنے انگیٹھی پر ایک لمبی سی موم بتی روشن تھی۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا، میں خالہ کی عجیب سی خاموشی سے تنگ آکر پہلو بدل رہا تھا، ایک بار میں نے بولنا بھی چاہا تو خالہ نے مجھے اشارے سے خاموش کردیا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور میری آنکھیں باوجود کھلی رکھنے کے بند ہونے لگیں۔

اچانک میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں مجھے باہر صحن کی طرف کسی عورت کے کراہنے کی آواز صاف سنائی دی اور اسی لمحے کوئی درد و کرب کے ساتھ کراہا......

میں نے وحشت زدہ ہوتے ہوئے خالہ کی طرف دیکھا جو دروازے کی طرف نگاہیں جمائے بیٹھی تھیں۔ جیسے انہیں کسی کا انتظار ہو، میں نے ان کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہیں دیکھا اور میں ایک بار پھر چونک اٹھا، اب کسی کے ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر چلنے کی آواز آئی اور پھر جو کچھ میں نے دیکھا، اس نے میرے ہوش اڑا کر رکھ دیئے، میں خوف و دہشت سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

میرے سامنے ایک چوبیں پچیس سالہ عورت جو کبھی بہت خوبصورت رہی ہوگی ایک ٹانگ پر کھڑی تھی، کرب و اذیت نے اس کے نقش و نگار کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ شانے سے کٹا ہوا تھا اور بائیں ٹانگ گھٹنے سے اور وہ اپنے ان کٹے ہوئے اعضا کو اپنے دوسرے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی، شانے اور گھٹنے سے تازہ تازہ خون فرش پر گرتا ہوا محسوس ہورہا تھا اس کے سینے میں ایک گہرا گڑھا نظر آتا تھا، جیسے کہ اس کا دل نکال لیا گیا ہو، اسکا سارا لباس خون سے تر ہورہا تھا، اس کے پیچھے کئی معدوم اور خوبصورت بچے بالکل اسی حالت میں کھڑے ہوئے تھے جس حالت میں وہ خود تھی۔ وہ بھی اپنے کٹے ہوئے اعضا اپنے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تھے، ان کی معصوم نگاہیں التجائیں اور فریادیں لئے ہوئے تھیں۔

وہ عورت اچھل کر ایک قدم میری طرف بڑھی اور میں نے اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر پیچھے ہٹنا چاہا مگر دھڑام سے چارپائی پر گر گیا اور خالہ نے جواب تک خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں جلدی سے ہاتھ میرے سینے پر پھیرا اور پھر میرا خوف بہت کم ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر بیٹھوں ایک سرسراتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔

"بھگوان کے لئے! میرے دکھی من کو شانتی دے دو ماں، میں انتقام کی پیاسی ہوں، اپنے اور اپنے نردوش بالکوں کے۔"

بچے بھی اب کافی آگے بڑھ آئے تھے، رونگٹے کھڑے کردینے والا منظر تھا۔ وہ پھر بولی۔

"مجھے اس آگ سے بچالو، بھگوان کے لئے میری سہائتا کرو، میں کئی برس سے آگ میں جل رہی ہوں، میری آتما کو شانتی دے دو ماں۔" اور پھر وہ سسکیاں لینے لگی۔

یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر تھا اور خالہ تھیں کہ اب بھی خاموش بیٹھی تھیں، آخر انہوں نے اپنی اس عجیب خاموشی کو توڑا۔ "میں اسی لئے یہاں آئی ہوں میری بچی، کیا تو مجھے اپنی کہانی سنائے گی، میں وعدہ کرتی ہوں......" اور وہ ایک دم خاموش ہوگئیں نہ جانے کیوں...... خالہ کی شفقت بھری باتوں سے میری بھی کچھ ہمت بندھی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا، مگر وہی سوال کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟

اس عورت نے ایک نگاہ میری طرف ڈالی کیسی حسرت تھی اس کی نگاہوں میں اور پھر وہ خالہ سے مخاطب ہوئی۔

"ماں مجھ ابھاگن کی جیون کتھا تو بہت لمبی ہے پر میں چاہتی ہوں کہ تم میری بپتا سن لو اور یہی میری اچھا ہے۔" اس نے سسکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"ماں مجھے اس نرکھ میں جھونکنے والا میرا اپنا پتی ہے وہ پتی جسے میں اپنا من موہر دیوتا سمجھتی تھی، مگر اس درندے نے مجھے اتنے کشٹ دیئے کہ میں انتقام کی دیوانی ہوگئی، اس کارن میری آتما آج تک تڑپ رہی ہے، میرا نام اوشا دیوی ہے۔ میرا اس سنسار میں اب کوئی نہیں رہا، میں اور شبھ نواس ایک دوسرے کو بچپن ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے بہت سے رشتہ داروں کے خلاف ہونے کے باوجود شبھ نواس نے میرے ماتا پتا کو میرے ساتھ لگن کے لئے کہا اور کچھ سے بعد ہم ایک بندھن میں باندھ دیئے گئے اور ایک برس کے اندر ہی میرے ماتا پتا سورگ باش ہوگئے۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جسے میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس وقت ہم اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔ میرا پتی پیسے والا آدمی تھا۔ لگن کے دو برس ہنسی خوشی گزر گئے، مگر میرا پتی اب کچھ دکھی دکھی نظر آنے لگا تھا، کیونکہ اب تک میرا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

ایک دن میرا پتی بے کل سا گھر میں آیا، میں نے اس کے من کا بھید جاننے کی اچھا کی پر وہ ٹال گیا، میں اسے سکھی رکھنے کی ہر طرح کوشش کرتی، پر وہ سکھی نہ ہوتا اور اب تو وہ مجھ سے الگ الگ رہنے لگا تھا۔ راتوں کو اکیلا کمرے میں بند ہوکر بھگوان جانے کیا کیا کرتا رہتا۔ وہ ایک رات کو اچانک نمودار ہوا اور مجھ سے بولا۔ "دیوی مجھے پتا لگا ہے کہ سریندر کو شہر میں دیکھا گیا ہے، کیوں نہ تم بھی میرے ساتھ شہر چلو اس طرح تمہارے من کو بھی شانتی مل جائے گی اور میں سریندر کو بھی ڈھونڈ لوں گا۔"

اگلے دن ہی ہم شہر چلے آئے، ہمیں شہر آئے ایک برس بیت گیا مگر سریندر کا کوئی پتہ نہ لگا یہاں آکر شبھ نواس بالکل ہی بدل گیا تھا۔ اب وہ ذرا ذرا سی بات پر مجھ سے لڑ پڑتا نہ جانے رات کو کس سے آتا۔ صبح کو جب میری آنکھ کھلتی تو وہ پڑا سوتا ہوتا۔ اس نے ان پانی بالکل تیاگ دیا تھا، اس کے منہ پر عجیب سی اداسی پھیلتی جارہی تھی جسے دیکھ کر مجھے ڈر سا لگنے لگا تھا۔

ایک رات اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی سسک رہا ہو، میں نے ادھر ادھر دیکھا شبھ نواس کی کھاٹ خالی پڑی تھی، میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اسی سے غسل خانے سے کراہنے کی آواز سنائی دی میں ڈرتے ڈرتے اس طرف بڑھی اور دروازے کی جھری میں سے اندر جھانکا اور میں دھڑام سے گر پڑی۔

میرے پتی نے ایک آٹھ نو سال کے بالک کو اپنے ہاتھوں سے دبا رکھا تھا اور اس کے ایک ہاتھ کو کندھے سے اور ایک ٹانگ کو گھٹنے سے الگ کردیا تھا اور لمبے چاقو سے اس کا دل نکال کر اپنے دانتوں سے بھنبھوڑ رہا تھا، اس کے منہ پر شیطانی مسکراہٹ ناچ رہی تھی اس نے نگاہ اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں کسی دہکتے ہوئے انگارے کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے وشواس ہی نہ تھا کہ یہ میرا پتی شبھ نواس ہے۔

صبح بہت دن چڑھے میری آنکھ کھلی، میں کچھ دیر خالی خالی آنکھوں سے چھت کو گھورتی رہی، پھر میں نے

اچانک شبھ نواس کی کھاٹ کی طرف دیکھا اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ شبھ نواس تو نہ جانے کب سے بیٹھا مجھے گھور رہا تھا، اس کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی تھی، کیا مجھے شبھ نواس نے ہی کھاٹ پر لٹایا تھا، اس نے مجھے اٹھتا دیکھ کر کہا۔

"بھلا ہو بھگوان کا کہ رانی دیوی کی آنکھ تو کھلی۔"

اس کے اس طرح بولنے پر میں کھول ہی تو اٹھی۔

"کیوں کیا بھوک لگی ہے مہاشے جی۔ کیا جلدی سے بھوجن تیار کردوں؟" میں جان گئی تھی کہ وہ اب گھر میں بھوجن کیوں نہیں کرتا۔ میں نے جو چوٹ کی تھی وہ اسے سمجھ گیا اور کہنے لگا۔

"میں یہ سب کچھ تمہارے من کی اچھا پوری کرنے کے لئے کر رہا ہوں...... میں تمہیں سدا سکھی......"

اور میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"شبھ نواس۔" آج پہلی بار میں نے اپنے پتی کا نام لیا تھا، اس نے چونک کر مجھے دیکھا، میں نے کہا۔

"مجھے کسی شانتی اور سکھ کی آشا نہیں ہے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگنا چاہتی۔" اس سے میرے ذہن نے سریندر کی مورتی میرے سامنے لاکر کھڑی کردی۔

"ہے بھگوان! کہیں میرے سریندر کو بھی اس راکھشش نے نہ مار ڈالا ہو۔ نہیں نہیں! میرا سریندر زندہ ہے، ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔" شبھ نواس حیران حیران سا مجھے دیکھ رہا اور بہت ہی گھمبیر آواز میں بولا۔

"دیوی۔ میں تمہارے من کی بات سن رہا ہوں۔"

میں نے ہکا بکا ہوکر اس کی طرف دیکھا، اس کے مکھ پر ہی پراسرار مسکراہٹ تھی، وہ اٹھ کر میرے قریب آگیا، اس نے پریم بھرے لہجے میں دھیمے دھیمے سے کہنا شروع کردیا۔

"میری لکشمی! تم تو جانتی ہو کہ ہمارے کوئی اولاد نہیں ہے، مجھے اولاد کی جتنی اچھا تھی...... اتنا ہی بھگوان نے مجھے اولاد سے دور رکھا۔ میں نراش ہوگیا تھا، لیکن ایک روز مجھے ایک بہت بڑے گیانی مہاراج ملے اور میرے کچھ کہے بغیر ہی انہوں نے کہا۔ "بچہ چنتا نہ کر۔" یہ شبدھ میرے کانوں سے ٹکرائے اور مختصر یہ کہ میں ان کے کہنے سے جاپ شروع کردیئے۔ میں ان مہاراج کو بھگوان کا اوتار سمجھتا ہوں اور ان ہی کے کارکن میں آج شکتی کا مالک بن گیا ہوں۔ بڑے بڑے گیانی میرے آگے کچھ نہیں۔ میری شکتی اتنی بڑھ گئی ہے کہ جسے چاہوں کنیا (لڑکی) دے دوں اور جسے چاہوں بالک دے دوں، اور من چاہے تو ان دونوں آتماؤں کو بھسم کردوں، میری اس مہان شکتی کے آگے کس کا بل۔ پرنتو اس شکتی کو رکھنے کے کارن مجھے کسی کنیا یا بالک کا ہردے (دل) کھانا ہوگا اور دل اس سے نکالنا ہوگا جب وہ لاش بری طرح تڑپ رہی ہو۔

اگر دل نکالنے سے پہلے منش مرجائے تو مجھے اپنے پریم کا دان دینا ہوگا، ورنہ میری تمام محنت اکارت جائے گی اور مجھے پھر شروع سے پھر جاپ کرنا ہوں گے۔"

وہ کچھ دیر رکا اور پھر بولا۔

"ہندو، مجھے بھگوان کا اوتار اور مسلے، پہنچا ہوا بزرگ سمجھیں گے۔ میری اور تمہاری پوجا ہوگی۔ تم بھی کسی دیوی سے کم تو نہیں ہو، دیکھو دیوی، میری شکتی کا ایک چھوٹا سا کرتب دیکھو پرنتو اگر تم نے ایک لفظ بھی کسی سے کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ شبھ نواس کی جگہ لمبے لمبے سیاہ بالوں والا ایک ریچھ کھڑا تھا، مگر اس کا منہ اب بھی شبھ نواس جیسا تھا، وہ وہی آواز میں بولا۔

"کیوں دیوی؟ دیکھی میری مہان شکتی، میں جس روپ میں چاہوں آسکتا ہوں۔"

اور پھر وہ انسانی صورت میں آگیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے جارہی تھی، اس نے آگے بڑھ کر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"کیا تم خوش نہیں دیوی...... ؟ دیوی یہ سب کچھ میں نے تمہارے کارن ہی تو کیا ہے...... میں تم کو سکھی دیکھنا چاہتا ہوں، دیوی اپنے چندرما جیسے مکھ کو مجھ سے نہ موڑو۔"

میں شبھ نواس کی باتوں سے پگھلنے لگی تھی، کتنا سے

بیتنے کے بعد میرے پتی نے اتنے پریم سے باتیں کی تھیں، پر اچانک شبھ نواس کا وہ بھیانک چہرہ میرے سامنے آیا جسے رات میں دیکھ چکی تھی، مجھے ان نردوش بالکوں کا خیال آیا جو نہ جانے کتنی ماؤں کی گود سے چھین لئے گئے تھے اور میرا سریندر...... اس کے خیال سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے غصے سے شبھ نواس کی اور دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں دیوی! سریندر امر ہو گیا، پرنتو ہماری بھینٹ بے کار نہیں گئی، اب ایک نہیں کئی سریندر اس گھر میں کھیلا کریں گے پر تم خوش نہیں ہوئیں۔"

"نہیں نہیں......" میں چلا پڑی۔ بھگوان کے لئے یہ اتیاچار نہ کرو، بھگوان جانے ہمیں کتنے کشٹ اٹھانا پڑیں، ابھی سے ہے کہ بھگوان کے چرنوں میں پڑو۔" میرے دل میں نفرت کا جو لاوا کھول رہا تھا وہ ابل پڑا، شبھ نواس اپنے کئے پر پچھتانے کے بجائے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ کچھ دیر رونے کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔

نیند میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے زور سے جھنجھوڑا ہو، میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، شبھ نواس مجھ پر جھکا ہوا تھا اس کے ہونٹ کمان کی طرح کھنچے ہوئے تھے اور اس کے سفید سفید دانت بڑے عجیب سے لگ رہے تھے، وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "دیوی میرا جاپ نشٹ ہونے والا ہے، مجھے انسانی دل چاہیے مجھے اپنا دل دے دو۔"

میں ڈر کر چیخنے ہی والی تھی کہ وہ بولا۔ "دیوی میری آنکھوں میں دیکھو۔"

میری نظریں بے ساختہ اس کی آنکھوں کی طرف اٹھ گئیں اور پھر جیسے میری آتما...... میرے شریر میں سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی، میں نے اپنی آنکھیں ہٹانا چاہیں...... لیکن باوجود کوشش کے ایسا نہ کر سکی، وہ مجھے اٹھا کر غسل خانے میں لے گیا، پھر اس نے مجھے فرش پر ڈال دیا اور گنڈاسا اٹھا کر میرے کندھے پر وار کیا۔ میرا پورا ہاتھ کٹ کر دور جا پڑا، پھر اس نے میرا ایک پیر کاٹ ڈالا اور اس کے بعد دل نکال کر چبانے لگا۔

مرتے سمے میری صرف ایک ہی اچھا تھی کہ میں اس پاپی سے کسی طرح اپنا اور ان نردوش بالکوں کا بدلہ لے سکوں جو اس سے تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ دیکھو! ماں جی! یہ وہی پھول ہیں جن کو اس مورکھ نے مسل کر رکھ دیا۔ اس نے مجھے اس غسل خانے میں دبایا تھا جہاں ان بالکوں کے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے، ایک دن میری ماتا جی میرے پاس آئیں اور رو رو کر کہنے لگیں۔

"اٹھ اوشا! یہاں کب تک پڑی رہے گی، اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا وہ پاپی بہت شکتی وان ہو گیا ہے، اس سے انتقام لینا تیرے بس کی بات نہیں، پرنتو اگر کوئی منش جاتی تیری سہایتا کرے تو شاید۔"

میں غضب ناک ہو کر اٹھ بیٹھی۔ "نہیں ماں تو فکر نہ کر، میں ایسا بدلہ لوں گی کہ دھرتی اور آکاش کانپ اٹھے گا، یا تو میں اسے نرکھ میں جھونک دوں گی یا میری آتما بھی بھسم ہو جائے گی۔" پھر میں اس پاپی کا انتظار کرتی رہی، مگر وہ ایسا چھپا کہ پھر کئی برس ورش میرے سامنے نہ آیا، جاتے جاتے کچھ لکیریں ایسی کھینچ گیا کہ میں باہر نہ نکل سکتی تھی۔

میں نے اپنی کتھا کئی منشوں کو سنائی لیکن اس کے نتیجے میں یہ مکان آسیب زدہ ہو کر رہ گیا۔ اب اس مکان میں کوئی نہ آتا کل اچانک ہی یہاں ایک مسلمان جوڑا آ کر رکا، میری کچھ آس بندھی، یہ نواب تھا جو اپنی پتنی کے ساتھ سیر کرنے اس شہر میں آیا تھا۔ اس کی پتنی بڑی سندر تھی، اسے دیکھ کر مجھے ترس سا آ گیا۔ کہیں میری کتھا سن کر یہ لوگ ڈر نہ جائیں، لیکن پھر انتقام کی آگ نے مجھے بے کل کر دیا تو میں مجبور ہو کر نواب کے سامنے آ گئی، نواب نے مجھے دیکھا اور بھیانک چیخ مار کر گر پڑا، اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ مجھ سے اس کی پتنی کا رونا نہیں دیکھا جاتا تھا، پھر لوگ اسے بھی لے گئے اور میں پھر مایوس ہو گئی۔"

میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ جنازہ نواب ہی کا تھا جسے خالہ نے رکوا کر اس کا منہ دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ اسی وقت اوشا نے ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ماں جی یہ ہے میرا سریندر......"

سریندر واقعی اوشا سے مشابہت رکھتا تھا۔ "میرا سریندر ہی اس مورکھ پاپی کا پہلا شکار تھا، ماں جی بھگوان کے لئے کچھ کرو۔"

میں ظلم و بربریت کی یہ انوکھی داستان سن کر تڑپ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اوشا میری اپنی بہن ہے، میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات ابھر رہے تھے، میری آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے، اچانک مجھے وہ خبریں یاد آئیں۔ "جن میں شہر سے بچوں کے اغوا ہو جانے کا ذکر تھا۔ تو کیا یہ کام اس موذی کا تھا کاش! وہ مجھے مل جائے، میں تو اس کی بوٹی بوٹی کروں۔"

خالہ جواب تک ہر بات خاموشی سے سنتی رہی تھیں بولیں۔

"فکر نہ کر! میری بچی! انشاء اللہ تجھے اور ان معصوم بچوں کو ضرور سکون مل جائے گا، کیا تجھے پتہ چلا کہ وہ موذی کہاں ہے؟"

اوشا بولی۔ "زیادہ تو پتہ نہیں، اتنا جانتی ہوں کہ وہ گنگا کے اس پار پوربی دیش میں۔" اور اس لمحے ہوا کا ایک زبردست جھونکا کمرے میں داخل ہوا، موم بتی بجھ گئی، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی دیو پیکر پرندہ پر پھڑپھڑاتا ہوا اوشا کی طرف جھپٹا ہو، اوشا اور بچوں کی چیخیں بلند ہوئیں اور معدوم پڑ گئیں اسی لمحے میں نے خالہ کے ہیولے کو پرندے کی طرف اچھلتے دیکھا، شاید انہوں نے اس پر حملہ بھی کیا ہو، کیونکہ ان کے اچھلتے ہی کمرے میں ایک اور بھیانک چیخ گونجی۔ "ظالم تیرا حشر......" اور پھر پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز تیزی کے ساتھ دور ہوتی چلی گئی، خالہ کریمن چلائیں۔

"اس سے پہلے کہ تو میرا لگایا ہوا زخم چاٹ چاٹ کر بھرے میں تیرا سرتن سے جدا کر دوں گی۔"

گو مجھے خالہ کریمن کے چہرے کے تاثرات تو نظر نہیں آرہے تھے مگر یہ آواز ان خالہ کی تو نہ تھی جو ایک بے ضرری عورت نظر آتی تھیں میں بھاڑ سا منہ پھاڑے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں گھور رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے، جب خالہ نے دوبارہ موم بتی جلائی تو میں نے دیکھا کہ جہاں اوشا اور بچے کھڑے تھے وہاں صرف راکھ اور اس کے قریب تازہ تازہ خون نظر آیا۔

خالہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ "یہ خون اسی موذی درندے کا ہے۔ اس نے اوشا اور بچوں کی روح کو ختم کر دیا ہے، خیر اس کا خاتمہ میرے ہاتھوں ہوگا۔"

مجھے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈر محسوس ہو رہا تھا، آنکھیں انگاروں کی دہکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لا کر گھر چھوڑ دیا۔ نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں اوشا کا چہرہ گھوم رہا تھا جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔ صبح جب میں سو کر اٹھا تو رات کے واقعات مجھے خواب کی مانند محسوس ہوئے۔ ناشتہ کر کے میں گھر سے نکلا اور کچھ سوچ کر رات والی گلی کی طرف چلا، وہاں پہنچا، اس مکان کے سامنے بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ معلوم یہ ہوا کہ رات کو لوگوں نے اس مکان سے بڑی بھیانک چیخوں کی آوازیں سنی تھیں۔ رات کو تو کسی نے یہاں آنے کی ہمت نہ کی۔ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یقیناً کوئی چور رات کو مکان میں داخل ہوا ہوا اور مکان کے بھوت نے اسے پکڑ لیا ہو۔ لیکن مکان کے اندر داخل ہونے پر کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔

دو ماہ بعد جب مالک مکان نے اس مکان کو گروایا اور غسل خانے کا فرش کھدوایا گیا تو نیچے سے کئی بچوں کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے اور ایک بڑا ڈھانچہ برآمد ہوا تھا۔

اس شام ہمارے ہاں والد صاحب کے ایک دوست عنایت اللہ صاحب قیام کی غرض سے آئے، دھان پان سے آدمی تھے لیکن بولتے تو ایسا لگتا جیسے لڑ رہے ہوں، وہ ہمارے شہر سے چالیس پینتالیس میل دور "سوئی" گاؤں میں رہتے تھے۔ پہلے تو وہ ہمارے شہر میں ہی رہتے تھے۔ مگر پتا نہیں کیوں چلے گئے تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے والد صاحب سے کہا۔

"بھائی! تمہیں معلوم ہے کہ جب میں پچھلے سال آیا تھا تو ایک فقیر کا ذکر تم سے کیا تھا۔ مگر اس وقت حالات کچھ اور تھے مگر اس سال کچھ عجیب عجیب واقعات رونما

ہو رہے ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے گاؤں پر جو مصیبتیں آئی ہیں وہ اسی مجاہد کے بچے کی وجہ سے آئی ہوئی ہیں۔ مگر میری بات کوئی نہیں مانتا۔“

چچا عنایت کی اتنی بات سے میں کچھ کھٹکا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”چچا میاں...... مجھے پوری بات سنایئے۔“ کیونکہ چچا عنایت کی باتوں سے میرا دھیان فوراً اوشا کی طرف مڑ گیا تھا۔ میرے شک کی دوسری وجہ یہ تھی کہ دریائے گنگا ہمارے شہر سے کوئی سو میل دور پر بہتا تھا اور چچا کا گاؤں گنگا کی طرف 15 میل پرے واقع تھا اور یہ وہی مقام تھا جس کا ذکر اوشا نے کیا تھا۔

چچا نے میرا کچھ اشتیاق دیکھ کر ایک لمبی سانس لی اور بولے۔ ”بیٹے قصہ دراصل یہ ہے کہ اب سے کوئی ڈیڑھ سال پیشتر ہمارے گاؤں سے دو فرلانگ دور ایک میدان سا تھا یہ کسی کی بھی ملکیت نہ تھا۔ کسی کاشتکار نے وہاں آٹھ گز لمبی قبر دیکھی، وہ چیختا ہوا بھاگا تھوڑی دیر میں ہمارے گاؤں والے قبر کے پاس جمع ہو گئے لیکن آس پاس کے کسی گاؤں میں آٹھ فٹ لمبا کوئی شخص نہیں رہتا تھا جس کی موت کے بعد اتنی لمبی قبر تیار کی جاتی اور تم تو جانتے ہی ہو کہ گاؤں والے کس قدر وہمی ہوتے ہیں۔ کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ قبر کو کھود کر دیکھتا۔

تھوڑے دن تو یہ قبر موضوع بحث بنی رہی۔ پھر لوگوں نے توجہ دینی چھوڑ دی۔ چھ ماہ بعد اچانک ہی وہاں ایک خوف ناک سی شکل کا لمبا تڑنگا آدمی آدھمکا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر قبر کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ اب قبر کے چاروں طرف کچی دیوار کا احاطہ بن گیا۔ اور اس میں سبزہ لہلہانے لگا۔ گاؤں کے منچلے نوجوانوں نے اسے کھانے پینے کا ایک ڈھونگ سمجھ کر قبر کو مسمار کرنے کا ایک منصوبہ بھی بنایا۔ لیکن مجاور چوبیس گھنٹے قبر کی نگرانی کرتا تھا اس لئے انہیں موقع ہی نہ ملا، ہوتے ہوتے یہ خبر دور دور تک پھیل گئی اور توہم پرست لوگ چادریں چڑھانے اور منتیں ماننے کے لئے آنے لگے اور یہ حیرت انگیز بات تھی کہ وہ جس کے لئے جو کہہ دیتا وہ واقعی پورا ہو جاتا۔ کئی بے اولاد لوگوں کے ہاں بچے ہوئے۔ مگر ان بچوں کو دیکھ کر عبرت ہوتی تھی، کسی کا ہاتھ غائب، کسی کی ٹانگ گھٹنے تک کٹی ہوئی، آنکھیں پتھرائی ہوئی۔“

”ہو نہ ہو یہ درندہ وہی شبھ نواس ہے۔“ میں نے سوچا۔ چچا میرے خیالات سے بے خبر کہے جا رہے تھے۔

”ایک سال تک تو خیر معاملہ ٹھیک رہا۔ لیکن پھر گاؤں سے چھوٹے چھوٹے بچے غائب ہونا شروع ہو گئے۔ گاؤں والے روتے پیٹتے مجاور کے پاس گئے۔ اس نے انہیں تسلی دے کر واپس کر دیا۔ تیسرے روز تمام گزشتہ بچے ایک ایک کر کے واپس آ گئے مگر اس حالت میں کہ جیسے چلتی پھرتی لاشیں ہوں، کفن کی طرح سفید۔ اب نہ کچھ کھاتے پیتے تھے نہ کھیل کود میں حصہ لیتے تھے۔ اگر ان سے بات کی جائے تو بمشکل تمام ایک جملے میں جواب دیتے۔ آواز ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے گہرے کنوئیں میں سے بول رہے ہوں۔ گاؤں کے کچھ لوگ تو اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ گھر چھوڑ کر دوسرے گاؤں چلے گئے۔

کچھ لوگ تو مجاور کے حامی تھے اور کچھ تمام واقعات کا ذمہ دار مجاور ہی کو سمجھتے تھے۔“ چچا کی باتوں سے مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ شبھ نواس ہی ہے۔ لیکن اتنی دور ہو کر اسے یہ علم کیسے ہو گیا کہ اوشا نے ہمیں ساری باتیں بتا دی ہیں۔ ہاں وہ تو پراسرار قوتوں کا مالک ہے۔ ایسے لوگ تو ہر ناممکن کام کو ممکن بنا سکتے ہیں۔“ اب مجھے فوراً خالہ کریمن کو یہ سب باتیں بتا دینی چاہئیں۔ کیونکہ شبھ نواس کا زندہ رہنا بہت خطرناک ہے۔“ یہ سوچ کر میں تقریباً بھاگتا ہوا خالہ کریمن کی تلاش میں نکلا...... خالہ قبرستان کی نیم تاریک کوٹھری میں بیٹھی کچھ پڑھنے میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔

”تو گھر جا کر آرام کر...... کل جمعرات ہے...... کل فیصلہ ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر خالہ...... میں تو آپ کو یہ بتانے......“

وہ بات کاٹ کر بولیں۔ ”ہاں ہاں تو جا! مجھے یہ سب معلوم ہے۔ کل تو تو میرے ساتھ ہی ہوگا۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔ ورنہ میں تجھے معاف

نہ کروں گی۔" میں خاموشی سے واپس آ گیا۔

اگلے دن مجھ سے وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا.....

خدا خدا کرکے رات ہوئی نو بجے کے قریب مجھے باہر کسی نے آواز دی۔ میں لپک کر باہر گیا۔ مجھے تو دور دور تک کوئی نظر نہ آیا میں اسے وہم سمجھ کر پلٹنے ہی والا تھا کہ خالہ کریمن کی آواز آئی۔ "ارشاد بیٹے! تو قبرستان میں آ جا..... میں انتظار کر رہی ہوں۔" یہ آواز کہاں سے آ رہی تھی خالہ کریمن تو یہاں تھیں ہی نہیں..... مگر ہاں! خالہ کریمن بھی تو پراسرار قوتوں کی مالک ہیں..... اگر ان کی آواز قبرستان سے یہاں تک آ گئی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

جب میں قبرستان پہنچا تو خالہ میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے فوراً میرا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف روانہ ہو گئیں۔

چاندنی رات ہونے کی وجہ سے چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی ہم کھیت، میدان، جنگل تیزی سے عبور کرتے جا رہے تھے بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں ایک جگہ ہی کھڑا قدم اٹھا رہا ہوں اور زمین تیزی کے ساتھ ہمارے نیچے سے پھسل رہی ہے، ہمیں چلتے ہوئے ابھی پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ہمارے راستے میں ایک بہت بڑا دریا حائل ہو گیا یہ گنگا تھا ہندوؤں کا متبرک دریا، اس کا مطلب ہے کہ میرے اندازے ٹھیک ہی ہیں۔ میں نے سوچا کہ کیا واقعی ہم چچا عنایت کے گاؤں کی طرف جا رہے ہیں، میں نے اپنے اطمینان کے لئے خالہ سے پوچھا۔

"خالہ کیا ہم سوا س گاؤں جا رہے ہیں؟ اور یہ دریا گنگا ہے نا؟"

انہوں نے کڑی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"کیا میں تجھے واپس بھیج دوں۔ یہ گنگا ہے بس اب خاموش رہنا۔" اور میں یکدم خاموش ہو گیا۔ جبکہ میں یہ سوال بھی کرنے والا تھا کہ گنگا کو کس طرح پار کریں گے۔ کیونکہ یہاں تو کوئی کشتی یا پل بھی نظر نہیں آ رہا اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

خالہ نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور پانی کی سطح پر آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئیں، میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے پانی کو گھور رہا تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم پانی پر نہیں زمین پر چل رہے ہیں اور ہم پلک جھپکتے ہی دوسرے کنارے پر کھڑے تھے۔ ہم نے یہ تمام سفر تقریباً دس منٹ میں طے کر لیا ہوگا کچھ دور ہم اور چلتے ہوں گے کہ ہمیں کسی آبادی کے کچے پکے مکان صاف نظر آنے لگے اور ہمارے دائیں طرف ہٹ کر ایک چھوٹی سی کچی دیوار کا احاطہ نظر آیا۔

خالہ اسی احاطے کے اندر مٹی کے ملبے کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ جس کے ساتھ ہی گھاس پھونس کی جھونپڑی بنی ہوئی تھی، بالکل وہی مقام تھا جیسا کہ چچا عنایت نے بتایا تھا۔ ہم خاموشی سے اس جھونپڑی کی پچھلی طرف جا کھڑے ہوئے اور اندر جھانکا۔

دیئے کی زرد زرد کمزور سی روشنی نے جھونپڑی کے ماحول کو پراسرار بنا رکھا تھا، ایک طرف کونے میں ایک لمبا تڑنگا خونخوار شکل کا انسان نما دیو جس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ تھیں بیٹھا ہوا اپنی زبان سے کسی درندے کی طرح اپنی ٹانگ پر لگے ہوئے زخم کو چاٹ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اس کی پنڈلی پر بڑے اطمینان سے چاقو سے لمبا زخم ڈالا ہو لیکن جب بھی وہ اپنی زبان زخم پر لگاتا تو اسی لمحے اس کا بدن کانپ کر رہ جاتا اور پھر وہ آپ ہی آپ غرایا۔ "بڑھیا تو نے جو زخم مجھے لگایا ہے اس کے بدلے میں تمام دنیا کو لاشوں میں تبدیل کر دوں گا..... بابا....." اس کا بھیانک قہقہہ خاموش فضا کو لرزاتا چلا گیا۔

"لاشیں میری تابع اور فرمانبردار لاشیں اوہ..... ہو ہو۔" میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں.....

"تو کیا..... یہ ہی اوشا کا بدکردار شوہر ہے! کیا یہی وہ موذی درندہ ہے۔ جس نے نہ معلوم کتنی بے گناہ اور معصوم زندگیوں کو اپنی بری خواہشوں کی بھینٹ چڑھایا۔" اور اچانک خالہ نے میرا ہاتھ دبا دیا جس کا مطلب میں سمجھا کہ وہ اثبات میں جواب دے رہی ہیں، اچانک اس دیو نما انسان نے منہ اٹھا کر کتے کی طرح فضا کو سونگھا اور چوکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"دشمن" اس کے منہ سے نکلا اور جلدی سے لنگڑاتا ہوا جھونپڑی سے باہر آ گیا اس کے باہر نکلنے سے پہلے ہی خالہ نے کچھ پڑھ کر اپنے اور میرے اوپر پھونک دیا۔ شبھ نو اس کچھ دیر کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا...... لیکن خدا جانے اسے ہم نظر کیوں نہ آ رہے تھے جب کہ کئی مرتبہ اس نے ہماری طرف بھی دیکھا تھا! پھر وہ اپنے آپ سے بولا۔ "کمال ہے، کیا میرا علم مجھے دھوکا بھی دے سکتا ہے،...... میں معمولی خطروں سے نہیں ڈرتا۔"

پھر اس نے طویل انگڑائی لی۔ "اوہ مجھے پیاس لگی ہے خون تازہ اور صاف خون...... دل...... جوان دل...... آ رہا ہوں میرے بچو...... تمہیں ہمیشہ کی زندگی دینے۔" وہ اپنی لمبی زبان ہونٹوں پر پھیرتا ہوا دو قدم آگے بڑھا اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح گردش دی جیسے وہ فضا میں اڑنا چاہتا ہوں...... اور...... میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ فضا میں بلند ہوتا چلا گیا مگر اب وہ ایک بہت بڑے بد ہیبت شکل کے پرندے میں تبدیل ہو چکا تھا، جس کے پر تو چمگادڑ سے ملتے جلتے تھے اور شکل میں نے نگر مچھ سے مشابہ محسوس کی تھی اس کا رخ دریا کی طرف تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شاید آج پھر کسی بدنصیب ماں کی گود خالی ہونے والی تھی۔ میں نے اضطراری حالت میں خالہ کو دیکھا جواب تک خاموش تھیں۔ انہوں نے میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیا اور مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

چند ہی لمحوں بعد ہمیں چاروں طرف سے ہلکی ہلکی آہٹوں کا احساس ہوا۔ خالہ نے اور میں نے ادھر دیکھا اور میں چونک پڑا، احاطے کی کچی دیوار سے ایک سر نمودار ہوا جو آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا جا رہا تھا اور اب وہاں مکمل ایک آدمی کھڑا تھا، اس نے اپنے ایک ہاتھ میں پھاوڑا اور دوسرے ہاتھ میں شاید کلہاڑی لے رکھی تھی۔ میں نے گھوم کر دوسری طرف دیکھا وہاں بھی ایک آدمی کھڑا نظر آیا پھر تو چہار طرف سے چار آدمی اندر آ گئے اور چوکنے انداز میں جھونپڑی کی طرف بڑھے اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ جھونپڑی خالی ہے تو جلدی سے قبر پر چڑھ دوڑے۔ انہوں نے جیسے ہی قبر کو کھودنے کے لئے پھاوڑے چلائے اسی لمحے ان چاروں آدمیوں کی بھیانک چیخیں فضا میں گونج کر رہ گئیں اور پھر تو جس کا منہ جدھر کو ہوا بھاگ کھڑا ہوا، وہ بھاگتے جاتے اور چلاتے جاتے تھے میں خود ان کی چیخیں سن کر اپنی جگہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

قبر سے تازہ تازہ خون چشمے کی طرح ابل رہا تھا، ان لوگوں کے بھاگتے ہی خالہ کریمن میرے ہاتھ کو دباتی ہوئی قبر پر جا پڑیں اور ان لوگوں کے پھاوڑے سے قبر کو ادھیڑ ڈالا۔ جوں جوں وہ قبر کو کھودتی جاتیں خون بے اندازہ نکلتا جاتا کہ اچانک میں خوف سے کانپ کر رہ گیا۔

خون کے بند ہوتے ہی انسانی ہڈیوں کا ایک پنجر قبر سے نکلتا نظر آیا اس نے نکلتے ہی خالہ کی طرف اپنے بازو پھیلائے اس سے پہلے کہ وہ خالہ کو دبوچے خالہ اچھل کر ایک طرف ہو گئیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس پنجر کے ہاتھ لمبے ہونے شروع ہو گئے جو خالہ کی طرف سرعت سے بڑھ رہے تھے خالہ بھی نہ معلوم کیا بڑبڑا رہی تھیں کہ اچانک ڈھانچے میں آگ لگ گئی۔ آگ کے لگتے ہی دریا کی طرف سے فضا میں ایک زبردست خوفناک دھاڑ سنائی دی اور پھر آگ کا ایک گولا سا آسمان کی وسعتوں سے تیزی کے ساتھ نیچے کی طرف آتا نظر آیا اور پلک جھپکتے ہی وہ ہمارے سروں پر تھا اور یہ تو وہی پرندہ تھا یا شاید شبھ نو اس، اس نے دو چکر فضا...... میں لگائے اور بجلی کی سی تیزی سے خالہ پر حملہ آور ہوا، اس کے منہ سے بڑی خوفناک آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

میں نے ایک بار پھر خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ کیونکہ اس بدہیبت پرندے کے حملہ کرنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ خالہ کو ایک ہی حملہ میں پیس کر رکھ دے گا۔ لیکن دھپ کی آواز نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا، مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے کوئی گوشت پوست کی بھاری چیز زمین پر گری ہو۔ خالہ کریمن نے بڑے اطمینان سے اس پرندے کو گھور رہی تھیں جو اب زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا، خدا جانے میری آنکھیں بند ہونے پر خالہ نے اس کا وحشیانہ وار کس طرح روکا ہوگا۔

ڈھانچہ قریب قریب جل کر راکھ ہو چکا تھا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے پرندے کی جگہ شبھ نواس آنکھیں پھاڑے اپنا سر جھٹک رہا تھا اور اسی لمحے شبھ نواس اس کا بھیانک قہقہہ گونجا۔ "ہاہا...... ہوہوہو...... بڑھیا تو سمجھتی ہے کہ اس ڈھانچے کو جلا کر تو نے مجھ پر قابو پالیا ہے۔ مگر ابھی تو نے میری طاقت کا اندازہ نہیں لیا ہے ایک بار تو میں نے تجھے معاف کر دیا تھا ورنہ ارادہ بھی تھا کہ اوشا سے پہلے تجھے ٹھکانے لگا دوں۔ مگر آج تجھے تیری موت میرے پاس لے آئی ہے، میں چاہوں تو تجھے ابھی بھسم کر کے رکھ دوں۔ خیر اسی میں ہے کہ میرے کام میں دخل نہ دے ورنہ تیرا وجود پانی کی طرح بہہ جائے گا۔"

خالہ نے کڑک کر کہا۔ "او ناہنجار مجھے کیا دھمکیاں دے رہا ہے ابھی تو نے میرا لگایا ہوا زخم بھی نہیں بھر سکا، کیا یہی تیری طاقت ہے، آج تیرا انجام بھیانک ہوگا، موذی تو نے جس قدر ظلم کیئے اس کے بدلے میں تجھے سسک سسک کر مارنا چاہتی ہوں۔" خالہ کی کڑک دار آواز ایک لمحے کے لئے تو شبھ نواس کو بھی لرزا دیا اور اچانک شبھ نواس کچھ بے تاب سا نظر آنے لگا۔

"اوہ مجھے پیاس لگی ہے، خون تازہ اور صاف خون...... دل...... جوان ہوتا ہوا دل!" اس نے گاؤں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پھر غصے سے بھرے لہجے میں بولا۔

"او بڑھیا! پہلے تو میں اپنی پیاس بجھا نہ سکا تھا بلکہ سوچا تھا کہ اس گاؤں سے اب اپنی خوراک حاصل نہ کروں گا۔ مگر اب اسی گاؤں کو میں جہنم بنا کر رکھ دوں گا تجھ سے ہو سکے تو روک لے۔"

اور اسی لمحے وہ فضا میں تحلیل ہو گیا اور میں بھی ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے باہر نکل آیا کیونکہ خالہ بھی مجھے دور دور تک نظر نہ آئیں۔ میں حیران و پریشان چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے گاؤں کی طرف دوڑ لگا دی، میں نے ابھی تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ ٹھٹک کر رہ گیا، گاؤں کی طرف سے پھر ایک خوف ناک درد میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تھی، مارے خوف کے میں کانپنے لگا تھا، اب تک جو دہشت ناک حالات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے شاید خالہ کی وجہ سے خوف محسوس نہ ہوا مگر اب اپنے آپ کو تنہا محسوس کر کے مجھ پر خوف نے غلبہ پانا شروع کر دیا تھا، میں سوچ ہی رہا تھا کہ گاؤں کی طرف بڑھوں یا......

اچانک گاؤں کی طرف سے ایک سیاہ سا چوپایہ میری طرف آتا دکھائی دیا اور پھر اس چوپائے کی شکل واضح ہوتی چلی گئی۔ اوہ خدایا وہ تو سیاہ بالوں والا ریچھ تھا جو غراتا ہوا میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا اور اسی وقت ایک اور زبردست دہاڑ نے میرے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے تھے، میں بھاگنا چاہتا تھا مگر میرے پیر من من بھر کے ہو کر رہ گئے تھے، میں بجائے بھاگنے کے اس کوشش میں زمین پر گر گیا، میرا سر زمین پر لگا۔ جس سے مجھے زبردست جھٹکا لگا اور جیسے مجھے ہوش آ گیا ہو۔

میں تیزی سے اٹھا اور بجلی کی طرح مخالف سمت میں دوڑ لگا دی، دوڑتے دوڑتے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور وہیں رک کر کھڑا رہ گیا وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔

اف خدا میں کس چکر میں پھنس کر رہ گیا، میں بے بسی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، خالہ ابھی تک نظر نہ آئی تھیں، خدا جانے ان کے ساتھ کیا بیتی اور پھر میں خوف سے چلا پڑا۔ "خالہ، تم کہاں ہو؟" اور اسی لمحے خالہ کریم میرے پاس کھڑی تھیں، ان کے ہاتھ میں تقریباً کوئی تین فٹ لمبا سانپ لٹک رہا تھا جس کا پھن انہوں نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا پھر وہ غراتی ہوئی بولیں۔

"کیوں شبھ نواس تو اپنے ناپاک علم کے ذریعے یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں کسی سے بھی شکست نہیں کھا سکتا، تجھے اتنا گھمنڈ ہو گیا تھا کہ اس سے بھی ٹکر لے سکے جس کی لاٹھی بے آواز ہے۔" اور یہ کہ انہوں نے اس کا پھن جسم سے الگ کر کے زمین پر پھینک دیا سانپ کا جسم کچھ دیر تڑپا اور ساکت ہو گیا۔

میں ایک بار پھر چونک اٹھا اب سانپ کی جگہ شبھ نواس کی بغیر گردن کی لاش زمین پر پڑی ہوئی تھی اور گردن کچھ فاصلے پر پڑی تھی، اس کی آنکھیں خوف

ناک حد تک پھٹ گئی تھیں اور زبان دانتوں کے درمیان آدھی لٹک رہی تھی۔

اچانک میرے تصور میں ایک بار پھر نواب کی لاش گھوم گئی، جس کے جنازے کو سرباز ار خالہ نے رکوا کر دیکھا تھا، وہی کیفیت شبھو ناس کی تھی۔ خالہ نے گھور کر اس کی لاش کو دیکھا اور نفرت سے تھوک اس پر دیا۔

"دشا تیرا اور معصوم جانوں کا انتقام لے لیا گیا کیوں بھڑیئے میں نہ کہتی تھی کہ تیرا انجام بھیانک ہوگا۔"

اور اسی لمحے گاؤں کی طرف سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔ میں نے حیرت سے گاؤں کی طرف دیکھا، خالہ نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑا اور بولیں۔

"چل دیکھ لیا اس مردود کا انجام۔"

"مگر خالہ یہ لاش؟"

خالہ میری بات کاٹتے ہوئے بولیں۔ "ہمیں کیا، یہاں کتے کافی بھوکے ہیں۔" اور مجھے اس خیال سے ہی جھرجھری سی آگئی۔

"مگر خالہ خدا کے واسطے اتنا تو بتادو کہ اب گاؤں پر کیا افتادہ آپڑی جو اس وقت رونا دھونا شروع ہوگیا ہے۔"

وہ چلتے چلتے بولیں، یہ آوازیں ان گھروں سے آرہی تھیں، جن کے لال ہمیشہ کے لئے ان کی نظروں میں ختم ہوگئے حالانکہ وہ تو چلتی پھرتی لاشیں تھیں جن کو اس موذی نے زبردستی اپنے ناپاک ارادوں کی خاطر چلنے پر مجبور کررکھا تھا ان کی تڑپتی ہوئی روحیں اس کے مرتے ہی آزاد ہوگئیں۔"

اور پھر ہم اسی راستے سے گھر واپس آگئے خالہ مجھے مکان تک چھوڑ کر اور میرا وعدہ یاد دلا کر چلی گئیں۔

لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا، والدہ تو ابھی عشاء کی نماز ہی ادا کررہی تھیں، انہوں نے سلام پھیر کر مجھے حیران کھڑے پایا۔

وہ بولیں۔ "خیر تو ہے تو اس طرح کیوں کھڑا ہے۔"

میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں اماں آپ ابھی تک نماز پڑھ رہی ہیں۔"

"کیوں؟" وہ چونک کر بولیں۔ "تیرا دماغ تو ٹھیک ہے نا! ارے ابھی تو گیا تھا اور تیرے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی میں نماز پڑھنے کھڑی ہوئی ہوں۔ ابھی تو تیرے ابا بھی نماز پڑھ کر نہیں لوٹے۔"

اور میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گیا۔

کمال ہے واہ میرے مولا تیرے اسرار تو ہی جانے اتنی دور کا سفر اور پھر کتنی دیر اس موذی سے نمٹنے میں لگی، مگر یہاں وہی وقت وہی سب کچھ....." اس حادثے نے میری زندگی کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ میں جتنا غور کرتا میرا دل کانپ کانپ کر رہ جاتا اور پھر ایک دم میرے قدم خود بخود مسجد کی طرف اٹھ گئے۔

آج خالہ کو فوت ہوئے دو سال کا عرصہ بیت گیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، مرنے سے دو دن پہلے وہ میرے پاس آئیں اور بولیں۔ "بیٹا ہمارا بلاوا آگیا ہے، ہم تو چلے مالک حقیقی کے پاس، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور خبردار اگر کوئی علم حاصل کرنا۔ تو شبھو ناس نہ بن جانا بلکہ اللہ کے حضور جھکے رہنا۔ کیونکہ عاجزی اس کو پسند ہے۔"

اور پھر انہوں نے مجھے دو ایک وظیفے ایسے بتائے جو اچانک مصیبت میں کام دے سکیں، میں دو سال تک خاموش رہا اور اب اس لئے قلم کو حرکت دے رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی خود غرض انسان اس کہانی سے سبق حاصل کرے ورنہ اللہ کی لاٹھی اسے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کردے گی جس کے اختیار میں تمام کائنات ہے۔

ہمالیہ کے دامن میں واقع ریاست ارجن پور کی راج بھومی کے قرب وجوار میں پہاڑ کی ترائی کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے ناگری قبیلے کے لوگ ایک زبردست جشن منا رہے تھے پورے ستر سال بعد دیوتا نے ان کی سن لی تھی اور ان کے دامن خوشیوں اور مسرتوں سے بھر گئے تھے ناگری قبیلے کے تمام افراد خوشی سے ناچ رہے تھے اور اپنی تمام رنجشیں اور دشمنیاں بھلا کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔

ناگری قبیلے کے لوگ ناگ دیوتا کے پجاری تھے

اور شہر شہر قریہ قریہ طرح طرح کے سانپوں کی پٹاریاں اٹھائے گھومتے تھے، زہریلے سے زہریلا سانپ بھی ان کی پٹاری میں بند ہونے کے بعد ان کا اس طرح فرماں بردار ہوجاتا تھا گویا وہ کوئی زہریلی چیز نہیں بلکہ ایک بے ضرر کیڑا ہے ان کی گزر اوقات کا ذریعہ یہ سانپ ہی تھے جو بین کی آواز سنتے ہی پٹاری سے ایک زبردست پھنکار کے ساتھ اپنا سر اٹھا کر جھومنے لگتے تھے ناگری قبیلے کے سپیرے اپنے فن میں بڑے ماہر تھے اور پہاڑ کے دامن سے ایسے ایسے سانپ پکڑتے تھے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا کر رہ جاتی تھیں۔

ان کے رسم ورواج بھی بڑے عجیب وغریب تھے اور وہ اپنی قدیم رسومات اور روایات پر بڑی سختی سے کاربند تھے۔ قبیلے کے لوگ اکثر مہذب دنیا میں گھوم پھر کر اپنا کاروبار کرتے تھے لیکن اس تہذیب سے متاثر ہرگز نہ ہوتے تھے وہ اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر جس وقت اپنے قبیلے میں واپس لوٹتے تو ترقی یافتہ اور مہذب دنیا کو بھول کر اپنے قدیم رسم ورواج میں مگن ہوجاتے۔ وہ قبیلے کی اس مٹھی بھر آبادی کو ہی اپنی دنیا سمجھتے تھے اور اس میں رہ کر ہی اپنی تمام حسرتیں پوری کرنا چاہتے تھے۔

ناگری قبیلے کے قدیم رسم ورواج کے مطابق اگر ناگ دیوتا ان پر مہربان ہوں تو ان کی تمام تکلیفیں خود بخود ختم ہوجاتی ہیں خوبصورت اور زہریلے سے زہریلے سانپ اپنے آپ ان کی پٹاری میں بند ہوجاتے ہیں جن سے وہ بستیوں سے خوب پیسہ کماتے ہیں لیکن اگر دیوتا خفا ہوجائیں تو پورے قبیلے میں قحط پڑ جاتا ہے اور طرح طرح کی بیماریاں انہیں گھیر لیتی ہیں اور ناگ دیوتا کو خوش کرنے کے لئے جہاں اور بہت سے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں، وہیں ایک دیوداسی کا پیش کیا جانا سب سے ضروری ہوتا لیکن ناگ دیوتا کی دیوداسی کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوسکتی اس کے لئے بڑی ہی کڑی شرطیں تھیں، ناگ دیوتا صرف اس لڑکی کو اپنی داسی قبول کرتے ہیں جو پھاگن کے مہینے کی پورن ماشی کی رات کو پیدا ہوئی، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پورن ماشی کی اس رات میں پیدا ہونے والی لڑکی دنیا کی حسین ترین لڑکی ہوتی تھی۔

ستر سال گزرے اس قبیلے میں پھاگن کی پورن ماشی کی رات کو قبیلے کے ایک سپیرے کے گھر ایک بچی پیدا ہوئی تھی تو پورا قبیلہ خوشی سے دیوانہ ہوگیا تھا دیوتا ان پر مہربان ہوگئے تھے اور دھن دولت کی ان پر گویا بارش ہونے لگی تھی، اٹھارہ سال تک اس لڑکی کو انتہائی نازونعم سے پرورش کیا گیا اور اسے ناگ رقص کا ماہر بنادیا گیا، جس رات اسے اٹھارہ سال پورے ہوئے، وہ رات بھی پھاگن کی پورن ماشی کی رات تھی اور اسی رات اسے ناگ دیوتا کے حضور دیوداسی بنا کر پیش کردیا گیا۔ ایک بہت بڑا جشن منایا گیا اور دیوداسی نے ناگ دیوترا کے سامنے ناگ رقص پیش کیا اور دیوتا نے اسے اپنے چرنوں میں قبول کرلیا لیکن پھر پورے ستر سال تک اس قبیلے میں کوئی دیوداسی پیدا نہ ہوئی وہ ناگ دیوتا کے سامنے اپنا ماتھا رگڑتے رہے لیکن دیوتا ان پر مہربان نہ ہوا، ستر سال کا وہ عرصہ پورے قبیلے پر بے حد کٹھن گزرا اور آخر ان کی بنتی دیوتا نے سن لی اور پھاگن کی اس رات جب چاند مکمل گولائی کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا، متوا کے جھونپڑے سے ایک نوزائیدہ بچی کی چیخ بلند ہوئی اور پھر پورا قبیلہ خوشی سے چیخ اٹھا۔

”دیوداسی آگئی دیوداسی آگئی۔“ اور وہ رات متوا کے ننھے سے جھونپڑے میں دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹ لائی سردار نے اسے سینے سے لگالیا اور قبیلے کے تمام مرد وعورتیں اور بچے دیوداسی کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب ہوگئے سردار نے جب بچی کو دیکھا تو وہ پکار اٹھا۔

”وہی ہے بالکل وہی ہے۔“ پھر اس نے قبیلے کے لوگوں کو اپنے قریب بلا کر کہا۔ ”غور سے دیکھو اس کی آنکھیں ناگ دیوتا کی آنکھیں ہیں، اس کی پیشانی پورن ماشی کے چاند کی طرح چمک رہی ہے اس کے ہونٹ انگاروں کی طرح دہک رہے ہیں یہی دیوداسی ہے۔“

پورے اٹھارہ سال تک دیوداسی کی اس طرح پرورش کی گئی گویا وہ لڑکی کوئی آبگینہ ہے جو ذرا سی ٹھیس

لگنے سے ٹوٹ جائے گا قبیلے کی نوجوان لڑکیاں اسے رشک کی نظروں سے دیکھتی تھیں کاش یہ اعزاز انہیں مل سکتا لیکن کسی لڑکی میں یہ جرأت نہ تھی کہ اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے قبیلے کے کسی نوجوان میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ دیوداسی کے جسم پر بھرپور نظر ڈالے وہ ان لوگوں کے درمیان دیوی سمان تھی ناگ دیوتا کا اس پر سایہ تھا وہ زہریلے سے زہریلے سانپ کو ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے گلے میں لٹکا لیتی لیکن سانپ کی حیثیت ایک معمولی رسی سے زیادہ نہ تھی۔

اور آج پھاگن کی پورن ماشی کی وہ رات تھی جب دیوداسی پورے اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی قبیلے میں ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا گیا نوجوان لڑکیوں نے مل کر رقص شروع کیا اور چاروں طرف ہزاروں چراغ جل اٹھے دیوداسی کو پوری طرح آراستہ کیا گیا خوشبودار ابٹن سے اس کے سارے جسم کو صاف کیا گیا رنگ رنگ کے منکوں کے ہار اس کے گلے میں پہنائے گئے سیاہ رنگ کے بالوں کے جوڑے میں چنبیلی کی کنواری کلیوں کا جوڑا سجایا گیا آنکھوں میں گجرے کے سیاہ ڈورے کھینچے گئے جنہوں نے اس کی خوبصورت اور کنول سی آنکھوں کو ایک تیز دھار خنجر سے مشابہ بنا دیا اس کے جسم پر گہرے رنگ کی پتلی سی دھوتی اس طرح لپیٹی گئی کہ اس کی سڈول رانیں بالکل ننگی تھیں اور سینے کا آدھا حصہ عریاں تھا گیروے رنگ کے اس پتلے سے مختصر لباس نے اس کے جوبن کو اور بھی ابھار دیا تھا اور اس کے جسم کا انگ انگ کپڑے کی آخری تہہ کو چیر کر باہر چھلک جانا چاہتا تھا۔

قبیلے کے لوگ تمام تیاریوں کے بعد ایک جلوس کی صورت میں دیوتا کے استھان کی طرف روانہ ہوئے دو لمبے بانسوں پر ایک گنبد نما بہت بڑی پٹاری ٹکی تھی اس پٹاری کو پھولوں کے گجروں اور منکوں کی مالاؤں سے خوب سنوارا گیا تھا پٹاری کو ایک ڈولی کی صورت میں لوگوں نے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا قبیلے کی لڑکیاں رقص کرتی ہوئی پٹاری کی ڈولی کے آگے آگے چل رہی تھیں مرد اور بچے سب پیچھے پیچھے تھے وہ بھی خوشی سے اچھل کود رہے تھے مرد و عورتوں کے ہاتھوں میں روشن مشعلیں تھیں جن سے پورا راستہ روشنی سے منور ہو رہا تھا ان سب کے لبوں پر خوشیوں کے ایسے گیت تھے جن سے اردگرد کا سارا ماحول جھوم رہا تھا۔

پورے ستر سال بعد انہیں اپنے دیوتا کے لئے دیوداسی ملی تھی ناگ دیوتا کا استھان بستی سے تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک اونچی پہاڑی پر واقع تھا ایک پگڈنڈی پہاڑی کے گرد سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی اوپر چڑھتی تھی جو سیدھی استھان کے دروازے تک پہنچتی تھی باہر سے ایک نظر دیکھنے سے یہ قطعی پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ بلند و بالا پہاڑی اپنے دل میں کسی دیوتا کا استھان چھپائے ہوئے ہے لیکن پگڈنڈی پر چلتے رہنے سے انسان ایسی جگہ پہنچ جاتا تھا جہاں اسے قدرت کا ایک ایسا کرشمہ نظر آتا تھا جس پر فرط حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں پتھروں نے ایک دوسرے سے سر جوڑ کر ایک ایسے خوب صورت مندر کی تشکیل کر دی تھی جو انسانی ہاتھ صدیوں میں بھی نہیں پا سکتے تھے۔

مندر کا قدرتی طرز تعمیر اتنا شاندار اور انوکھا تھا کہ دیکھ کر انسان کا ذہن چکرا جاتا تھا، سنگ مرمر سے بنے ہوئے صدر دروازے کے اندر ایک وسیع و عریض ہال تھا اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ہال کمرے کے اوپر ایک سربفلک پہاڑ انتہائی غرور و تمکنت سے اپنا سر اٹھائے کھڑا ہے۔ قبیلے کے لوگ قدم قدم چلتے ناچتے گاتے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر رواں تھے وہ اردگرد کے ماحول کو روشن کرتے جب مندر کے صدر دروازے پر پہنچے تو مندر کا دروازہ باہیں پھیلائے اپنی دیوداسی کا منتظر تھا۔

دروازے پر سب لوگ یکدم خاموش ہو گئے اور احترام سے سر جھکا لئے، اس سے پہلے قبیلے کا سردار جو کہ مذہبی رسوم بھی خود ہی ادا کیا کرتا تھا داخل ہوا اس کے بعد پٹاری کی ڈولی اٹھانے والے لوگ اپنے کندھوں پر پٹاری اٹھائے اندر داخل ہوئے اور ان کے پیچھے قبیلے کے سب لوگ بھی قطار در قطار اندر داخل ہو گئے، دیوتا کا استھان مشعلوں کی روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔

اس وسیع و عریض ہال کمرے کے مشرقی دیوار کے

عین وسط میں ناگ دیوتا کا پتھر کا بت اپنی پوری شان کے ساتھ پھن پھیلائے کھڑا تھا، دیوتا کے بت کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے دو چراغ روشن ہوں، قبیلے کے مرد عورتیں اور بچے چاروں طرف ایک نیم دائرے کی شکل میں کھڑے ہوگئے۔

پٹاری مندر کے ہال کمرے کے عین وسط میں رکھ دی گئی اب ہال میں مکمل خاموشی تھی اسی مہیب خاموشی کو توڑتی ہوئی اچانک بیس پچیس بینوں کی آواز گونج اٹھی بیس پچیس ماہر فن سپیرے ایک ہی سرے اپنی اپنی بین پر ایک دل کش دھن بجا رہے تھے۔ سب بینوں کی آواز ہم آہنگ ہوکر ہال کی فضاؤں میں گونجنے لگی، تو پورے ماحول پر ایک سحر سا طاری ہوگیا پھر یکدم پٹاری کا ڈھکنا اٹھا اور اس کے اندر سے اپنے سر پر دونوں ہاتھوں سے ایک پھن کی شکل بنائے دیوداسی کا چہرہ ابھرا پٹاری کا ڈھکنا ایک طرف جا پڑا اور دیوداسی بین کی لہروں پر ایک ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی پٹاری کے اندر کھڑی ہونے لگی، دیوداسی کے کھڑے ہوتے ہی بینیں تیز ہوگئیں اور دیوداسی کا جسم بل کھا کھا کر جھومنے لگا۔

اچانک گھونگھروؤں کا ایک چھناکا ہوا اور دیوداسی پٹاری سے باہر آ کر دیوتا کے سامنے رقص کرنے لگی۔

بینوں کی آواز اور تیز ہوگئی جس کے ساتھ ساتھ دیوداسی کے رقص میں بھی شدت پیدا ہوگئی وہ رقص کرتی ہوئی ناگ دیوتا کے قریب پہنچتی اور جھک کر دیوتا کے قدموں سے چٹکی مٹی اٹھاتی اور اپنی مانگ میں بھر لیتی، رقص اور موسیقی نے پورے ماحول پر ایسا اثر کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ناگ دیوتا ایک پھنکار کے ساتھ متحرک ہوجائیں گے معاً چاروں طرف سانپوں کی پھنکار گونجنے لگی اور پھر پھنکار کی آوازوں سے ٹکراتی ہوئی گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز استھان کے قریب ابھری۔

دو سائے گھوڑوں سے اتر کر اندر داخل ہوگئے لیکن بین کی مدھر آواز اور دیوداسی کے گھونگھروؤں کی چھنا چھن نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کو اپنے اندر کچھ اس طرح جذب کرلیا کہ ہال میں موجود کسی بھی شخص کو دو اجنبیوں کے اندر داخل ہوجانے کی خبر نہ ہوئی شاہانہ لباس پہنے ہوئے یہ ریاست ارجن پور کے مہاراج ٹھاکر رنبیر اور ان کے سیناپتی پورن سنگھ تھے جو اپنے محل سے پہاڑ کے دامن میں ہزاروں چراغ روشن دیکھ کر چلے آئے تھے۔

مہاراج ٹھاکر رنبیر سنگھ نصف شب کے قریب اپنے عشرت کدہ میں چند حسین و جمیل دوشیزاؤں کو پہلو میں لئے شغل مے نوشی میں مصروف تھے کہ ایک باندی نے انہیں اطلاع دی کہ پہاڑ کے دامن میں گویا آگ لگی ہوئی ہے انہوں نے اپنے محل کی چھت پر چڑھ کر پہاڑ کی طرف دیکھا تو واقعی باندی کی اطلاع درست ثابت ہوئی اس قدر روشنیاں مہاراج رنبیر نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ انہوں نے فوراً اپنے سیناپتی پورن سنگھ کو طلب کیا اور اس روشنی کی وجہ دریافت کی پورن سنگھ کچھ دیر غور کرتے رہے پھر بولے۔

''مہاراج معلوم ہوتا ہے ناگری قبیلے کے لوگ کوئی جشن منا رہے ہیں۔''

''لیکن اس سے قبل انہوں نے کوئی جشن نہیں منایا۔'' مہاراج بولے اور پھر یہ بھک منگے لوگ اتنی روشنیاں کر کے کس طرح جشن منا سکتے ہیں۔

''یہ بھک منگے نہیں ہیں مہاراج۔'' پورن سنگھ نے جواب دیا بظاہر ان کا لباس بے حد گندہ اور پھٹا پرانا ہوتا ہے لیکن یہ پیسے کافی کما لیتے ہیں سنا ہے ان کے پاس لعل سے بھی قیمتی چیزیں ہوتی ہیں جو ناگ من انہیں دیتے ہیں۔

پورن سنگھ کی باتوں سے انہیں بڑا تجسس پیدا ہوا۔ انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا کبھی پہاڑ کے دامن سے انہیں کوئی روشنی نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی کبھی انہوں نے سانپ پالنے والے اس قبیلے کے لوگوں کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش ظاہر کی تھی حتیٰ کہ وہ اپنے پتاجی کے سرگ باش ہونے کے بعد جب گدی نشین ہوئے تو بھی انہوں نے کبھی پہاڑ کے دامن میں جا کر اس قبیلے کو نہ دیکھا تھا انہوں نے پورن سنگھ سے کہا۔

''پورن سنگھ ہم وہاں جا کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ

کس بات کا جشن منا رہے ہیں۔"

"مہاراج" پورن سنگھ نے مشورہ دیا۔ "یہ لوگ جو کیڑے مکوڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں اس قابل نہیں کہ آپ خود ان کے ہاں براجمان ہوں۔"

"نہیں پورن سنگھ۔" مہاراج بضد ہوئے ہم یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیں گے کہ ہم کون ہیں اجنبیوں کی طرح جا کر دیکھیں گے کہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔"

"جیسے آپ کی اچھا مہاراج۔" پورن سنگھ نے سر تسلیم خم کر دیا اور مہاراج پورن سنگھ کو ساتھ لے کر گھوڑوں پر سوار پہاڑ کے دامن میں جا پہنچے وہ جب وہاں پہنچے تو پورا قبیلہ ناگ دیوتا کے استھان میں داخل ہو چکا تھا اور دیوداسی اپنے دیوتا کے سامنے محو رقص تھی۔

مہاراج رنبیر سنگھ اور سینا پتی پورن سنگھ جب دیوتا کے استھان میں داخل ہوئے تو خلاف توقع ان کی آمد کا کسی نے نوٹس نہیں لیا وہ سب لوگ رقص و سرور میں اس قدر محو تھے کہ انہیں یہ جاننے کی فرصت ہی نہیں تھی کہ کون آیا ہے اور کون گیا ہے۔

مہاراج رنبیر سنگھ بڑے حسن پرست واقع ہوئے تھے اور ان کی راج دھانی کی کوئی بھی حسین دوشیزہ کی قیامت جوانی ان کی دوربین نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھی، ان کے محل میں ہر لمحہ حسن کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا اور دور و نزدیک کی دوسری ریاستوں میں مشہور تھا کہ حسن نے جو نادر نمونے مہاراج رنبیر سنگھ کو بھی اس بات پر بے حد فخر تھا لیکن آج جو پچھان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اس کا انہیں کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا۔

دیوداسی بجلی کی طرح ان کے سامنے کوندرہی تھی اور ان کے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اتنے گندے لوگوں میں اس قدر حسین لڑکی بھی ہو سکتی ہے دیوداسی حسن کا ایسا شاہکار تھی کہ رنبیر سنگھ کو اپنے محل کا حسن اس کے مقابلے میں مٹی نظر آنے لگا۔ دیوداسی رقص کر رہی تھی اور مہاراج کی دل کی دھڑکنیں گویا بند ہو رہی تھیں ان کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے وہ متحرک حسن ان کے دل و دماغ پر پوری طرح مسلط ہو گیا تھا۔

دیوداسی ناگ دیوتا کے مجسمے پر نظریں جمائے، رقص کے نئے نئے زاویئے بنا رہی تھی اور جان پڑتا تھا کہ اس کے رقص سے ابھی ناگ دیوتا کے مجسمے میں جان پڑ جائے گی اور وہ پھنکارتا ہوا خود بھی اس کے ساتھ رقص کرنے لگے گا۔

مکمل ایک گھنٹہ یہ سحر طاری رہا، مہاراج کا دل چاہتا تھا کہ وہ ہر بات سے بے نیاز ہو کر دیوداسی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے آج پہلا موقع تھا کہ حسن کو اپنے قدموں میں جھکانے والا مہاراج ایک سپیرے کی بیٹی کے قدموں میں اپنا سر رکھنے پر آمادہ تھا، مہاراج انداز بے خودی کے ساتھ آگے بڑھے تو اچانک پورن سنگھ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں روک لیا۔

"نہیں مہاراج۔" وہ بولے۔ "یہ موقع مناسب نہیں یہ لوگ اس وقت اپنے مذہبی جنون میں مبتلا ہیں، نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں ایسا نہ ہو آپ کو کوئی نقصان پہنچا دیں۔"

"لیکن پورن سنگھ۔" مہاراج بے چین ہو کر بولے پورن سنگھ فوراً بات کاٹ کر بولے۔ "میں آپ کی کیفیت کو سمجھتا ہوں مہاراج لیکن تھوڑا صبر کیجیے۔"

"صبر۔" مہاراج بولے۔ "اس لڑکی کو دیکھ کر بھی۔"

"یہ سچ ہے مہاراج۔" پورن سنگھ نے سرگوشی کی۔ "ایسا حسن میں نے بھی اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا لیکن یہ موقع مناسب نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مہاراج کو سمجھا بجھا کر باہر لے آیا۔

"کل صبح میں ان کے سردار سے مل کر بات کروں گا۔" پورن سنگھ نے مشورہ دیا۔ "یہ غریب لوگ ہیں مجھے یقین ہے کہ میری بات مان جائیں گے۔"

"لیکن یاد رکھو پورن سنگھ۔" رنبیر بولے۔ "اگر مجھے یہ لڑکی نہ ملی تو میں پورے قبیلے کو قتل کرا دوں گا۔" یہ کہہ کر مہاراج گھوڑے پر سوار ہوئے اور تیزی کے ساتھ محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہ رات مہاراج رنبیر سنگھ پر قیامت بن کر گزری ان کے ذہن میں بار بار دیوداسی کا حسین چہرہ اور بجلی کی طرح تھرتھراتا ہوا جسم گھوم رہا تھا وہ چاہتے تھے کہ اس پورن ماشی کے چاند کو جتنی جلدی ہو سکے اپنے محل میں لے آئیں تاکہ ان کا پورا محل اس کی روشنی سے جگمگا اٹھے صبح اٹھتے ہی انہوں نے پورن سنگھ کو بلایا اور بولے۔

''پورن سنگھ تم نہیں جانتے میرے دل کی اب کیا کیفیت ہے تم فوراً جاکر ان کے سردار سے بات کرو اور یاد رکھو میں انکار سننے کی تاب نہیں رکھتا۔''

تمام رات ناگ دیوتا کے استھان پر جشن منانے کے بعد ناگری قبیلے کے تمام لوگ پو پھوٹتے ہی اپنے اپنے جھونپڑوں میں واپس آکر سو گئے تھے۔

دیوداسی کو انہوں نے ناگ دیوتا کے چرنوں میں ہی چھوڑ دیا تھا۔

قبیلے کے رواج کے مطابق پہلی رات اسے ناگ دیوتا کے چرنوں میں گزارنا تھی اس رات کو دیوداسی کی سہاگ رات کہا جاتا تھا اس کے بعد وہ ایک سہاگن بن کر قبیلے میں رہتی تھی صرف صبح اور شام اسے استھان میں جاکر دیوتا کے سامنے رقص کرنا ہوتا تھا قبیلے کے لوگ خود خواہ کیسا ہی کھائیں اور پہنیں لیکن دیوداسی کے لئے بہتر خوراک اور عمدہ سے عمدہ لباس مہیا کرنا لازمی تھا البتہ پھاگن کے مہینے کی پورن ماشی والی پوری رات اسے دیوتا کے چرنوں میں ہی گزارنا ہوتی تھی چونکہ ناگ دیوتا ہی اس کے محافظ اس کے سرتاج اور اس کے والی تھے۔

سیناپتی پورن سنگھ جب قبیلے کی حدود میں داخل ہوئے چاروں طرف گہری خاموشی کا راج تھا معلوم ہوتا تھا رات کے ہنگامہ پرور جشن کے بعد یا تو سب نے خودکشی کرلی ہے۔

سیناپتی نے ایک جھونپڑی کے دروازے کو کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہ ملا اس نے تنکوں کی جھونپڑیوں کے اندر جھانک کر دیکھا سب لوگ اس بری طرح محوخواب تھے کہ انہیں اپنے تن من کا ہوش ہی نہ تھا۔

پورن سنگھ نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور کچھ دیر ادھر ادھر پھرتے رہے ان کی نظر دور ناگ دیوتا کے استھان پر پڑی وہ گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے استھان کے قریب پہنچے اور گھوڑے سے اتر کر استھان کے دروازے پر آئے استھان کا دروازہ بند تھا پورن سنگھ نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا لیکن اندر سے کنڈی بند تھی انہوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر دروازے پر ہلکی سی دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔

پھر انہوں نے دروازہ زور سے کھٹکھٹایا اندر ہلکی سی گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دی جو بڑھتے بڑھتے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی پھر کسی نے اندر سے کنڈی کھولی دروازہ کھلا اور پورن سنگھ کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے انہیں مضبوط زنجیروں میں جکڑ دیا ہے دیوداسی کی نظریں ان کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

''کیا ہے ان نظروں میں کہ جس چیز پر پڑ جاتی ہیں اسے ساکن کردیتی ہیں۔''

پورن سنگھ سوچ رہے تھے ''کھٹاک۔'' کی ایک زوردار آواز آئی اور استھان کا دروازہ بند ہوگیا۔

پورن سنگھ اچانک اپنے خیالات سے چونکے ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور پورے جسم کے رونگٹے کھڑے تھے انہیں احساس ہوا جیسے ان کی نظریں کسی دوشیزہ سے نہیں بلکہ کسی ناگ کی آنکھوں سے ٹکرا گئی تھیں۔

پورن سنگھ استھان سے واپس آئے اور انہوں نے ایک جھونپڑے سے ایک مرد کو نکلتے دیکھا انہوں نے اسے اپنے قریب بلایا اور پوچھا۔

''تمہارے سردار کا جھونپڑا کون سا ہے؟''

''وہ'' اس نے اشارے سے بتایا سب سے آخری سرے پر پورن سنگھ چلتے ہوئے اس جھونپڑے کے قریب آئے انہیں یقین تھا کہ اتنی حسین و جمیل لڑکی سوائے سردار کے اور کسی کی بیٹی نہیں ہوسکتی یقیناً وہ سردار ہی کی بیٹی تھی انہوں نے جھونپڑے کے دروازے پر دو تین بار دستک دی تو گلے میں بے شمار منکوں کی مالا پہنے ایک بوڑھا شخص برآمد ہوا اس کی آنکھوں میں تھکن اور نیند کے

آثار تھے اس نے قدرے غصیلی نظروں سے پورن سنگھ کو دیکھا، گویا اس کے آرام میں مخل ہو کر انہوں نے بہت برا کیا تھا لیکن جب ان کے لباس پر اس کی نظر گئی تو وہ سنبھل گیا اور آنکھیں ملتا ہوا بولا۔

"کیا حکم ہے سرکار۔"

"تم ہی اس قبیلے کے سردار ہو۔" پورن سنگھ نے پوچھا۔ "جی مہاراج میں ہی اس قبیلے کا سردار ہوں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"تو پھر سنو۔" پورن سنگھ بولے۔ "تمہاری قسمت جاگ اٹھی ہے تم عنقریب مالا مال ہو جاؤ گے اور تمہارے قبیلے پر بھی دولت کی بارش ہونے لگے گی۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں مہاراج؟" وہ بھونچکا ہو کر پورن سنگھ کا منہ تکنے لگا گویا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا پورن سنگھ نے وضاحت کی۔ "مہاراج رنبیر تم پر مہربان ہو گئے ہیں وہ تمہیں اس جھونپڑے سے نکال کر محل میں لے جانا چاہتے ہیں۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا مہاراج۔" سردار ہکلاتے ہوئے بولا۔ "آپ اندر چلے آئیں مہاراج۔" اس نے دعوت دی پورن سنگھ جھونپڑے کے اندر چلے گئے چاروں طرف منکوں کی مالائیں اور سانپوں کی پٹاریاں پڑی تھیں ایک طرف کونے میں پورن سنگھ بیٹھتے ہوئے بولے۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"سیتل مہاراج۔" سردار بولا۔

"ہاں تو سیتل۔" پورن سنگھ نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ مہاراج رنبیر تمہاری بیٹی کو رانی بنا کر اپنے محل میں رکھنا چاہتے ہیں تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ سرکار۔" سیتل کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "میری بیٹی کو مہاراج سویکار کر لیں تو۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں سیتل۔" پورن سنگھ بولے۔ "مہاراج کو تمہاری بیٹی پسند آ گئی ہے اور وہ اسے اپنی رانی بنانا چاہتے ہیں تمہارے بھاگ کھل گئے ہیں سیتل اب تم معمولی سپیرے نہیں بلکہ مہاراج رنبیر کے سسر کہلاؤ گے۔" سپیروں کا سردار یہ سن کر حیرت اور خوشی سے سینا پتی کا منہ تکنے لگا پھر وہ بولا۔

"یہ سب ناگ دیوتا کی کرپا ہے وہ ہم پر مہربان ہو گیا ہے۔" پھر وہ خوشی سے تقریباً چیختا ہوا جھونپڑی سے نکلا اور برابر کی جھونپڑی میں اپنی بیوی کو جگاتے ہوئے بولا۔

"ہمارے گھر ناگ دیوتا براجمان ہیں ہم پر دولت کی بارش ہونے والی ہے ناگ دیوتا کی جے جے ہو۔" اس کی بیوی سیتل کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ "یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں کہاں ہیں ناگ دیوتا یہ کیسی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" وہ بولا غور سے سنو۔ "مہاراج رنبیر ہماری بیٹی کو اپنی رانا بنانا چاہتے ہیں۔"

"کیا کہا......؟" اس کی بیوی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کیا بک رہے ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"تو نہیں سمجھتی۔" وہ خوشی سے بولا۔ "ناگ دیوتا نے لکشمی کو ہمارے گھر بھیج دیا ہے یقین نہ ہو تو چل کر میرے جھونپڑے میں دیکھ لے۔"

اس کی بیوی بھاگم بھاگ برابر والے جھونپڑے میں آئی اور پورن سنگھ کو دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھٹکی پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا پورن سنگھ نے بھی ہاتھ جوڑ کر پرنام کا جواب دیا وہ بولی۔

"مہاراج کیسے پدھارے ہیں غریبوں کی کٹیا میں۔"

پورن سنگھ بولے۔ "میں سپیروں کے سردار سیتل کو بتا چکا ہوں کہ مہاراج رنبیر اس کی بیٹی کو اپنی رانی بنا کر محل میں رکھنا چاہتے ہیں۔"

"وہ میری بھی بیٹی ہے مہاراج۔" وہ بولی۔ "میں اس کی ماں ہوں۔"

"لیکن مہاراج۔" وہ ذرا دیر رک کر بولی۔ "اچانک ہمارے بھاگ یہ کیسے جاگ پڑے؟"

"بات یہ ہے۔" پورن سنگھ بولے۔ "رات جب

قبیلے کے لوگ جشن منا رہے تھے تو ناگ دیوتا کے مجسمے کے سامنے تمہاری بیٹی کو رقص کرتے ہوئے مہاراج نے دیکھ لیا اسی وقت سے وہ اس کے دیوانے ہوگئے۔"

"کیا......؟" سیتل اور اس کی بیوی دونوں چونک پڑے "آپ کیا کہہ رہے ہیں سرکار؟"

"رات تم لوگ اپنا جشن منانے میں اس قدر محو تھے کہ تمہیں مہاراج کی آمد کا علم نہ ہوسکا۔" پورن سنگھ نے وضاحت کی۔" ناگ دیوتا کے سامنے جب تمہاری بیٹی رقص کررہی تھی تو مہاراج تڑپ رہے تھے وہ اسی وقت تمہاری بیٹی پر سوجان سے فریفتہ ہوگئے اور اب۔"

"لیکن مہاراج......" اچانک بات کاٹ کر سیتل بولا" وہ ہماری بیٹی نہیں ہے" اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں غصہ جھانکنے لگا۔

"مہاراج سے کہہ دیجیے سرکار اس لڑکی کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔"

"کیوں؟" پورن سنگھ نے حیران ہوکر پوچھا۔

"اس لئے۔" سیتل بولا کہ" وہ پوتر دیوی ناگ دیوتا کی داسی ہے وہ میری نہیں پورے قبیلے کی عزت ہے ہم اسے ناگ دیوتا کے حضور پیش کرچکے ہیں وہ انہی کے لئے پیدا ہوئی ہے اس کی طرف کسی نے میلی آنکھ سے دیکھا تو ہم اس کی آنکھیں نکال لیں گے خواہ وہ مہاراج رنبیر ہی کیوں نہ ہو۔"

سیتل غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا پورن سنگھ کو بھی یہ سن کر پسینہ آ گیا پھر سیتل بولا۔

"مہاراج سے کہہ دیجیے کہ اگر کسی بری نیت سے انہوں نے ہماری بستی میں قدم رکھا تو ہمارا بچہ بچہ دیوداسی پر سے قربان ہوجائے گا۔"

پورن سنگھ کو بھی قدرے غصہ آ گیا وہ بولے۔

"تم بھول رہے ہو سردار کہ تم کس سے مخاطب ہو میں اس ریاست کا سیناپتی ہوں اور تم اس ریاست کی اس زمین پر آباد ہو جو مہاراج رنبیر کی ہے۔"

"زمین تو بھگوان کی ہوتی ہے مہاراج۔" سیتل بولا۔" اگر آپ کو اس زمین پر اتنا ہی مان ہے تو ہم کل ہی یہ زمین چھوڑ کر کسی اور ریاست میں جا بسیں گے، ہم گھر گھومنے والے لوگ ویسے بھی ایک جگہ ٹک کر رہنا اچھا نہیں سمجھتے۔"

"مہاراج اس لڑکی کے لئے تمہارے پورے قبیلے کو قتل کروادیں گے تم ایک معمولی لڑکی کے لئے کیوں اتنا خون خرابہ کروانا چاہتے ہو۔" پورن سنگھ بولے۔

سیتل کو بے حد غصہ آ گیا اور وہ چیخ کر بولا۔

"جسے آپ ایک معمولی سی لڑکی کہہ رہے ہیں وہ ایک ہستی ہے جو ہماری زندگیوں سے کہیں قیمتی ہے شاید تم نہیں جانتے کہ پورے ستر سال بعد اس قبیلے کو دیوداسی ملی ہے اب اسی کی بدولت ناگ دیوتا ہم پر مہربان ہوں گے ناگ دیوتا کی مرضی کے بغیر اس کی دیوداسی کو ہوا بھی نہیں چھوسکتی۔" پھر وہ کرخت لہجے میں بولا۔

"جایئے مہاراج سے کہہ دیجیے ہم سب دیوداسی کے اوپر سے قربان ہونے کو تیار ہیں۔"

پورن سنگھ ایک معمولی سپیرے سے ایسے تیکھے الفاظ سن کر تیزی سے جھونپڑے سے باہر نکلے اور گھوڑے پر سوار ہوکر اسے سرپٹ دوڑا دیا۔

مہاراج رنبیر انتہائی بے چینی سے اپنے سیناپتی کے منتظر تھے پورن سنگھ جونہی ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ان کا دل دھک سے ہوگیا وہ سمجھ گئے کہ پورن سنگھ کو ناکامی ہوئی ہے پھر بھی انہوں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کیا خبر لائے ہو پورن سنگھ؟"

"خبر اچھی نہیں ہے مہاراج۔" پورن سنگھ بولے۔

"جسے آپ ایک معمولی سپیرن سمجھتے ہیں وہ ان کی دیوداسی ہے مہاراج جسے وہ ناگ دیوتا کی نذر کرچکے ہیں اور اب ان کا سردار کسی قیمت پر بھی دیوداسی کو آپ کے حوالے کرنے پر رضامند نہیں ہے۔"

"میں ان سب کو قتل کروادوں گا۔" رنبیر غصے سے چیخے۔

"وہ سب اس کے لئے بھی تیار ہیں ان کے سردار کا کہنا ہے کہ وہ ناگ دیوتا کی دیوداسی کے لئے اپنی جانیں

قربان کردیں گے۔" پورن سنگھ نے جواب دیا۔

"چاہے سب کی جانیں چلی جائیں مجھے کچھ پرواہ نہیں۔" مہاراج رنبیر دھاڑنے لگے۔

"مگر اس لڑکی کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" اور وہ تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں ادھر ادھر پھرنے لگے ان کی آنکھوں سے مایوسی کے ساتھ ساتھ شدید غصہ بھی جھلک رہا تھا ایک معمولی سپیرے نے اتنے بڑے مہاراج کا غرور خاک میں ملا دیا تھا وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک غریب اور بے کس آدمی ان کو اتنا بے بس بنا دے گا وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح غرا رہے تھے ان کی اپنی راجدھانی اپنی دھرتی پر کیڑے مکوڑوں کی طرح چلنے والوں نے اپنی موت کو خود ہی آواز دے لی تھی وہ چاہتے تو سب کے سامنے جشن والی رات کو ہی اس لڑکی کو اٹھا لاتے اور کسی کو بولنے کی بھی جرأت نہ ہوتی لیکن اس سینا پتی نے وہ موقع ہی ہاتھ سے گنوا دیا انہیں یک دم سینا پتی پورن پر غصہ آ گیا۔

"تم سخت بزدل ہو تم نے مجھے کل رات ہی کیوں نہ اس لڑکی کو۔"

"مہاراج" پورن سنگھ بات کاٹ کر بولے۔

"میں پھر عرض کروں گا وہ موقع ہرگز مناسب نہیں تھا۔"

"تو اب کون سا موقع مناسب ہے۔" مہاراج غصہ سے بولے۔ "اب جب کہ تم بھی ان معمولی سپیروں سے منہ کی کھا کر آ گئے ہو وہ ذلیل کمینے میری ہی بخشی ہوئی دھرتی پر بیٹھ کر میرے ہی سینے پر مونگ دلیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"ذرا تحمل سے کام لیجیے سرکار۔" پورن سنگھ نے مشورہ دیا۔ "وہ لوگ سپیرے ہیں اور سپیروں کا کوئی دیس نہیں ہوتا وہ آج یہاں ہیں تو کل وہاں ممکن ہے وہ آج رات ہی یہ راجدھانی چھوڑ کر کسی دوسری ریاست میں چلے جائیں۔"

"میں آج ہی رات ان کا صفایا کروا دوں گا۔" مہاراج بولے۔ "وہ اس لڑکی کو یہاں سے نہیں لے جاسکتے۔"

"وہ لڑکی صبح و شام دونوں وقت مندر میں ناگ دیوتا کے سامنے رقص کرنے جاتی ہے ورنہ وہ اپنے قبیلے میں ہی رہتی ہے۔" پورن سنگھ نے بتایا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا۔" مہاراج نے سوال کیا۔

"میں آج صبح جب وہاں پہنچا تو وہ سب لوگ سو رہے تھے اس لڑکی کے بارے میں میرے دل میں ایک تجسس پیدا ہوا اور میں مندر کے دروازے پر پہنچ گیا دروازہ اندر سے بند تھا میرے دستک دینے پر اسی لڑکی نے دروازہ کھول کر مجھے گھورا تھا اور مہاراج....." پورن سنگھ کچھ کہتے کہتے رک گئے پھر بولے۔

"یقین کیجیے مہاراج جب ایک پل کے لئے میری اس سے آنکھیں چار ہوئیں تو میں بالکل ساکن ہوگیا اس لڑکی کی آنکھوں میں وہی سحر تھا جو ایک ناگ کی آنکھوں میں ہوتا ہے میرا خیال ہے وہ لڑکی ایک ناگن ہے جس نے ایک خوبصورت دوشیزہ کا روپ دھار رکھا ہے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔" مہاراج بولے۔ "اگر وہ ناگن بھی ہے تو میں اس ناگن کو ضرور اپنے محل میں لاؤں گا۔"

"اب میرے لئے کیا حکم ہے۔" مہاراج پورن سنگھ نے پوچھا۔

"تم اسی وقت سینا کا ایک دستہ لے کر اس بستی میں پہنچ جاؤ اور پوری بستی کو جلا کر راکھ کر دو تمام سپیروں ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دو اور اس لڑکی کو اٹھا کر محل میں لے آؤ میں آج رات اسے اپنی خواب گاہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" مہاراج نے حکم دیا۔

"مہاراج۔" پورن سنگھ بولے۔ "میری یہ مجال نہیں کہ آپ کا حکم بجا نہ لاؤں لیکن ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

"کیسا مشورہ۔" مہاراج نے پوچھا۔

"میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ کام دن کے اجالے کی بجائے رات کی تاریکی میں کیا جائے۔"

"وہ کس لئے؟" مہاراج نے سوال کیا۔

"وہ اس لئے۔" سرکار پورن سنگھ نے وضاحت کی۔ "اس وقت ہم یہ نہ جان سکیں گے کہ وہ لڑکی کس جھونپڑے میں ہے ایسا نہ ہو دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ بھی قتل ہوجائے یا آگ کی نظر ہوجائے رات کو وہ لڑکی جونہی مندر میں رقص کرنے کے لئے جائے گی ہم اسے اٹھالیں گے اور بستی کو آگ لگادیں گے۔"

"میں تمہارے مشورے کی قدر کرتا ہوں۔" مہاراج خوش ہوکر بولے تم شام کے سائے پھیلتے ہی اپنے دستے کے ہمراہ بستی کے قریب پہنچ جاؤ اور اس لڑکی پر نظر رکھو۔"

"ایسا ہی ہوگا مہاراج۔" پورن سنگھ بولے۔ "بھگوان نے چاہا تو آپ کی اچھا ضرور پوری ہوگی۔ جھونپڑوں میں چمکنے والا حسن آج رات آپ کی خواب گاہ کو ضرور روشن کرے گا اور پھر مہاراج قبیلے کے سردار نے میرا بھی بہت اپمان کیا ہے میں اپنے اس اپمان کا ان سے ایسا بدلہ لوں گا کہ ان کا نام ونشان مٹادوں گا۔"

شام کے سائے گہرے ہورہے تھے پورن سنگھ اپنے گھوڑے پر سوار پچاس آدمیوں کے ایک دستے کے ساتھ پہاڑ کے دامن کی طرف بڑھ رہے تھے درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب وہ رک گئے یہاں سے سپیروں کی بستی صاف نظر آرہی تھی لوگ اپنے اپنے کام میں مگن تھے ان کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم یہ بتارہے تھے کہ وہ اپنا سازوسامان اکٹھا کررہے ہیں تاکہ آج ہی رات قافلہ کی صورت میں پورا قبیلہ کسی دوسری جگہ منتقل ہوجائے۔

کچھ دیر بعد پورن سنگھ نے دیوداسی کو بالوں میں موتیے کا جوڑا سجائے ہاتھ میں چراغ لئے مندر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا، وہ تنہا نہیں تھی اس کے ساتھ ارد گرد دو سپیرے بھی تھے۔

پورن سنگھ نے اپنے چار آدمیوں کو اشارہ کیا وہ چکر کاٹ کر پہلے ہی اس پگڈنڈی پر جاپہنچے جو مندر کی طرف جاتی تھی دیوداسی نے جونہی پگڈنڈی پر قدم رکھا پورن سنگھ کے آدمی دونوں سپیروں پر ٹوٹ پڑے اور آن واحد میں ان کی گردنیں تن سے الگ ہوگئیں پھر فوراً ہی انہوں نے دیوداسی کو پکڑ کر گھوڑے پر سوار کیا اور تیزی سے واپس مڑے، حیرت کی بات یہ تھی کہ دیوداسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ انتہائی خاموشی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوئی۔

پورن سنگھ نے جب دیکھا کہ اس کے آدمی دیوداسی کو لے گئے ہیں تو اس نے اپنے دستے کو مشعلیں روشن کرنے کا حکم دیا تمام سپاہیوں نے مشعلیں روشن کرکے بائیں ہاتھ میں پکڑلیں اور دائیں ہاتھ سے اپنی تلوار میانوں سے نکالیں، سیناپتی نے یکدم حملے کا حکم دیا تو سپاہی ایک قہر بن کر بستی پر ٹوٹ پڑے آن واحد میں پوری بستی شعلوں کی لپیٹ میں آگئی مردوں، عورتوں اور بچوں کی چیخ وپکار سے ایک کہرام مچ گیا جلتے ہوئے جھونپڑوں سے جو بھی باہر نکلتا سپاہیوں کی تلواریں انہیں خون میں نہلادیتیں۔ پورن سنگھ ایک چٹان پر کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سپاہیوں نے اس قتل عام میں کسی کو نہیں بخشا، ناگری قبیلے کے لوگوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا اور ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شعلے آسمان سے باتیں کررہے تھے اور قتل ہونے والوں کی دلدوز چیخوں سے کانوں کے پردے پھٹے جارہے تھے صرف دو گھنٹے کے کشت وخون کے بعد پوری بستی پر موت کی خاموشی چھاگئی تمام جھونپڑے جل کر راکھ ہوگئے اور ان کے مکین موت کی ابدی نیند سوگئے چاروں طرف بے شمار لاشیں بکھری پڑی تھیں انہیں لاشوں میں قبیلے کے سردار اور اس کی بیوی اور بیٹی کی لاشیں بھی شامل تھیں۔

مہاراج رنبیر نے اپنے محل کی اونچی چھت سے اڑتے شعلوں کا وہ خوب صورت کھیل دیکھ لیا تھا جونہی بستی سے آگ کے شعلے بلند ہونا شروع ہوئے مہاراج کو دیوداسی اپنے پہلو میں نظر آنے لگی وہ انتہائی بے چینی کے ساتھ چھت سے نیچے اترے اور محل کے صدر دروازے پر پہنچ کر اپنے سیناپتی کا انتظار کرنے لگے۔ ایک ایک پل ان کے لئے قیامت بن کر گزر رہا تھا دو گھنٹے بعد سیناپتی اپنے دستے کے ہمراہ واپس آئے تو سب سے آگے وہی گھوڑا تھا جس پر دیوداسی پوری تمکنت کے ساتھ بیٹھی تھی۔

''پہنچئے مہاراج۔'' پورن سنگھ نے گھوڑے سے اتر کر مہاراج کو تعظیم دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کی امانت حاضر ہے۔ اس کے قبیلے کا ایک بھی فرد ایسا نہیں بچا جو اب اس کی رکھشا کے لئے آسکے۔''

''شاباش پورن سنگھ۔'' مہاراج خوش ہو کر بولے۔ ''تم نے آج وہ کام کیا ہے جس کے لئے ہم ہمیشہ تمہارے مشکور رہیں گے۔''

پھر انہوں نے ایک نظر دیوداسی کی طرف دیکھا حسن کا ایک لافانی شاہکار ان کے دروازے پر موجود تھا اور اب پورن ماشی کا یہ چاند ہمیشہ ان کے محل میں جگمگائے گا۔

محل کے اندر پہنچ کر انہوں نے باندیوں کو حکم دیا ''مسیبروں کی اس ملکہ کو لے جاؤ۔ شاہی حمام میں اسے غسل دے کر اس کے حسین جسم کو خوشبوؤں سے بسا دو اور اسے اتنا قیمتی لباس پہناؤ جسے پہن کر دنیا کا حسن اس کے قدموں کی دھول نظر آنے لگے۔'' اور پھر مہاراج دیوداسی کی طرف معنی خیز نظر سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

''اسے ہماری خواب گاہ میں پہنچا دینا کہ ہم اسے مہارانی بننے کا شرف عطا کر سکیں۔''

مہاراج رنبیر سنگھ کی ہدایات کے مطابق دیوداسی کو شاہی حمام میں غسل دیا گیا اس کے جسم کو طرح طرح کی خوشبوؤں سے بسا کر اسے سرخ رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنائی گئی۔

دیوداسی خاموشی کے ساتھ ہر کام میں تعاون کرتی رہی اس نے اس کے خلاف ایک لفظ بھی بطور احتجاج نہیں کیا۔ باندیوں نے اسے بنا سنوار کر مہاراج کی خواب گاہ میں پہنچا دیا اسے ایک شاندار مسہری پر بیٹھایا گیا خواب گاہ کی کھڑکیوں اور دروازوں پر بیش قیمت ریشمی پردے لٹک رہے تھے اور چھت سے لٹکتے ہوئے جھاڑ فانوس کی روشن شمعیں پورے کمرے کو بقعہ نور بنا رہی تھیں۔

شاندار مسہری پر دیوداسی کو بیٹھا کر تمام باندیاں قہقہے لگاتی ہوئی خواب گاہ سے باہر چلی گئیں اب خواب گاہ میں دیوداسی بالکل تنہا تھی اس کی تیز نگاہیں اس دروازے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے مہاراج رنبیر کو داخل ہونا تھا۔ مہاراج رنبیر کو آج دو آتشہ شراب کا نشہ تھا خواب گاہ میں داخل ہونے سے پہلے اس نے جی بھر کر سوم رس پیا تھا اور اب اس کے دل میں جو آگ بھڑک اٹھی تھی صرف دیوداسی ہی بجھا سکتی تھی۔

رات کا ایک بج رہا تھا جب مہاراج رنبیر نے اپنی خواب گاہ کے دروازے میں قدم رکھا، دیوداسی کی نظریں پہلے ہی دروازے پر تھیں۔ بدمستی کا یہ عالم تھا کہ مہاراج رنبیر کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ لیکن جونہی انہوں نے خواب گاہ کی دہلیز پار کی ان کی نظریں دیوداسی کی نظروں سے ٹکرا گئیں لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگیں اپنی جگہ پر ساکت ہو گئیں اور ان کا پورا جسم چند لمحوں کے لئے بالکل ساکن ہو گیا۔

دیوداسی کی نگاہوں میں ایسا سحر تھا کہ مہاراج رنبیر جنبش بھی نہ کر سکے۔

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا خواب گاہ کی مشرق طرف کھلتی ہوئی کھڑکی میں سے داخل ہوا اور کمرے کے تمام پردے سرسرانے لگے دیوداسی کی نظریں مہاراج رنبیر کے جسم سے ہٹتی ہوئی مشرقی کھڑکی پر مرکوز ہو گئیں۔ دیوداسی کی نظریں ہٹتے ہی مہاراج کو جیسے ہوش آ گیا۔

اب مہاراج کی نظریں دیوداسی کے خوبصورت جسم پر مرکوز تھیں اور وہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دیوداسی کے قریب پہنچ کر انہوں نے اسے چھونا چاہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ان سے دور ہٹتے ہوئے بولی۔

''میرے شریر کو چھونے کی کوشش مت کریں مہاراج ورنہ.....''

مہاراج نے ایک قہقہہ لگایا اور پوچھا۔

''ورنہ کیا ہوگا؟''

''ورنہ۔'' دیوداسی بولی۔ ''دیوتا آپ سے انتقام لیں گے کیوں کہ میں ان کی امانت ہوں۔''

''تم کسی دیوتا کی امانت نہیں ہو۔'' مہاراج بولے۔ ''اس وقت تم میرے محل میں ہو اور صرف میں تمہارا مالک ہوں۔ پھر وہ آگے بڑھتے ہوئے بولے۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ ہم تمہیں اپنی مہارانی بنا رہے ہیں۔''

"میں صرف دیوداسی ہوں۔" دیوداسی اور پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔ "ناگ دیوتا میرے مالک ہیں، میں انہیں کے لئے پیدا ہوئی ہوں، میں مہارانی بننا نہیں چاہتی۔"

مہاراج رنبیر کا زوردار قہقہہ خواب گاہ میں گونجا۔

"اس خواب میں آئی ہوئی کوئی حسین لڑکی مہارانی بنے بنا یہاں سے باہر نہیں گئی پھر تم کیسے جاسکتی ہو؟" یہ کہہ کر مہاراج آگے بڑھے۔

دیوداسی نے تقریباً بھاگتے ہوئے کہا۔ "میں پھر کہتی ہوں میرے شریر کو مت چھونا ورنہ ناگ دیوتا تمہیں جلا کر بھسم کردیں گے۔"

"تمہارے حسن نے ہی مجھے تو جلا کر بھسم کر ڈالا ہے، دیوتا آکر اب کیا کریں گے۔" مہاراج ہنستے ہوئے بولے اور آگے بڑھ کر ایک کونے میں سمٹی سمٹائی دیوداسی کا انہوں نے ہاتھ پکڑ لیا پھر انہوں نے ہنستے ہنستے ساڑھی کے پلو کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ دیوداسی لاکھ کوشش کرتی رہی لیکن وہ مہاراج رنبیر کے مضبوط بازوؤں کا مقابلہ نہ کرسکی ریشمی ساڑھی کھلتی گئی اور دیوداسی کا حسین جسم لباس سے بے نیاز ہوگا گیا۔ اب دیوداسی بالکل برہنہ تھی ساڑھی کا آخری پلو اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا اور اس کا باقی حصہ مہاراج کے قدموں میں ڈھیر ہوچکا تھا۔

دیوداسی کا حسن کے سانچے میں ڈھلا ہوا جسم دیکھ کر مہاراج کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی تصور میں بھی اتنا سڈول اور خوبصورت جسم نہیں دیکھا تھا، ہوس کی آگ بھڑک کر ان کے دل میں دہکنے لگی۔ اور وہ پیاسی آنکھوں اور تشنہ لبوں کے ساتھ دیوداسی کی طرف بڑھے تاکہ اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ کر اپنے من کی پیاس بجھالیں۔

اچانک مشرقی دیوار والی کھڑکی سے ہوا کا ایک اور تیز جھونکا آیا جس کے ساتھ ہی ایک زبردست پھنکار کی آواز کمرے میں گونج گئی، دیوداسی اور مہاراج کی نظریں بیک وقت تیزی کے ساتھ کھڑکی کی طرف گئیں دیوداسی کی خوف زدہ آنکھوں میں ایک عجیب چمک اور ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھل گئی، مہاراج کی آنکھیں خوف سے کھلی کی کھلی رہ گئیں اور ان کے چہرے پر اچانک زردی پھیل گئی۔

ایک بہت بڑا اژدھا نما سانپ کھڑکی کے راستے خواب گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔

مہاراج رنبیر کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے، دیوداسی نے فوراً آگے بڑھ کر ساڑھی کو اٹھایا اور اپنے برہنہ جسم کے گرد اسے لپیٹ لیا۔

سانپ جس کا جسم قوس وقزح کے رنگ دکھا رہا تھا اور سر پر ایک سرخ رنگ کا تاج تھا جس سے تیز شعائیں پھوٹ رہی تھیں۔ کھڑکی کے راستے آہستہ آہستہ اندر داخل ہو رہا تھا، اندر پہنچ کر وہ دیوداسی کے قریب آکر رک گیا، دیوداسی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا اور بولی۔

"مجھے یقین تھا ناگ دیوتا کہ آپ اپنی امانت کی رکھشا کو ضرور پہنچیں گے۔"

ناگ نے اپنا انتہائی خوف ناک پھن اٹھایا اور پھر اپنی پونچھ کے بل ایک ستون کی مانند مہاراج رنبیر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ مہاراج رنبیر خوف اور دہشت سے بت بن چکے تھے ناگ کی سرخ انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں ان کی آنکھوں میں گڑی تھیں جوش اور غصے کے عالم میں اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا اس نے سر گھما کر پوری خواب گاہ کا جائزہ لیا اور پھر اچانک ایک زبردست پھنکار کے ساتھ مہاراج رنبیر کے پاؤں کی طرف بڑھا اور ٹانگوں سے لپٹتا ہوا اوپر کی طرف چڑھنے لگا، چند ہی لمحوں بعد ناگ نے مہاراج کے پورے جسم کے گرد لپٹ کر ان کو ایک مضبوط موٹے رسے کی طرح جکڑ لیا۔ وہ ایک شکنجے کی طرح ان کے جسم کو کس رہا تھا۔

مہاراج کے جسم کی ہڈیاں کڑکڑانے لگیں اور ان کی چیخیں خواب گاہ سے نکل کر پورے محل میں گونجنے لگیں، اب ناگ کا پھن مہاراج کے چہرے کے بالکل سامنے تھا اور اس کی لمبی باریک زبان بار بار مہاراج کے ماتھے کو چھو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک سوالیہ انداز سے مہاراج کی آنکھوں میں مرکوز تھیں گویا پوچھ رہی ہوں۔

''اب بتا۔ دیوداسی کا مالک تو ہے یا میں؟'' شدت تکلیف سے مہاراجہ کی آنکھیں پپوٹوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ اور زبان دانتوں میں دبی باہر لٹک رہی تھی ناگ نے اپنا پھن ذرا پیچھے کی طرف جھکایا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ باہر کی طرف لٹکتی ہوئی زبان پر ڈنک مارا۔

مہاراج کے منہ سے آخری سسکی نکلی اور ان کا سر ڈھلک گیا پورا جسم پہلے ہی نیلا اور پھر سیاہ ہوتے ہوتے بالکل کوئلہ بن گیا۔

ناگ نے اپنے جسم کا شکنجہ ڈھیلا کردیا اور بڑے آرام کے ساتھ مہاراج کے جھلسے ہوئے جسم سے نیچے اتر آیا۔ مہاراج کا مردہ جسم ایک جلی ہوئی لکڑی کی طرح فرش پر گر پڑا۔ ناگ نے پوری خواب گاہ کا ایک چکر لگایا اور اپنی دہشت ناک پھنکاروں سے کمرے کی پوری فضا کو لرزا کر رکھ دیا وہ جس جگہ بھی پھنکارتا تھا وہاں ایک شعلہ سا پیدا ہوتا اور آگ دہکنے لگتی۔ کچھ ہی دیر بعد پورا کمرہ آگ کی لپیٹ میں آگیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مہاراج رنبیر کے پورے محل کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

آگ اس قدر اچانک اور شدید تھی کہ محل میں موجود ایک شخص بھی اپنا بچاؤ نہ کرسکا، شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے، محل میں ایک کہرام مچ گیا، چیخ وپکار سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ راج دھانی کے تمام لوگ خبر پاتے ہی اپنے بستروں سے اٹھ کر محل کے دروازے پر جمع ہوگئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور انتہائی کوشش کے باوجود اسے نہ کھولا جاسکا کسی بھی شخص میں یہ ہمت نہ تھی کہ کسی اور طریقے سے محل میں داخل ہوسکے۔

صرف ایک گھنٹے میں محل کا کونہ کونہ آگ کی زد میں آچکا تھا......

اچانک محل کا صدر دروازہ کھلا اور آگ کی روشنی میں لوگوں نے دیکھا کہ صدر دروازے سے ایک ناگ برآمد ہوا جسم پر قوس وقزح کے رنگ اور سر پر ایک سرخ تاج جس سے تیز شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ لوگوں نے ناگ کو دیکھتے ہی راستہ چھوڑ دیا، ناگ بڑے اطمینان کے ساتھ شاہانہ انداز سے چلتا ہوا دروازے سے باہر آیا، ناگ سے صرف ایک قدم پیچھے گھنگروؤں کا ایک چھنا کا ہوا اور لوگوں نے دیکھا کہ سرخ رنگ کی ریشمی ساڑھی میں ملبوس سیاہ بال شانوں پر بکھیرے ہاتھوں میں ایک روشن چراغ رکھے، دیوداسی پاؤں میں گھنگرو باندھے چلی آرہی تھی۔ ناگ آگے بڑھتا رہا اور اس کے پیچھے پیچھے دیوداسی بڑھتی چلی گئی۔

یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دولہا اپنی دلہن کو بیاہ کر لیئے جارہا تھا، ناگ اور دیوداسی دور ہوتے چلے گئے اور گھنگروؤں کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ دور پہاڑ کے دامن میں ایک چراغ ستارے کی مانند جھلملا رہا تھا۔

''حکیم صاحب۔'' رولوکا کو مخاطب کرتے ہوئے حکیم وقار بولے۔

حکیم وقار کی بات سن کر رولوکا بولا۔ ''جی حکیم صاحب آپ نے دونوں کہانیاں پڑھ لیں جو کہ حقیقت پر مبنی ہیں، اب اگر آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہے تو پوچھیں۔''

رولوکا کی بات سن کر حکیم وقار بولے۔ ''حکیم صاحب پہلی کہانی میں...... خالہ کریمن ایک عام سی عمر دراز عورت جو کہ روحانی طاقت میں مثالی...... اور پھر ان کی ذات سے جو حقیقت سامنے آئی ہے...... اور یہی بات مجھے حیران کررہی ہے کہ خالہ کریمن طاقت کے اس مقام پر کیسے پہنچیں؟ اور انہوں نے جو کارنامہ انجام دیا وہ عقل حیران کردینے والا ہے۔

اور پھر دوسری کہانی میں ناگری قبیلے میں ستر سال بعد ایک بچی پیدا ہوئی...... اور اس کی ذات سے جو انوکھے واقعات سامنے آئے اور یہ بات بھی عقل میں آنے والی نہیں، آپ ذرا تفصیل سے بتائیں تا کہ میرا ذہن مطمئن ہوجائے۔''

حکیم وقار کی بات سن کر رولوکا بولا...... ''کہ اتنے میں مطلب کے اندرونی کمرے میں ایک فلک شگاف نسوانی چیخ سنائی دی......''

(جاری ہے)

پراسرار انسان

چوہدری قمر جہاں علی پوری۔ ملتان

دوکاندار کی آواز سنائی دی۔ "نوجوان اس سے مجھے اور تمہیں دونوں کو جانی نقصان کا اندیشہ ہے، یہاں تو ایسے ایسے دیو اور جن مقیم ہیں مت پوچھو، شیر، مگرمچھ اور خونخوار چمگادڑ کے چہرے والے انسان موجود ہیں

حقیقت پر مبنی اور دل و دماغ کو اچنبھے میں ڈالتی حیرتناک، تحیر انگیز، خوفناک کہانی

معروف سراغ رساں مسٹر لاک وڈ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ہوائی اڈے سے باہر آیا اور سامنے کھڑی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر اسے شہر کی طرف روانگی کا کہا۔ برطانوی نیوز پیپر کے قارئین کو یاد ہوگا یہ ایک ماہ قبل مشہور انگریز سائنسدان ڈاکٹر ارون کے اچانک غائب ہو جانے پر ان اخبارات میں کئی نہایت سنسنی خیز خبریں شائع ہوئی تھیں، ڈاکٹر ارون نہ صرف برطانیہ میں بلکہ پوری دنیا میں چند حیرت انگیز ادویات کی موجد کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا ان دنوں وہ دوائیں تیار کرنے والے ایک بڑے کارخانے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا شروع شروع میں یہ بات سننے میں آئی تھی کہ ڈاکٹر ارون کی اچانک پراسرار گمشدگی کاروباری رقابت کا نتیجہ ہے کیونکہ ادویات کے تیار کرنے والے چند دیگر کارخانوں

کے مالکان ڈاکٹر اروِن کے کارخانے کی شہرت سے خائف ہیں انہی لوگوں نے ڈاکٹر کو غائب کروایا ہے۔

ابتداء میں جب تک اس وقوعہ کی تفتیش مقامی پولیس کررہی تھی تو اخبارات میں کئی قسم کی افواہیں گردش کررہی تھیں مگر پچھلے پندرہ روز سے یہ تفتیش برطانوی خفیہ پولیس اسکاٹ لینڈ کے سپرد کردی گئی تھی جس کے باعث من گھڑت اور بے بنیاد افواہوں کا سلسلہ دم توڑ گیا تھا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے نوجوان سراغ رساں انسپکٹر لاک وڈ نے اوپر نیچے چار ایسے کارنامے سرانجام دیئے کہ نہ صرف اس کے آفیسرز اور عوام میں اس کی ناموری کا ڈنکا بجنے لگا بلکہ بڑے نامی گرامی جرائم پیشہ افراد بھی اس کے نام سے لرز اٹھتے تھے چنانچہ لاک وڈ کی فرض شناسی اور اعلیٰ کارکردگی کے باعث ڈاکٹر اروِن کی اچانک گمشدگی کی تفتیش کا کام بھی اعلیٰ آفیسرز نے اس کے حوالے کردیا تھا۔

انسپکٹر وڈ نے پورے پندرہ روز ڈاکٹر اروِن کے رہائش گاہ سے لے کر اس کے دفتر تک نہایت خاموشی سے ایک ایک چیز اور ایک ایک جگہ کو چھان مارا تھا اس دوران میں وہ چپکے سے لندن جاکر مختلف ہوٹلوں اور ہوائی کمپنیوں کے دفاتر میں بھی گیا پورا ایک دن اس نے کارخانے کے اردگرد پھیلے ہوئے جنگل میں بھی بسر کیا آخری دن جب وہ لندن کے ہوائی اڈے پر ہوٹل میں بیٹھا ویسٹ انڈیز جانے والے طیارے کی روانگی کا منتظر تھا تو اس نے اپنے انچارج آفیسر کو فون پر اطلاع دی کہ ”پندرہ روز کی کوشش کے بعد وہ یہ سراغ لگانے میں کامیاب ہوگیا ہے کہ ڈاکٹر اروِن کی گمشدگی کا معمہ ویسٹ انڈیز کے ایک دور دراز جزیرے میں جاکر حل ہوگا اگر وہ ایک خفیہ سوسائٹی کا پتہ لگانے میں کامیاب ہوگیا تو آپ وہاں کی خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ کو خفیہ طور پر اس کی آمد کی اطلاع دے دیں تاکہ بہ وقت ضرورت وہ میری ممکنہ مدد کرسکیں۔“

وڈ نے شہر کے ایک بہترین ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا اور فریش ہوکر نفیس لباس زیب تن کیا اور ہوٹل کے کلرک کے پاس جا پہنچا اس وقت وہ ایک سیاح کا روپ دھار چکا تھا، چند ضروری معلومات کرنے کے بعد اس نے کلرک سے کسی ایسے نائٹ کلب کا پتہ دریافت کیا جہاں رات کو رقص و سرور کی محفل جمتی ہو، کلرک نے ایک کلب کا نام اسے بتایا اور وڈ ٹیکسی میں سوار ہوکر سیدھا اس کلب میں جا دھمکا۔

کلب کے ہال میں جاکر اس نے اپنے لئے ایک سیٹ ریزرو کروائی اور انناس کا ٹھنڈا، میٹھا اور ترش جوس نوش کرتے ہوئے اسٹیج پر موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگا اسے وہاں پر آئے ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو سیدھا اسی کی طرف آرہا تھا یہ آدمی اپنی چال ڈھال سے انگریز نظر آتا تھا جب وہ سلام دعا کے بعد وڈ کے قریب ہی سیٹ پر براجمان ہوگیا تو ایک ہم وطن سے گفتگو میں مصروف ہوگیا۔ ”کیسے مترنم دھن بج رہی ہے؟“ اجنبی نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں بہت اچھی ہے لیکن سر اگر مزید دھیمہ ہوتو بہت اچھا ہے۔“ وڈ نے اپنی رائے دی اور پھر اجنبی سے پوچھا۔

”کیا آپ انگریز ہیں؟“

”بالکل۔“ اجنبی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ شاید برطانیہ سے چھٹیاں گزارنے یہاں آئے ہیں۔“

”ہاں ایسا ہی ہے دراصل مجھے دنیا کے مختلف مذاہب اور دنیا کے مختلف علاقوں میں پائے جانے والے مذہبی اداروں کے مسئلے کا ازحد شوق ہے، میں نے سنا ہے کہ اس ملک کے باشندے بڑے عجیب وغریب مذہبی عقائد رکھتے ہیں ان کے کئی مذہبی فرقے ہیں اور ہر فرقہ کسی نہ کسی خفیہ سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس شہر کے گردونواح میں ایک ایسی ہی خفیہ سوسائٹی کا وجود ہے جس کا نام ”ڈوڈو کلب“ ہے اس سوسائٹی یا حلقے کے ماننے والے ایسے دیوی دیوتاؤں کے پجاری ہیں جن کے دھڑ عام انسانوں سے مشابہ ہیں، ان کے سر مختلف جانوروں کے ہوتے ہیں۔“

”آپ کی اطلاع بالکل درست ہے اس حصہ میں

اس قسم کی بے شمار باتیں آپ کے دیکھنے اور سننے میں آئیں گی۔" اجنبی نے کہا اور پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "میرا نام سمن سیلز ہے مگر تمام دوست مجھے "سالٹی" کے نام سے پکارتے ہیں، میرا تیل کا کاروبار ہے اور میں نے یہاں تیل صاف کرنے کا کارخانہ لگا رکھا ہے۔"

جواب میں وڈ نے اس سے اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنا صحیح نام اور پیشہ امپورٹ ایکسپورٹ بتایا۔

جب وڈ نے عام جانوروں کے سر انسانی دھڑ رکھنے والے دیوتاؤں کا تذکرہ کیا تو سالٹی نے اسے بتایا کہ "مقامی لوگوں میں اس قسم کی بے شمار کہانیاں مشہور ہیں بلکہ وہ قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دیوتاؤں کو رات کے وقت جنگل میں اکثر دیکھا ہے اس نے مزید بتایا کہ یہاں سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کے قریب ایک پہاڑی پر ایک پرانی طرز کی قلعہ نما عمارت موجود ہے اس عمارت میں ایک تنہائی پسند انگریز رہتا ہے جسے مقامی لوگ ڈاکٹر کے نام سے پکارتے ہیں، اسے بہت کم باہر آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ مکان اونچی اونچی بلند دیواروں سے گھرا ہوا ہے، دیواروں پر ہر وقت مسلح پہرے دار پہرہ دیتے ہیں، گاؤں میں ڈاکٹر اور اس کے قلعے کے بارے میں عجیب وغریب قسم کی باتیں مشہور ہیں اور مقامی لوگ دن کے وقت بھی اس مکان کے قریب جانے سے کتراتے ہیں، لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے مکان کے اردگرد پھیلی ہوئی پہاڑیوں اور جنگل میں ایسی مخلوق دیکھی گئی ہے جس کا دھڑ انسانوں جیسا اور سر مختلف جانوروں جیسا ہے۔ دلچسپ جگہ ہے۔"

وڈ نے جوس کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اسے دیکھنے ضرور جاؤں گا۔"

وڈ کو اٹھتے ہوئے دیکھ کر سالٹی خود بھی اٹھ گیا، جب وڈ کلب کے کاؤنٹر پر بیٹھے کلرک سے باتیں کر رہا تھا تو اس کی نگاہ فون کرتے ہوئے سالٹی پر پڑی وہ کوئی نمبر ملانے کے بعد اپنی زبان میں کہہ رہا تھا۔ "مجھے ڈاکٹر سے ملاقات کرنی ہے۔"

وڈ پندرہ میل کا سفر ایک کرائے کی کار میں طے کرتے ہوئے پہاڑی کے دامن میں واقع گاؤں میں پہنچا تو آدھی رات کا وقت تھا تاہم اسے گاؤں میں چائے کی ایک ایسی دکان مل گئی جو اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی، وڈ دکان کے مالک کے پاس ایک کرسی پر براجمان ہوگیا اور اس سے پہاڑی پر واقع عمارت کے متعلق دریافت کرنے لگا مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عمارت کا نام آتے ہی دکان کے مالک کا رنگ فق ہوگیا اور وہ جواب دینے کے بجائے اپنے عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔ "کیا آپ مجھے اتنی بات بھی نہیں بتاسکتے کہ مکان تک پہنچنے کے لئے مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے آخر اس میں تمہارا کیا نقصان ہے؟"

"نقصان" دکاندار نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "اس سے میری اور تمہاری، ہم دونوں کی جان کو نقصان کا اندیشہ ہے، وہاں جاکر کیا لینا ہے میاں، وہاں تو ایسے ایسے دیو اور جن مقیم ہیں کہ کچھ مت پوچھو کیا تم نے کبھی شیر، مگرمچھ اور خونخوار چمگادڑ کے چہرے والے دیو قامت انسان دیکھے یا سنے ہیں وہ جگہ ایسے ہی بھوتوں کا مسکن ہے، دن دیہاڑے گاؤں سے لوگ غائب ہوجاتے ہیں، پہاڑی پر سے زرافے کی گردن شکل اور چمگادڑ کے پروں والی چیز چیتے کی سی تیز رفتاری سے نمودار ہوتی ہے اور پلک جھپکنے میں انسان غائب ہوجاتا ہے، میری مانو تو ان ہی قدموں واپس لوٹ جاؤ، کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔" نیک دل دوکاندار نے وڈ کو روکنے کے لئے اپنی سی ہر ممکن کوشش کی مگر بالآخر اس کے اصرار پر زچ ہوکر اسے راستہ بتادیا اس کی ہدایت کی روشنی میں وڈ نے اپنی کار قلعہ نما عمارت کی طرف جانے والی پگڈنڈی کے سرے پر چھوڑی اور خود اپنے آٹو میٹک پستول کو ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا جس کی نورانی کرنیں چاروں اطراف کو منور کررہی تھیں۔ دس منٹ بعد جب وہ اونچے نیچے پتھریلے راستے پر چلا جارہا تھا تو

اس کے کانوں پر کسی پرندے کے پروں کی سرسراہٹ سی سنائی دی اور وہ ٹھٹک کر سامنے کے رخ آسمان کی طرف دیکھنے لگا یکدم اس کی نظر ایک عجیب وغریب چیز پر پڑی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا، ایک انسانی شکل جس کے بازوؤں کی جگہ پر لگے ہوئے تھے چاندکی روشنی میں اڑتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھی، خونخوار پنجوں والے اس بھوت کی صورت سخت مہیب اور خوفناک تھی، اس بلا کا مقابلہ کرنے کے لئے وڈ راستہ چھوڑ کر درختوں کی اوٹ میں ہوگیا اور پستول پر اس کی گرفت اور بھی زیادہ سخت ہوگئی۔

پیشتر اس کے کہ وہ بلا حملہ آور ہو کر وڈ کو اپنے تیز پنجوں یا نوکیلے دانتوں کا نشانہ بناسکتی، فضا میں لرزادینے والے دھماکے کی آواز گونجی اور بندر کے چہرے اور انسانی دھڑ والی مکروہ صورت چمگادڑ ہیبت ناک چیخیں مارتی زخمی کبوتر کی مانند لوٹ پوٹ ہوتی زمین پر گری اور گرتے ہی ختم ہوگئی، اتنی آسانی سے چھٹکارا پانے پر وڈ نے سکون اور اطمینان کا سانس لیا اور بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا، رات کے سناٹے میں اس عجیب وغریب لاش کا معائنہ کرتے وقت وڈ کا سارا بدن پسینے میں نہا گیا اور خوف کی لہر اس کی رگ رگ میں سرایت کرگئی، گاؤں کے دکاندار نے کچھ غلط نہ کہا تھا یہ سوچتے وقت اس کا سارا جسم خوف کے مارے کانپ رہا تھا کہ قلعہ نما عمارت کے اندر پہنچ کر خدا جانے اسے کیسی آفتوں سے واسطہ پڑنے والا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وڈ درختوں کی اوٹ سے چھپتا چھپاتا دوبارہ پہاڑی پر واقع عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا، عمارت کی بیرونی دیوار کے پاس پہنچ کر وڈ نے اس کی اونچائی کا اندازہ لگایا یا بغیر کسی سہارے کے دیوار پھلانگنا ممکن نہ تھا، چنانچہ اس نے ایک ایسا درخت منتخب کیا جس کی شاخیں دیوار پر جھکی ہوئی تھیں اور بغیر آہٹ پیدا کئے وہ درخت پر چڑھنے لگا، دیوار کے برابر پہنچ کر اس نے شاخوں میں دبک کر ادھر ادھر نگاہ ڈالی، چاندکی روشنی میں ایک پہرے دار چھوٹی مشین گن بغل میں دبائے سامنے سے چلا آرہا تھا۔

وڈ نے سوچا کہ اسے ڈاکٹر اردن کا پتہ معلوم ہوگا تو اس کے لئے عمارت کے اندر داخل ہونے کا خطرہ مول لینا ہوگا، چنانچہ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور جب پہرے دار عین اس ٹہنی کے نیچے پہنچا جہاں وڈ چھپا ہوا تھا تو وڈ چیتے کی سی تیزی اور چالاکی سے اس پر جھپٹا اور پستول کے دستے کے ایک ہی وار میں پہرے دار بے ہوش ہوکر دھم سے زمین پر آرہا۔ وہ عمارت کے اندر داخل ہوچکا تھا اس پراسرار عمارت کی پہلی منزل مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی البتہ اس کے اندر سے جنگلی جانوروں اور درندوں کے پھنکارنے اور زور زور سے سانس لینے، لرزادینے والی صدائیں آرہی تھیں، وڈ نے اندازے سے جانوروں والے حصے کو ایک طرف چھوڑا اور خود دبے قدموں سے چلتا ہوا ایک ایسے حصہ میں داخل ہوگیا جو کسی سائنسدان کی تجربہ گاہ سے مشابہ نظر آتا تھا۔

وڈ نے جیبی ٹارچ کی مدد سے دیکھا کہ وہاں پر سائنس کا عجیب وغریب سامان مشینیں اور مختلف تیزابوں اور گیسوں کے بھرے ہوئے شیشے کے برتن اور سلنڈر چاروں طرف پڑے تھے ایک بہت بڑے گیس کے سلنڈر پر موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ''خطرہ'' بھڑک اٹھنے والی گیس، تجربہ گاہ کا ایک دروازہ ایک بڑے ہال میں کھلتا تھا ہال کے اندر دیواروں کے ساتھ ساتھ مضبوط سلاخوں کے اندر عجیب وغریب جانور بند تھے۔ جانوروں کے دھڑ آدمیوں جیسے تھے، البتہ ان کے سر مختلف تھے شیر کی نسل کے تمام درندوں سے لے کر مگرمچھ چمگادڑ، زرافہ اور اسی قسم کے تمام خونخوار درندے وہاں موجود تھے یہ تمام مخلوق خدا کی پیدا کردہ تو ہرگز نہیں تھی پھر وہ ظالم اور گمراہ شخص کون تھا جس نے یہ مکروہ کارنامہ سرانجام دیا۔

وڈ نے اس انسانیت دشمن شخص کی تلاش میں دوسری منزل کا رخ کیا اب رفتہ رفتہ تمام معاملہ وڈ کی سمجھ میں آنے لگا تھا، ڈاکٹر اردن سائنس کے جس شعبہ سے متعلق تھا۔ وہ انسان کے جسم کی بناوٹ اور نشوونما سے

براہ راست تعلق رکھتا تھا اور ڈاکٹر ارون نے اس شعبہ میں زندگی بھر تجربات کرنے کے بعد وہ شہرہ آفاق دوائیاں ایجاد کرنے میں کامیاب ہوا تھا جو انسانی جسم کے معاملے میں انقلاب انگیز ثابت ہوئی تھیں، اس پراسرار عمارت کا مالک بھی یقیناً کوئی سائنسدان تھا اور وہ اپنے فن کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کرنے کے بجائے انسانی جسم کو مسخ کرکے درندوں کی شکل دینے میں استعمال کر رہا تھا اور اس نے اس مکروہ کام میں مدد حاصل کرنے کے لئے ڈاکٹر ارون کو اغوا کیا تھا۔

دوسری منزل پر پہنچ کر وڈ نے دیکھا کہ برآمدے کے آخری سرے پر ایک سلاخ دار کوٹھری میں سے روشنی نکل رہی تھی۔ وڈ دبے پاؤں اس کوٹھری کی طرف چلا تو راستہ میں ایک بند کمرے میں سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز اسے سنائی دی وہ وہیں ٹھٹک گیا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر سننے لگا آواز آرہی تھی۔

"میں نے تمہیں تاکید کی تھی کہ جیسے بھی ہو تمہیں وڈ کو ہلاک کرنا ہے۔"

"کیا؟"

"اس نے اڑنے والے شیر کو قتل کر دیا ہے؟"

"اچھا اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تم اس کا سراغ لگانے کی کوشش کرو دیکھو اب سستی کاہلی نہیں ہونا چاہئے۔"

بات ختم ہونے پر وڈ نے درز میں سے دیکھا تو ایک عجیب مکروہ صورت شخص جس کی پشت پر اونٹ کی طرح کا کوہان بنا ہوا تھا اور اس کا سر غیر معمولی طور پر بڑا تھا، مکان کے اندر استعمال ہونے والے ٹیلی فون کے ریسیور کو اسٹینڈ پر رکھ رہا تھا۔

وڈ کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ تو ابھی تک اس کی عمارت کے اندر موجودگی سے بے خبر ہیں، معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت تک بے ہوش پڑا پہرے دار کی کسی نے خبر نہ لی تھی، وقت بہت کم تھا۔

اب وہ کمرے کے اندر سے وہ شخص شاید باہر کی طرف آرہا تھا وڈ جلدی سے برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں ہو لیا، ایک لمحہ بعد دروازہ کھلا اور وہ پراسرار شخص جو ڈاکٹر کے علاوہ اور کوئی نہ تھا اس سلاخ دار کوٹھری کی طرف چل دیا جہاں روشنی ہو رہی تھی۔

چند لمحوں کے وقفے کے بعد وڈ بھی اس کے تعاقب میں چلتا ہوا کوٹھری کے قریب جا پہنچا اندھیرے کے رخ کھڑے ہو کر وڈ نے کوٹھری کے اندر نظر ڈالی، ڈاکٹر ایک ایسے شخص کے اوپر جھکا ہوا تھا جس کے ہاتھ پاؤں بیڑیوں اور زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے اور بے بس قیدی نفرت بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔ "میں تم پر اور تمہاری پیش کش پر لعنت بھیجتا ہوں، یاد رکھو میں ہرگز تمہارے ساتھ کام نہیں کروں گا، چاہے تم مجھے مار بھی ڈالو، میرا جواب پھر بھی یہی ہوگا۔"

"ارون، بے وقوف نہ بنو تم بہت بڑے سائنسدان ہو میرے علاوہ دنیا بھر میں تمہارا کوئی ثانی نہیں، اگر تم میرا ساتھ دینے پر رضامند ہو گئے تو ہم دونوں مل کر ساری دنیا پر حکومت کر سکتے ہیں، ہمارا تیار کردہ مخلوق زمین، سمندر اور ہوا میں ایسی تباہی مچا سکتی ہے جس کا توڑ دنیا بھر کی کسی حکومت کے پاس نہیں ہوگا، تمہاری مدد سے میں ایسے دیو پیکر اور فولاد صفت سپاہیوں کی ایسی فوج تیار کر سکتا ہوں جو چند دنوں میں ساری دنیا کو ہمارے قدموں پر جھکنے کے لئے مجبور کر سکتی ہے وہ سپاہی ہاتھی کی مانند طاقتور، چیتے کی طرح برق رفتار اور ہوا کی شکل نظر آنے والے ہوں گے۔"

"تم مجھے کتنی ہی دولت دو مگر میرا جواب سن چکے ہو، میں آخری وقت تک اس پر قائم رہوں گا۔"

یاد رکھو میں تمہیں ایک ایسے حقیر کیڑے میں بدل سکتا ہوں جو....."

پیشتر اس کے وہ اپنی بات پوری کر سکتا ڈاکٹر ارون نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا، اس پر اس کمینہ صفت اور مکروہ صورت ڈاکٹر کی جو حالت ہوئی وہ دیکھنے کے لائق تھی، وہ مارے غصے کے زور زور سے زمین پر پاؤں پٹختا اور نفرت سے پھنکارتا ہوا دروازہ بند کر کے یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ "میں تمہیں چھ گھنٹے کی مہلت

دیتا ہوں اگر اس دوران میں اپنا فیصلہ نہ بدلا تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

میدان خالی دیکھ کر وڈو نے کی ہول کے ساتھ منہ لگا کر آہستہ سے کہا۔ "اروان! میں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں اور میں چابیاں تلاش کرنے جا رہا ہوں۔"

"محترم جلدی کرو ورنہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے پورا کرنے سے باز نہ آئے گا۔"

وڈ پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتا ہوا باری باری ہر ایک کمرے کا جائزہ لیتا جا رہا تھا کہ ایک کمرے کے سامنے وہ ٹھٹک کر رک گیا کمرے کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی تپائی پر چابیوں کا گچھا پڑا دیکھا، اس نے بڑی چوکنی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا، چاروں طرف رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا اور کسی انسان کا پتہ نہ تھا اس نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور دبے پاؤں چلتا ہوا تپائی کے پاس پہنچا، ابھی اس نے ہاتھ بھی نہیں بڑھایا تھا کہ زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور ساتھ ہی کسی نے اس کا نام لے کر کہا۔ "مسٹر وڈ، آخر پھنس گئے نا!"

وڈ نے گھوم کر دیکھا تو سامنے نائٹ کلب والا اس کا دوست سالٹی کھڑا تھا اس کے دائیں بائیں مگرمچھ کے چہروں والے دو وحشی ہاتھ میں پستول تھامے کھڑے تھے ان کی پشت پر خود ڈاکٹر کھڑا خوفناک نظروں سے وڈ کو گھور رہا تھا۔ "ہمیں معلوم ہوا کہ تم اندر داخل ہو چکے ہو اس لئے تمہیں پھنسانے کے لئے ہمیں یہ چھوٹا سا جال بچھانا پڑا۔"

سالٹی نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "مسٹر وڈ حیران کیوں ہوتے ہو، ڈوڈو کلب کا میں ہی صدر ہوں کلب میں تم سے ملنے کے بعد ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم کون ہو اور یہاں کس ارادے سے آئے ہو، اس لئے ہم نے تم سے نمٹنے کے لئے اسی وقت انتظام کیا تھا تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم حملے سے بچ نکلے مگر اب نہ بچ سکو گے۔"

وڈ نے آخری وقت میں حوصلہ نہ ہارا اور کن انکھیوں سے کمرے کا جائزہ لیا اس کی یہ حرکت سالٹی سے نہ چھپ سکی اور اس نے اسی وقت وڈ کو ٹوکا۔ "وڈ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس پر تمہیں پچھتانا پڑے۔ خاموشی سے اپنے ہاتھ اوپر کر لو اور اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرو۔" یہ کہتے ہوئے سالٹی نے آگے قدم بڑھایا۔

مگر اتنی دیر میں وڈ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اس نے دیکھا کہ دائیں ہاتھ کی دیوار کے ساتھ کھڑی الماری کے پیچھے ایک چھوٹا سا خفیہ دروازہ تھا جو یقیناً کسی زینے کا راستہ تھا وڈ نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا پستول نکالا اور یکے بعد دیگرے دو فائر کرتے ہوئے ایک چھلانگ میں الماری کے پیچھے پہنچ گیا۔

سالٹی اور اس کے گرگوں کے فائروں سے سارا کمرہ گونج اٹھا اور مارے دھوئیں کے سانس لینا دوبھر ہو گیا وڈ نے دھوئیں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اندازے سے سالٹی پر ایک فائر کیا اور زخمی کرتا ہوا زینے کا دروازہ بند کر کے تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا، دوسرے لمحے وہ تجربہ گاہ کے اس حصہ میں موجود تھا جہاں بھڑک اٹھنے والی گیس کا سلنڈر رکھا تھا وڈ جلدی سے اس سلنڈر کو اٹھا کر دروازے کے پاس گیا اور کھٹکا دبا کر اس کا منہ کھول دیا جس سے خطرناک گیس تیزی سے باہر نکلنے لگی۔

سالٹی کے گرگے جلدی جلدی ایک دوسرا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے وڈ نے انہیں اپنے حال پر چھوڑا اور خود درندوں کے پنجروں کے پاس پہنچ کر تیزی سے ان کے دروازے کھولنے لگا، پنجروں کے منہ کے درمیان دروازہ توڑ رہے تھے، خونخوار درندوں کو آزادی نصیب ہوئی تو انہوں نے چوکیداروں اور دیکھ بھال کرنے والوں ہی کو آگے رکھ لیا اور بڑھ بڑھ کر ان پر حملہ آور ہوئے، وڈ جانتا تھا کہ اب ان میں سے کوئی شخص ان اس کے تعاقب میں نہیں آئے گا، وہ دو سیڑھیاں ایک ایک قدم میں پھلانگتا دوسری منزل پر پہنچا اور ڈاکٹر اروان کی کوٹھری کا تالا پستول کی گولی سے توڑ کر جلدی سے اندر داخل ہو گیا، ڈاکٹر کی زنجیروں اور بیڑیوں کے ساتھ بھی اس نے وہی سلوک کیا جو تالے کے ساتھ کر چکا تھا، ڈاکٹر اروان نے آزاد ہو کر کھڑا ہونے کی کوشش کی مگر بھوک، کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے کھڑا نہ

ہوسکا اور لڑکھڑا کر گر پڑا، اب برآمدے کے دوسرے سرے سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔

ڈاکٹر ارون کو ساتھ لے جانے کا ایک ہی طریقہ تھا، وڈ نے اسے اپنے کندھوں پر ڈالا اور جدھر منہ اٹھا تیزی سے بھاگ اٹھا اس وقت تک ان کی خوش قسمتی سے آسمان پر بادل گھر آئے جن کی وجہ سے چاند کی روشنی اندھیرے میں بدل گئی، وڈ نے نچلی منزل میں پہنچ کر دیکھا کہ کسی چوکیدار کی چلائی ہوئی گولی ہوا میں پھیلی ہوئی گیس میں آگ لگا چکی تھی جس کی وجہ سے اندھیرے میں ڈوبی اس پراسرار عمارت میں جگہ جگہ آگ لگ گئی تھی۔ وڈ ڈاکٹر ارون کو اٹھائے بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں چلتا ہوا جب بڑے دروازے کے پاس پہنچا تو دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ بڑا دروازہ، چوپٹ کھلا تھا اور اس کے آس پاس کسی محافظ کا نام ونشان تک نہ تھا۔ دروازے سے نکل کر وڈ تیز تیز قدموں سے پہاڑی کی اترائی اتر رہا تھا کہ یک لخت اس کے کانوں میں بہت سے آدمیوں کے بھاگنے کی آواز آئی۔

وہ لوگ وڈ کے تعاقب میں آرہے تھے، وڈ نے جلدی سے ڈاکٹر ارون کو ایک پتھر کی اوٹ میں لٹا دیا اور گھوم کر دیکھا تو اسے قلعہ نما عمارت آگ کے شعلوں میں گھری ہوئی نظر آئی چند لمحے بعد وڈ کی نظر عجیب و غریب مخلوق پر پڑی، یہ ایک دس فٹ لمبا دیو قامت انسان تھا جو تین شاخوں والا نیزہ ہاتھ میں لئے ان کے تعاقب میں بھاگا آرہا تھا۔ وڈ نے اسی کے قدموں کی آواز سن کر یہ سمجھا تھا کہ بہت سے آدمی ان کے پیچھے بھاگے آرہے ہیں، اس کے قریب پہنچتے ہوئے وڈ نے یکے بعد دیگرے تین گولیاں فائر کیں مگر یہ دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ ان میں کسی گولی کا اس دیو پر صرف اس قدر اثر ہوا تھا کہ اس کا نیزہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دونوں ہاتھ آگے بڑھاتے جیسے وڈ کی گردن کو گرفت میں لینے کے لئے اس کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔

وڈ نے سوچا کہ اس دیو کا مقابلہ اس مقام سے دور ہٹ کر کرنا چاہئے تاکہ ڈاکٹر ارون کو کوئی تکلیف نہ ہو لیکن وڈ کو جنگل کی طرف بھاگتے دیکھ کر اس دیو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، جیسے وہ وڈ کی اس بچکانہ حرکت پر مسکرا رہا ہو اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک اچھے بھلے درخت کو ایک ہی جھٹکے میں یوں جڑوں سے اکھاڑ لیا جیسے کوئی وہ مولی گاجر کا پودا تھا اور وڈ کا راستہ روکنے کے لئے اس درخت کو دور ہی سے اس کے راستے میں ڈال دیا پھر اس نے دوسرا اور تیسرا درخت اکھاڑا اور ان دونوں کو بھی وڈ کے اردگرد یوں ڈال دیا جیسے کوئی مویشی خاردار ٹہنیوں کے باڑے میں گھرا ہوا ہو اب وڈ کے سامنے فرار کا ایک ہی راستہ تھا اور اس راستے کے منہ پر وہ دیو کھڑا فلک شگاف قہقہے لگا رہا تھا اب وڈ کے پستول میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں، مگر اس نے بددل ہونے کے بجائے پستول کو دستے کی طرف سے ہاتھ میں پکڑ لیا اور لحہ بہ لحہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیو سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

وڈ جاپانی طرز کی کشتی جوڈو کا بہترین ماہر تھا چنانچہ اس نے اپنے اس فن سے کام لینے کا تہیہ کیا اور جب وہ خونخوار دیو دونوں ہاتھ آگے بڑھاتے اس کے قریب پہنچا تو وڈ نے بجلی کی سی برق رفتاری سے نیچے جھک کر وار بچایا اور لومڑی کی سی پھرتی سے دیو کی دونوں ٹانگوں میں سے نکل کر اس کے عقب میں پہنچا اب اس کے وار کرنے کا موقع تھا چنانچہ اس نے دیو کی ریڑھ کی ہڈی پر وزنی پستول کا ایک ایسا ہاتھ جمایا کہ وہ ایک ہی وار میں زمین پر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ اب میدان وڈ کے ہاتھ میں تھا اور وڈ کامیاب رہا۔

دوسرے روز جب وڈ اور ڈاکٹر ارون لندن جانے والے ہوائی جہاز میں بیٹھے وطن کی طرف جارہے تھے تو دنیا میں کسی شخص کو معلوم نہیں تھا کہ وڈ کتنا بڑا کارنامہ سرانجام دے کر آرہا ہے۔ اس نے نہ صرف اس پراسرار قلعہ نما عمارت کو تہس نہس کر دیا تھا بلکہ ڈاکٹر سمیت اس کے تمام ساتھیوں کو بھی ٹھکانے لگا کر دنیا کو ایک بہت بڑی آفت سے نجات دلائی تھی۔

انوکھا آئیڈیا

طارق محمود۔ اٹک

برے کا انجام کسی صورت بھی اچھا نہیں ہوتا مگر برائی کرنے والے اپنے تئیں دندناتے پھرتے ہیں اور بالکل بھول جاتے ہیں کہ جو پوری کائنات کا مالک ہے وہ ہر عمل کو دیکھ رہا ہے اور پھر برائی کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔

حقیقت سے چشم پوشی ہمیشہ زندہ در گور کر دیتی ہے اسی کے مصداق سبق آموز کہانی

"یہ نقشہ تمہارے والد کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔" شان نے اپنے ہاتھ میں پکڑے اس چھوٹے سے کاغذی نقشہ کو الٹ پلٹ کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں" میں نے اتنا ہی جواب دیا پھر جیب سے ایک اور کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ شان نے اس کاغذ کو کھولا اور کچھ سیکنڈ بغور دیکھنے کے بعد با آواز بلند پڑھنے لگا۔

"میرے بیٹے میں اپنے آخری وقت میں بہت ہی شرمندہ اور افسردہ ہوں کہ تمہیں اکلوتا ہوتے ہوئے بھی زندگی کی حقیقی خوشیاں نہ دے سکا۔ لیکن وقت گواہ ہے کہ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ تمہیں پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بناؤں اور میری یہ کوشش تمہاری پڑھائی کی حد تک کامیاب رہی لیکن تمہاری معذوری دیکھ کر میں بہت ہی پریشان ہوں، کاش کے تمہارے لئے وہ پہلے ہی حاصل کر لیتا جواب بتانے جا رہا ہوں،

تمہاری معذوری نے مجھے مجبور کردیا کہ وہ بات جس سے کہ میں پوری زندگی پچتارہا اور تمہیں بھی اس سے دور ہی رکھنا چاہتا تھا وہ ایک چھپا ہوا خزانہ ہے جو کہ اتنا ہے کہ تمہاری آئندہ آنے والی سات نسلیں بھی عیش سے کھاتی رہیں تو ختم نہ ہو لیکن کہتے ہیں کہ پیسہ آتا ہے تو اپنے ساتھ ان دیکھی بلائیں بھی لے آتا ہے اسی ڈر سے میں نے کبھی اس خزانے کے بارے میں مکمل جاننے کے باوجود بھی حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ کاش کے میں اسی وقت اس کو حاصل کرلیتا جب تم پر پولیو کا حملہ ہوا تھا تو تم یوں معذور نہ پھرتے لیکن جو اللہ کو منظور۔ نقشہ بنا کر میں نے اس خط کے ساتھ ہی رکھ دیا ہے، بیٹے اس خزانہ کو حاصل کرنا ضرور لیکن اس میں سے غریبوں اور محتاجوں کے لئے ضرور خرچ کرنا تمہارے ذہن میں یہ خیال بھی ہوگا کہ یہ خزانہ آیا کہاں سے یہ ایک لمبی کہانی ہے اور میرے پاس اب اتنا وقت نہیں بس اپنے والد کو معاف کردینا کہ میں تمہارے لئے زندگی میں کچھ نہ کرسکا اور ہاں ایک بات یاد رکھنا خزانے کو حاصل کرنے کے لئے بہت سے آدمی جان گنوا بیٹھے ہیں تم عجلت اور لالچ سے کام نہ لینا۔"

شان نے وہ خط مکمل پڑھا تو اس کے بعد چند منٹ تک خاموشی سی ہوگئی کمرہ میں ہم چار آدمی بیٹھے تھے۔ شان، مراسل تنویر اور میں طارق لیکن خاموشی سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے کمرہ میں کوئی نہیں۔

"ایک بات غور طلب ہے۔" شان نے اس خاموشی کو توڑا اور ہم سب اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔

"تمہارے ابو نے نقشہ تو بنادیا لیکن خزانہ کو خاص طور پر نشان زدہ نہیں کیا۔"

"ہاں بس اس غار تک نشان لگے ہیں، جس میں خزانہ ہو سکتا ہے۔" شان کی بات کو میں نے مکمل کردیا۔

"یار اس میں اتنا سوچنے والی بات کیا ہے ہم چار ہیں آخر ڈھونڈ ہی لیں گے مل کر خزانہ۔" تنویر نے بھی کہا۔

اس کے بعد ہم سب خزانے تک پہنچنے کا پلان بنانے لگے اور پھر کچھ ہلکے پھلکے اختلاف کے بعد دو دن بعد ہی اس خزانے کو حاصل کرنے کا پلان ترتیب دیا گیا۔

"ابے طارق تو اتنا لمبا چل بھی لے گا......"

مراسل نے میری کمزور ٹانگ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں نہیں دوستو! دولت کی طرف تو اندھے، ٹانگ کٹے بھاگتے ہیں اس کی تو پھر بھی ٹانگیں ہیں، ایک کمزور ہے تو کیا ہوا۔" شان نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس بات پر ان تینوں نے بھی قہقہہ لگایا اور میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا ساتھ دیا۔

"یار جنگل تو اتنا بڑا ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا کہیں ہم غلط سمت تو نہیں جارہے۔" خیر ہم سب پروگرام کے تحت اپنے سفر پر روانہ ہوگئے، تینوں میں شان بہت ہی چالاک، ہوشیار اور خطرناک آدمی تھا اس کی آنکھیں ہر وقت سرچ لائٹس کی طرح گھومتی نظر آتی تھیں، جس کی بات سن کر میں تھوڑا نروس ہوگیا اور مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے چہرے کا رنگ بھی متغیر ہوگیا ہوگا لیکن چند سیکنڈ کے لئے پھر میں نے جلدی سے اپنے آپ پر کنٹرول حاصل کرلیا، مراسل میری طرف ہی دیکھ رہا تھا میں نے ہلکی سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی۔

"طارق وہ پہاڑ کتنا دور ہے۔" شان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "اس سے کیا پوچھتے ہو یار یہ بھی تو ہماری طرح پہلی بار اس جنگل میں آیا ہے۔" تنویر نے شان کی بات کے جواب میں کہا۔

"طارق نقشہ نکال کہ شاید پتا چل جائے کہ ہم اس وقت کہاں بیٹھے ہیں۔"

تنویر کے کہتے ہی میں نے نقشہ نکالا اور پھر ہم لوگ نقشہ کو غور سے دیکھنے لگے۔ ہمیں اپنی گاڑی میں یہاں تک پہنچتے ہوئے ایک دن اور رات کا کچھ حصہ لگ چکا تھا، جنگل سے باہر ہی چھوٹا سا ٹینٹ لگا کر رات بسر کی اور پھر صبح ہوتے ہی ناشتہ کرنے کے بعد ہم لوگوں نے آگے کا رخ کیا اور اب گیارہ بج رہے تھے لیکن ہم ابھی تک جنگل ہی میں بھٹک رہے تھے۔ نقشہ کے مطابق ان پہاڑوں تک پہنچتے ہوئے دو سے تین گھنٹے مزید لگ سکتے تھے۔

''دوستوں ہمیں جلدی چلنا چاہئے تاکہ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی خزانہ تلاش کرلیں۔'' شان یہ کہتے ہی اپنا بیگ اٹھا کر چل پڑا اور اس کے پیچھے ہم لوگ بھی۔

ہم سب کے پاس ایک ایک بیگ تھا جس میں ضرورت کا ہلکا پھلکا سامان تھا جس گاڑی میں ہم آئے تھے وہ شان کی تھی۔ جنگل میں جہاں تک گاڑی چل سکتی تھی وہاں تک ہم لوگ گاڑی ہی میں آئے تھے اور پھر گاڑی کو گھنے درختوں کے اندر چھپا کر اس کے اوپر درختوں کی شاخیں رکھ دیں تاکہ وہ مکمل چھپ جائے، اس میں سے اپنے بیگ نکال لئے، میرا اور مراسل کا ہلکا سا بیگ تھا جبکہ شان اور تنویر کے پاس وزنی بیگ تھے جن میں پہاڑی پر چڑھنے کے لئے کچھ اوزار تھے اور مضبوط رسیاں بھی۔

اونچے نیچے راستے کانٹے دار جھاڑیوں کی بہتات زہریلے اور کاٹنے والے کیڑوں کا خوف لیکن خزانہ پانے کی خواہش ان سب پر حاوی گھنے جنگل سے ہٹ کر ہری بھری پہاڑیوں کا ایک سلسلہ نظر آیا جس کے دامن میں ایک صاف شفاف پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ ہم سب نے وہاں سے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور پھر اپنی منزل کی طرف چلنے لگے پھر پہاڑی پہ آہستہ آہستہ چڑھنے لگے اب میں سب کو لیڈ کر رہا تھا تھکن کی وجہ سے میری ٹانگ میں کافی تکلیف تھی لیکن میں برداشت کرتا رہا۔ ہم نے اپنی طرف سے جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش کی لیکن سورج پھر بھی غروب ہونے ہی والا تھا۔ ہماری منزل ہمارا مطلوبہ غار سامنے ہی تھا جس کے سامنے پہنچتے ہی میں نے ان تینوں کی طرف دیکھا ان کے چہروں پر خوشی سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بھی اپنے چہرے سے خوش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن میرے اندر ایک لاوا سا ابلتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تینوں اکٹھے ہو کر غار میں داخل ہوگئے پھر میں بھی بوجھل قدموں سے ان کے پیچھے اندر پہنچا تو انہیں حیران کھڑا پایا۔ کیونکہ اس غار کے اندر چھوٹے بڑے سات غار مختلف سمتوں میں جاتے نظر آئے اور غار کے فرش پر کچھ گہری کھائیاں بھی تھیں۔ اندھیرا ہونے لگا تھا اس لئے ہم سب نے ٹارچ نکال کر روشن کرلیں۔

''دوستو! رات ہونے والی ہے یہ غار مجھے خطرناک لگ رہے ہیں۔ اس لئے زیادہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہمیں دو دو کی ٹولی بنا کر جتنا آسانی سے ہو سکے خزانہ تلاش کرنا ہوگا اور پھر اس کے بعد اسی بڑے غار میں رات گزارنے کا بندوبست کریں گے۔'' شان نے اونچی آواز میں جیسے اعلان کیا۔

اس طرح میری اور مراسل کی اور شان کے ساتھ تنویر دو ٹولیاں بن گئیں اور پھر ہم لوگ ڈسکس کرنے لگے کہ پہلے کس طرف سے اور کس ٹولی کو کہاں سے شروع کیا جائے۔'' طارق...... یار اگر تیرا باپ خزانہ کی نشاندہی کر دیتا تو کتنی آسانی ہوتی۔'' مراسل نے آہستہ سے کہا۔ ہم سب اس کی بات سن کر خاموش ہی رہے۔

''اب باتیں نہیں بس کام۔'' شان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اور پھر ہم لوگ دو دو کی ٹولیوں میں خزانہ کی تلاش میں ان چھوٹے غاروں میں داخل ہوگئے، میں اور مراسل جس غار میں داخل ہوئے وہ ایک تنگ سا غار تھا جس میں ایک ہی آدمی کے چلنے کی جگہ تھی تو مراسل آگے اور میں اس کے پیچھے۔ کافی لمبا غار تھا۔ ہم آگے ہی آگے چلتے رہے پھر کچھ دیر مزید چلنے کے بعد سامنے سے ہلکی ہلکی روشنی کی جھلک نظر آنے لگی اور پھر اچانک وہ تنگ غار ختم ہوگیا اور ہم ایک بڑے ہال میں جا نکلے۔ جس کی دیواریں باقاعدہ پہاڑی کو اندر سے کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ اس ہال کے بیچ ایک کنواں بھی تھا۔ مراسل نے کنواں دیکھتے ہی اس میں ٹارچ کی لائٹ ڈال کر جھانکا، میں اس سے کچھ پیچھے تھا۔'' طارق......'' وہ اتنا ہی کہہ سکا کہ میں نے ہاتھ میں پکڑی اسٹک پوری قوت سے اس کے سر کے پیچھے ماری تو اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی ساتھ ہی اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ کنویں میں قلابازی کھا کر گر گیا۔ اس کی چیخ بہت ہی بھیانک تھی جو کہ آخری ثابت ہوئی۔

اس کی چیخ تھمتے ہی میں نے احتیاط سے اس کنویں میں ٹارچ سے دیکھا جس کی تہہ روشنی سے اوجھل تھی۔ مجھے اسی وقت ایک جھٹکا لگا، مراسل کے چیخنے کی آواز کچھ اونچی تھی اور ضرور شان اور تنویر نے بھی سنی ہوگی اسی لئے میں بے ڈھنگی آواز میں شور مچاتا واپس اسی سرنگ نما غار میں بھاگا، وہی ہوا راستے میں وہ دونوں بھاگتے ہوئے آرہے تھے جن سے میں ٹکراتے ٹکراتے بچا اور اس تنگ سی جگہ پر گرنے کے انداز میں بیٹھتا چلا گیا۔ میری اسٹک میرے ہاتھ میں ہی تھی۔

"کیا ہوا" ان دونوں کے منہ سے اکٹھا نکلا۔

"اور مراسل کہاں ہے۔" شان نے ٹارچ کی لائٹ میرے پیچھے غار میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"وہ......وہ......" میں اٹکنے لگا۔

"کیا ہوا طارق اور کس چیز سے اتنا ڈر گئے ہو......؟ مراسل کہاں ہے بتاؤ۔"

میں کانپنے لگا اور چہرہ ایسا بنالیا جیسے کہ بہت ڈرا ہوا ہوں۔ تنویر نے کمر سے لٹکتی پانی کی بوتل سے مجھے پانی پلایا۔

"میں اور مراسل غار میں آگے جارہے تھے، میں تھوڑا تھکا ہوا تھا اس لئے آہستہ چل رہا تھا جبکہ مراسل مجھ سے بہت آگے نکل گیا کچھ دیر بعد اس کے چیخنے کی آواز سنائی دی تو میں تیزی سے ادھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ......ان کی ٹارچ اپنی لائٹس میرے چہرہ پر ڈال رہی تھیں جس کی روشنی میں ان دونوں کو ضرور میرے چہرہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی نظر آرہی ہوں گی۔

"تم نے کیا دیکھا۔" شان نے مجھے ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے دیکھا کہ مراسل زمین پر گرا ہوا ہے اور اسے ایک سفید اجلے کپڑوں والی عورت جس کے بال سنہرے اور لمبے لمبے تھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک غار میں کھینچ کے لے جارہی تھی غائب ہونے سے پہلے اس نے منہ موڑ کر میری طرف دیکھا تو میں یقین نہ کرسکا وہ......وہ......"

"کیسی باتیں کررہے ہو تمہارا وہم ہوگا۔" شان نے میری بات کاٹ کر تشویش زدہ لہجہ میں کہا۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیا اور کھڑا ہوگیا۔

"اور پتا ہے وہ چہرہ کس کا تھا......" میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سسپنس پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کس کا......؟" تنویر نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ذوبی ہی تھی۔" میں نے خوابیدہ لہجہ اختیار کیا۔

"کیا۔" دونوں نے بیک وقت حیران ہوکر کہا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ان کو جھٹکا بھی لگا کیونکہ ان کے ہاتھوں میں پکڑی ٹارچیں لرز سی گئیں اور دونوں گم صم ہوگئے۔ کچھ دیر کے لئے اس غار میں سکوت سا چھا گیا۔

"کیسی گھسی پٹی باتیں کررہے ہو طارق وہ ذوبی نہیں ہوسکتی، ضرور تمہیں دھوکہ ہوا ہے، اسے تو ہم نے......" شان روانی میں کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

"میرا مطلب ہے اس کی لاش تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔" اس نے سنبھل کر بات مکمل کردی۔ لیکن اس کے لہجہ سے خوف اور بے یقینی جھلک رہی تھی۔ میں اب آہستہ آہستہ اٹھا اور ان دونوں سے منت کرتے ہوئے کہا۔ "پلیز یہاں سے نکلیں وہ ضرور ذوبی کی روح ہے وہ ہم سب کو ماردے گی۔"

میری یہ بات انہیں ضرور میری بنائی کہانی پہ یقین دلادیتی۔ لیکن وہ دونوں کچھ دیر سوچنے کے بعد بھی واپسی کے لئے تیار نہ ہوئے۔

"نہیں ہم مراسل کو ڈھونڈیں گے اور ساتھ میں خزانہ بھی۔" شان نے اٹل لہجہ میں کہا۔ "تم آؤ ہمیں وہ جگہ دکھاؤ جہاں سے تمہارے بقول مراسل کو ذوبی کی روح لے گئی۔" پھر انہوں نے مجھے سختی سے پکڑا اور اپنے ساتھ اس سرنگ میں سے گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے سرنگ تنگ تھی اس لئے انہیں بہت مشکل پیش آرہی تھی اور مجھے بہت تکلیف ہورہی تھی کیونکہ دیواریں اور فرش

مجھے بری طرح زخمی کر رہے تھے لیکن شان کے انداز میں ایک جنون سا تھا اور مجھے اپنی موت صاف نظر آنے لگی کیونکہ ان کی گرفت سخت سے سخت ہوتی جارہی تھی۔ جس سے میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔

ذوبینہ جسے پیار سے اس کی دوست، گھر والے اور پھر میں ذوبی کہتے تھے۔ اتنی اسمارٹ تھی کہ جب اس کی پشت اور بال سنہرے اور لمبے جو کہ پشت پر لہراتے ہوا سے اٹھکھیلیاں کرتے تو یقیناً ہر کسی کا دل چاہتا کہ پیچھے سے اتنی اسمارٹ نظر آنے والی اور سنہرے لمبے بالوں والی چہرہ سے بھی خوب صورت ہوگی۔ لیکن ذوبی سانولے رنگ کی لڑکی تھی اس کے چہرہ پر نمایاں اس کی آنکھیں اور اس کے بعد اس کے بات کرنے کا انداز بہت ہی پیارا تھا اور میرے لئے سب سے بڑی بات یہ کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے ہم دونوں ہی نفسیات کے طالب علم تھے ہمارا زیادہ وقت ساتھ گزرتا تھا۔

ذوبی گاؤں سے اپنی بیوہ خالہ کے گھر آئی ہوئی تھی اس کی غرض پڑھائی تھی اور اس کی خالہ کی مجبوری اکیلا پن، ذوبی کے شہر آتے ہی دونوں کی مجبوریوں کا مداوا ہوا۔ ہمارے پہلے سمسٹر کے امتحانات ہوگئے تھے، ذوبی نے مجھے اپنے ساتھ اپنے گاؤں لے جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ میں اسے اپنے ابو سے ملا چکا تھا اور وہ میرے ابو کو بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے بعد ذوبی مجھے اپنے والدین سے ملوانے جارہی تھی کہ اچانک ذوبی گم ہوگئی اس کی خالہ نے مجھے بتایا اور پھر ہم مل کے ڈھونڈتے رہے لیکن وہ نہ مل سکی۔

پولیس میں رپورٹ کروائی گئی، ذوبی کے والدین بھی شہر آگئے بہت ہی پریشان تھے لیکن دو ماہ تک تلاش کرنے اور اخبارات میں اشتہار دینے کے باوجود بھی ذوبی نہ مل سکی اور پھر ایک دن مجھے پولیس اسٹیشن سے فون آیا اور جلد سے جلد وہاں پہنچنے کا کہا گیا۔ میرے ابو کی طبیعت بھی ان دونوں کچھ خراب تھی۔ میں کتنی ہی دفعہ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی کوشش کر چکا تھا۔ لیکن وہ میرے ساتھ جانے سے انکاری تھے۔ روز بروز ان کی صحت گرتی جارہی تھی۔ میں نے ان کو دودھ گرم کرکے پلایا اور پولیس اسٹیشن پہنچا اور پھر پولیس والوں نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور ہاسپٹل کے مردہ خانے میں لے گئے جہاں ذوبی کی خالہ پہلے ہی سے باہر بیٹھی ہوئی تھیں جن کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرہ پر دکھ اور کرب جگ اٹھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن کچھ دیر آمنے سامنے کھڑے رہنے کے باوجود بھی بات نہ کرسکے۔

اس کے بعد پولیس والے مجھے اندر لے گئے میں سمجھ چکا تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ اب انسپکٹر اور سول کپڑوں میں دو آدمی کھڑے ان میں سے ایک تو ڈاکٹر تھا دوسرا ضرور کوئی پولیس اہلکار ہوگا۔ ان کے سامنے ہی ایک اسٹریچر پر لاش پڑی تھی جس پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی جب میں اس اسٹریچر کے پاس پہنچا تو اس اہلکار نے لاش کے چہرہ سے چادر ہٹادی۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ اس چہرہ کی طرف دیکھا جس پر گوشت یا جلد برائے نام رہ گئی تھی۔ مجھے کچھ شک سا تھا اس لئے میں نے اس اہلکار کی طرف دیکھا تو اس نے لاش کے سر کو تھوڑا سا گھمادیا۔ جس سے اس کے لمبے لمبے سنہری بال نظر آنے لگے اس کے بعد پولیس اہلکار نے لاش کا بایاں ہاتھ میرے سامنے کردیا جس میں ایک انگوٹھی درمیانی انگلی میں پہنی نظر آنے لگی اور پھر مجھے چکر سے آگئے کیونکہ یہ انگوٹھی میں نے ذوبی کو خود پہنائی تھی۔ اس کے بعد کوئی شک وشبہ کی بات نہ رہی۔

ہم نے لاش وصول کی کچھ کاغذات پر سائن کئے اور پھر لاکر دفنا دیا۔ میری اور ذوبی کی پریم کہانی کا خاتمہ ہوا۔ پولیس نے اس کے قاتلوں کو ضرور تلاش کیا ہوگا بقول ان کے لیکن کچھ بھی نہ ہوا، ذوبی کے والدین، خالہ اور میں بھی رو دھو کر چپ ہوگئے۔

دوسری طرف میرے ابو دن بہ دن کمزور ہوتے جارہے تھے کوئی ایسی بات ضرور ان کے دل میں تھی جو انہیں اندر سے کھائے جارہی تھی۔ میرے بہت اصرار

کے باوجود بھی وہ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے اور اپنی زندگی کے آخری دن جب میں ان کی فرمائش پر انہیں سبز قہوہ بنا کر پلا رہا تھا تو اچانک ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے مجھے ایک جھٹکا لگا اور پھر میں نے ابو کے ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''ابو پلیز نہ روئیں آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں انہیں حوصلہ دے رہا تھا لیکن خود مجھے اپنے آپ پر یقین نہ تھا میرا دل اندر سے رو رہا تھا۔ کیونکہ میں ابو کا اور ابو میرا سہارا تھے ہم دونوں کا ایک دوجے کے سوا کوئی نہ تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ ابو کی زندگی کا آخری دن ہے تو میں انہیں اکیلا ہی نہ چھوڑتا، وہ پورا دن میرے ابو کے پاس بیٹھے گزرا، شام سے پہلے انہوں نے ایک ایسی چیز کی فرمائش کی جو کہ ہمارے گھر سے کافی دور ملتی تھی میرا دل ان کے پاس سے اٹھنے کو نہ تھا لیکن ان کی خواہش بھی پوری کرنی میرے لئے بہت ہی اہم تھی اس لئے میں نے اپنی اسٹک اٹھائی اور اسے زمین پر ٹیکتا اس طرف جانے لگا۔

میری کوشش تھی کہ جلدی سے جاؤں، اور چیز لے کر واپس آجاؤں، میں ان کی پسندیدہ کھانے کی چیز ایک ہوٹل سے لے کر واپس آرہا تھا کہ میری نظر ان تین بدمعاشوں پر پڑی جو کہ یونیورسٹی کے بدنام لڑکے تھے، میں ان سے کترا کے گزرنے لگا کہ اچانک میری نظر ان میں سے شان کے گلے میں پہنے لاکٹ پر پڑی نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے بریک لگ گئی کیونکہ وہ لاکٹ ذوبی کا تھا جسے وہ بہت عزیز رکھتی تھی وہ اسے اس کی نانی نے تحفہ دیا تھا۔ یہ لاکٹ شان کے گلے میں دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا اور میرا دل جیسے چیخ چیخ کے کہنے لگا کہ ذوبی کا قاتل ''یہ ہی ہے یہ ہی ہے۔''

میں ان سے الجھنے ہی والا تھا کہ پھر خیال آیا کہ ایک تو وہ تین ہیں اور میں اکیلا اور کمزور دوسرا میرے ابو گھر میں بیمار آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ اس لئے میں نے برداشت کیا اور سیدھا گھر آیا لیکن ابو کی روح پرواز کر چکی تھی۔ میں اتنا رویا اتنا رویا...... ان کے چلے جانے کے بعد مجھے ان کی ڈائری ملی۔

میرے ابو محکمہ جنگلات میں سیکورٹی گارڈ تھے اپنی آخری سروس میں انہیں کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا تھا لیکن انہوں نے توجہ نہ دی اور زہر اندر ہی اندر کھاتا رہا اور جب انہیں احساس ہوا تو لاعلاج ہو چکے تھے اور پھر ریٹائرڈ ہونے کے پانچ ماہ بعد ہی اس دنیا سے چلے گئے۔

میرے لئے وہ خط اور خزانے کا نقشہ چھوڑ گئے۔

ان کے دفن کے دو دن بعد میں نے شان اینڈ پارٹی پر توجہ دینی شروع کر دی میں نے ان سے آہستہ آہستہ دوستی شروع کر دی کیونکہ میں ان سے کھل کے بدلہ نہیں لے سکتا تھا۔ جب ہماری دوستی کو دو ماہ سے اوپر ہو گئے اور ان کا بھرپور اعتماد مجھ پر ہو گیا تو میں نے خزانے کا چکر چلایا اور یوں ہم لوگ ان غاروں تک پہنچے۔

میں اندر سے ان دونوں سے ڈرا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ اللہ سے دعا مانگ رہا تھا۔ شان اور تنویر مجھے گھسیٹتے ہوئے اس ہال نما غار میں لے گئے جس کے درمیان وہ کنواں تھا اور اس کنویں کی تہہ میں کہیں مراسل کی لاش پڑی تھی۔ ''اب بتاؤ ذوبی کی روح مراسل کو لے کر کس غار میں گئی۔'' شان نے ان چند غاروں کی طرف روشنی کی، شان کی ٹارچ ان غاروں پر روشنی ڈال رہی تھی جبکہ تنویر کی ٹارچ کی روشنی میرے چہرہ پر تھی اور اس سے میری آنکھیں چندھیانے لگی تھیں میں نے جھجکتے ہوئے ایک تنگ غار کی طرف اشارہ کر دیا۔

''تنویر تم اس کے پاس ہی رہو میں اس غار میں دیکھتا ہوں۔'' شان نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر اس غار کی طرف چلا گیا جبکہ تنویر مجھ پر پہرہ داری کرنے لگا۔

اب میں بہت پریشان ہو گیا نہ جانے وہ دونوں میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ شان کے جانے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر تنویر نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''طارق تم نے خوب غور سے ذوبی کو پہچانا تھا۔''

''بالکل وہ ذوبی ہی تھی میں کیوں جھوٹ بولنے لگا۔'' میں نے اپنی بات پر وزن ڈالتے ہوئے کہا۔ اس

کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور میں کوئی ترکیب سوچنے لگا کہ جس سے میں ان دونوں سے بچ سکوں اور بدلہ بھی لے سکوں ذوبی کا۔

اور پھر مجھے اسی وقت موقع مل گیا جب تنویر نے اس کنویں کو دیکھ کر کہا۔ "ارے یہ کنواں کیسا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ میری طرف سے غافل سا ہو کر اس کنویں کی طرف بڑھا اور مراسل ہی کی طرح اس میں ٹارچ کی روشنی ڈال کر اندر جھانکنے لگا، میں نے تھوڑی ہمت کی اور اٹھ کر اس پر جمپ لگایا تو اسے زور کا دھکا لگا جس سے وہ اچھل کر کنویں میں جا گرا اس کے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی لیکن اس کے کنویں میں غائب ہوتے ہی اس ہال میں اندھیرا چھا گیا۔ کیونکہ ٹارچ اس کے ساتھ ہی کنواں برد ہو گئی تھی۔

میں احتیاط سے دور ہونے لگا اور اس غار کی طرف بڑھا جس میں سے ہم گزر کر اس ہال میں پہنچے تھے لیکن مجھ سے اندازہ لگانے میں غلطی ہو گئی چونکہ غار میں اندھیرا تھا اور جمپ لگاتے ہوئے میں نے رخ بدل لیا تھا اس بات کا مجھے احساس نہیں ہوا کہ میں غلط سمت بڑھ رہا ہوں، جس وقت تک مجھے سمجھ آئی بہت دیر ہو چکی تھی، میرے چہرہ پر ٹارچ کی لائٹ پڑی اور پھر شان کی آواز نے جیسے میرے ہواس معطل کر دیئے۔ "اوئے تم کہاں جا رہے ہو اور..... تنویر کہاں ہے۔"

میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور کچھ جواب نہ دے سکا وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا جب میں نے جواب نہ دیا تو اس نے غصہ سے مجھے ایک ٹھوکر ماری اور بالوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ "تیری تو....." وہ مجھے ہال کے اندر لے جانے لگا، اسی وقت اس کی نظر بھی اس کنویں پر پڑی اس نے مجھے چھوڑتے ہوئے میرے منہ پر زور کا گھونسہ مارا میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

پھر اچانک وہ چیخا اس کی چیخ غصہ سے بھری تھی میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کا ہیولہ کنویں میں جھکا نظر آیا بس اس کے بعد شان نے مجھ پر چڑھائی کر دی اور اس کے ہاتھ میری اسٹک آ گئی۔

"تو نے اتنا بڑا دھوکہ کیوں دیا ہمیں..... تیری تو۔" اس نے اسٹک زور سے میری ٹانگ پر ماری تو مجھے ایسا لگا جیسے ہڈی ٹوٹ گئی ہو "آہ..... اوئے۔" میرے منہ سے چیخیں اور درد بھری آوازیں نکلنے لگیں لیکن اس کو مجھ پر رحم نہ آیا اور آ بھی کیسے سکتا تھا، میں نے معذور ہوتے ہوئے بھی اس کے دو ہٹے کٹے جگری دوست جو مار دیئے تھے۔

"مجھے پہلے ہی تجھ پر شک تھا لیکن وہ دونوں بیوقوف میری بات پر یقین نہیں کر رہے تھے، تیرا یوں ہمارے قریب آنا ہم سے دوستی بڑھانا اور پھر ہمیں خزانہ کا لالچ دینا میرے حلق سے نہیں گزر رہا تھا۔ یہ تو میں مراسل کو ڈھونڈنے جب میں اس غار میں جا رہا تھا تو یاد آیا کہ تو بار بار ذوبی ذوبی کیوں کر رہا ہے اسی وقت میرے ذہن میں جھماکہ ہوا اور مجھے ساری بات سمجھ آ گئی میں بھی کتنا بیوقوف ہوں کاش کہ یہ بات پہلے سوچ لیتا تو میرے دو دوست ابھی زندہ ہوتے۔" یہاں تک بات کر کے اس نے مجھ پر شائیں شائیں اسٹک برسائی۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے جسم میں مرچیں ہی بھرتی جا رہی ہوں۔ "میں بھی کتنا غائب دماغ ہوں ذوبی کے منہ پر مرتے وقت تمہارا نام تھا طارق..... کاش مجھے پہلے یاد آ جاتا۔"

اب شان بہت ہی غصہ میں آ گیا اور کانپنے لگا تھا اور اس نے مجھے ٹانگ سے پکڑ کر اس کنویں کی طرف کھینچنا شروع کر دیا اس سے ٹارچ گر کر فرش پر پڑی تھی اور اس کی ترچھی روشنی مجھ پر اور پھر شان پر پڑ رہی تھی جس میں شان کا چہرہ بہت خوفناک لگ رہا تھا، میں نے ہمت کر کے اس سے اپنی ٹانگ چھڑانی چاہی تو اس نے ہاتھ میں پکڑی اسٹک غصہ سے میرے سر پر ماری تو مجھے اپنا سر دو حصوں میں تقسیم ہوتا محسوس ہوا، میں پہلے ہی کمزور تھا اور اب اتنی مار کھانے کے بعد بالکل ہی نڈھال ہو گیا تھا۔

شان کی باڈی بالکل کسی باڈی بلڈر کی طرح تھی

اب مجھے اپنا بچنا بہت ہی مشکل لگ رہا تھا۔ وہ میری طرف گھور رہا تھا اس کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت ہی نفرت تھی ادھر میرے دل میں بھی اس کے لئے نفرت کا ایک سیلاب تھا لیکن میں بے بس تھا، وہ مجھ سے طاقت میں زیادہ تھا میں اس کے سامنے لاچار پڑا ہوا تھا۔

''تجھے میرے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچا سکتا کوئی نہیں۔'' اس نے غصہ سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنے مرنے کا کوئی افسوس نہیں بس افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں تم سے ذوبی کا انتقام نہ لے سکا۔'' میں نے پہلے اوپر آسمان کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن اوپر تو غار کی چھت تھی اس کے بعد بے بسی سے کہا۔

''آہ'' میری بات کے ختم ہوتے ہی اس کا ہاتھ چلا اور مجھے دائیں طرف کمر میں آگ سی لگتی محسوس ہوئی اس ظالم نے اتنے زور سے اسٹک ماری کہ مجھے اپنا گوشت ادھڑتا محسوس ہوا اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

میں نے دل میں کلمہ پڑھا اسی وقت مجھے ایک عجیب سی روشنی کا احساس ہوا میں چونک اٹھا روشنی اتنی تیز تھی کہ میرے بند پپوٹوں سے بھی آنکھوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے ہمت کرکے آنکھیں وا کردیں۔ غار میں دودھیا رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس سے غار منور ہو رہا تھا۔ میں نے شان کو دیکھا جو کہ میرے سر کے پیچھے دیکھتے ہوئے حیران تھا اور پھر اس کے چہرہ پر ڈر کی کیفیت نظر آنے لگی۔ پیچھے دیکھنے کی مجھے ہمت نہ تھی، شان کنویں سے دو ڈھائی فٹ کے فاصلہ پر بے جان مورتی کی طرح ایستادہ تھا میرے پاس وہ ہی چند لمحے تھے میں نے بائیں لات زور سے چلائی جو کہ شان کی ناف کے نیچے لگی اور وہ کسی بے جان چیز کی طرح الٹ کر کنویں میں جاگرا اس کے منہ سے بھی آواز تک نہ نکلی اس کے گرنے کے بعد میں نے جلدی سے اپنے پیچھے دیکھا، چند سیکنڈ کے لئے میں بھی گم صم اور حیران رہ گیا کیونکہ میرے سر کے پیچھے ذوبی مکمل سفید لباس میں کھڑی تھی اور اس کے چہرہ سے وہ دودھیا روشنی جیسے پھوٹ رہی تھی اس کی آنکھوں میں میرے لئے نرمی اور شفقت سی تھی۔

میں اسی طرح بے حس وحرکت زمین پر پڑتا گیا درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جو کہ ناقابل برداشت تھیں۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اس کے بعد ایک خواب کا سا عالم تھا ذوبی کی آواز میرے دماغ میں سرگوشیاں کررہی تھی، پھر میں اٹھا اور ذوبی جو کہ ایک طرف جارہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے ہوا میں اڑتی جارہی ہو اور پیچھے پیچھے میں بھی ادھر ہی جارہا تھا کوئی احساس نہ تھا کوئی درد تکلیف کچھ نہ تھا اور پھر جانے کتنی دیر بعد ذوبی نے مڑکر میری طرف دیکھا اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر الوداع کہا۔ اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ اسی وقت ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا جس نے مجھے ہوش کی دنیا میں لاکھڑا کیا، جنگل کے باہر میں مین روڈ پر کھڑا تھا۔ اس کے بعد میں اپنے گھر کیسے پہنچا یہ ایک اور لمبی کہانی ہے۔

ان تین ناسوروں کو مار کر میں نے اچھا کیا یا برا اس کا مجھے نہیں پتا، ہاں بس گاؤں کو تین شیطانوں سے میں نے خالی کردیا۔

جہاں تک بات ہے اس خزانے کی تو وہ میں نے پہلے ہی نکال لیا تھا، میرے ابو کے ہاتھ سے بنے نقشہ میں مکمل راہنمائی تھی اس خزانہ تک، جب میں اس غار میں خزانہ حاصل کرنے گیا تو ان شیطانوں سے انتقام لینے کا انوکھا آئیڈیا ذہن میں آیا کیونکہ اس غار میں بھول بھلیاں بہت تھیں۔

خزانے کی دولت سے میں نے ایک یتیم خانہ اور چھوٹی سی این جی او بنائی جو کہ دیہات کی بیوہ عورتوں کو مفت سلائی کڑھائی سکھاتی اور مفت میں کئی عورتوں کو سلائی مشینیں بھی دیں۔

اور میں خود پولیو کے خلاف کئے گئے حکومتی اقدامات کی رفاہی پارٹیوں کے ساتھ پریکٹیکل اور مالی طور پر بھی مدد کرنے لگا۔

پچھتاوا

ضرغام محمود۔کراچی

نوجوان گڑگڑانے لگا کہ میں نے ناقابل معافی گناہ کیا ہے میں وہ بدنصیب ہوں جس نے خدائی کاموں میں منصوبہ کے تحت دخل اندازی کی اور اب میری زندگی اجیرن بن گئی ہے جو ناقابل برداشت ہے۔

اپنے دام میں صیاد خود آ گیا اسی کے مصداق ایک خوفناک اور حیرت ناک روداد

جیمس پارکر ایک وجیہہ آدمی تھا وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں قدرت نے فراوانی کے ساتھ حسن دیا تھا مگر اس کے باوجود اس کی آنکھیں بہت ویران رہتی تھیں اس کی گہری نیلی آنکھوں میں ہر وقت اداسی کے ڈیرے ہوتے تھے اس کی آنکھیں نہایت بے چین اور مضطرب محسوس ہوتی تھیں۔ جیمس پارکر کی زندگی میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی ہاں۔۔۔۔۔۔ اس کی موت ضرور خاص کہی جا سکتی ہے کیونکہ اس نے خودکشی کی تھی اس نے خودکشی کیوں کی اس کا راز اس کی موت کے اگلے دن کھلا جب میرے نام اس کا پوسٹ کیا ہوا آخری خط آیا حالانکہ اس کے خودکشی کرنے سے پہلے اس سے آخری ملنے والا آدمی میں تھا مگر اس آخری ملاقات میں مجھے ایسا کوئی تاثر نہیں ملا جس سے میں یہ اندازہ کر سکتا کہ جیمس پارکر نے خودکشی کرنے جیسا فعل

کرنے کا ارادہ کرلیا ہے بلکہ اس آخری ملاقات میں وہ بہت مطمئن نظر آرہا تھا۔

میری شناسائی جیمس پارکر سے چھ ماہ قبل ہوئی تھی۔ جب میں اس قصبے میں منتقل ہوا۔ میرے یہاں آنے کی وجہ جولیانہ تھی، جولیانہ میری زندگی کی ساتھی میری رفیقِ حیات میری پیاری بیوی جس سے میں بہت محبت کرتا تھا جس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی میرے لئے محال تھا ہماری رفاقت چالیس سالوں پر محیط تھی اور اس خوشگوار رفاقت کو موت کے بے رحم پنجوں نے توڑ ڈالا، موت میری پیاری جولیانہ کو دوسری دنیا میں لے گئی جولیانہ کی موت کے بعد میری حالت بہت نہ گفتہ بہ ہوگئی۔ میری ذہنی حالت ایسی ہوگئی کہ شاید میں پاگل ہو جاتا اس لئے میرے ڈاکٹر نے مجھے فوری طور پر آبائی مکان چھوڑ کر کسی پر فضا مقام پر جانے کا مشورہ دیا لہٰذا ایک پراپرٹی ایجنٹ کے ذریعے میں نے کیرن نامی اس قصبے میں ایک فلیٹ حاصل کیا اور یہاں شفٹ ہوگیا۔

یہ قصبہ قدرتی حسن سے مالا مال ہے میں چھ ماہ سے یہاں رہ رہا ہوں یہ جگہ شہر سے کافی فاصلے پر ہے لہٰذا شہر کی گہما گہمی کا یہاں ابھی تک اثر نہیں ہوا ہے۔ میں جس اپارٹمنٹ میں رہ رہا ہوں اس اپارٹمنٹ کے پیچھے ایک خوبصورت ندی بہتی ہے میرے فلیٹ سے اس ندی کا نظارہ بہت دلکش دکھائی دیتا ہے اس قصبے کے اطراف میں چھوٹا سا ایک جنگل ہے جہاں خرگوش اور ہرن وغیرہ کی بہتات ہے اسی لئے میں نے اس قصبے میں رہائش اختیار کی۔

یہاں منتقل ہونے کے بعد میں نے جس شخص سے سب سے پہلے ملاقات کی وہ جیمس پارکر تھا۔ فلیٹ میں منتقل ہونے کے دوسرے ہی دن اپنے پڑوسی سے ملنے اور راہ و رسم بڑھانے کی خاطر میں نے اپنے پڑوس کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو جواب میں جیمس پارکر نے دروازہ کھولا جیمس پارکر کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا اس کا سرخ و سفید چہرہ، ستواں ناک، باریک ہونٹ، ناک اور ہونٹوں کے درمیان گھنی مونچھیں اسے اور دلکش بنا رہی تھی۔ جیمس پارکر واقعی خوبصورت آدمی تھا ایک ایسا آدمی جسے دیکھ کر کئی لڑکیاں ٹھنڈی آہیں بھرتی ہونگیں اور نہ جانے کتنی لڑکیاں اسے اپنے خوابوں میں بساتی ہونگیں۔ واقعی جیمس پارکر اتنا خوبصورت تھا کہ لڑکیاں اس کے سپنے دیکھیں مگر جیمس پارکر کی گہری نیلی آنکھوں میں ویرانی چھائی ہوئی تھی اس کی آنکھیں ہر وقت اداس رہتی تھیں جیسے ابھی چھلک پڑیں گی۔ جیمس پارکر کی عمر میرے حساب سے تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ ایک ایسے قصبے میں جہاں شہر کی رونقیں مفقود ہوں جیمس پارکر جیسے وجیہہ و خوبصورت اور جوان شخص کو دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔

جیمس پارکر مجھ سے نہایت خوش دلی سے ملا اور مجھے اپنے فلیٹ کے اندر لیکر گیا اندر سے اس کا فلیٹ نہایت دلکش تھا، فرش پر خوبصورت ایرانی قالین بچھا ہوا تھا ہر کمرے میں عمدہ فرنیچر تھا جو جیمس پارکر کے اعلیٰ ذوق کی نشانی تھا جیمس پارکر مجھے اپنے بیڈ روم میں لے کر گیا وہاں میں نے دیکھا کہ اس کے بیڈ کے ٹھیک سامنے ایک قد آدم تصویر لگی ہوئی ہے جس میں جیمس پارکر ایک چھوٹے سے قد کے آدمی کے ساتھ نہایت بے تکلفی سے کھڑا ہے اس چھوٹے سے قد کے آدمی کا چہرہ بھورے تلوں سے بھرا ہوا ہے اور وہ انتہائی دبلا پتلا ہے اس چھوٹے سے قد والے آدمی کے چہرے پر اتنے بھورے تل تھے کہ ایک لمحے کو مجھے کراہیت محسوس ہوئی مگر جیمس پارکر نہایت بے تکلفی کے ساتھ اس شخص کے گلے میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔

چند دنوں میں میری جیمس پارکر سے گہری دوستی ہوگئی اور ہم دنیا جہاں کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے اسی دوران میرے پوچھنے پر جیمس پارکر نے مجھے بتایا کہ تصویر میں کھڑا دوسرا شخص اس کا عزیز ترین دوست آندرے کارٹر ہے۔ جس سے اس کی مثالی دوستی تھی۔ بے چارہ آندرے کارٹر دو سال پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔

جیمس پارکر تنہائی پسند شخص تھا وہ زیادہ کسی سے گھلتا ملتا نہیں تھا پوری کالونی میں بس مجھ سے اس کی گہری دوستی ہوگئی تھی لڑکیوں سے تو جیمس پارکر اتنا گھبراتا تھا کہ اگر راہ چلتی کوئی لڑکی جیمس پارکر سے کچھ معلوم کرنا چاہے تو جیمس پارکر کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ قصبے میں رہنے والی ایک خاتون ڈائنا ایلیز بتھ کی نوجوان بیٹی مارگریٹ جیمس پارکر سے بہت فری ہونے کی کوشش کرتی تھی مگر جیمس پارکر اسے دیکھ کر بدکتا تھا، مارگریٹ کے ساتھ جیمس پارکر کا رویہ بہت ہتک آمیز ہوتا تھا حالانکہ مارگریٹ جوان اور قبول صورت لڑکی تھی اس کے گھنگھروں دار بال جب اس کے چہرے پر آکر اٹھکیلیاں کرتے تو وہ منظر قابل دید ہوتا تھا۔ مارگریٹ کو دیکھ کر مجھ جیسے ستر سال کے آدمی میں بھی جوانی کی لہر دوڑ جاتی مگر جیمس پارکر نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا اس کے اوپر مارگریٹ کی اداؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

میں اکثر جیمس پارکر سے پوچھتا تھا کہ اس عمر میں تو امنگیں جوان ہوتی ہیں اور آدمی نئی نئی دوستیاں کرتا ہے خاص طور پر صنف مخالف سے دوستی اس عمر کا تقاضہ ہوتی ہے مگر جیمس پارکر ہمیشہ ہنس کر میری بات ٹال دیا کرتا تھا۔ میں نے کئی بار اس سے شادی کے متعلق بھی پوچھا کہ آخر وہ کب تک اکیلے زندگی گزارے گا کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر وہ شادی کیوں نہیں کر لیتا مگر جیمس پارکر، لڑکی یا شادی کے موضوع پر بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا اس کا پسندیدہ موضوع انسانی نفسیات تھا بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جیمس پارکر نے نفسیات میں ماسٹرز کیا ہے اور کافی عرصہ وہ شہر میں ایک یونیورسٹی میں پڑھاتا بھی رہا ہے مگر اب سب کچھ چھوڑ کر وہ اس قصبے میں آن بسا تھا۔ قصبے میں بھی وہ کسی سے بلا ضرورت بات چیت نہیں کرتا تھا پورے قصبے میں، میں اس کا واحد دوست تھا مگر میں بھی محسوس کرتا تھا کہ جیسے جیمس پارکر مجھ سے بھی کچھ باتیں چھپا رہا تھا حالانکہ میں نے اپنے بارے میں جیمس پارکر کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ میرا بچپن میری جوانی جولیانہ سے پہلی ملاقات پھر محبت اور شادی۔۔۔ اور جب ہمارا پہلا بچہ مردہ پیدا ہوا ڈاکٹروں نے بتایا کہ جولیانہ آئندہ ماں نہیں بن سکے گی تو کس طرح میں نے ایک مخلص ساتھی کی طرح جولیانہ کو سہارا دیا بچے نہ ہونے کے باوجود ہمارے درمیان مثالی محبت رہی۔۔۔ اور ہم دونوں نے خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری۔۔۔ پھر جولیانہ کے چلے جانے کے بعد کس طرح میرا نروس بریک ڈاؤن ہوا اور مجھ پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے لہٰذا ڈاکٹر کی تجویز پر میں اپنے آبائی شہر سے اس قصبے میں منتقل ہوا۔۔۔

میں نے اپنے متعلق جیمس پارکر کو سب کچھ بتایا مگر جیمس پارکر نے سوائے اس کے کہ وہ نفسیات کا پروفیسر تھا اپنے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا میں نے اس سے کئی بار اس سے پوچھا کہ وہ اس قصبے میں کیوں آ گیا جہاں کوئی رنگینی نہیں ہے یہ قصبہ تو بوڑھوں کا ہے مگر جیمس پارکر ہمیشہ ہنس کر بات ٹال دیتا تھا۔

ایک شام جب میں جیمس پارکر سے ملنے اس کے فلیٹ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا تھا اور اس کے سامنے شیمپین کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔

''اوہ تو آج یہ عیاشی ہو رہی ہے؟'' میں نے شیمپین کی بوتل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہوا آپ خود آ گئے میں ابھی آپ سے ملنے آنے والا تھا۔'' جیمس پارکر مجھے دیکھ کر بولا اور شیمپین کی بوتل کھول کر جام بنانے لگا

''کیوں خیریت۔۔؟'' میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔؟''

''کہاں جا رہے ہو؟'' میرا لہجہ بدستور سوالیہ تھا۔

''خوشیوں کی تلاش میں۔۔ آپ ہی تو کہتے تھے کہ یہ قصبہ بوڑھوں کا ہے مجھ جیسا جوان یہاں کیا کر رہا ہے۔ لہٰذا میں یہ قصبہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔۔'' جیمس پارکر نے ایک جام میری جانب بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''لیکن جا کہاں رہے ہو؟'' میرا لہجہ اب بھی

سوالیہ تھا۔

"جہاں قسمت لے جائے۔۔" جیمس پارکر نے مختصر جواب دیا اور جام منہ سے لگالیا میں سمجھ گیا کہ وہ بتانا نہیں چاہ رہا لہٰذا میں نے بھی اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور جام کو منہ لگالیا۔

میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنا خوش اور مطمئن نظر آنے والا جیمس پارکر دراصل خودکشی کی نیت کر بیٹھا ہے اس رات میں اور وہ رات گئے تک شراب سے شغل کرتے ہے پھر میں اپنے فلیٹ میں آ کر سوگیا۔

اگلے دن جب میں صبح کی سیر کر کے واپس آرہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اخبار ڈالنے والا لڑکا جیمس پارکر کا دروازہ مسلسل کھٹکھٹارہا ہے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس لڑکے سے پوچھا۔

"آدھے گھنٹے سے دروازہ کھٹکھٹارہا ہوں مگر جیمس پارکر دروازہ نہیں کھول رہا ہے؟" لڑکے نے مجھے جواب دیا تو میں نے جیمس پارکر کے دروازے کی اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھی اور کافی دیر تک اسے دبائے رکھا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا پھر میں نے جیب سے موبائل نکالا اور جیمس پارکر کا نمبر ملا کر اسے کال کرنے لگا کافی دیر تک رنگ ٹون بجتی رہی پھر معذرتی میسج نمودار ہوگیا۔

اب میں بھی تھوڑا سا پریشان ہوگیا اور میں نے جیمس پارکر کا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا پورا دروازہ ہل گیا مگر جیمس پارکر نے دروازہ نہیں کھولا اب حقیقت میں، میں بھی پریشان ہوگیا۔

"تم ایسا کرو۔۔ البرٹ ڈیسوزا کو بلالاؤ۔۔ اور ان سے کہنا کہ جیمس پارکر کے فلیٹ کی ڈپلیکیٹ چابی ساتھ لیکر آئے۔۔" میں نے اخبار والے لڑکے سے کہا تو وہ اپنے اخبار کا تھیلا وہیں رکھ کر البرٹ ڈیسوزا کے فلیٹ کی جانب دوڑ گیا۔

البرٹ ڈیسوزا اس اپارٹمنٹ کی یونین کے جنرل سیکریٹری ہے اور اس کے پاس تمام فلیٹوں کی ڈپلیکیٹ چابیاں ہوتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں البرٹ ڈیسوزا نائٹ گاؤن ہی میں بھاگتا ہوا آیا۔

"کیا ہوا۔۔ کیا ہوا؟" البرٹ ڈیسوزا کی سانس بھاگ کر آنے کی وجہ سے پھولی ہوئی تھی۔

"کافی دیر ہوگئی۔۔۔ جیمس پارکر دروازہ نہیں کھول رہا ہے۔۔" میں نے تشویش زدہ لہجے میں جواب دیا۔

"شراب پی کر سو رہا ہوگا۔۔" البرٹ ڈیسوزا نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"جیمس پارکر شراب پیتا ہے مگر اعتدال کے ساتھ۔۔" میں نے جواب دیا۔

"دروازہ کھولو۔۔" میں نے دوبارہ البرٹ ڈیسوزا سے کہا تو اس نے اپنے نائٹ گاؤن کی جیب سے جیمس پارکر کے فلیٹ کی چابی نکالی اور دروازے کے کی ہول میں ڈالی، ہلکے سے کلک کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں اور البرٹ ڈیسوزا ایک ساتھ جیمس پارکر کے فلیٹ میں داخل ہوئے میں سیدھا جیمس پارکر کے بیڈروم کی جانب بڑھا میں نے جیمس پارکر کے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ بیڈروم میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ سامنے بیڈ پر جیمس پارکر سو رہا تھا سوتے میں اس کا چہرہ بہت پرسکون تھا میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر بیڈروم کی لائٹ آن کی تو پورا کمرہ دودھیا روشنی میں نہا گیا لائٹ جلانے کے بعد میں آگے بڑھا اور جیمس پارکر کے بیڈ کے قریب پہنچ کر میں نے جیمس پارکر کا کندھا پکڑ کر ہلایا میرے کندھا ہلانے پر جیمس پارکر کی گردن ایک جانب لڑھک گئی تو میں نے جلدی سے جیمس پارکر کے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا مگر اس کے دل کی دھڑکن محسوس نہ ہوئی میں نے اپنا ہاتھ اس کی ناک کے پاس لے جا کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ سانس لے رہا ہے یا نہیں۔۔

مگر۔۔ مگر اس کی سانسیں رک چکی تھیں وہ یہ دنیا چھوڑ کر جاچکا تھا بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔۔ رات۔۔ رات میں وہ کتنا خوش تھا۔۔ خوشیوں کی تلاش میں جارہا تھا۔۔۔ اور اب۔۔۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''یہ کیا ہے؟'' البرٹ ڈیسوزا نے جیمس پارکر کے سرہانے رکھا ایک کاغذ اٹھایا اور مجھے دکھاتے ہوئے کہا، میں نے وہ کاغذ البرٹ ڈیسوزا سے لیا اور پڑھنے لگا۔

''میں جیمس پارکر بہ ہوش وحواس اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں اپنی زندگی کا خود خاتمہ کر رہا ہوں۔ میرے اس فعل کا میں خود ذمہ دار ہوں۔ میں اس زندگی سے تنگ آچکا ہوں لہٰذا اپنے آپ کو موت سے ہمکنار کر رہا ہوں میں نے بڑی تعداد میں نیند کی گولیاں کھالی ہیں۔۔۔''

جیمس پارکر

ذرا سی دیر میں پورے قصبے میں جیمس پارکر کی اندوناک موت کا چرچا ہوگیا پولیس بھی آگئی۔ سیدھا سیدھا خودکشی کا کیس تھا لہٰذا پولیس نے اپنی ضروری کارروائی پوری کر کے لاش ہمارے حوالے کردی۔

جیمس پارکر کی تدفین میں، میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا میرا ذہن مسلسل پریشان تھا کہ جیمس پارکر نے خودکشی کیوں کی۔ خوشیوں کی تلاش میں جانے سے اس کی مراد خودکشی کرنا تھی یا کچھ اور بات تھی۔۔۔ آخر ایسی کیا مجبوری تھی جو جیمس پارکر نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔

میری یہ الجھن اگلے دن ختم ہوئی جب شام کو پوسٹ مین نے میرے نام ایک خط دیا یہ خط جیمس پارکر نے اپنے مرنے سے قبل لکھا تھا میں نے انتہائی حیرت سے پوسٹ مین سے خط لیا اور لفافے کو چاک کیا اندر لفافے میں ایک تصویر تھی اور ساتھ ہی جیمس پارکر کے ہاتھ سے لکھا ایک خط تھا میں نے تصویر دیکھی تصویر وہ ہی تھی جو جیمس پارکر کے بیڈروم میں لگی تھی جس میں جیمس پارکر اپنے دوست آندرے کارٹر کے گلے میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا میں نے تصویر میز پر رکھی اور خط پڑھنے لگا۔

''مسٹر جان نکولس۔۔۔۔

آپ کو یہ خط اس وقت ملے گا جب میں اس دنیا سے بہت دور جا چکا ہوں گا میں بہت سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ میں اس بے کار اور بے مقصد زندگی سے تنگ آ گیا ہوں، لہٰذا آج میں اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں۔ مجھ سے زندگی میں ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے عزیز دوست کو موت کے حوالے کیا تھا اب میں اوپر جا کر اس سے معافی مانگوں گا شائد وہ مجھے معاف کردے۔

آپ اکثر مجھ سے پوچھتے تھے کہ میں اتنا تنہائی پسند کیوں ہوں میں اتنا اداس کیوں رہتا ہوں میری آنکھیں اتنی ویران کیوں ہیں، آج میں آپ کو اپنی کہانی سناتا ہوں۔

یہ کہانی ہے ایک چھوٹے سے قد کے دبلے پتلے شخص کی جس کا چہرہ بھورے تلوں سے بھرا ہوا تھا اور اس شخص کا نام تھا جیمس پارکر۔۔۔ آپ چونک گئے کہ میں حلیہ اپنے دوست آندرے کارٹر کا بتا رہا ہوں اور نام اپنا استعمال کر رہا ہوں۔۔۔ نہیں میں صحیح کہہ رہا ہوں اس تصویر میں وہ سوکھا مریل سا لڑکا جس کا چہرہ بھورے تلوں سے بھرا ہوا ہے وہ میں ہوں جیمس پارکر۔۔۔

میں بچپن سے ہی اسی طرح دبلا پتلا تھا میرا چہرہ بھورے تلوں سے بھرا ہوا تھا میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی لوگ منہ پھیر لیتے تھے کوئی لڑکا مجھ سے دوستی نہیں کرتا تھا لہٰذا میں نے سب کو چھوڑ کر کتابوں سے دوستی کرلی اور میں ہر کلاس میں فرسٹ آنے لگا میں نے نفسیات میں ماسٹرز کیا پھر ایک یونیورسٹی میں پڑھانے لگا، جوان ہوکر بھی میں ذرا سا موٹا نہیں ہوا اور اسی طرح دبلا پتلا رہا اور میرا چہرہ اسی طرح بھورے تلوں سے بھرا ہوا تھا۔ جوان ہوکر میں نے فطری تقاضوں کی وجہ سے کئی لڑکیوں سے دوستی کرنی چاہی۔۔ مگر۔۔ مگر ہر لڑکی نے دوستی کے لئے بڑھا میرا پرخلوص ہاتھ ٹھکرا دیا۔

اس دنیا میں اگر کوئی شخص میرا دوست بنا تو وہ آندرے کارٹر تھا۔ آندرے کارٹر خوبصورت چہرے اور ورزشی جسم کا مالک تھا لڑکیاں اس پر مرتی تھیں مگر

ہو۔۔۔

وہ لڑکیوں سے اس طرح گھبراتا تھا جیسے بلی پانی سے گھبراتی ہے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ اگر آندرے کارٹر کا جسم میرا ہوتا تو میں نفسیات کا پروفیسر ہونے کے بجائے کسی رومانی فلم کا ہیرو ہوتا اور ہر رات ایک نئی لڑکی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر سیر کو لے جاتا۔

اسی دوران ہماری یونیورسٹی میں ایک نئی لڑکی کیتھرین لیکچرار کی پوسٹ پر آئی کیتھرین خوبصورت سراپے کی مالک تھی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نشیلی تھیں اس کے باریک باریک ہونٹ رس بھرے تھے۔ اس کی چھوٹی سی ناک میں ہیرے کی لونگ لشکارے مارتی تھی اس کے گھنگھریالے سنہری بال جب اس کے گالوں پر لہراتے تو میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی میں نے بارہا کیتھرین کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر اس نے ہر مرتبہ میرے دوستی کے پرخلوص ہاتھ کو نہایت بے رخی سے جھٹک دیا۔ وہ خود آندرے کارٹر کے گرد منڈلاتی رہتی تھی مگر آندرے کارٹر ایک دم کاٹھ کا الو تھا وہ کیتھرین سے دور بھاگا کرتا تھا۔

ایک صبح گاؤں سے میرے لئے اطلاع آئی کہ میرے اکلوتے ماموں کا انتقال ہوگیا ہے لہٰذا میں نے یونیورسٹی سے دو دن کی چھٹی لی اور گاؤں روانہ ہوگیا شام تک میں گاؤں پہنچ گیا ماموں کی تدفین میرے انتظار میں رکی ہوئی تھی میرے پہنچتے ہی تدفین کی کارروائی شروع ہوگئی ماموں کی تدفین میں رات ہوگئی لہٰذا رات کو میں ماموں کے گھر ہی رک گیا میری کزن یعنی ماموں کی بیٹی نے مجھے رات گزارنے کے لئے ماموں کا کمرہ دے دیا۔ ماموں کے کمرے میں رات بسر کرنے کے خیال سے میرے پسینے چھوٹ گئے کیونکہ سنا تھا مرنے والے کی روح کئی دن تک اپنے گھر کے گرد منڈلاتی رہتی ہے اور اپنے استعمال کی چیزوں کو استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر مجھے رات بسر کرنی تھی چھوٹے سے گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور کمرہ خالی نہ تھا۔ لہٰذا میں نے رات اسی کمرے میں بسر کرنے کا فیصلہ کیا ماموں کے بیڈ پر لیٹتے ہوئے مجھے تھوڑا سا خوف محسوس ہوا مگر میں نے سر کو جھٹک کر اپنے خوف کو دور کیا۔

مجھے مطالعے کی عادت تھی لہٰذا میں نے ماموں کے کمرے کی تلاشی لینا شروع کی وہاں بہت ساری کتابیں رکھی تھیں میں ان کتابوں کو کھوجنے لگا تمام کتابیں عملیات کے متعلق تھیں شائد ماموں کو جادو ٹونے کا شوق تھا۔ میں نے چوائس کر کے ایک کتاب اٹھائی تو اس کتاب کے پیچھے مجھے ایک لال رنگ کا بٹن نظر آیا۔ میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بٹن دبایا تو کتابوں کا شیلف ایک جانب کھسک گیا اور دیوار میں ایک تجوری نمودار ہوئی میں نے تجوری کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ ہینڈل گھوم گیا اور تجوری کا دروازہ کھل گیا میں نے تجوری کے اندر جھانکا تو حیران رہ گیا اندر تجوری میں کوئی روپیہ پیسہ یا زیور نہیں رکھا تھا بلکہ اس تجوری میں ہاتھ سے لکھی کالی جلد والی ایک کتاب رکھی تھی۔

"یہ کونسی کتاب ہے جس کی ماموں اتنی حفاظت کر رہے تھے؟" میں نے سوچا اور اس کتاب کو تجوری سے نکال لیا اور تجوری بند کر کے شیلف کو دوبارہ اس کی جگہ پر کر دیا۔ اس کالی جلد والی کتاب کا سرورق بہت خوفناک تھا کالے رنگ کے سرورق پر لال رنگ کے شعلے بنے ہوئے تھے ان لال شعلوں کے درمیان سے ایک چہرہ جھانک رہا تھا وہ چہرہ بھی انتہائی بھیانک تھا اس چہرے کی صرف ایک آنکھ تھی جو اس کے ماتھے پر تھی اس چہرے کے کھلے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ میں اس کتاب کو لیکر بستر پر بیٹھ گیا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔

وہ کتاب کالی شکتیوں کے بارے میں تھی خاص طور پر آگ کے دیوتا آتوش کے بارے میں اس کتاب میں تفصیل سے لکھا ہوا تھا کہ کس طرح آگ کے دیوتا آتوش کو بلایا جاتا ہے اور کس طرح اسے خوش کر کے اس سے کام لیا جاتا ہے۔ میں اس کتاب کو پڑھنے میں ایسا مگن ہوا کہ رات گزر گئی اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ یہ کتاب میرے کام کی تھی لہٰذا میں نے وہ کتاب اپنے

بیگ میں رکھ لی اور جب اگلی صبح میں واپس شہر آ رہا تھا تو وہ کائی جلد والی کتاب میرے ہمراہ تھی۔

شہر آ کر میں نے اس کتاب کا کئی بار مطالعہ کیا بالآخر میں نے اس کتاب میں لکھے طریقے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور آگ کے دیوتا کو بلا کر اس سے کام لینے کا اٹل ارادہ کر لیا۔

کتاب میں لکھے عمل کے مطابق مجھے کسی قبرستان میں ایک چلہ کاٹنا تھا شہر کے کسی قبرستان میں تو یہ ممکن نہیں تھا کہ میں چلہ کاٹ سکوں کیونکہ شہر کے قبرستانوں میں عموماً لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہیں لہذا میں نے شہر سے باہر ایک پرانے قبرستان کا انتخاب کیا اس قبرستان میں اب تدفین نہیں ہوتی تھی اور یہ قبرستان تھا بھی شہر سے باہر ایسی جگہ پر جہاں آبادی بھی نہیں تھی مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اس قبرستان کے اطراف کی دیواریں گر چکی تھیں اور جگہ جگہ جھاڑیاں اگ آئی تھیں اکثر قبریں دھنس چکی تھیں شہر کے لوگ اس قبرستان کا رخ کرنے سے ڈرتے تھے لہذا میرے لئے یہ قبرستان ایک آئیڈیل جگہ تھی۔

ایک رات میں نے چند ضروری سامان اپنی گاڑی میں رکھا اور قبرستان پہنچ گیا وہ کوئی عام رات نہ تھی ایک گھنگھور سیاہ سناٹے بھری تاریک رات تھی بادل بھی چھائے ہوئے تھے لہذا چاند نے بھی اپنا منہ بادلوں میں چھپا لیا۔ اس رات سردی بھی اپنے عروج پر تھی۔ میں ٹھٹھرتے ہوئے قبرستان پہنچا میں نے چلہ کاٹنے کے لئے جگہ کا انتخاب دن ہی میں کر لیا تھا لہذا ٹارچ کی روشنی میں، میں اس جگہ پہنچا اندھیری رات میں قبرستان بہت ہولناک لگ رہا تھا ہر سو سناٹا چھایا ہوا تھا، ہوا سائیں سائیں کرتی چل رہی تھیں کبھی کبھی کسی جھینگر کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی محسوس ہوتی قبرستان میں ٹوٹی پھوٹی قبریں عجب بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں یہ تھا اس انسان کا انجام جو زندگی میں بڑی بڑی بڑکیں مارتا ہے آخر کار انجام ہر انسان کا یہی ہوتا ہے ہر زندگی کا اختتام موت کی دہلیز پر ہی ہوتا ہے۔

میں نے چلہ کاٹنے کے لئے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہاں ایک ٹنڈ منڈ سا درخت تھا اور چند شکستہ قبریں تھیں۔ میں نے چلہ کاٹنے کے لئے کتاب میں لکھے طریقہ کار کے مطابق ایک بڑا حصار کھینچا اور حصار کے اندر سوکھی لکڑیاں جمع کر کے آگ کا الاؤ روشن کیا الاؤ کی روشنی میں قبرستان کا ماحول مزید ہولناک ہو گیا میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا میں نے چند گہری سانسیں لیں تاکہ ماحول کے خوف سے باہر نکل سکوں۔

حصار کھینچنے اور الاؤ روشن کرنے کے بعد میں نے حصار میں بیٹھ کر کتاب میں لکھے منتر کو پڑھنا شروع کیا ساتھ ہی میں ایک لکڑی سے آگ کو کریدتا بھی جا رہا تھا پہلی رات میں تین گھنٹے تک منتر پڑھتا رہا مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔

میں اگلی رات پھر آیا اور اسی طرح منتر پڑھنے لگا اس طرح میں سات راتوں تک منتر پڑھتا رہا آخر کار آٹھویں رات مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرے علاوہ قبرستان میں کوئی اور بھی موجود ہے مجھے خوف محسوس ہونے لگا مگر میں نے دل کڑا کر کے منتر جاری رکھا، نویں رات جیسے ہی میں نے منتر شروع کیا اچانک چاروں طرف سے بھیانک آوازیں آنے لگیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہزاروں چڑیلیں رو رہی ہوں، خوف و دہشت سے میرا برا حال ہو گیا مگر میں نے منتر پڑھنا بند نہیں کیا میں منتر پڑھتا رہا۔

اچانک قبرستان میں سناٹا چھا گیا ساری آوازیں بند ہو گئیں الاؤ میں جلتی آگ کا شعلہ بلند ہونے لگا شعلہ بلند ہوتے ہوتے کئی فٹ بلند ہو گیا ایسا لگ رہا تھا جیسے آگ سارے قبرستان کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ میں خوف سے کانپنے لگا ماحول کی دہشت مجھ پر طاری ہونے لگی میں حصار سے نکل کر بھاگ جانا چاہتا تھا مگر میرے پیروں نے میرا ساتھ نہ دیا میں حصار میں بیٹھا خوف سے کانپتا رہا۔

اچانک بلند ہوتی آگ میں سے ایک شعلہ باہر نکلا اور اس شعلے نے انسانی شکل اختیار کر لی۔ مگر۔ مگر

وہ انسانی شکل نہیں تھی انسانی شکل سے ملتی جلتی کوئی مخلوق تھی۔ آگ سے نکلنے والی اس مخلوق کا قد بیس فٹ سے لمبا تھا اس کے چہرے پر صرف ایک آنکھ تھی جو اس کے ماتھے پر تھی اس کے ہونٹ بہت موٹے اور باہر کو نکلے ہوئے تھے اس کے ہاتھ غیر معمولی طور پر لمبے تھے یہ آگ کا دیوتا آتوش تھا۔

آتوش دیوتا کو دیکھتے ہی میں سجدے میں گر گیا میں جو یسوع مسیح کا سچا سپاہی تھا میں جو خداوند مسیح کے سامنے جھکتا تھا میں۔۔۔ میں نے یہ کیا کر دیا ۔۔۔ میں نے آتوش دیوتا کو سجدہ کرلیا۔

"تم نے ہمیں خوش کیا۔۔ بولو تم کیا چاہتے ہو؟" آتوش دیوتا مجھے اپنے سامنے سجدے میں گرا دیکھ کر خوش ہوگیا۔

"یا آتوش مجھے ایک جاندار اور خوبصورت جسم چاہیئے؟" میں نے لجلجا کر فریاد کی۔

"جسم بنانا میرے بس میں نہیں ہے میں انسان کی تخلیق نہیں کرسکتا؟"

"یا آتوش میں آپ کا بھگت ہوں پلیز میری مدد کیجیے مجھے راستہ بتایئے؟"

"تم کسی خوبصورت نوجوان کو اماوس کی رات اس حصار میں لے آؤ میں تمہاری روح اس کے جسم میں ڈال دونگا اور اس کے روح کو اپنے قبضے میں لے لونگا اس طرح تم ایک خوبصورت جسم حاصل کر سکتے ہو؟" آتوش دیوتا نے مجھے راہ دکھائی۔

"میں اماوس کی رات کو کسی خوبصورت جوان انسان کو لے آؤنگا۔" میں نے آمادگی ظاہر کی۔

"پھر تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔" آتوش دیوتا اتنا کہہ کو آگ کے الاؤ میں غائب ہوگیا۔ میں فوراً الاؤ کے سامنے سجدے میں گر گیا۔

صبح ہوتے ہی میں گھر لوٹ آیا میں نے کلینڈر دیکھ کر حساب لگایا تو پتا چلا کہ تین دن بعد اماوس شروع ہونے والی ہے لہٰذا میں نے اپنے اطراف کا جائزہ لینا شروع کیا کہ میں کس کا جسم حاصل کروں، پہلے میں نے سوچا کسی دولت مند کا جسم حاصل کرلوں مگر پھر خیال آیا کہ اگر میں کسی ایسے شخص کا جسم حاصل کیا جس کے رشتے دار وغیرہ ہوئے تو میرے لئے مشکل ہو جائے گی اور میں پھنس بھی سکتا ہوں کیونکہ جس شخص کا میں جسم حاصل کروں گا مجھے بعد میں اس شخص کا رول بھی ادا کرنا ہوگا۔

لہٰذا میری نظرِ انتخاب آندرے کارٹر پر ٹھہری کیونکہ آندرے کارٹر میری طرح نفسیات کا پروفیسر ہے اور آندرے کارٹر کے ماں باپ اس کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے اور اس نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی تھی اس کا کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہے اور دوستیاں کرنے میں بھی آندرے کارٹر کنجوس واقع ہوا تھا اور آندرے کارٹر تھا بھی بہت خوبصورت چھ فٹ سے نکلتا قد، ورزشی بدن، سنہری چمکدار بال، نشیلی نیلی آنکھیں، ستواں ناک اور ناک اور ہونٹوں کے درمیان گھنی مونچھیں اسے وجیہہ اور باوقار بنا رہی تھی لہٰذا میں نے آندرے کارٹر کا جسم حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اماوس کی رات کو سرِ شام میں نے آندرے کارٹر کو ایک ضروری کام کا جھانسا دے کر اپنے گھر بلایا اور اس کی چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی جب آندرے کارٹر بے ہوش ہو گیا تو میں اسے اپنی گاڑی میں ڈال کر پرانے قبرستان پہنچا اور آندرے کارٹر کو گاڑی سے نکال کر حصار میں لیٹا دیا۔

اب میں سورج ڈھلنے کا انتظار کر رہا تھا جیسے ہی سورج نے اپنا منہ چھپایا اور اندھیرے نے دن کی روشنی کو نگلنا شروع کیا میں نے حصار کے اندر لکڑیاں جمع کیں اور آگ لگا کر الاؤ روشن کیا اور جب اندھیرا پوری طرح پھیل گیا تو میں نے کالی جلد والی کتاب میں لکھا منتر پڑھنا شروع کیا۔

منتر پڑھنے کے ساتھ ساتھ میں ایک لکڑی سے الاؤ کو کریدتا بھی جا رہا تھا۔ اچانک ہوا تیز چلنے لگی میں جس درخت کے نیچے حصار میں بیٹھا تھا اس درخت کے پتے اپنی شاخوں سے جدا ہو کر ہوا کے دوش پر اڑنے

لگے پورے قبرستان میں ہولناک سناٹا تھا الاؤ کی روشنی میں قبرستان بہت ہیبت ناک لگ رہا تھا اسی وقت قبرستان کے ہولناک سناٹے میں ایک تیز چیخ گونجی پھر ایسا لگا جیسے ہزاروں چڑیلیں رونے لگی ہوالاؤ کی آگ ایک دم بھڑک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے الاؤ میں سے آگ دیوتا آتوش نمودار ہوا آتوش دیوتا کو دیکھتے ہی میں سجدے میں گر گیا۔

"یا آتوش میں لے آیا اس شخص کو جس کا جسم میں حاصل کرنا چاہتا ہوں" میں نے سجدے سے سر اٹھا کر آندرے کارٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آتوش دیوتا سے کہا۔

آتوش دیوتا نے اپنا ہاتھ آندرے کارٹر کی جانب کیا تو آتوش دیوتا کے ہاتھ سے آگ کا ایک شعلہ نکلا اور آندرے کارٹر کے جسم میں گھس گیا۔

شعلے کا آندرے کارٹر کے جسم میں گھسنا تھا کہ آندرے کارٹر کا جسم زمین سے اوپر اچھلنے لگا آندرے کارٹر کا جسم زمین سے دو دو فٹ اوپر اچھلتا اور زمین پر گر رہا تھا ایسا لگ رہا تھے جیسے آندرے کارٹر کے جسم کی اندر جنگ ہو رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد آندرے کارٹر کے جسم سے وہ شعلہ باہر نکلا اور آتوش دیوتا کے قدموں سے لپٹ گیا اس کے ساتھ ہی آندرے کارٹر کا جسم بھی پرسکون ہو گیا پھر آتوش دیوتا نے میری جانب اپنا ہاتھ بڑھایا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری جان ہی نکل گئی ہو، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا میرے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑنے لگے اور میں زمین پر گر پڑا اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر توانائی کی ایک لہر دوڑ گئی ہو میرے ذہن میں چھایا اندھیرا دور ہو گیا میں نے آنکھیں کھول دی، اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائی تو میں حیران رہ گیا میرے سامنے آتوش دیوتا کے قدموں میں میرا بھورے نکوں والا دبلا پتلا جسم پڑا تھا۔ اس کا مطلب ہے میں آندرے کارٹر کے جسم میں داخل ہو چکا تھا، میں نے جلدی سے اپنے اوپر نظریں دوڑائیں اور اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ وہ واقعی آندرے کارٹر کا جسم تھا، جس کا مالک اب میں تھا میں بے ساختہ آتوش دیوتا کے سامنے سجدے میں گر پڑا۔

"تمہارا کام ہو گیا اب ہمیں تنگ مت کرنا۔"

آتوش دیوتا الاؤ کی آگ میں غائب ہو گیا میں نے جلدی سے سجدے سے اپنا سر اٹھایا اور اپنے پرانے جسم کو دیکھنے لگا جو بے جان پڑا تھا۔ اسی وقت ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا اور میرے بے جان پڑے جسم کو آگ لگ گئی اس کے ساتھ ہی منتر والی کتاب کو بھی آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا آگ آہستہ آہستہ بڑھنے لگی اور اس آگ نے آس پاس کی چیزوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا ایسا لگ رہا تھا جیسے آگ سارے قبرستان کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ میں بوکھلا گیا اور حصار سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب بھاگا، آگ کے شعلے بلند سے بلند تر ہو رہے تھے میں جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھا اور میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے بھاگ نکلا۔

مین روڈ پر آکر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور گاڑی میں لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا وہ آندرے کارٹر کا چہرہ تھا جو، اب میری ملکیت تھا مجھے اب آندرے کارٹر بن کر جینا تھا اب میں اس خوبصورت جسم کے ذریعے وہ سب کچھ حاصل کر سکتا ہوں، جس کی مجھے خواہش ہے۔ میں یہ سب سوچتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا۔

میں گاڑی چلاتے ہوئے اپنی قسمت پر رشک کر رہا تھا کہ اب میں ایک خوبصورت جسم کا مالک ہوں ایک ایسا چہرہ میرے پاس ہے۔ جس پر لڑکیاں مرتی ہیں میں تصور میں ہر خوبصورت لڑکی کو اپنی بانہوں میں دیکھ رہا تھا میرے گاڑی آہستہ آہستہ شہر میں داخل ہو گئی۔

آج مجھے ہر چیز حسین لگ رہی تھی میں دل ہی دل میں گنگنانے لگا اسی وقت میری نظر سڑک کنارے پڑی ایک ڈانسنگ بار کے سامنے کھٹرین کی کار کھڑی تھی میں نے گھڑی میں ٹائم دیکھا رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

''کیتھرین سے ملنا چاہئے۔'' میرے اندر سے آواز ابھری اور میں نے اپنی گاڑی کیتھرین کی کار کے ساتھ پارک کی اور اپنے بال سنوارتا ہوا ڈانسنگ بار میں داخل ہوا میں نے ڈانسنگ بار میں داخل ہو کر چاروں طرف نظریں گھمائیں میری نظریں کیتھرین کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کیتھرین ایک میز پر تنہا بیٹھی ہے۔ میں نہایت باوقار انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا کیتھرین کی جانب بڑھا کتنی ہی آنکھوں میں مجھے اپنے لئے ستائش نظر آئی میری گردن غرور سے تن گئی میں کیتھرین کی میز کے پاس پہنچا اور کیتھرین کو مخاطب کر کے کہا۔ ''ہیلو کیتھرین''

''ہائے آندرے تم یہاں۔۔'' کیتھرین کے لہجے میں حیرت تھی کیونکہ آندرے کارٹر ایک خشک مزاج شخص تھا وہ کلب یا ڈانسنگ بار جیسی جگہوں پر جانا پسند نہیں کرتا تھا۔

''ہاں میں۔۔میں یہاں صرف تمہارے لئے آیا ہوں۔۔'' میں نے اپنے لہجے میں دنیا جہاں کی محبت سمیٹتے ہوئے کہا

''ہائے نصیب۔۔'' کیتھرین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اس کے چھونے سے مجھے کرنٹ سا لگا میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر ہولے سے اس کے ہاتھ کی پشت کو سہلایا۔

''ایک شیمپین۔۔'' میں نے پاس سے گزرتے ویٹر سے کہا تھوڑی دیر میں ہم دونوں شیمپین سے شغل کرنے لگے۔ پھر ڈانسنگ بار میں میوزک تبدیل ہوئی تو میں نے اٹھ کر کیتھرین کے سامنے جھکتے ہوئے اسے ڈانس کی آفر دی جسے اس نے ایک ادا کے ساتھ قبول کر لیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ڈانس کرتے رہے کتنی ہی دیر گزر گئی ہم دونوں ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔

پھر ڈانسنگ بار میں میوزک رک گئی اور بار بند ہونے کی اطلاعی گھنٹی بجنے لگی ہم دونوں ایک دوسرے کی بانہوں کا سہارا لیکر ڈانسنگ بار سے باہر نکلے اس وقت میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھ رہا تھا جس کی بانہوں میں اس وقت ایک حسین و جمیل لڑکی تھی میں اور کیتھرین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے گاڑی کے پاس پہنچے۔

''میرا خیال ہے تم اپنی کار یہیں چھوڑ دو۔۔ میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں'' میں انتہائی والہانہ انداز میں کیتھرین سے کہا۔

''او کے۔۔'' کیتھرین فوراً راضی ہو گئی شاید وہ اسی آفر کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا اور کیتھرین کو بیٹھنے کی دعوت دی، کیتھرین ایک ادائے ناز کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی، میں نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی جانب آیا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے آج بہت رومانٹک موڈ میں ہو۔؟'' کیتھرین میرے انداز دیکھ کر بولی۔

''کیوں رومانس پر میرا حق نہیں۔۔'' میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ حق تو تمہیں پہلے بھی تھا مگر پہلے تو تم۔۔۔'' کیتھرین نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

''پہلے کی باتیں چھوڑو۔۔آج کو انجوائے کرو۔۔'' میں نے کہا تو کیتھرین نے اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا۔

تھوڑی دیر میں ہم کیتھرین کے فلیٹ میں تھے کیتھرین تنہا رہتی تھی اس کے ماں باپ نیویارک میں رہائش پذیر تھے کیتھرین اپنی جاب کی وجہ سے اس شہر میں رہتی تھی لہذا اکیلے رہنا اس کی مجبوری تھی۔ میں کیتھرین کے ساتھ اس کے فلیٹ میں داخل ہوا کیتھرین نے مجھے اپنے بیڈروم میں بیٹھایا اور خود فریش ہونے چلی گئی۔

آج میری خوشی دیدنی تھی پہلی بار۔۔۔پہلی بار میں کسی لڑکی کے ساتھ اس کے بیڈروم میں تھا اور یہ سب

آندرے کارٹر کے جسم کی وجہ سے ممکن ہوا، ورنہ کیتھرین مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ تھوڑی دیر میں کیتھرین فریش ہوکر بیڈروم میں آئی تو میری آنکھیں چندھیا گئیں اس نے پنک کلر کی ہلکی سی نائٹی پہن رکھی تھی نائٹی کے اندر سے اس کا چاندی جیسا بدن جھلک رہا تھا میرے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی میں نے ہاتھ بڑھا کر کیتھرین کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنی جانب کھینچا تو وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری جھولی میں آگری اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے رس بھرے ہونٹوں پر رکھ دیئے کیتھرین مزید بے خود ہوگئی میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ٹیبل لیمپ کا بلب بند کردیا، نائٹ بلب کی روشنی میں ماحول مزید رومانی ہوگیا اور میری گستاخیاں بڑھنے لگیں۔

ایک گھنٹے بعد میں کیتھرین کے فلیٹ سے باہر نکلا، غم و غصے سے میرا برا حال تھا، میں غصے سے باؤلا ہو رہا تھا میں نے اس رات اپنی زندگی کی تیز رفتار ڈرائیونگ کی کئی جگہ حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا میں غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا گاڑی کو اپنے فلیٹ کے سامنے روکتے ہی میں چھلانگ مار کر گاڑی سے اترا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اپنے فلیٹ میں داخل ہوا۔

میں اپنے فلیٹ میں پہنچ کر آئینے کے سامنے کھڑا ہوگیا اور اپنے کپڑے اتارنے لگا آئینے میں میرا عکس نظر آرہا تھا میں اب آندرے کارٹر کے جسم میں تھا اس کے سنہری چمکدار بال اس کا خوبصورت چہرہ جس پر لڑکیاں مرتی تھیں اس کے ورزشی بازو اس کا چوڑا سینہ، اس کا مضبوط پیٹ اور۔۔۔ اور اس کے نیچے۔ آہ میں نے کیا کر دیا میں نے جلد بازی میں کتنا غلط فیصلہ کیا، میں نے اپنا مکمل جسم گنوا کر یہ ادھورا جسم حاصل کیا۔

ہاں آپ صحیح سمجھے آندرے کارٹر اسی لئے لڑکیوں سے دور بھاگتا تھا کیونکہ وہ۔۔۔ وہ نامرد تھا۔

آہ میں نے کیا کردیا، میں جو یسوع مسیح کا سچا بھگت تھا میں نے آگ کے دیوتا کو سجدہ کرلیا مجھے اسی بات کی سزا ملی میں نے خدائی کاموں میں ہاتھ ڈالا، میں نے شیطان سے مدد لی مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

وہ کالی کتاب بھی جل چکی تھی جس میں لکھے منتر کے ذریعے میں نے آتش دیوتا کو بلایا تھا۔۔۔ میں پ ناکام ہوگیا۔۔۔ میں نے خدا کی دی ہوئی نعمت کو ٹھکرایا اور مجھے اس کی سزا ملی۔

اگلے دن کیتھرین نے یونیورسٹی ہی میں نہیں پورے شہر میں مجھے بدنام کردیا لہٰذا میں نے شہر چھوڑ دیا اور اس قصبے میں آگیا، میں نے اپنے بیڈروم میں آندرے کارٹر اور اپنی تصویر اسی لئے لگائی کہ مجھے اپنا گناہ یاد رہے۔ میں روزانہ رو رو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں مگر میرا گناہ اتنا بڑا ہے کہ خدا بھی مجھے معاف کرنے کو تیار نہیں ہے۔

آج شام مجھے قصبے کے بازار میں کیتھرین نظر آئی وہ مجھے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرائی، اب میری بدنامی کے قصے اس قصبے میں بھی گونجیں گے لہٰذا اس سے پہلے کہ کیتھرین میرے بارے میں قصبے والوں کو بتائے میں یہ دنیا ہی چھوڑ کر جارہا ہوں میں نے خودکشی کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے، آپ کو خط لکھنے کا مقصد صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہے۔

میں وہ بدنصیب شخص ہوں جس نے خدائی کاموں میں دخل اندازی کی اور منہ کی کھائی اب یہ پچھتاوے کی زندگی مجھ سے نہیں گزاری جاتی لہٰذا میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہوں تاکہ اوپر جاکر آندرے کارٹر سے معافی مانگ سکوں۔

بدنصیب۔۔۔ جیمس پارکر

جیمس پارکر کا خط پڑھ کر میں نے میز پر سے تصویر اٹھائی جس میں جیمس پارکر اپنے دوست آندرے کارٹر کے گلے میں ہاتھ ڈالے مسکرا رہا ہے، تصویر دیکھ کر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔

خوفناک انجام

عثمان غنی۔ پشاور

پورے کمرے میں موت کی خاموشی طاری تھی اور بدمعاش کئی لوگوں کو کھولتے تیل میں ڈال چکا تھا۔ اچانک ایک نادیدہ ہاتھ نمودار ہوا اور چشم زدن میں بدمعاشوں کی گردن کٹ کر تیل میں گر پڑی۔

جسم وجاں پر لرزہ طاری کرتی، حرص ولالچ کی عجیب وغریب دل کو ہولا دینے والی کہانی

امی کی موت کے بعد میرے لئے میری زندگی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ واحد میری امی ہی وہ ہستی تھیں جو مجھ پر جان نچھاور کرتی تھیں میرے لئے دھوپ میں وہ چھاؤں کی مانند تھیں۔ میں اس صدمے سے ٹوٹ کر رہ گیا مجھے آج تک یقین نہیں آ رہا کہ امی مجھے چھوڑ کر یوں اچانک چلی جائیں گی۔

جب امی کی موت ہوئی تھی اس وقت میں پورے 20 برس کا ہٹا کٹا نوجوان تھا میری امی کی موت جھلنے سے ہوئی تھی۔

میرے ابو کا بیان تھا کہ ''امی کچن میں کام کر رہی تھیں کہ اچانک آگ ان کے کپڑوں میں لگ گئی اور امی کو آگ نے جھلسا کر مجھ سے چھین لیا۔ میں اس وقت گھر پر نہیں تھا مگر جب گھر لوٹا تو اس صدمے سے جیسے نیم مردہ ہو گیا۔''

مگر مجھے پتہ تھا کہ امی حادثے سے نہیں مری ہیں بلکہ ان کو قتل کر دیا گیا تھا اور قاتل کوئی اور نہیں میرا اپنا سگا باپ تھا میرے باپ اور امی کے درمیان تعلقات آخری حد تک خراب ہو چکے تھے میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

ابو نے امی کے کپڑوں پر تیل چھڑک کر انہیں آگ لگائی کیونکہ امی بہت بڑی پراپرٹی، بینک بیلنس، کی مالک تھیں۔ اگر ابو انہیں طلاق دیتے تو ابو کو بڑی جائیداد سے محروم ہونا پڑتا۔ اس لئے ابو نے امی کو خاموشی سے راستے سے ہٹا دیا۔

امی نے ایک ہفتہ پہلے مجھ سے انہی خدشات کا اظہار کیا تھا کہ ''ہشام بیٹا تمہارے ابو کے تیور ٹھیک نہیں ہیں وہ کسی بھی وقت مجھے مار سکتے ہیں اور انہوں نے کئی بار مجھے مارنے کی کوشش بھی کی ہے مگر اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص فضل وکرم ہے جو میں اب تک زندہ ہوں۔''

''امی مگر وہ کیوں آپ کو مارنا چاہتے ہیں؟ آخر آپ کی موت سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟''

''میرے بعد تمہارے ابو کو میری موت سے فائدے حاصل ہوں گے پہلا فائدہ انہیں بیمہ پالیسی سے ملے گا دو سال پہلے انہوں نے میری زندگی کا بیمہ پالیسی کرایا تھا یہ پالیسی پچیس لاکھ روپے کی تھی میری حادثاتی موت کی صورت میں انہیں پچاس لاکھ ملیں گے اور ایک سال سے وہ مجھے مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''امی کیا آپ اس پالیسی کو ختم نہیں کر سکتیں؟ یا اس کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہشام بیٹے، میں نے اپنی ساری جائیداد وصیت کے مطابق تمہارے نام کردی ہے۔ مگر بیمہ پالیسی کی میں کچھ نہیں کرسکتی۔ یہ وصیت میں نے چھپ کر اپنے قانونی وکیل سے مشورہ کرکے لکھی ہے۔''

''امی یقیناً اس بیمہ پالیسی کا بھی کوئی توڑ ہوگا کیونکہ ہر چیز کا ایک توڑ ضرور ہوتا ہے۔ اس بیمہ پالیسی کو منسوخ کردیجیے تاکہ اس فساد کا جڑ سے خاتمہ ہوسکے۔'' میں نے کہا۔

میری بات سن کر امی سوچنے لگیں اور چند لمحے سوچنے کے بعد ان کا چہرہ دمکنے لگا۔

''ہشام بیٹا ایک صورت ہے جس سے اشتیاق (میرے والد کا نام) کو ایک ٹکہ بھی نہیں ملے گا۔''

''کیا صورت ہے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''میں تمہیں ایک خط لکھ کر دوں گی۔ اسے تم اپنے پاس محفوظ رکھنا۔ اگر خدانخواستہ میری حادثاتی موت ہوجاتی ہے تو وہ خط بذریعہ ڈاک پولیس کو ارسال کردینا۔ اس بات کا اشتیاق کو پتہ نہیں چلنا چاہئے۔''

''اس خط میں آپ کیا لکھیں گی؟''

''میں اس خط میں لکھوں گی۔ کہ میں اپنے شوہر کے ظلم وستم سے مجبور ہوکر خودکشی کررہی ہوں۔ میری خودکشی کا ذمہ دار یہی شخص ہے جو میرا شوہر ہے۔ یہ شخص نہ صرف مجھے مار پیٹ رہا ہے بلکہ میرے ساتھ بے وفائی بھی کررہا ہے اس لئے روز روز کے مرنے سے بہتر ہے کہ میں خود کو ختم کرڈالوں میری موت کا سوائے میرے شوہر کے کسی اور کوئی الزام نہ دیا جائے اور نہ ہی میرے شوہر کو معاف کیا جائے۔ یہ شخص معاف کرنے کے قابل نہیں ہے۔''

''کیا اس خط کے ملنے سے ابو کو بیمہ پالیسی کی رقم نہیں ملے گی؟''

''نہیں اس خط کی وجہ سے اشتیاق کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ بیمہ پالیسی خودکشی کرنے پر رقم نہیں دیتی۔'' امی کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو؟ آپ ابو سے نجات پانے کا کوئی دوسرا طریقہ کیوں نہیں سوچتی ہیں؟'' میں نے کہا۔

''میں سوچ رہی ہوں۔ مگر میں تمہارے ابو کی طرح خودغرض نہیں بننا چاہتی۔ کہ میں انہیں قتل کردوں اور سب کچھ خود ہڑپ کرلوں۔ میں تمہیں یہ دکھ نہیں

دے سکتی۔ اور تمہارے مستقبل کی طرف سے فکرمند ہوں۔ میرے پاس اپنا جو کچھ بھی تھا تمہارے نام منتقل کر دیا ہے اور یہی میرے لئے اہم تھا۔"

"ابو کو آپ کی موت سے کیا ملے گا۔ وہ اس عمر میں اتنے پیسوں کا کیا کریں گے؟"

"ہشام بیٹا! وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اسی شادی کے لئے سارا چکر چلا رہے ہیں۔"

"دوسری شادی!" مجھے بڑے زور کی ہنسی آئی۔

"اس عمر میں ایسے بڈھے سے کون شادی کرے گا؟ ان کا دماغ تو صحیح ہے۔"

"ہشام تم نہیں جانتے، ہے ایک لڑکی۔ عمر اٹھارہ سال ہے۔ اس کا نام جمیلہ ہے اس کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ بدچلن ہے تمارے ابو کو اس نے اپنے عشق کے جال میں پھنسایا ہے اور اس سازش میں اس لڑکی کی ماں بھی برابر کی شریک ہے۔ جمیلہ کی ماں بھی بدچلن رہ چکی ہے مرد کی شادی ہر حال میں ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ اس کی جیب بھاری ہو اور تمہارے والد کی جیب بھاری ہے چند دن پہلے اشتیاق مجھ سے دوسری شادی کی اجازت مانگ رہے تھے مگر میں نے نہیں دی۔ میں تمہیں اس لڑکی کا پتہ دے دیتی ہوں۔"

میں نے پتہ لے لیا اور اس لڑکی جمیلہ سے اگلے دن ملنے چلا گیا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر واقعی مجھے جیسے کئی سوواٹ کے جھٹکے لگے وہ حسن کی دیوی تھی ماں بیٹی کے بارے میں پڑوسیوں کی رائے اچھی نہیں تھی اس کی ماں "چاندنی" بڑی شاطر عورت تھی وہ جادو ٹونے میں بھی ماہر تھی۔ اور کالے سفلی علم سے مردوں کو پھنساتی تھی۔ میں وہاں سے لوٹ آیا۔

☆......☆......☆

میری امی کے قتل پر مجھے انتہائی دکھ پہنچا تھا۔ وہ میری ٹھنڈک تھیں۔ مجھے اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتی تھیں میری امی ہی میرا سب کچھ تھیں۔ امی کو مرے ہوئے چوتھا دن تھا۔ کہ مجھے اس خط کا خیال آیا جو امی نے مجھے ایک ہفتے قبل دیا تھا۔ شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ اب زیادہ عرصہ جی نہیں سکیں گی۔

میں نے وہ خط بذریعہ رجسٹری پولیس کو بھیج دیا اور اس کی فوٹو کاپی بیمہ پالیسی کی کمپنی کو بھیج اور بقیہ سیٹ فوٹو کاپی اپنے پاس چھپا کر رکھ لی۔

ابو بیمہ پالیسی کے پچاس لاکھ کے خواب دیکھ رہے تھے مگر انہیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی اگلے دن پولیس اور بیمہ پالیسی کے لوگ ایک ساتھ آئے اور امی کی قتل یعنی حادثے کو خودکشی کا نام دے کر بیمہ پالیسی نے رقم دینے سے انکار کیا۔

ابو حیران پریشان رہ گئے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ حرکت کس نے کی ہے میری امی کی تحریر اور دستخط کو وہ جھٹلا نہیں سکے اور نہ ہی وہ مجھ پر شک کر سکتے تھے۔

پولیس اور بیمہ پالیسی والوں کے جانے کے بعد میرے ابو نے میری امی کو خوب برے الفاظ میں یاد کیا اور انہیں خوب گالیاں دیں بہرحال انہیں اس بات کا غم تھا کہ میری امی نے مرنے کے بعد انہیں وہ زخم دیا تھا کہ وہ ساری عمر اس کا گھاؤ بھرتے رہیں گے مگر وہ نہیں بھرے گا۔

خیر میں ابھی ابو کو دوسرا جھٹکا فی الحال نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ ابھی امی کی وہ وصیت دکھانا نہیں چاہتا تھا جو کچھ ابو کا اپنا تھا وہ میرا نہیں تھا مگر جو بھی چیزیں امی کی تھیں وہ سب اس وصیت کے رو سے میری ہو گئی تھیں اور ابو اس وصیت سے بے خبر تھے، میں نے بھی انہیں بے خبر رہنے دیا کہ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

ایک ماہ کے بعد ابو نے روایتی طریقے سے جمیلہ سے شادی کر لی۔ پھر دونوں ہنی مون کے ٹرپ پر چلے گئے۔

جمیلہ نے مجھے نہیں دیکھا تھا مگر میں نے اسے دیکھ رکھا تھا۔ ابو کی اس حرکت پر مجھے دلی غصہ آیا اور ان کے آنے پر میں کس طرح سے پیش آتا مجھے نہیں معلوم تھا۔

میرے ابو کی میری امی سے تیسری شادی تھی ان کی پہلے بھی دو شادیاں ہوئی تھیں وہ ایک بیوی کے

۔۔دس سال رہے تھے اور دوسری کے ساتھ 5 سال دونوں کی اموات بھی حادثوں میں ہوئی تھی اور دونوں کی موت سے ابو کو بے تحاشہ پیسے ملے تھے میری امی سے بھی انہوں نے محبت کی شادی رچائی تھی۔ مگر اس محبت کے باوجود وہ بیس سال تک ادھر ادھر منہ مارتے رہے تھے میری امی کے مطابق ابو اولاد نہیں چاہتے تھے مگر شادی کے ایک سال بعد میں پیدا ہو گیا تھا اس بات پر بھی ابو امی سے بہت ناراض تھے۔ خیر اللہ تعالیٰ کی مرضی کو کون ٹال سکتا ہے۔

میرے والد میری ماں سے دگنے عمر کے تھے اب ان کی عمر ساٹھ سال کی تھی ساری عمر عیاشیاں کرنے سے ان کی صحت گر گئی تھی۔ اور سوکھ کر جیسے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکے تھے۔

ابو اور جمیلہ 15 دنوں کے لئے ہنی مون پر گئے تھے مگر انہوں نے ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصہ گزارا۔

جب وہ دونوں گھر لوٹے تو جمیلہ نئی نویلی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی وہ ہنی مون کی وجہ سے اور زیادہ نکھر گئی تھی۔

وہ میرے ابو کے پہلو سے لگی بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی پہلی ہی نظر میں پیاسی آنکھیں دیکھنے والوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ لیتی تھیں۔ اب وہ اٹھارہ سال کے بجائے سولہ سال کی نوخیز نظر آ رہی تھی۔

البتہ میرے ابو اس کے ساتھ بہت برے لگ رہے تھے وہ اپنی عمر سے دگنا نظر آ رہے تھے جیسے کہ حور کے پہلو میں لنگور۔

ابو نے جمیلہ سے میرا تعارف کرایا۔

''جمیلہ یہ میرا بیٹا ہشام ہے اور ہشام بیٹے یہ تمہاری نئی امی جمیلہ ہیں، جمیلہ ہشام بڑا سیدھا سادھا لڑکا ہے اس لئے آج سے تم اس کا خیال رکھنا اور ہشام بیٹے تم اپنی ماں کا ہر حکم بجا لانا۔'' ابو کی بات سن کر میں خاموش رہ گیا۔

جمیلہ بولی۔

''اشتیاق آپ بے فکر رہیں! یہ آپ کا بیٹا ہے ہم آپ سے بڑھ کر اس کا خیال رکھیں گے۔''

''اب یہ اس گھر کی مالکن ہے مجھے امید ہے تم اپنی ماں کو شکایت کا موقع نہیں دو گے۔'' ابو نے کہا۔

میں نے بھی بظاہر مسکراتے ہوئے ماں کو سلام کیا جو عمر میں مجھ سے بھی دو ڈھائی سال چھوٹی تھی۔

مجھے یہ بات زہر لگی اور میرے دل میں اس کے لئے نفرت بڑھ گئی، میں نے دل ہی دل میں اپنی امی کو مخاطب کر کے کہا۔ ''میں اس عورت کو آپ کی جگہ کبھی نہیں دوں گا۔ بلکہ میں اس ڈائن کا گلا گھونٹ دوں گا یہ ماں نہیں ہے بلکہ ناگن بن کر اس گھر میں آ گئی ہے۔''

''حوصلہ کرو بیٹے! اللہ کی پانچ وقت کی عبادت کرو اللہ تمہارے ساتھ ہے اور میں بھی تمہارے ساتھ ہوں تم کسی بات کی فکر مت کرو۔ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔'' میری امی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔

اچانک میری نظر جمیلہ پر پڑ گئی وہ مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے شکاری شکار کو دیکھتا ہے۔ میں جسمانی لحاظ سے ایک بھرپور نوجوان اور دماغی لحاظ سے بھرپور مرد تھا۔ میں نے حقارت سے اپنی نظریں پھیر لیں اور وہاں سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں پہنچ کر اپنی والدہ کی تصویر لے کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میری ماں کی ممتا میرے اندر ایک گہرا تاثر چھوڑ کر گئی تھی مجھے محسوس ہونے لگا کہ میری ماں بے چین ہے اکثر راتوں کو مجھے محسوس ہوتا کہ امی کی روح میرے پاس آتی ہے اور ساری رات میرے پلنگ کے سرہانے گزارتی ہے مجھے یقین ہونے لگا کہ میری امی کی روح اپنے شوہر سے انتقام ضرور لے گی۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ روحیں کبھی انتقام لیتی ہیں۔

میرے دل میں انتقام کی آگ دہک رہی تھی ابو کی یہ شادی کی عمر نہ تھی۔ مگر جمیلہ سے شادی کر کے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ وہ جوان ہیں اور اسی شادی اور پیسوں کی وجہ سے انہوں نے میری ماں کو قتل کیا تھا۔ وہ قاتل تھے اگر میری ماں اپنے قاتل سے انتقام نہ لے

سکی۔ تو میں ضرور لے لوں گا۔

کوئی دس دن کے بعد جمیلہ کی ماں بھی اس گھر میں آ گئی۔

جمیلہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی اس کی خواہش تھی کہ میں اس کے دام میں پھنس جاؤں۔

ایک روز میں اپنے کمرے کے باتھ روم میں نہا رہا تھا، نہانے کے بعد اپنے جسم سے تولیہ اچھی طرح لپیٹ لیا اور باتھ روم سے باہر نکلا۔

سامنے بیڈ پر جمیلہ نیمی لباس میں بے باک انداز میں آڑی ترچھی لیٹی تھی اسے اس حالت میں دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ دو آتشہ ہتھیار لگ رہی تھی۔ اس لباس میں وہ مکمل طور پر عیاں ہو رہی تھی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔ جاؤ میرے کمرے سے!" میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور دھکیلنے لگا۔

اس نے میرے تولیے کو کھینچا اگلے لمحے تولیہ میرے بدن سے جدا ہو کر اس کے ہاتھ میں جھولتا رہ گیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا اس سے پہلے کہ تولیہ اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی حیا پوشی کرتا اس نے تولیہ کھلے دروازے سے باہر پھینک دیا اور اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے میری کمر کے گرد دائرے کی صورت میں حائل کر دیئے اور بولی۔ "ہشام پلیز! میری بات مان لو اور میرا دل نہ توڑو، میری پیاسی روح کو سیراب کر دو۔"

چھوڑو مجھے بے شرم شیطانی عورت۔" میں نے کہا۔

"کیسے چھوڑ دوں۔ کتنے مشکلوں سے ہاتھ آئے ہو۔" پوری قوت سے اس نے مجھے پلنگ پر گرا دیا اور میرے اوپر خود بھی گر پڑی۔

پھر میں نے بھی پوری قوت صرف کی اور اس کے وجود کو خود سے جدا کر دیا۔

میں نے جلدی سے چادر اپنے گرد لپیٹ لی اور اسے دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ اور جلدی سے کپڑے پہن لئے۔

وہ باہر دروازے سے گالیاں دیتی اور اس بے عزتی کی سنگین نتائج کی دھمکیاں دے کر چلی گئی۔

اس دن سے دونوں ماں بیٹی میری بدترین دشمن ہو گئیں مجھ پر کھانا پینا جیسے حرام کر دیا نہ مجھے کھانا ملتا نہ پیسے مل رہے تھے دوستوں کا چند دنوں میں ہزاروں کا قرضہ چڑھا لیا۔

میں نے امی کے قانونی وکیل کو فون کیا اور اس سے کہا۔" میں اپنے والد سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میری والدہ نے میرے لئے ترکے میں چھوڑا ہے وہ مجھے ملنا چاہئے۔" وکیل سے فون پر میری دس منٹ تک بات ہوئی۔

وکیل واصف صاحب نے مجھے پوری تسلی دی اور کہا۔" میں بے فکر رہوں جو کچھ میرا ہے وہ مجھے مل کر رہے گا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو پیچھے جمیلہ کھڑی تھی گویا اس نے میری پوری باتیں سن لی تھیں اور جو بات میں نے ابو سے چھپائی تھی وہ اس ناگن نے سن لی۔ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

میں کافی پریشان ہوا مگر جلد ہی سنبھل گیا کسی نہ کسی دن تو ابو کو یہ پتہ چلنا ہی تھا سو آج ہی چل جائے۔

رات کے وقت اچانک جمیلہ میرے کمرے میں داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی کھانے سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی میں بہت سخت بھوکا تھا پھر جمیلہ نے بہت پیار سے میرے سامنے کھانے کی ٹرے رکھی اور کسی خادمہ کی طرح سر جھکا کر چلی گئی جیسے کہہ رہی ہو۔" بادشاہ سلامت کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو تالی بجا کر منگوا لیجیے گا۔"

اور پھر دونوں ماں بیٹیوں نے پینترا بدل لیا دونوں میں کافی نرمی آ گئی۔ پتہ نہیں کیوں اچھا اور لذیذ کھانا مجھے ملنے لگا اس عنایت اور مہربانی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ایک رات میں نے جیسے ہی کھانے کی طرف

پھر تو ایک نادیدہ ہاتھ نے میرا ہاتھ روک دیا۔
پھر میرے کانوں میں امی کی آواز سنائی دی۔
''ہشام یہ کھانا مت کھانا اس میں اس کمینی نے زہر ملایا ہے۔ یہ ماں بیٹی تمہیں مارنا چاہتی ہیں۔
جمیلہ کو پتہ چل گیا ہے کہ میں نے اپنا سب کچھ تمہارے نام کر دیا ہے۔''
''امی آپ.....'' اور میں تڑپ اٹھا۔
''ہاں میں ہوں۔ ہشام تم خود کو اکیلا مت سمجھنا میں تمہارے ساتھ ہوں اب میں جا رہی ہوں۔''
میری آنکھوں میں آنسو آ گئے بھوک اڑن چھو ہو گئی تب میرے ذہن میں خیال آیا۔ کیوں ناں یہ گوشت جمیلہ کی ماں کے کتے ''ٹیری'' کو کھلا دوں۔
جمیلہ کی ماں اپنے ہمراہ ایک صحت مند کتا بھی ساتھ لائی تھی جسے وہ پیار سے ٹیری کہا کرتی تھی میں نے گوشت کو لان میں موجود کتے کے آگے ڈال دیا اور روٹی دیوار سے باہر پھینک دی۔
تھوڑی دیر بعد جمیلہ کمرے میں آئی۔ اور برتن اٹھا کر چلی گئی اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔
صبح میری آنکھ جمیلہ کی ماں کے شور سے کھلی۔ وہ چیخ چلا رہی تھی اور مردہ کتا اس کے ہاتھوں میں تھا۔
بڑھیا نے رو، رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ جب میں ان کے سامنے گیا تو دونوں کی حالت قابل دید تھی وہ کتے کی موت کا سوگ بھول گئیں اور ہونقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگیں وہ دونوں مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں جیسے کہ میں کسی اور دنیا سے آیا ہوں۔
اور پھر میں اپنے کمرے میں چلا گیا وہ دونوں بھی وہاں سے اٹھ گئیں۔
ایک گھنٹہ بعد جب میں ان کے کمرے کے پاس سے گزرنے لگا تو دونوں کی باتیں سنائی دیں۔
''ارے جمیلہ یہ کیسے زندہ ہے۔ کل کیا تم نے اسے سالن نہیں دیا تھا۔''
''میں بھی حیران ہوں اماں میں نے خود جھوٹے برتن اٹھائے تھے اور اماں تم نے خود تو زہر ملایا تھا، ارے اماں کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے زہر کی جگہ کچھ اور ملا دیا ہو۔'' جمیلہ حیرت سے بولی۔
''نہیں نہیں، خود میں نے اپنے ہاتھوں سے زہر ملایا تھا مگر آج کل ہر چیز میں ملاوٹ ہو رہی ہے مگر یہ میرا پیارا ٹیری کیسے مر گیا؟'' بڑھیا بولی۔
''اماں چھوڑو بھی مر گیا، دوسرا لے لینا کتا تھا۔''
''ارے تو کیا جانے یہ ٹیری کیسے مجھ پر جان نچھاور کرتا تھا۔'' جمیلہ کی ماں دکھ سے بولی۔
''اماں ہشام اگر مر جاتا جو کچھ اس کی ماں نے اس کے نام کیا تھا وہ اس بوڑھے کو مل جاتا پھر بوڑھا بھی مر کھپ جاتا اور میں سب کچھ حاصل کر لیتی۔''
''اس کو ختم کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا تم سمجھ رہی ہو وہ بوڑھا اسے ناپسند کرتا ہے مگر ہے تو اسی کی اولاد۔ اس لئے تو اسے گھر سے نکالنے کو تیار نہیں ہے۔
اماں ہمیں کچھ ایسی تدبیر سوچنی چاہئے کہ اس کا باپ اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جائے اور اسے جائیداد سے عاق کر دے۔''
''ہاں اب تم اسے بہلا پھسلا کر اپنے کمرے میں لے آنا اور میں اشتیاق کو تمہارے کمرے میں لے آؤں گی تم چیخنا چلانا کہ اس نے پستول کے زور پر میری عزت لوٹ لی۔ میں پستول بھی لے آؤ گی۔ تم آج سے ہشام پر محبت کے ڈورے ڈالنا شروع کر دو۔'' بڑھیا نے کہا۔
''اماں وہ میری محبت کے جال میں کہاں پھنسے گا وہ کمینہ تو مجھے امی کہہ کر بلاتا ہے مجھے تو خود اس کی ضرورت ہے وہ بڈھا تو نہ کام کا ہے نہ کاج۔''
''بس تم ہمت نہ ہارو اپنے ہتھکنڈے استعمال کرتی رہو۔ وہ ضرور تمہارے پیار کے جال میں پھنس جائے گا کیونکہ وہ نوجوان ہے۔'' بڑھیا یقین سے بولی۔
میں ان دونوں ماں بیٹیوں کا منصوبہ سن کر پریشان ہو گیا۔ ساری رات سوچتا رہا کروٹیں بدلتا رہا۔ میرا سکون غارت ہو کر رہ گیا تھا۔
رات کے تین بجے ہوں گے جب میری امی کی

آواز سنائی دی۔

''ہشام بیٹا تم فکر نہ کرو۔ وہ دونوں اپنے ارادوں میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوں گی میں تمہیں اس فاحشہ کے سائے سے محفوظ رکھوں گی۔'' جب میں نے امی کی تسلی بھری بات سنی تب مجھے نیند آئی۔

صبح اٹھا تو جیب میں ایک روپیہ بھی نہیں تھا گاڑی میں پیٹرول ختم تھا مجھے یونیورسٹی جانا تھا ۔سمیسٹر کی فیس بھی جمع کرانی تھی۔ بہت زیادہ پریشان تھا۔ اچانک جمیلہ میرا ناشتہ لے آئی میں حیرت سے گنگ اسے دیکھ رہا تھا۔ آج اس نے خاص اہتمام سے ناشتہ تیار کروایا تھا۔

''ارے تم خواہ مخواہ مجھ سے چڑتے ہو، میری نظر میں تم بہت اچھے ہو، کب تک ہم ایک دوسرے سے دور رہیں گے ۔سوچا تمہاری دوست بن جاتی ہوں۔ تمہاری بھی سو ضرورتیں ہوں گی، آج سے تم اپنے تمام مسئلے مجھ سے کہو گے۔ لو یہ پیسے رکھ لو۔'' جمیلہ نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ میری طرف بڑھائے۔ دل میں سوچا کہ پیسے لے لوں کہ نہیں! مگر مجھے واقعی ان پیسوں کی ضرورت تھی وہ پورے دس ہزار تھے، میں نے دل پر جبر کرکے وہ روپے لے لئے۔

پھر تو وہ میری ہمدرد بن گئی، مجھے خرچ کے طور پر پانچ سو روپے بھی روزانہ کے حساب سے دینے لگی۔ ہر ویک اینڈ پر میرے لئے نیا سوٹ خرید کر لاتی میرے ساتھ اکثر پارٹیز میں جانے لگی۔

ابو کی غیر موجودگی میں مجھ سے پیار محبت کی بات چیت کرتی اور ایسے لباس میں سامنے آتی کہ میرے جذبات بھڑک اٹھیں۔ بڑی مشکلوں سے میں خود کو روکے ہوئے تھا۔ وہ زبردستی میرے ساتھ بیٹھی ہوتی۔

وہ کہتی۔ ''ہشام تم مجھے جمیلہ کہہ کر مخاطب کیا کرو ۔میں چھوٹی ہوں تم سے۔''

اور میں اسے اماں کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

پھر میں اسے جمیلہ کہنے لگا وہ ایسے خوش ہوتی کہ جیسے محاذ ح کرلیا ہو اب وہ میرے ساتھ ب ہوئے باتیں کرتی۔

ایک دفعہ تو مجھے لگنے لگا کہ یہ مجھے ضرور فتح کرلے گی، مجھے بے بس کرکے بڑے گناہ کا مرتکب ٹھہرائے گی جس کے بارے میں، میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا اور نہ میں اسے کامیاب ہونے دینا چاہتا تھا۔

اب کبھی کبھی وہ میرے یونیورسٹی بھی آنے لگی۔ میرے دوست سمجھنے لگے کہ یہ میری گرل فرینڈ ہے میں نے کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

میں نے اسے یونیورسٹی آنے سے منع کیا مگر وہ نہ مانی ۔''ہم اپر کلاس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ محلے والے یہ دردسر نہیں پالتے ،کہ کس بنگلے میں کون کیا کیا کر رہا ہے۔اس لئے محلے اور پڑوسیوں کی طرف سے وہ مطمئن تھی۔ مگر یونیورسٹی میں، میں بڑا شریف مشہور تھا۔ کبھی کسی لڑکی کے پیچھے نہیں بھاگا تھا۔ اس لئے اب یار دوست کہنے لگے تھے، کہ میں نے بڑی پٹاخہ گرل فرینڈ رکھی ہے پہلے تو بڑے شریف بنتے تھے اب ایسی چیز سے آنکھیں چار کی ہیں کہ مضبوط ایمان والا بھی پھسل جائے ۔میں خاموش رہتا اپنا تماشہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔

وہ میرے لئے جوس لائی وہ ایک رنگین شام تھی سرمئی بادل آسمان پر تیر رہے تھے اس نے ایسے ادا سے مجھے جوس کا گلاس تھمایا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے مسکرا کر گلاس لے لیا۔

اس نے بہت باریک لباس پہن رکھا تھا جس میں وہ بے تحاشہ عیاں ہو رہی تھی۔

''ہشام تم بہت خوبصورت ہو جب تم مسکراتے ہو تو تمہارے موتیوں کی طرح سفید دانت دل پر چھری چلاتے ہیں۔'' وہ بولی۔

میں اس کی بات سن کر ہنسنے لگا اور جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگا دیا، جوس پیتے ہی میرا سر چکرانے لگا اور میں بے دم ہو کر بیڈ پر گر گیا۔

میں بے ہوش نہیں ہوا تھا صرف مدہوش ہوا تھا

. . نشے تب وہ مجھ پر مہربان رہی پھر چلی گئی۔

جب میں مکمل طور پر ہوش میں آیا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں اسکے آگے بے بس ہو جاؤں گا، اس نے اپنی من مانی کر لی تھی۔

ابو سے میرا سامنا بالکل بھی نہیں ہوتا تھا جیسے میں کسی کونے میں پڑا ڈیکوریشن پیس ہوں جسے وہ رکھ کر بھول گئے ہوں۔

اگلے دن میں کمرے سے نہیں نکلا۔ صرف غم تھا جو میرا ساتھی تھا دل میں سوچ رہا تھا کہ میں اس عورت کا گلا گھونٹ دوں گا، ایک آگ سی میرے اندر لگی تھی باتھ روم گیا اور شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا ٹھنڈے پانی کی پھوار نے بھی میرے اندر کی آگ کم نہ کی۔ میرے کپڑے بھیگ چکے تھے جب میں باتھ روم سے باہر نکلا تو جمیلہ میرے کمرے میں پہلے سے موجود تھی۔

''ہشام مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے میں تمہاری دیوانی بن گئی ہوں۔'' وہ اٹھ کر میرے گلے کا ہار بن گئی۔

''مگر مجھے تم سے نفرت ہے۔ ماں تم رشتوں کو میلا کر رہی ہو۔'' میں نے اسے جھڑک دیا۔

''میں تمہیں بچانا چاہتی ہوں۔ مگر میری ماں نے تمہیں مارنے کا منصوبہ بنایا ہے اس لئے دو دن سے وہ گھر نہیں آئی۔''

جملہ بالکل عجیب طریقے سے بولی۔

''ہشام! میرے پیار کو ہوس کا نام مت دو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تمہارے باپ سے دولت کی خاطر شادی کی تھی مگر اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے غلط قدم اٹھایا۔'' وہ بولی۔

''واہ! تم کمال کی اداکارہ ہو تمہیں تو ہالی ووڈ میں ہونا چاہئے تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہشام تم غلط سمجھ رہے ہو یہ سچائی ہے پیار اندھا تو ہوتا ہے مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔'' وہ اٹھی اور میری طرف بڑھنے لگی اب وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی ''ان آنکھوں میں دیکھو۔ تم ہی نظر آؤ گے۔''

''تمہاری ان جھوٹی آنکھوں میں کتنوں کی

خوشی

جیسے ساون کی گھنگھور گھٹا سے پانی کا پہلا قطرہ

جیسے کسی میلے میں ڈھول پر پڑنے والی پہلی تھاپ

جیسے کسی شادی والے گھر میں سکھیوں کا پہلا گیت

جیسے کسی سونے آنگن میں بچے کی پہلی چہکار

جیسے محبوب کے ہاتھوں کا اولین مس یا پھر

جیسے شفق رنگ آسمان پر عید کے چاند کا نظارہ

کسی دور کے نگر میں کسی شناسا چہرے کا دیدار

کسی اجڑے گلشن میں بہار کی واپسی کا احساس

کسی خوش خبری سنانے والے کے ہونٹوں مخصوص جنبش

کسی مسکرانے والے کی آنکھ کا نرالا آنسو

کسی لوٹ کر آنے والے کے قدموں کی خوش کن صدا

اے خوشی

تو دل کے سمندر کا سب سے انمول موتی ہے

تو زندگی کی لہر ہے، تو کائنات کی روح ہے

تو نے شاذ ہی مجھے اپنی زندگی کی جھلک دکھائی ہے

لیکن مجھے تجھ سے شکوہ نہیں کہ تیری کامیابی ہی تیرا حسن ہے

(انتخاب، شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

تصویر رہی ہوگی مجھے اپنی آنکھیں مت دکھاؤ۔ تم چلی جاؤ میرے کمرے سے یہ نا ہو کہ تم میرے ہاتھوں ماری جاؤ۔"

وہ کمرے سے چلی گئی دو گھنٹے کے بعد وہ گھبرائی ہوئی کمرے میں دوبارہ داخل ہوگئی۔ "ہشام اشتیاق کو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا ہے وہ تاوان کی رقم مانگ رہے ہیں، ڈاکو کہہ رہے ہیں اگر شام تک رقم کا بندوبست نہ ہوا تو وہ اشتیاق کو ماردیں گے۔" یہ خبر سن کر مجھے کئی جھٹکے لگے۔ جمیلہ بے تحاشہ رو رہی تھی۔

"کتنی رقم؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"دس لاکھ مانگ رہے ہیں شام تک کا وقت دیا ہے۔" وہ کانپ کر بولی۔

"مگر میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس ہیں۔ اشتیاق نے میرے لئے بینک میں رکھے تھے۔ تم میرے ساتھ بینک چلو پھر ہم وہاں سے سیدھا ڈاکوؤں کے بتے پر جائیں گے۔"

میں اپنا غم بھول گیا اور جمیلہ کے ساتھ بینک گیا۔ بینک سے اس نے رقم نکالی اور پھر مجھے انجان راستوں پر لے گئی۔ شام کے سائے پھیل چکے تھے وہ مجھے ہائی وے سے دور ایک کچے راستے پر لے گئی۔ گاڑی وہ ڈرائیور کررہی تھی میں پریشان تھا۔ دو گھنٹے کے بعد وہ ایک فارم ہاؤس کے سامنے رک گئی۔ ہارن بجانے پر کالے کپڑوں میں ملبوس ایک دیوہیکل آدمی نے دروازہ کھولا اسے دیکھ کر میں تھر تھر کانپ اٹھا۔

اس آدمی نے رائفل میرے سر سے لگا کر کہا۔ "باہر نکلو"

میں باہر نکلا، جمیلہ فاتحانہ انداز سے گاڑی سے باہر نکلی۔ اور اس آدمی کے پہلو سے جا لگی۔

"ہشام تمہارے والد کو کسی نے نہیں بلکہ ہم نے اغوا کیا ہے۔ دودن سے وہ یہیں ہیں۔ یہ شہر کا مشہور بدمعاش رؤف لالہ ہے۔ اور یہ فارم ہاؤس اسی کی ملکیت ہے اس کی اجازت کے بغیر یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا میں تمہیں یہاں لا رہی تھی مگر تم پیار سے نہیں مانے اس لئے دھوکے سے لے آئی۔" رؤف لالہ اور جمیلہ قہقہے لگانے لگے۔

میرے ہاتھ پیروں کو مضبوطی سے باندھ دیا گیا پھر وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک بڑے ہال نما کمرے میں لے گئے، کمرے میں ایک بہت بڑی کڑاہی رکھی تھی، کڑاہی لبالب تیل سے بھری تھی اور اس کے نیچے تیز چولہا جل رہا تھا۔ کڑاہی کے قریب ایک اسٹریچر رکھا تھا اور اسٹریچر پر خنجر موجود تھا کڑاہی میں تیل کھول رہا تھا جمیلہ کی ماں وہاں آگئی وہ تینوں قہقہے لگانے لگے۔ ان تینوں کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ رؤف لالہ میرے ابو کو بھی لے آیا وہ خون میں لت پت تھے، ان کے جسم گرم لوہے سے داغ دیئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے غصہ آگیا میں نے حقارت سے منہ موڑ لیا انہیں دیکھ کر مجھے ذرا بھی ترس نہیں آیا کیونکہ یہی سب چیزوں کا ذمہ دار تھے۔

جمیلہ نے ان کے منہ سے کپڑا ہٹایا تو وہ کراہنے لگے ان سے رحم کی بھیک مانگنے لگے گڑگڑاتے ہوئے لگے۔

انہیں اس حالت میں بھی دیکھ کر مجھے ان پر رحم نہیں آرہا تھا کیونکہ انہوں نے میری ماں کو قتل کیا تھا زندہ جلایا تھا اور جس لڑکی کی خاطر انہوں نے یہ ظلم کیا تھا آج وہی ان کی جان کی دشمن بن گئی تھی۔

جمیلہ کی ماں کے حکم پر رؤف لالہ نے میر ابو کو اٹھا کر کھولتے تیل میں پھینک دیا کمرہ ان کی بھیانک چیخوں سے گونجنے لگا وہ کڑکتے تیل میں پک رہے تھے مگر انہیں دیکھ کر مجھ پر کوئی ترس نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے میری ماں کو بھی زندہ جلایا تھا۔ وہ بھی اسی طرح چیخی چلائی ہوں گی۔ مگر یہ بے حس ظالموں کی طرح کھڑا ان پر ہنس رہا ہوگا۔ یہ مکافات عمل تھا۔

"تم لوگ اچھا نہیں کررہے ہو، آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" میں روہانسی آواز میں بولا۔

میں رؤف لالہ کی زیر دست رہی ہوں

اور رہوں گی میں نے تمہارے باپ سے شادی کرلی ،بڈھا بے وقوف تھا جو کہ میرے جال میں پھنس گیا۔ تمہارا بے وقوف باپ تو مرکھپ گیا اب تمہاری باری ہے تاکہ سب کچھ میرا ہوجائے تم نے میری عزت لوٹی اگر میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گی تو کل تم سب کو بتاؤ گے اور جائیداد سے مجھے الگ کردو گے۔ یعنی مجھے جائیداد سے بے دخل کردو گے۔'' جمیلہ پھنکارتی ہوئی بولی۔

''تم لوگ خدا کے قہر سے بچو، تمہارا یہ ظلم خدا دیکھ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں اپنی ماں سے بہت پیار ہے اس لئے ہم تمہیں اس کے پاس بھیج رہے ہیں۔''

جمیلہ کی ماں کے حکم پر رؤف لالہ نے مجھے اٹھا کر اسٹریچر پر باندھ دیا اور جمیلہ نے خنجر اٹھایا اور میری طرف حقارت سے دیکھ کر بولی۔

ہم پہلے تمہیں گرم لوہے سے داغ دیں گے۔ اور آخر میں تمہارے وجود کو اس کڑکتے تیل میں کسی مرغ کی طرح ڈال دیں گے۔''

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پھر میں نے خدا کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یاد کیا۔

''اے دونوں جہانوں کے رب مجھے ان ظالموں سے نجات دلا دے مجھے ان شیطانوں کے شر سے محفوظ فرما۔'' میری پکار قبولیت کی سند اختیار کرگئی۔

رؤف لالہ نے لوہے کی سرخ دہکتی ہوئی راڈ اٹھائی اور میری طرف بڑھنے لگا...... میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ رہا تھا، جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا تو ٹھنڈی ہوا کا زبردست جھونکا میرے بدن کو چھو کر گزر گیا۔

اور پھر میری امی کی آواز سنائی دی

''ہشام بیٹا، میں آگئی ہوں۔ تم اکیلے نہیں ہو۔'' رؤف لالہ کا ہاتھ خود بخود مڑ گیا۔ اور وہ راڈ اس نے اپنے سینے پر رکھ لی وہ چیخ کر اچھلنے لگا...... چند لمحوں کے بعد کراہتا ہوا خنجر اٹھانے لگا مگر خنجر خود بخود ہوا میں اڑتا ہوا ادھر ادھر جانے لگا، رؤف لالہ خنجر کو دیکھ کر گھبرا گیا خنجر اڑتا ہوا آیا اور چشم زدن میں اس کی گردن کھیرے کی طرح کٹ گئی اور اس کا سر کڑاہی میں گر گیا اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

پھر وہی خنجر جمیلہ کی ماں کے دل میں پیوست ہوگیا۔

جمیلہ چیختی چلاتی ہوئی بھاگنے لگی، نادیدہ ہاتھوں نے اس کو پکڑا اور وہ ہوا میں ایسے اٹھی جیسے وہ پلاسٹک کی کوئی گڑیا ہو پھر ان نادیدہ ہاتھوں نے اسے آگ پر رکھی کڑاہی میں ڈال دیا، وہ کڑاہی میں گرتے ہی چیخنے چلانے لگی۔ اور آخری لمحے میں کڑاہی الٹ گئی۔ خنجر اڑتا ہوا آیا اور میری رسیاں کاٹنے لگا۔ پھر میں باہر بھاگ گیا۔

اچانک دھماکے ہونے لگے، جیسے ہی میں فارم ہاؤس سے باہر نکلا فارم ہاؤس دھماکے سے اڑ گیا شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے آن کی آن میں فارم ہاؤس جہنم بن چکا تھا اور وہ تینوں شیطان نشان عبرت بن چکے تھے، میں اس جلتے فارم ہاؤس کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میری امی کی روح مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''ہشام بیٹا میرے جانے کا وقت ہوگیا ہے میں نے اپنا انتقام لے لیا ہے اور تمہیں بچالیا ہے۔'' میں خاموشی سے اپنی امی کے لمس کو محسوس کررہا تھا وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ انہوں نے میرے ماتھے پر اپنے ہونٹ ثبت کردیئے ہوں۔

''امی مجھے آپ ہمیشہ یاد رہیں گی۔'' میں نے کہا۔

''بیٹا! ہمیشہ سچ اور بھلائی کا ساتھ دینا۔ مظلوموں کی مدد کرنا۔ برائی کا راستہ جتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو انجام اس کا برا ہی ہوتا ہے۔ اب سب کچھ تمہارا ہے، میں تمنا رکھوں گی کہ تم ایک کامیاب زندگی گزارو گے۔''

میری امی اپنی آخری منزل پر چلی گئیں، جمیلہ اور اس کی ماں یہ نہیں جانتی تھیں کہ شیرنی کے منہ سے نوالہ تو چھینا جاسکتا ہے مگر ایک ماں سے اس کا بیٹا نہیں۔

زندہ صدیاں

ایم اے راحت

قسط نمبر: 11

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے دریچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

میں نے رونے کی آواز پہچان لی، وہ کوروتی ہی تھی، میں حیرانی سے دو قدم آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کوروتی کیا ہوا کیا ہوگیا؟" میں نے سوال کیا وہ اور زور زور سے رونے لگی، اتنے عرصے کی رفاقت میں پہلی بار میں نے اسے اس طرح روتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھائے تو اس نے جلدی سے اپنا چہرہ پیچھے کرلیا اور بولی۔

"نہیں، مجھے مت دیکھو، مجھے مت دیکھو، میرے ساتھ بہت برا ہوگیا۔ آہ میرے ساتھ بہت برا ہوگیا۔" اس کی آواز میں ایک عجیب سا درد بسا ہوا تھا۔

"مجھے اپنا چہرہ تو دکھاؤ آخر ہوا کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ کمبخت وہ کمبخت جل دے گیا مجھے، آخر وہ میرے خلاف اپنی سازش میں کامیاب ہو ہی گیا۔"

"کون؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"گوتم بھنسالی... مار گیا وہ مجھے، مار دیا اس نے مجھے، تم ذرا واش روم میں جاؤ، باتھنگ ٹب دیکھو اور اس کے آس پاس آہ پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے، کیا ہو رہا ہے؟"

"واش روم...... باتھنگ ٹب۔" میری عقل میرا ساتھ چھوڑتی جارہی تھی، تاہم میں واش روم کی جانب بڑھ گیا، فائیو اسٹار ہوٹل کا شاندار واش روم جس قدر شاندار ہوسکتا تھا، یہاں تو کسی قسم کی بدبو وغیرہ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، لیکن جیسے ہی ایئر ٹائٹ دروازہ کھلا مجھے یوں لگا جیسے شدید بدبو کا طوفان امنڈ پڑا ہو اور یہ بدبو بھی انتہائی عجیب اور حیرت انگیز قسم کی تیزابی بدبو تھی، مجھے ایک دم سے ابکائی سی آنے لگی۔ لیکن حیرت اور تجسس نے مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے پر مجبور کردیا۔ میں دو قدم آگے بڑھ کر واش روم میں داخل ہوگیا۔ تب میں نے باتھنگ ٹب کے نزدیک فرش پر ایک عجیب سی چیز دیکھی، براؤن رنگ کا ایک محلول سا تھا جو جگہ جگہ زمین پر پڑا ہوا تھا، وہ واش بیسن تک گیا تھا اور ایک لکیری بنتی چلی گئی تھی گاڑھی گاڑھی براؤن رنگ کی لکیر جو کسی سیال کی تھی، واش بیسن میں بھی ویسا ہی گاڑھا براؤن سیال پڑا ہوا تھا، میری حیرانی شدت کو پہنچی ہوئی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے، بدبو اس قدر شدید تھی کہ میں زیادہ دیر نہ رک سکا اور باہر نکل آیا۔ وہ روئے جارہی تھی۔

"خدا کے لئے مجھے بتاؤ تو سہی کوروتی ہوا کیا ہے

تمہارے ساتھ، یہ کمبل ہٹاؤ چہرے سے اور اپنے بدن سے یہ سب کیا ہے؟''

''میرا بدن بے لباس ہے اس پر کچھ نہیں ہے۔''

''ارے......کیوں؟''

'''وہ جل کر خاکستر ہوگیا ہے اب میں بے لباس ہوں مکمل طور پر۔''

''کیسے؟'' میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر پوچھا۔ بات ہی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ہوا کیا ہے۔

''گوتم بھنسالی، گوتم بھنسالی آیا تھا، لیکن کمینہ تمہارے روپ میں تھا، اس نے بڑی کامیابی سے تمہارا روپ دھارا تھا، بالکل تمہارا ہی انداز اختیار کیا ہوا تھا اس نے۔ جس کی لازمی طور پر اس نے زبردست ریہرسل کی ہوگی۔''

''اچھا پھر۔''

''واش روم کا دروازہ لاک نہیں کیا تھا میں نے ضرورت ہی نہیں تھی، بس مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کوئی اس طرح اندر آجائے گا، وہ آگیا، دروازہ کھول کر اندر آیا، میں باتھ لے رہی تھی، میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ بھی تمہارے انداز میں مسکراتا ہوا میرے قریب آگیا، میں نے کہا۔

''یہ کیا حرکت ہے، باہر جاؤ، میں نہا رہی ہوں۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، غالباً وہ تمہاری آواز نہیں اختیار کرسکتا تھا، البتہ اس نے اپنی جیب سے ایک شیشی نکالی، بڑی خوبصورت شیشی تھی جس طرح تمہارے پاس سینٹ کی شیشیاں ہوتی ہیں، میں یہی سمجھی کہ وہ کوئی شرارت کررہا ہے اور باتھنگ ٹب میں کوئی سینٹ ڈالنا چاہتا ہے، میں نے ہنس کر تمہیں دیکھا تو اس نے سینٹ کی پوری شیشی باتھ ٹب میں الٹ دی، جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا تو وہ بول پڑا اس نے کہا۔

''یہ ایک ایسی حرکت ہے کوروتی جو میں نے انتہائی مجبوری کے عالم میں کی ہے۔'' اور میں نے اس کی آواز پہچان لی، میں نے کہا۔

''گوتم بھنسالی۔ تم......''

''ہاں شاید مجھے اپنے اس کیے پر دکھ ہوتا لیکن اب نہیں ہے، وہ تمہارے غسل کے دوران بھی اس طرح تمہارے پاس آسکتا ہے جبکہ تم بے لباس ہو، اس سے اس کی تم تک پہنچ کا مجھے اندازہ ہورہا ہے اور اس چیز نے مجھے بالکل مطمئن کردیا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ غلط نہیں ہے۔'' میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی اور اسی وقت مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا، مجھے یوں لگا کہ باتھنگ ٹب کا پانی آہستہ آہستہ سنسناہٹ پیدا کررہا ہے، وہ ابلنے لگا ہے میں دہشت زدہ ہوگئی میں نے ٹب کے کنارے پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کی، لیکن میرے ہاتھ پھسل گئے اور میں ٹب میں ڈوب گئی چہرہ سمیت۔ گوتم نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور بولا۔

''ہاں کوروتی، مختلف ادوار میں، میں تمہارے نزدیک آنے کی کوشش کرتا رہا اور تم نے مجھے دھتکار کر خود سے دور بھگادیا، بے شک میں خوبصورت نہیں تھا، بے شک میں تمہارے قابل نہیں تھا، لیکن میں تم سے محبت کرتا تھا، میں نے صدیاں تمہیں چاہتے ہوئے گزاری ہیں، لیکن یہ کل کے لوگ جو تمہارے قریب آتے ہیں اور تمہاری قربت سے سرشار ہوجاتے ہیں میرے لئے اتنا بڑا دکھ کا باعث ہوتے ہیں کہ میں تمہیں الفاظ میں نہیں بتا سکتا، کتنے کرداروں کا نام لوں میں، تم محبتیں بدلتی رہتی ہو تم نے ہر ایک کو اپنی قربت بخشی ہے، تم نے سیمون، ایوس، ڈیبلن اور نجانے کس کس کو دل سے چاہا ہے اور وہ تمہارے حسین وجود سے سرشار ہوتے ہیں اور میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا ہوں، میں نے بہت سے موقعوں پر تمہاری حفاظت بھی کی ہے، ورنہ تمہارے رقیب تمہیں مختلف طریقوں سے تکلیف دینا چاہتے تھے، میں ایک خدمت گار کی

طرح تمہارے ساتھ ساتھ رہا ہوں، لیکن میں نے اپنی ان بدنصیب آنکھوں سے ان سے تمہاری رغبت اور محبت دیکھی ہے اور خون کے آنسو روتا رہا ہوں۔ اولاش، سکندر اور نجانے کون کون، صرف میں ایک ایسا بدنصیب تھا جسے کبھی تمہاری ایک محبت بھری نگاہ بھی نہ مل سکی، بتاؤ مجھ جیسے شخص کے دل میں کیا ہونا چاہئے تھا، اور اب اس دنیا کے اس شخص سے جس کا نام ذیشان عالی ہے تم اسی طرح بے تکلف ہو جیسے ماضی میں تم اپنے دوسرے من پسند لوگوں سے رہی ہو۔

تو آخر کار میں نے ایک فیصلہ کرلیا میں نے سوچا کہ میں بھی تمہاری طرح جیتا جاگتا انسان ہوں، یہ الگ بات ہے کہ میری بدنصیبی نے مجھے موت سے دور کردیا ہے، آہ کاش میں آب حیات نہ پیتا، کاش امرت جل مجھے نہ مل پاتا تو اب تک کب کا مرکھپ گیا ہوتا اور مجھے رقابت کے یہ صدمے برداشت نہ کرنے پڑتے، لیکن نصیب اسی کا نام ہے، تم بھی زندہ ہو اور میں بھی زندہ ہوں، میں تمہیں چاہتا رہوں گا اور تم دوسروں کو چاہتی رہوگی، میں نے آخر کار ایک حل سوچ لیا، جو چیز میں نے تمہارے اس نہان میں ڈالی ہے وہ تمہیں ایک ایسا لطف دے گی کہ یاد رکھوگی، تمہیں چاہنے والا کوئی بھی نہ ہوگا سوائے میرے، اور پھر کوروتی جب تم نفرتوں سے تھک جاؤ اور یہ محسوس کرلو کہ تمہاری نفرت نے گوتم بھنسالی کو کس طرح درد وکرب دیا ہوگا تو مجھے آواز دینا میں آجاؤں گا میں تمہیں اس وقت بھی چاہوں گا تمہیں جب بھی آواز دوگی اور ایسا ہوا ہے کہ تم نے جب بھی مجھے پکارا ہے میں تم سے دور نہیں رہا۔'' یہ کہہ کر وہ واپس مڑا۔

لیکن اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے ٹب کا وہ کھولتا ہوا پانی اچانک ہی سرد ہوگیا ہو، برف کی طرح سرد، پہلے گرم اور پھر سرد، میں نے اس بار پوری قوت سے ٹب کے کنارے پکڑے اور باہر نکلنے کی کوشش کی اور اس بار میں کامیاب ہوگئی، لیکن میرے بدن و سخت سردی کا احساس ہو رہا تھا، جب میں نے باہر پاؤں رکھا تو اچانک ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کا گوشت ایک براؤن مادے کی شکل میں زمین پر بہنے لگا ہو، میں حیران ہوگئی، بڑی مشکل سے میں چند قدم آگے بڑھی اور شفاف آئینے کے سامنے سے گزری، آہ جو ہو رہا تھا تم نہیں سوچ سکتے ذیشان عالی، تم نہیں سوچ سکتے، مجھے اپنا چہرہ اس طرح لگا جیسے کوئی کسی تصویر کو کھرچ دیتا ہے، میرے چہرے پر جگہ جگہ دھبے پڑ رہے تھے اور آہستہ آہستہ میرا چہرہ بدنما ہوتا جا رہا تھا، میرے بال گچھوں کی شکل میں میرے سر پر سے اترنے لگے تھے، بمشکل تمام میں نے اپنا تھوڑا سا چہرہ دیکھا اور میرے حلق سے بھیانک چیخ نکل گئی، میں نجانے کس طرح باتھ روم سے باہر آگئی، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں، میں نے کمبل اوڑھا اور یہاں بیٹھ گئی، یہ تمہارے آنے سے کچھ لمحے پہلے کی بات ہے، گوتم بھنسالی یہاں سے جاچکا ہے۔''

''اوہ میرے خدا، ذرا کمبل تو ہٹاؤ؟'' میں نے کہا۔

''نہیں نہیں میں اپنی صورت نہیں دیکھ سکتی، نجانے کیا ہوا ہے نجانے کیا ہوگیا ہے؟'' وہ بولی لیکن میں نے آگے بڑھ کر اس کے بدن سے اس کا کمبل گھسیٹ لیا۔

کیا آپ تصور کرسکتے ہیں ایک ایسے حسین وجود کا جو کچھ لمحے پہلے اس قدر دلکش ہو کہ میرے ہوٹل کے قیام کے دوران بہت سے لوگوں نے مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کی، صرف کوروتی کی وجہ سے، وہ انتہائی دلکش تھی، اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ بیان سے باہر ہے، لیکن اس وقت میرے سامنے ایک ایسا وجود تھا جس کے چہرے پر گوشت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، ناک غائب ہوگئی تھی، آنکھوں کی جگہ گہرے گڑھے تھے، سر پر بالوں کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس قدر بھیانک وجود کہ انسان اسے دیکھ کر موت کی آغوش تک میں جاسکتا تھا، پھر میری نگاہ اس کے جسم پر پڑی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر جھوٹ بولوں تو ڈرامہ

بازی ہوگی مشکل ہی سے یقین کیا جائے گا، میرے بدن میں بھی سرد لہریں دوڑنے لگی تھیں، خوف کی سرد لہریں، اس کا چہرہ میری جانب اٹھا ہوا تھا، اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''ذیشان عالی! وہ کمبخت چال چل گیا، میں نہیں جانتی کہ اس نے کس دیوانگی کے عالم میں یہ کیا کیونکہ وہ تو دل سے میرا پرستار تھا، میرے حسن کا دیوانہ لیکن میرا خیال ہے صدیوں کی تپسیا کے بعد بھی اسے کچھ نہیں مل سکا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھا، آہ یہ تو میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس کے پاس بھی علم تھا بڑے بڑے گیانیوں سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا اور اسے استعمال کر گیا، لیکن دیکھو دیکھو کیا ہو گیا میرا، دیکھو میرا کیا ہو گیا۔'' اس نے کہا اور آہستہ آہستہ صوفے سے اٹھ گئی، کمبل چونکہ میں نے کھینچ کر نیچے پھینک دیا تھا، اس نے اسے دوبارہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے قریب پہنچ گئی، میرے ہوش وحواس گم تھے، میں اپنے سامنے ایک انسانی ڈھانچے کو چلتا ہوا دیکھ رہا تھا، ڈھانچے سوکھی ہڈیوں والے ہوتے ہیں لیکن ایسا ڈھانچہ جس سے وہ گاڑھا بدبودار سیال اب بھی بہہ رہا تھا، اس کا تھوڑا تھوڑا گوشت اب بھی اس کے جسم سے چپٹا ہوا تھا لیکن اس طرح کہ وہ اس گاڑھے سیال کی شکل میں ایک لکیر بناتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل تک گیا تھا، بدبو تھی کہ انتہاء سے زیادہ ذہن کو قابو میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

اچانک ہی مجھے اس کی ہولناک چیخ سنائی دی، ڈریسنگ آئینے میں شاید پہلی بار اس نے اپنے پورے حلیئے کو دیکھا تھا اور اس کے بعد تو وہ چیخنے کی مشین بن گئی، وہ بری طرح دھاڑ رہی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔

اچانک ہی وہ دروازے کی جانب بھاگی، بدحواسی کے عالم میں اس نے یہ کیا تھا، دروازہ کھولا اور اسی طرح چیختی ہوئی باہر نکل گئی، میں اب بھی گم صم کھڑا ہوا تھا، لیکن اس کے بعد باہر سے جو چیخیں سنائی

دیں انہوں نے مجھ سے میرے ہوش وحواس بالکل چھین لئے، ان چیخوں میں مردوں کی چیخیں بھی تھیں، عورتوں کی چیخیں بھی تھیں، سب چیخ رہے تھے اور بری طرح بھگدڑ مچ گئی تھی، الٹا پنج کی آوازیں آ رہی تھیں، نجانے کیا کیا ہو رہا تھا، میں نے ایک جھرجھری سی لی اور اس ہولناک صورت حال سے نمٹنے کے لئے میں خود بھی دروازے سے باہر نکل آیا، میں اس سیال مادے سے بچ بچ کر نکل رہا تھا جو زمین پر کافی حد تک پھیلا ہوا تھا اور اس کی بدبو ساتھ ساتھ سفر کر رہی تھی۔

باہر تو قیامت مچی ہوئی تھی، کمروں کی گیلری میں لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، دروازے دھڑا دھڑ بند ہو رہے تھے، اس کے بعد یہ آوازیں نیچے سے آنے لگیں، غالباً وہ لفٹ میں جانے کے بجائے سیڑھیاں اترنے لگی تھی، لفٹ وغیرہ کا تو خیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور جس منزل سے بھی وہ گزرتی وہاں خوفناک تاثرات چھوڑ جاتی، پورے ہوٹل میں افراتفری پھیل گئی تھی، انتظامیہ کے افراد بھاگے بھاگے پھر رہے تھے لوگ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ وہ خوفناک بلا کہاں سے نمودار ہوئی ہے، وہ انسانی ڈھانچہ کون سے کمرے سے نکلا ہے، میرے کمرے کی خصوصاً نشاندہی ہو گئی تھی، میں سیڑھیوں ہی سے اترتا ہوا نیچے آ گیا۔

ہر طرف ایک ہولناک بھگدڑ مچی ہوئی تھی، لوگ چیخ چلا رہے تھے، کچھ عورتیں دہشت سے بے ہوش ہو گئی تھیں، کچھ بچے بھی تھے جو بھاگ بھاگ کر پتہ نہیں کہاں کہاں چڑھ گئے تھے، یہی حال گراؤنڈ فلور کا بھی ہوا، میں گراؤنڈ فلور پر آ گیا، لیکن وہ اب ہال میں بھی نہیں رکی تھی اور دروازے سے باہر نکل گئی تھی، مختصر یہ کہ اس وقت جو کچھ ہوا تھا وہ ایک ناقابل یقین سا عمل معلوم ہوتا تھا جس کی صحیح تشریح میں بھی نہیں کر سکتا، حقیقت مجھے معلوم تھی لیکن اس کے بعد مجھے غور کرنا تھا کیونکہ میرے ساتھ جو کچھ ہوتا وہ میرے لئے بڑا عذاب ناک ہوتا۔

یقینی طور پر ہوٹل میں جو افراتفری پھیلی تھی اس سے اس شاندار ہوٹل کو نقصانات بھی ہوئے تھے اگر میں ساری صورتحال بتا دیتا تو میری گردن گرفت میں آسکتی تھی اور یہ معاملہ پولیس کی تحویل میں بھی جا سکتا تھا اس لئے عقل سے کام لینا تھا، میں تھکے تھکے سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ باہر کی باتیں اندر ہو رہی تھیں، وہ باہر نکلی تھی، یقینی طور پر سڑک پر بھی کچھ حادثات ہوئے ہوں گے۔ میں ان کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، کچھ لوگ باہر بھی دوڑ گئے تھے اور اس کے بعد جب وہ اندر آئے تو ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے، پتہ یہ چلا کہ وہ اچھل کر ایک ٹرک پر چڑھ گئی تھی جو سبزیوں سے لدا ہوا تھا، ٹرک ڈرائیور کو نہیں معلوم تھا کہ پیچھے اس طرح کا کوئی فرد آ گیا ہے، بہر حال اس طرح باہر زیادہ ہنگامہ نہیں ہو سکا تھا چونکہ وہ گم ہو گئی تھی، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد ہوٹل کے منیجر اور دو سپروائزر میرے پاس پہنچ گئے۔

''سر...... آپ روم نمبر چار سو تیرہ کے مکین ہیں؟'' بھلا انکار کی کیا گنجائش تھی میں نے گردن ہلا دی تو منیجر کا موڈ بگڑ گیا، وہ بولا۔

''آیئے آپ میرے آفس میں آیئے۔''

میں نے اپنے ذہن میں ایک کہانی تیار کر لی تھی، میں جانتا تھا کہ منیجر میرے ساتھ سختی سے پیش آئے گا اور اس بارے میں سوالات کرے گا، چنانچہ میں اس کے شاندار آفس میں پہنچ کر تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کیا تماشہ لگایا ہے آپ نے یہ سب، وہ انسانی ڈھانچہ کون تھا؟''

تب میں نے اپنے چہرے پر شدید غصے کے آثار پیدا کئے اور کہا۔ ''منیجر میں پولیس سے رابطہ قائم کرنا چاہتا ہوں؟''

''وہ تو ہم خود کر لیں گے، لیکن آپ بتایئے کیا ہوا تھا، وہ آپ کے کمرے سے برآمد ہوا تھا، کون تھا وہ؟''

دعائے صحت

ملک کے مشہور و معروف کہانی نویس جن کی بے شمار شہرہ آفاق کہانیاں بڑے ڈائجسٹوں میں اور خاص طور پر زیادہ تر ڈر ڈائجسٹ میں جلوہ گر ہوتی رہی ہیں ایم الیاس جو کہ آج کل بہت علیل ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ قلبی لگاؤ کے ساتھ ایم الیاس کی صحت یابی کے لئے اللہ کے حضور ضرور دعا کریں۔ شکریہ۔

ادارہ، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ

''یہ سوال آپ مجھ سے کر رہے ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''ایک آسیب زدہ کمرے میں آپ نے کسی مسافر کو ٹھہرانے کی جسارت کیسے کی، مجھے جانی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''بتاتا ہوں مطلب آپ کو، میں اس کمرے میں مسلسل خوف ناک کیفیتیں محسوس کر رہا تھا، رات کی تاریکی میں مجھے یوں لگتا تھا جیسے کچھ پراسرار روحیں ادھر سے ادھر آ جا رہی ہوں، پہلے میں نے اسے ایک وہم قرار دیا اور اس کے بعد میں سوچنے لگا کہ اگر میں یہ بات کسی کو بتاتا ہوں تو لوگ میرا مذاق اڑائیں گے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

''وہ ایک آسیب زدہ کمرہ ہے منیجر صاحب اور وہاں جو کچھ ہوا ہے اس کی مکمل ذمہ داری آپ پر ہے، جایئے اس کمرے میں جا کر دیکھئے، وہاں ایک عجیب و غریب کیفیت ہے۔''

''کک...... کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مطلب اندر جا کر دیکھئے، اٹھیے چلئے میرے ساتھ۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

منیجر ان دونوں سپروائزروں کے ساتھ اپنی جگہ

سے اٹھ گیا، پھر وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتا ہوا اس کمرے میں آیا، لیکن وہ سیال مادہ جو شدید بدبودار تھا پڑے ہوئے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے دونوں سپروائزروں میں سے ایک تو اپنا سینہ پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا، وہ غالباً دل کا مریض تھا۔ منیجر نے ادھر ادھر دیکھا پھر خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''یہ..... یہ..... یہ سب کچھ کیا اور کیسے ہوا؟''

''میں نے کہا نا آپ یہ سوال مجھ سے کر رہے ہیں اپنے ہوٹل کے ذمہ دار آپ ہیں، آپ کو پتہ ہے کہ یہاں لوگ اعتماد کے ساتھ آکر ٹھہرتے ہیں، ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ پہلی بار ہوا ہو، آپ کو علم ہوگا کہ آپ کے ہوٹل کا یہ کمرہ یا پورا ہوٹل ہی آسیب زدہ ہو۔''

''خ..... خدا کے لئے ایسی بات نہ کہئے، یہ یہ یہ ..... سب کچھ کیا ہے، یہ سب کچھ کیا ہے، اسے تو کیوں مر رہا ہے، میری مدد کر رہا ہے یا دل پکڑ کر بیٹھ گیا ہے، اپنا، چل واپس جا۔'' منیجر سپروائزر پر بگڑ گیا، لیکن سپروائزر سے اٹھا نہیں جا رہا تھا، اس نے دوسرے سپروائزر سے کہا۔

''دوسروں کو بلا کر اس کو اٹھا کر کمرے میں پہنچاؤ، کیا مصیبت آگئی ہے، آپ میرے ساتھ آیئے سر، میرے ساتھ آیئے۔'' منیجر کا لہجہ ایک دم سے نرم ہوگیا، غالباً وہ خوف زدہ ہوگیا تھا، پھر وہ اپنے آفس میں جانے کے بجائے برابر کے ایک خالی کمرے میں داخل ہوگیا۔

''م..... مجھے بتایئے، پلیز بتایئے۔''

''منیجر میں یہاں آیا تھا آنے کے بعد ظاہر ہے میرا یہاں قیام رہا، میری ایک دوست بیرون ملک سے آئی تھی، اصل میں اسی کے لئے میں نے یہ کمرہ لیا تھا اور مجھے اس کے ساتھ ٹھہرنا بھی پڑا، وہ چلی گئی، لیکن میں یہ محسوس کرتا رہا کہ اس کمرے میں کوئی پراسرار سی کیفیت ہے، میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ میرا مذاق اڑایا جائے گا، مجھے وہمی سمجھا جائے گا اس لئے میں خاموش رہا، اب

سے کچھ دیر پہلے جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تو میں نے یہاں شدید بدبو محسوس کی، مجھے یوں لگا جیسے غسل خانے میں کوئی نہا رہا ہے، مجھے حیرت ہوئی، پھر جب میں نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو میرے خدا، میرے خدا.....'' میں نے اداکاری شروع کردی۔

''ک..... کیا ..... ک..... کیا ہوا وہاں کوئی تھا؟''

''آپ وہاں جا کر دیکھ لیجیے۔''

''ن..... نہیں، م..... مجھے بتایئے آپ۔''

''وہاں واشنگ ٹب میں ایک عجیب سا مادہ پڑا ہوا ہے اور پورا غسل خانہ اس مادے سے بھرا ہوا ہے۔''

''او مائی گاڈ۔'' منیجر نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''میں باہر آیا تو میں نے اس انسانی ڈھانچے کو دیکھا اور میرے حواس گم ہوگئے، میں پچھڑا سا گیا تھا، تبھی وہ ڈھانچہ دروازہ کھول کر باہر بھاگا اور اس کے بعد یہ سارا واقعہ پیش آیا۔''

''مائی گاڈ، مائی گاڈ، آپ یقین کریں سر، یہ بالکل پہلی بار ہوا ہے، اس ہوٹل کی زندگی میں پہلی بار ہوا ہے، لیکن لیکن یہ سب ..... سر میں آپ سے ایک درخواست کروں۔''

''جی ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ کا رویہ بہت سخت تھا.....؟''

''اس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں، میری ایک درخواست ہے، اس بات کو یہیں رہنے دیجیے، یہ بات منظر عام پر نہیں آنی چاہئے کہ وہ ڈھانچہ اس کمرے سے برآمد ہوا تھا، سر ہمارا ہوٹل بدنام ہوجائے گا، ہمارے ہوٹل میں پھر کوئی مسافر قیام نہیں کرے گا، ہم برباد ہوجائیں گے، لٹ جائیں گے ہم۔''

''مگر ابھی تو.....''

''م..... معافی چاہتا ہوں۔ بہت زیادہ معافی چاہتا ہوں، خدا کے لئے آپ خاموشی اختیار کیجیے، خدا

کے لئے بلکہ ایسا کریں آپ اب اس کمرے میں جائیں ہی نہیں، یہاں جس کمرے میں چاہیں آپ قیام کرلیں۔"

"تھوکتا ہوں میں اس ہوٹل کے کمروں پر۔"

"ایسا نہ کہیئے، پلیز! آپ کسی کو بھی یہ صورت حال نہ بتایئے گا، ہم ہرجانہ ادا کرنے کے لئے تیار ہیں، آپ کا جو سامان اس کمرے میں موجود ہے اس کے لئے اطمینان رکھیئے گا پوری احتیاط کے ساتھ آپ تک پہنچادیا جائے گا۔"

"مگر میرے ساتھ جو ہوا ہے۔"

"خدا کے لئے آپ ہمیں معاف کردیجیے، ہم پوری تحقیقات کرائیں گے کہ آخر یہ ایسا ہوا کیسے، ہوسکتا ہے یہ کوئی اتفاقیہ امر ہی ہو، کوئی ایسی پراسرار روح یہاں داخل ہوگئی ہو جس نے یہ تمام حرکتیں کی ہوں، لیکن اگر یہ بات منظر عام پر آگئی تو ہمارا ہوٹل دوکوڑی کا ہوکر رہ جائے گا۔"

میں نے آہستہ آہستہ اپنا رویہ نرم کیا ظاہر ہے میں بھی بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا جبکہ میرے اپنے حواس بھی ٹھیک نہیں تھے، میری طبیعت متلا رہی تھی جو بدبودار سیال میں نے دیکھا تھا اس نے میرے ہوش وحواس خراب کررکھے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اب میرا کیا ہوگا۔

بہرطور منیجر میری خوشامدیں کرتا رہا، باہر ہنگامہ آرائی ہورہی تھی اور اس سلسلے میں بھی مجھ سے کچھ نہ کچھ کہنا تھا، میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور وہاں سے باہر نکل آیا، منیجر پہلے ہی باہر نکل گیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے ہوٹل بھی چھوڑ دیا۔

مجھے کوئی پرسکون گوشہ درکار تھا جہاں بیٹھ کر میں کوروتی کے بارے میں سوچ سکتا اور یہ پرسکون گوشہ میرے گھر کے علاوہ کون سا ہوسکتا تھا، میں گھر واپس آگیا، غیر متوقع طور پر ہوٹل کے ہنگامے سے جان چھوٹ گئی تھی، ورنہ نجانے کہاں کہاں گھسٹنا پڑتا، منیجر تو ہوٹل کی ساکھ قائم رکھنے کے لئے میرے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوگیا تھا، پتہ نہیں بعد میں وہاں کیا ہوا، لیکن یہ ان کا معاملہ تھا، میں تو اپنے حواس قائم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ بہت زیادہ بہادر بننا نہ تو ممکن ہے اور نہ آپ اس پر یقین کریں گے۔

جو واقعات گزرے تھے وہ بے حد بھیانک تھے، یہ الگ بات ہے کہ صدیوں پرانی ایسی شخصیتوں سے میرا واسطہ تھا جو کوئی ارواح خبیثہ نہیں تھی، بلکہ جیتے جاگتے انسان تھے دونوں کے دونوں، اور انوکھی روایت جو صرف کہانیوں کی شکل میں آتی رہتی تھی یعنی آب حیات امرت جل چشمہ حیوان اس سے متعلق سینکڑوں داستانیں میں نے پڑھی تھیں بلکہ کچھ لکھی بھی تھیں، لیکن وہ صرف کہانیاں ہوتی تھیں، میری اپنی گھڑی ہوئی کہانیاں، میں تو حیران رہ گیا تھا اس وقت جب میری ملاقات ایسے دو انسانوں سے ہوئی تھی جو چشمہ حیواں سے فیض یاب ہوچکے تھے اور زندگی گزار رہے تھے۔ میں نے ان کے تاثرات بھی سنے تھے، خاص طور سے کوروتی کے، وہ کہتی تھی کہ امر رہنے کے فیصلے ٹھیک نہیں ہوتے اور نہ وہ خواہش اچھی ہوتی ہے کیونکہ قدرت نے ہر چیز فانی پیدا کی ہے اور یہ چشمہ حیوان وغیرہ اس کے معجزات ہیں۔

یقینی طور پر ہم قیامت پر یقین رکھتے ہیں، اس وقت جو کوئی بھی ہوگا فنا کے بعد زندگی کی منزل میں آئے گا اپنے حساب کتاب کے لئے اس سے تو کسی طرح انکار کیا ہی نہیں جاسکتا، اس وقت ایسے کسی وجود کا کیا ہوگا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن بہرحال یہ جو کچھ واقعات ہورہے تھے، یہ ناقابل یقین تھے اور ہوش وحواس چھین لینے کے لئے کافی، میرے سارے بدن میں سناٹے دوڑ رہے تھے، پھر میرے ذہن میں اپنی کتاب کا خیال آیا اور میرے دل کو ایک دکھ کا سا احساس ہوا۔

زندہ صدیاں تو نامکمل رہ گئی، کوروتی مجھے کہاں تک لے جاتی ہے، میری یہ کتاب کتنی طویل ہوسکتی ہے اس کا میں نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن

کتاب یہاں پر ختم ہوجائے گی اس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا، اب کیا کروں، کیا ہونا چاہئے، تو تم بھنسالی بدمعاش اپنا کام دکھا گیا تھا اس نے کوروتی سے انتقام لے لیا تھا، سارے بدن میں اینٹھن ہورہی تھی، رات ہوگئی تھی طبیعت پر ایک بوجھ سا طاری تھا اور دماغ سائیں سائیں کررہا تھا، کچھ کھانے پینے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا، میں اسی طرح بستر پر دراز ہوگیا، میری اولین کوشش تھی کہ مجھے نیند آجائے تاکہ اس ذہنی انتشار میں کچھ کمی ہوجائے، نیند نے مہربانی کی اور آہستہ آہستہ میری پلکیں جڑ گئیں۔

پتہ نہیں کتنی دیر سویا تھا کہ مجھے کچھ تحریک سی محسوس ہوئی، ایک لمحے تک تو نیم غنودہ ذہن کوئی کام نہ کرسکا لیکن دوسرے لمحے مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے پاس لیٹا ہوا ہے، اس احساس کے تحت میں نے ہاتھ اپنے برابر رکھا تو ایک دم سے پورا بدن جھنجھنا کررہ گیا، وہ ہڈیاں تھیں، سوکھی ہوئی انسانی پسلیاں جو میرے ہاتھ کی گرفت میں آئی تھیں اور ایک دم سے میرا ذہن جاگ گیا، مجھے کوروتی یاد آگئی، میرے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی اور میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک استخوانی پنجہ میرے سینے پر آکر جم گیا، اتنا مضبوط اور وزنی دباؤ تھا کہ میں اٹھ نہ سکا، تبھی کوروتی کی آواز سنائی دی۔

"مجھے دیوانگی کا شکار مت کرو ذیشان عالی، لیٹے رہو اسی طرح میرے پاس جو کچھ میں کہہ رہی ہوں اسے غور سے سنتے رہو، اگر تم نے مجھ سے اضطراب برتنے کی کوشش کی تو ہوسکتا ہے میرا ذہن منتشر ہوجائے اور میں کچھ کر بیٹھوں۔"

اس کے الفاظ بڑے سخت تھا، ایسا لہجہ اس نے آج تک اختیار نہیں کیا تھا، پھر میرے سینے پر جو دباؤ تھا مجھے محسوس ہورہا تھا کہ اگر میں نے طاقت لگا کر اٹھنے کی کوشش کی تو شاید کامیاب نہ ہوسکوں، بدن نے ٹھنڈا پسینہ چھوڑ دیا، لیکن لیٹا رہا۔

"خود کو وہ مت ظاہر کرو جو مجھے دیوانہ کردے، تم میرے محبوب ہو، میرے بہت اچھے دوست ہو، مجھ سے تعاون کرو، مجھ پر جو بپتا پڑی ہے تمہاری وجہ سے پڑی ہے، تم اس طرح مجھ سے اجتناب کروگے تو پھر میں کس کے سہارے آگے کا سفر طے کروں گی۔ تم ہی سے تو ساری باتیں کرنی ہیں۔"

میں نے ذرا ٹھنڈے دل سے سوچا کہ کہہ تو ٹھیک رہی ہے، اگر میں اس سے اجتناب برتوں گا تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور میں جانتا تھا کہ وہ جس روپ میں بھی ہے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش ہرگز نہیں کرے گی اور اب جو کچھ ہوگا وہ میری کہانی میں نئے اضافے کا باعث ہوگا، یقینی طور پر اس کی قربت کا ایک ایک لمحہ میری کتاب کے صفحات میں اضافہ کرے گا چنانچہ میں نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے اس کے استخوانی پنجے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے معاف کرنا کوروتی، میں صرف ایک انسان ہوں کوئی سپر مین نہیں، واقعی تم سے اجتناب ممکن نہیں ہے، تم میری بہترین دوست ہو، میری ساتھی۔" میں نے کہا اور اس نے میرے سینے پر سے ہاتھ اٹھا کر میری گردن میں حائل کرلیا، پھر اپنا رخ میری جانب کرکے اپنا چہرہ میرے چہرے سے منسلک کردیا۔ زندہ صدیاں پڑھنے والے ساتھیو! مجھ پر ہنسو دل ہی دل میں میرا مذاق اڑاؤ، ایک دوسرے سے میرے بارے میں باتیں کرو، کیونکہ تمہارا محبوب مصنف ذیشان عالی ایک عجیب وغریب کیفیت سے دوچار ہوا تھا۔

ایک سوکھے ہوئے ڈھانچے کا منہ میرے منہ سے مس ہورہا تھا، اس کے ہونٹوں پر گوشت کا کوئی نشان نہیں تھا، لیکن اس کا دباؤ مجھے اپنے ہونٹوں پر محسوس ہورہا تھا، انسانی جذبات کی کیا کیفیت ہوسکتی ہے، میں نہیں تو تم اس کا اندازہ ضرور کرسکتے ہو، لیکن جو فیصلہ میں نے کیا تھا میں اس پر قائم تھا، میں نے اس سے اجتناب نہیں کیا اور ایک خوف ناک ڈھانچہ بری طرح مجھ سے لپٹ گیا۔

وہ بڑی گرم جوشی کا اظہار کررہی تھی، مجھ سے

رہی

ور پر یسے کیسے

ب۔۔ ہر سور میں اس کی طرح

سنا، لیکن اس کے بعد میں نے اسے

احساس نہ ہونے دیا کہ میرے دل میں اس کے لئے کوئی برا تصور ہے، وہ دیر تک اپنے جذبات کا مظاہرہ کرتی رہی اور اس کے بعد پرسکون ہوگئی۔

''آہ میں تمہاری شکر گزار ہوں، کوئی بھی اس کیفیت کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا، ذیشان عالی تم نے مجھے ایک سچے دوست ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ باتیں کرو گے مجھ سے؟''

''ہاں کیوں نہیں کوروتی؟''

''وہ آیا، تمہارے روپ میں آیا اس لئے میں نے اس پر غور نہیں کیا کہ تمہیں تو ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، کچھ غلطیاں میری بھی تھیں، لیکن تم خود سوچو کہ وہ غلطیاں غلطیاں نہیں تھیں، میں ہوٹل کے کمرے میں تھی، ویٹر زیادہ سے زیادہ اندر آسکتا تھا، مجھے غسل خانے میں پاکر واپس چلا جاتا، اس لئے میں نے غسل خانے کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا اور اگر بند بھی کر لیتی اور وہ بدبخت آنا چاہتا تو اس کے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا، میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس نے بھی بے شمار علوم سیکھے ہیں، ہم نے اپنی طویل ترین صدیوں کی زندگی میں اور کیا ہی کیا ہے، تو وہ بند دروازے کھول سکتا تھا، تمہارے روپ میں اندر آیا اور میں مسکرادی کیونکہ تم تو میرے روئیں روئیں کے راز دار ہو، پھر اس نے وہ شیشی کھول کر باتھ ٹب میں ڈالی تو میں نے یہی سمجھا کہ تم اس میں خوشبو ڈال کر محبت کا اظہار کر رہے ہو، لیکن وہ کچھ اور ہی کر کے آیا تھا، اس نے ایسا اس لئے کیا کہ میں تمہاری قربت میں تھی۔''

''یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے میری قربت میں تو تم تھیں، لیکن یہ لمحات تو تمہیں صدیوں میں گزر چکے ہیں جیسا کہ بقول تمہارے اولاش، سکندر یا پھر نیوسکی اداس جیسے دوسرے۔''

''پاگل پن کی باتیں کر رہے ہو، بتا چکی ہوں تمہیں کہ وہ میں نہیں تھی بلکہ صدیوں کے گزرے کردار تھے، میں تو صرف ایک دیدہ ور تھی جو دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی، سمجھ رہی تھی اور وہی ساری باتیں میں نے تمہیں بتائیں، لیکن اب میں مجسم کوروتی کی حیثیت سے تمہارے ساتھ تھی، وہ کوروتی جو گوتم بھنسالی کی آرزو تھی۔ اس کی امید تھی یہ امید کہ شاید کبھی کوئی ایسا لمحہ آجائے جب میرے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ پیدا ہوجائے، وہ اسی لمحے کے انتظار میں تھا، لیکن تم نے میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کے بعد وہ مایوس ہوگیا۔''

''کوروتی مجھے ایک بات بتاؤ......'' میں نے اب اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال لیا تھا، بے شک ایک انسانی ڈھانچہ میرے نزدیک لیٹا ہوا تھا، لیکن وہ کوروتی تھی، کوئی اور نہیں تھا اور اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا، یہ بھی ایک انوکھا تجربہ تھا جو ایک مصنف کو ہی ہوسکتا ہے، سمجھ رہے ہیں نا آپ، بہت دیر تک خاموشی طاری رہی، پھر کوروتی نے کہا۔

''آہ مجھے کبھی ایسی امید نہیں ہوسکتی تھی اس سے، میں جانتی تھی کہ وہ مجھے بہت زیادہ چاہتا ہے، دیوانہ ہے میرا، میرے ساتھ وہ کوئی ایسا سلوک کرے گا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا لیکن ذیشان عالی میرا ساتھ دو مجھے پیار کرتے رہو، میں اسے ناکام بنانا چاہتی ہوں، میں اسے یہاں بھی تڑپانا چاہتی ہوں، ضبط سے کام لو پلیز، ضبط سے کام لو، مجھے ناکام نہ کرو، میں نے یہ سب کچھ تمہارے لئے کیا ہے ورنہ وہ کبھی میرے ساتھ ایسا نہ کرتا۔''

میرے ذہن میں بہت سے برے خیالات آئے تھے، لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا، خواہ مخواہ اپنی مصیبت نہیں بلانا چاہتا تھا، البتہ میں نے اتنا ضرور کہا۔

''مگر مجھے ایک بات پر حیرت ہے کوروتی۔''

''کونسی بات پر؟''

''یہ سلوک وہ میرے ساتھ بھی تو کر سکتا تھا۔''

سے محفوظ کردیا ہے۔

''کیسے؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''ایک عمل کے ذریعے ایک منتر کے ذریعے جو مجھے معلوم تھا، وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، میں نے تم سے پہلے بھی یہ بات کہی تھی جو شاید تمہارے ذہن سے نکل گئی۔''

''ہاں تم نے مجھ سے کہا تھا۔''

''میں نے تمہیں محفوظ کردیا تھا لیکن یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ جھنجلاہٹ میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

میں خاموش ہی رہا، ظاہر ہے میں خود اپنی کیا رائے دے سکتا تھا، لیکن یہ سن کر مجھے ذرا سا اطمینان ہوا تھا کہ گوتم بھنسالی مجھ پر اس طرح کا کوئی وار نہیں کرسکتا، یہ بھی کوروتی کی مہربانی تھی، ورنہ میں بھلا اس کا کیا مقابلہ کرسکتا تھا، مجھے تو یہ سب کچھ آتا ہی نہیں تھا، میں نے اس سے اور کوئی سوال نہیں کیا، یہ افتاد اس پر بھی پڑی تھی اور مجھ پر بھی، حالانکہ سچی بات میں آپ کو بتاؤں، کوروتی مجھ سے بہت قریب آگئی تھی اور ایک ایسا کردار تھی جو میرے لئے بڑا انوکھا اور کافی سنسنی خیز تھا، اس کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ ایک ایسی کہانی تھا جس پر اپنے آپ کو بھی یقین نہ آئے، جبکہ کہانی اپنے ساتھ چل رہی تھی، لیکن جو تھا وہ تھا، اب مجھے بھی سوچنا تھا اور کوروتی کو بھی۔

صبح تک وہ میرے ساتھ رہی اور جاگتی رہی، وہ بار بار یہ محسوس کرنا چاہتی تھی کہ میں اس سے منحرف تو نہیں ہو رہا، یہاں میرے دوستو! میں عورت کی اس فطرت کا تذکرہ کروں کتنی ہی آگے بڑھ جائے کچھ بھی ہوجائے لیکن عورت پن اس سے دور نہیں ہوتا، وہ اپنے سارے وجود میں صرف عورت ہی رہتی ہے اور کوروتی بھی اس وقت دہشت کا شکار تھی، ظاہر ہے اس کی سوچیں کیسی عجیب عجیب ہوں گی، اسے صدیوں

دوسری صبح میں نیند کی وجہ سے چکرایا ہوا تھا، بھلا اس طرح کسی کو نیند آسکتی ہے کہ اس کے برابر ایک استخوانی ڈھانچہ لیٹا ہوا ہو اسے مخاطب کر رہا ہو، بار بار وہ مجھے اپنے آپ میں سمیٹ لیتی تھی اور میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے، بہت سی سوچیں دامن گیر ہوجاتی تھیں، قبر میں انسان کے جسم کا سارا گوشت گل جاتا ہے، ڈھانچے رہ جاتے ہیں جیسے کہ میں نے بہت سے دیکھے تھے، لیکن وہ قبر کی بات ہے ایک زندہ انسان کسی ڈھانچے کے ساتھ کیسے گزارہ کرسکتا ہے، شکر ہے کہ اس کے پاس کوئی ایسا علم نہیں تھا جس سے وہ دل کے اندر کی بات جان لے اور اسے پڑھ لے۔ سورج پوری طرح نہیں نکلا تھا، ابھی جھٹپٹا پھیلا ہوا تھا کہ اس نے مجھے آواز دی۔

''عالی.....''

''ہاں کوروتی.....'' میں نے اپنے لہجے میں پیار گھولتے ہوئے کہا۔

''کیا سوچ رہے ہو میرے بارے میں؟''

''دکھی ہوں اور پریشان ہوں اور یہ سوچ رہا ہوں کہ کاش میرے پاس ایسی قوتیں ہوتیں جو تمہیں تمہاری اصلی شکل واپس دلا دیتیں۔''

''یہ سوچ رہے ہو تم؟'' اس کے لہجے میں خوشی کا عنصر تھا۔

''ہاں۔''

''آہ عالی! ہم پر یہ افتادہ پڑی ہے، لیکن تم فکرمند نہ ہو، میں نے بھی اس سنسار میں بہت کچھ سیکھا ہے، کبھی سوچا نہیں تھا اس بارے میں کہ ایسا کوئی وقت آجائے تو کیا کروں گی، اصناکیہ کے بارے میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نے تاریخ کے ان بڑے کرداروں کی خواہش پر اصناکیہ کا وجود حاصل کیا تھا اور جو کچھ بھی

ہوا تھا امنائیہ کی تاریخ کے مطابق ہوا تھا، لیکن وہ طریقہ کار میں اب بھی اختیار کرسکتی ہوں اور عارضی طور پر بہت کچھ کرسکتی ہوں، لیکن میں کوروتی ہوں اور کوروتی ہی رہنا چاہتی ہوں، میں گوتم بھنسالی کو کتا بنانا چاہتی ہوں، اس کے ہر عمل کو ناکام کرنا میرے جیون کا سب سے بڑا مقصد ہے، مجھے سوچنا پڑے گا یہ غور کرنا پڑے گا کہ میرے ساتھ یہ سب کچھ جو ہوا ہے اسے ختم کرنے کے لئے کیا کروں، یہ سوچنا پڑے گا مجھے اور تم مجھے اس کا سے دو۔"

"میں ہر طرح تمہارے لئے حاضر ہوں کوروتی...... فکرمند نہ ہو۔"

وہ چند لمحات سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔ "مجھے ایسے کپڑے دو جو میں اپنے اس شریر پر پہن سکوں۔"

"میرے پاس مردانہ کپڑوں کے ایسے انبار ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں مجھے ایک بڑی چادر دے دو۔"

"ہاں وہ ہے۔" میں نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا، میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ نظر بھر کر اسے دیکھوں، الماری سے میں نے ایک چادر نکالی اور اس کی جانب بڑھا دی۔ اس نے وہ چادر میرے ہاتھ سے لے کر اسے اوڑھ لیا، چہرہ تک ڈھک لیا پھر اس نے کہا۔

"میں آئینے کے سامنے نہیں جانا چاہتی، انسان ہوں، زندہ ہوں، اپنی یہ حالت برداشت نہیں کرسکوں گی، ابھی میں یہ سوچ رہی ہوں کہ میری دوسری کیفیات میں کیا فرق پڑے گا، جیسے کھانا پینا، ویسے میرے اندر کی خواہشات تو بالکل اسی طرح ہیں جس طرح میری پہلی شکل میں تھیں۔"

"تم زندہ ہو کوروتی اور میں جانتا ہوں کہ تم جتنی ذہین ہو بہت جلد تم اپنی اصل حیثیت میں واپس آجاؤ گی۔"

"بھگوان تمہارا کہا درست کرے، تمہارا یہ کہنا پورا ہوجائے، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کمرے کے دروازے سے باہر نکل گئی، میں مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانس لینے لگا۔

میرے خدا مجھے اب کیا کرنا ہوگا، اتنا اندازہ مجھے ہوگیا تھا کہ کوروتی آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی بلکہ اب تو اور بھی بہت سے خیالات میرے دل میں آنے لگے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ زندہ صدیاں میری آخری کتاب ہو، اس کے بعد لکھنے لکھانے کا سلسلہ مجھے ترک کرنا پڑے کیونکہ کوروتی کی جان بچنا مشکل نظر آرہا تھا۔

اس وقت نجانے کیا کیا سوچیں دامن گیر تھیں، میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا، آدھا گھنٹہ پونا گھنٹہ گزر گیا کوروتی دروازے سے باہر نکل گئی تھی، واپس نہیں آئی تو میں اٹھ کر باہر نکل آیا، پھر میں پورے گھر میں اسے تلاش کرتا رہا، لیکن وہ پراسرار طور پر چلی گئی تھی وہ میرے گھر میں موجود نہیں تھی، ایک پریشانی سی ذہن میں پیدا ہوگئی تھی، بہرحال غسل خانے میں جاکر میں بہت اچھی طرح نہایا، بلکہ میں نے اپنے آپ کو خصوصی طور پر اتنا رگڑا کہ بعض جگہ بدن کے کچھ حصوں میں جلن ہونے لگی، پھر لباس پہن کر میں بیٹھ گیا۔

کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، حالانکہ بھوک لگ رہی تھی، لیکن طبیعت میں ایک کراہیت سی تھی، البتہ مجھے یہ کراہیت چھپانی تھی۔ کوروتی کو اس کا احساس نہیں ہونا چاہئے، باقی تو اور کوئی بات نہیں تھی، لیکن نہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بددل ہوکر میرا ہی تیاپانچہ کرنے پر تیار ہوجائے۔ آدھا دن چڑھ گیا، بھوک شدت اختیار کرنے لگی تو کچن میں جاکر کھانے پینے کی تیاریاں کیں، طبیعت پر ایک عجیب سی دہشت سوار تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں، پورا دن گھر میں پڑے پڑے ہی گزرا، مجھے رات کا خوف تھا کہ کہیں رات میں اس کی واپسی نہ ہوجائے۔ جو رات گزری تھی وہ تو بڑی عجیب گزری تھی اس کے اثرات ابھی تک ذہن پر طاری تھے، دن میں سونے کی کوشش نہیں کی تھی، لیکن بس سرِ شام ہی نیند سی آرہی تھی۔ تھوڑا

بہت کھایا پیا اور جا کر بستر پر لیٹ گیا، بہت دیر تک اس وحشت کا شکار رہا کہ دیکھیں کب اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے، پھر نجانے کب نیند آ گئی اور پھر صبح ہی کو جاگا تھا۔

ایک خوشی کا سا احساس ہوا وہ رات کو بھی واپس نہیں آئی تھی اور یہ بات ذرا عجیب سی تھی، خدا کرے اب اس کی واپسی نہ ہو، زندہ صدیاں کا وائنڈ اپ تو میں کر ہی لوں گا، لیکن وہ بھیانک وجود کہیں میرے اوپر مسلط ہی نہ ہو جائے وہ دن بھی گزر گیا، رات بھی چلی گئی، پھر اس طرح تقریباً تین یا چار دن گزر گئے تو مجھے ذہنی سکون نصیب ہوا، وہ کہیں چلی گئی تھی اور ہو سکتا ہے اب وہ واپس نہ آئے، آہ کاش ایسا ہی ہو، لیکن ابھی اور کچھ دل نہیں چاہ رہا تھا۔

اس دن بھی وہ مجھے بتائے بغیر چلی گئی تھی، پھر شاید ساتواں یا آٹھواں دن تھا کہ میرے اپنے ہی دل میں کچھ خیال آیا، میں نے سوچا کہ ذرا اس پراسرار عمارت میں جا کر تو دیکھوں جہاں وہ پراسرار کتاب موجود ہے، اندازہ لگاؤں کہ اب وہاں کی کیا کیفیت ہے، ویسے بھی ایک اور خیال دل میں تھا اگر وہ وہاں ہے تو یہ ضرور سوچے گی کہ میں نے اس طرف رخ نہیں کیا، کیا میں اس سے منحرف ہو رہا ہوں جب تک کہ اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ وہ مجھ سے کہیں بہت دور چلی گئی ہے، مجھے آرام سے نہیں بیٹھنا چاہئے کہ کہیں میرے لئے مصیبت ہی نہ بن جائے، ویسے اس دوران گوتم بھنسالی کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔

آخرکار اپنے پروگرام کے مطابق میں اس کوٹھی کی جانب چل پڑا جہاں وہ کتاب موجود تھی اور جو پراسرار عمارت کوروتی کی ملکیت تھی، عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی، انتہائی ہولناک ویرانی برس رہی تھی اس پر، حالانکہ پہلے بھی یہ عمارت ویران ہی ہوتی تھی، لیکن اس وقت کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا، ہو سکتا ہے یہ احساس میرے دل کے اندر ہو، آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر داخل ہو گیا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ پراسرار نگاہیں میرا جائزہ لے رہی ہوں، ہو سکتا ہے کوروتی نے اپنے آپ کو یہاں پوشیدہ کر لیا ہو، ہو سکتا ہے وہ یہ جائزہ لے رہی ہو کہ میں یہاں کس مقصد کے تحت آیا ہوں، میں کوٹھی کے مختلف حصوں میں چکراتا رہا اور آخرکار وہاں پہنچ گیا جہاں وہ کتاب موجود تھی، پتھر کی کتاب جس میں صدیاں زندہ تھیں، نجانے کتنی صدیاں، لیکن میں نے ان سیڑھیوں کو عبور کر کے کتاب تک جانے کی کوشش نہیں کی، اب اس قدر بھی احمق نہیں تھا پہلے تو کوروتی صحیح سالم حالت میں موجود تھی، اگر میں کسی دور میں چلا جاتا اور وہاں کسی بڑی مشکل کا شکار ہو جاتا تو کوروتی مجھے اس مشکل سے نکال سکتی تھی، لیکن اب اگر میں نے یہ احمقانہ کوشش کی اور کتاب تک گیا تو کہیں یوں نہ ہو کہ میں تاریخ کے کسی ورق میں قید ہو کر رہ جاؤں اور وہیں فنا ہو جاؤں، نا بابا نا، اتنا بڑا مصنف نہیں بننا چاہتا تھا چنانچہ وہاں سے واپس پلٹ پڑا، کوروتی اپنی کوٹھی میں بھی موجود نہیں تھی۔ ظاہر ہے اعصابی کیفیت بہتر نہیں تھی۔

پھر چھ سات دن مزید گزر ے غالباً آٹھواں دن تھا جب بالکل ہی اتفاقیہ طور پر ایک تین چار دن پہلے کے اخبار پر نظر پڑ گئی، مجھے اخبارات پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا، لیکن بس وہ اخبار مل گیا تھا اور اس میں ایک انوکھی کہانی درج تھی۔ یہ کہانی ایک ڈاکٹر احسان علی کی کہانی تھی اور بڑے بڑے جلی الفاظ میں چھپی ہوئی تھی، ڈاکٹر نے بیان دیا تھا کہ وہ اپنے کلینک میں موجود تھا اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور موسم بہتر نہیں تھا، آخری مریض اس سے معائنہ کرا کے گیا تھا کہ اس کے اردلی نے بتایا کہ ایک خاتون اس سے ملنا چاہتی ہے۔

''ہوں بھیج دو۔'' ڈاکٹر نے حسب عادت کہا اور اس کا اردلی ذرا جھجکتا ہوا سا کھڑا رہ گیا۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

''کچھ پراسرار سی عورت ہے جناب آواز

تو بہت خوبصورت ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو ایک موٹے کھیس میں ڈھک رکھا ہے، نہیں جذام کی مریضہ نہ ہو۔"

"تم اس کا چہرہ کھلوا کر دیکھو اس سے کہو کہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ مریض کو دیکھنے کے بعد اندر بھیجا جائے۔"

"کہا تھا صاحب میں نے نہیں مانی۔" اردلی نے کہا۔

"خیر چلو بھیجو۔" ڈاکٹر نے کہا اور وہ پراسرار وجود اس کے کمرے میں داخل ہوگیا، ڈاکٹر کے اشارے پر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بی بی اپنا چہرہ کھولو اس طرح کیوں ڈھک رکھا ہے، کیا تکلیف ہے تمہیں؟"

"ڈاکٹر اگر اجازت ہو تو میں دروازہ بند کردوں۔"

"کک...... کیا فضول باتیں کررہی ہو، دروازہ کیوں بند کرنا چاہتی ہو؟"

"ڈاکٹر صاحب میں اپنا معائنہ کرانا چاہتی ہوں۔"

"تو اس کے لئے دروازہ بند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تکلیف ہے تمہیں اور یہ تم نے اس طرح اپنے آپ کو ڈھک رکھا ہے، آخر تم ہو کون اور کیا چاہتی ہو؟" ڈاکٹر نے کہا۔

عورت کچھ لمحے خاموش رہی، پھر اس نے اپنے چہرے پر سے کھیس ہٹادیا اور ڈاکٹر اچھل پڑا، وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا جو بول رہا تھا، باتیں کررہا تھا، ڈاکٹر کچھ لمحوں کے لئے ساکت رہ گیا، اسے کوئی بھی ایسی چیز نظر نہیں آرہی تھی جس سے یہ احساس ہوتا کہ یہ سب کچھ نظر کا فریب ہے، جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ اصلیت نہیں ہے وہ اصلیت ہی دیکھ رہا تھا، یہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا۔

"مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ڈاکٹر، میں تو خود زندگی کے بدترین عذاب سے گزر رہی ہوں، ڈاکٹر میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا ہے جس کی وجہ سے میرے جسم کا سارا گوشت گل کر بدن سے جدا ہوگیا ہے، لیکن میں مردہ نہیں ہوں، میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ تم میرا علاج کرو، میں تم سے دروازہ بند کرنے کے لئے اس لئے کہہ رہی تھی کہ کہیں کوئی آنہ جائے۔"

ڈاکٹر کے منہ سے شروع میں تو کوئی آواز نہ نکلی، لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

"ت...... تم ...... کیا تم...... کیا کوئی ارواح بد ہو؟"

"میں نے تم سے کہا نا ڈاکٹر قصور تمہارا نہیں ہے ورنہ ان الفاظ کے جواب میں، میں تمہیں جواب دیتی وہ تمہاری طبیعت خوش کردیتا، میں نہ ارواح بد ہوں نہ ارواح نیک میں ایک زندہ حقیقت ہوں، زندہ وجود ہوں، ایک ایسے کیمیکل کی وجہ سے میری یہ کیفیت ہوئی ہے جو جسم کو گلادیتا ہے، ڈاکٹر، میرا ٹھیک سے معائنہ کرو، مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اگر تم نے مجھے میری اصلیت واپس دلادی تو میں تمہیں اتنی دولت دوں گی کہ تم اپنا ایک اسپتال بناسکتے ہو ایک ایسا اعلیٰ اسپتال جسے دنیا دیکھتی رہ جائے۔"

ڈاکٹر بمشکل تمام خود کو سنبھالے ہوئے تھا اس نے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ ایسا کون سا عمل ہوسکتا ہے جس سے تمہاری یہ کیفیت ہوگئی ہو، لیکن اگر تم کہتی ہو تو میں تمہارا معائنہ کرلیتا ہوں، جاؤ اس ٹیبل پر لیٹ جاؤ۔" ڈاکٹر نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا وہ کسی بھی طرح اپنے اردلی کو یا کسی اور کو بلانا چاہتا تھا تاکہ اس کی کچھ مدد ہوجائے، لیکن عورت نے اس کی نیت کو بھانپ لیا اور بولی۔

"سنو ڈاکٹر! میں جو کچھ کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں مجھے دیوانگی پر آمادہ مت کرو، میرا معائنہ کرو۔"

"یہ کہہ کر وہ ٹیبل پر جالیٹی، وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا، سوفیصدی انسانی ڈھانچہ، ڈاکٹر ٹیبل کے پاس پہنچ گیا، اسے موقع نہیں ملا تھا کہ وہ کسی کو بلانے کے لئے بیل ہی بجادے، بس اس کے دل میں یہ آرزو تھی کہ اردلی اندر

آ جائے اور یہ صورت حال دیکھ لے، چنانچہ وہ میز کے پاس پہنچ گیا، انسانی ڈھانچہ مکمل تھا، حیرت کی بات تھی کہ اس کے تمام گوشت کے اعضا پگھل چکے تھے، اندرونی نظام میں وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو نظام کو متحرک رکھتی ہیں لیکن صرف جھلی اور رگوں کی شکل میں، یہ دنیا کا سب سے حیرت انگیز وجود تھا جسے دیکھ کر یقین نہ آئے کہ اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہوگی، لیکن وہ ایک زندہ وجود ہی لگ رہی تھی صرف آواز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے باقی اس کی شناخت دوسرے طریقوں سے ذرا مشکل ہی سے ہوسکتی تھی، یہ ایک ڈاکٹر ہی سمجھ سکتا تھا کہ وہ ایک عورت کا ڈھانچہ ہے۔ ڈاکٹر نے اب خود کو سنبھال لیا تھا اس نے کہا۔

"لیکن تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"میں اپنے کمرے میں واش روم میں باتھ ٹب میں لیٹی نہا رہی تھی کہ میرے دشمن نے کوئی کیمیکل اس پانی میں ڈال دیا جس میں، میں نہا رہی تھی بس اس سے میری یہ حالت ہوئی ہے، میرے جسم کا سارا گوشت گل کر گاڑھے سیال مادے کی شکل میں زمین پر بہہ گیا، ایک بدبودار مادہ اور میں ایک ڈھانچے کی شکل میں رہ گئی، ڈاکٹر مجھے ٹھیک کردو، میرے لئے وہ سب کچھ کرو جو تم اپنی ماہرانہ مہارت سے کرسکتے ہو، تم جانتے ہو کہ میرا علاج کس طرح سے ہوسکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔" دیکھو، میں تو ایسے افراد کے علاج جانتا ہوں جو گوشت پوست رکھتے ہیں، ایسا کوئی پراسرار عمل میرے لئے ممکن نہیں ہے، البتہ میں تمہیں ایک بہت بڑے ڈاکٹر کا پتہ بتاتا ہوں جو بڑی مہارت رکھتے ہیں اور تمہارے کام آسکتے ہیں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر نے اسے ایک پتہ بتایا اس نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور اس کی میز پر پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی یعنی پانچ لاکھ روپے رکھ دیئے اور وہ چادر اوڑھ کر کمرے سے باہر نکل گئی، ڈاکٹر سخت دہشت زدہ تھا، اس کے بعد اس نے پولیس سے رابطہ قائم کیا اور پولیس کو تمام تر رپورٹ دی۔

یہ کہانی دوسروں کے لئے ممکن ہے کوئی کہانی ہو، ممکن ہے لوگوں نے ڈاکٹر سے رابطے قائم کئے ہوں اور اس پراسرار وجود کے بارے میں معلوم کیا ہو، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کوئی جھوٹی کہانی نہیں ہے، یہ اخبار جس میں یہ واقعہ چھپا تھا کئی دن پہلے کا تھا، میں نے اس کے بعد بازار جاکر دوسرے اخبارات تلاش کئے جو اس کے بعد کے تھے اور ان میں بھی مجھے اس کہانی کا بقیہ حصہ مل گیا، پولیس نے اس ہوٹل کے اسٹاف سے چھان بین کی تھی جس میں تھوڑے ہی عرصے پہلے ایک ایسا حادثہ ہوا تھا، ایک کمرے سے ایک ڈھانچہ نکل کر باہر آیا تھا اور ہوٹل میں کافی افراتفری مچ گئی تھی، بعد میں کچھ لوگوں نے پولیس کو اس سلسلے میں اطلاعات دی تھیں اور پولیس نے تحقیقات شروع کردی تھی، بعد کے اخبارات میں کوئی خبر نہیں تھی لیکن مجھے ایک دم سے خدشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں میری شامت نہ آجائے، میری تلاش نہ شروع ہوجائے کیونکہ ہوٹل میں میں ہی ٹھہرا تھا اور وہاں کے ریکارڈ میں میرا نام لازمی طور پر ہوگا۔

مجھے تو اب تک یہ حیرت تھی کہ ہوٹل والوں نے میرے بارے میں پولیس کو معلومات کیوں نہیں فراہم کی تھیں، میں نے آج تک کے اخبارات دیکھے بعد میں اس بارے میں اور کوئی کہانی نہیں تھی، صرف اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر لگی تھی کہ ڈاکٹر نے جس بڑے ڈاکٹر کا پتہ بتایا تھا وہ ڈاکٹر غائب ہوگیا تھا، غالباً اس خبر کے بعد وہ خوف زدہ ہوکر کہیں روپوش ہوگیا تھا، بے شک یہ ایک دلچسپ خبر تھی لیکن میرے لئے سخت باعث تشویش میں نے دل میں سوچا کہ پولیس بہرطور واقعہ کو نظر انداز نہیں کرے گی اور اس کی چھان بین کرتی ہوئی آخر کار میرے پاس پہنچ جائے گی، میں اسے کیا بتاؤں گا کتنی انوکھی کہانی ہوگی یہ، یہ کہانی وقت سے پہلے منظر عام پر نہیں آنی چاہئے۔

مجھے حالات کا انتظار کرنا چاہئے کہ حالات کا

اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، میری اپنی کتاب بے حد قیمتی تھی، چنانچہ میں نے مصلحت سے کام لیا، فوراً ہی میں نے اپنے کچھ لباس اور ایسی دوسری چیزیں جو میری ضرورت کی چیزیں تھیں ساتھ لیں اور اس کے بعد زندہ صدیوں کا مسودہ جو میرے لئے انتہائی اہمیت کا حامل تھا اپنے پاس محفوظ کیا اور اپنی رہائش گاہ سے باہر نکل آیا، مجھے اپنے لئے ایک ٹھکانہ درکار تھا، یہ ٹھکانہ کوروتی کی وہ ویران کوٹھی بھی ہوسکتی تھی، لیکن سچی بات یہ ہے کہ تھا تو میں بھی انسان ہی، خوف کا بسیرا میرے اندر بھی تھا۔

میں تو یہ بھی سوچ رہا تھا کہ گوتم بھنسالی کوروتی کو نقصان پہنچانے کے بعد ضرور میرے بارے میں کچھ سوچے گا، بے شک کوروتی نے جیسا کہ اس نے مجھے بتایا میرے گرد منتروں کا حصار قائم کردیا تھا، لیکن گوتم بھنسالی وہ تھا جس نے کوروتی کے منتروں کو فیل کرکے آخرکار اسے ایک ایسے عذاب میں گرفتار کردیا تھا جس سے پتہ نہیں اسے کبھی نجات ملے گی بھی یا نہیں، چنانچہ وہاں جانا بالکل مناسب نہیں تھا، شہر میں ہوٹلوں کی کمی نہیں تھی، میں نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کا انتخاب کیا اور اس میں کمرہ لے کر منتقل ہوگیا، بڑی عجیب وغریب کیفیت کا شکار تھا، میں ہوٹل میں محدود ہوگیا تھا بس تھوڑے وقت کے لئے باہر نکلتا تھا اخبارات وغیرہ خریدتا اور ان کا جائزہ لیتا رہتا تھا اور پھر ہوٹل میں منتقل ہوجاتا تھا۔ میں نے اپنی کتاب کا مسودہ بھی لکھنا بند کردیا تھا، کہانی کس طرح آگے بڑھاؤں بات سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی، بس انتظار کررہا تھا کہ وقت اپنے راستے تبدیل کرے تو ہوسکتا ہے مجھے کچھ مل جائے۔

پھر ایک اور صبح اخبارات نے ایک بھیانک انکشاف کیا، یہ شہر کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر قیصر شاہ کے قتل کی کہانی تھی، لیکن اس کہانی نے میرے رونگٹے کھڑے کردیئے تھے، ڈاکٹر قیصر شاہ کے اسسٹنٹ نے ساری تفصیل بتائی تھی اس نے کہا کہ ایک دن پہلے ڈاکٹر قیصر شاہ سے کسی نے ٹیلی فون پر اپائنٹمنٹ لیا اورا س کو بتایا کہ وہ ایک ایسی مریضہ ہے جو ایک عجیب وغریب بیماری کا شکار ہوگئی ہے، وہ ڈاکٹر قیصر شاہ سے معائنہ کرانا چاہتی ہے ڈاکٹر قیصر شاہ نے اسے ٹائم دے دیا، مقررہ وقت پر جو شخصیت ڈاکٹر قیصر شاہ کے پاس آئی تھی وہ ایک انتہائی فیشن ایبل برقعے میں ملبوس تھی، لیکن اس نے اپنا چہرہ ڈھکا ہوا تھا، ڈاکٹر قیصر شاہ نے اسے مقررہ وقت پر طلب کرلیا، قیصر شاہ کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اپنے کلینک کے بیسمنٹ میں مریضوں کا معائنہ کرتا ہے، اس وقت مکمل خاموشی ہوتی ہے، اس کے ساتھ اس کا صرف ایک اسسٹنٹ جس کا نام فرید بیگ ہے ہوتا ہے، ڈاکٹر قیصر شاہ کسی نرس کو اپنے ساتھ نہیں رکھتا فرید بیگ ہی اس کو اسسٹ کرتا ہے۔

برقعہ پوش خاتون کو بیسمنٹ میں پہنچادیا گیا، اس سے کہا گیا کہ وہ برقعہ اتار دے لیکن اس نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ ڈاکٹر قیصر شاہ آجائیں تب وہ برقعہ اتارے گی، بہرحال اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی گئی۔ ڈاکٹر قیصر شاہ اندر آئے تو اسسٹنٹ فرید بیگ نے دروازہ بند کردیا، ڈاکٹر قیصر شاہ نے اس سے کہا کہ میڈم آپ کوئی دقیانوسی خاتون معلوم ہوتی ہیں مجھے بتایئے کہ برقعے میں، میں آپ کا معائنہ کیسے کرسکوں گا اور یہ بھی بتایئے کہ آپ کو تکلیف کیا ہے، جواب میں برقعہ پوش خاتون نے کہا کہ ڈاکٹر میرے بدن کا سارا گوشت گل گیا ہے، اسے کسی کیمیکل کے ذریعے گلا دیا گیا ہے آپ کو میرا علاج کرنا ہے، ڈاکٹر قیصر شاہ نے ہنس کر کہا کہ اگر آپ کا گوشت گل گیا ہے تو اس کا مقصد ہے کہ آپ کو ڈھانچے کی شکل میں ہونا چاہئے تو خاتون نے اپنا برقعہ اتار دیا تو اسسٹنٹ اور ڈاکٹر قیصر شاہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ وہ ایک انسانی ڈھانچہ تھا، مکمل انسانی ڈھانچہ، اسسٹنٹ نے تو یہی سمجھا تھا کہ کوئی بدروح انہیں تنگ کرنے کے لئے آگئی ہے، لیکن ڈاکٹر قیصر شاہ عورت کو بغور دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔

"آپ اس بیڈ پر لیٹ جایئے۔"

عورت لیٹ گئی تو ڈاکٹر قیصر شاہ اس کے قریب پہنچ گیا، البتہ فرید بیگ کی حالت کچھ بگڑی سی گئی تھی، وہ اس عجیب وغریب وجود کو دیکھ رہا تھا، ڈاکٹر قیصر شاہ نے اس سے کہا۔

"آپ کا کہنا ہے کہ آپ ایک زندہ وجود ہیں؟"

"جی ڈاکٹر، ایک انوکھا وجود جس کے بارے میں تفصیل جاننا آپکے لئے ضروری نہیں ہے، بس یوں سمجھ لیجیے کہ کچھ عرصہ قبل میں ایک گوشت پوست کی عورت تھی لوگوں کا خیال ہے کہ میں شکل وصورت کی بھی اچھی تھی، میرے ایک دشمن نے جو مجھ سے محبت کرتا تھا اور مجھے حاصل کرنا چاہتا تھا رقابت میں آ کر مجھے اس وقت جبکہ میں غسل کر رہی تھی کسی ایسے کیمیکل سے نہلا دیا جس کی وجہ سے میرے جسم کا سارا گوشت ایک سیال مادے کی شکل میں بہہ گیا اور میں صرف ایک ڈھانچے کی شکل رہ گئی، ڈاکٹر میرے کھانے پینے کا سارا سسٹم ختم ہو چکا ہے، میں باقی تمام حسیات سے آشنا ہوں، لیکن میرا بدن مجھ سے جدا ہو گیا ہے، مجھے بھوک نہیں لگتی لیکن میرے جسم کی توانائی برقرار ہے، میرے اس ڈھانچے میں مکمل طور پر طاقت ہے اور میں وزنی سے وزنی چیز اٹھا بھی سکتی ہوں چل پھر بھی سکتی ہوں دوڑ بھی سکتی ہوں، ڈاکٹر مجھے ٹھیک کر دیجیے، آپ یوں سمجھ لیجیے میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے، آپ جو مانگیں گے میں دوں گی۔"

ڈاکٹر قیصر شاہ کی اندرونی کیفیات کا صحیح طور پر جائزہ نہیں لیا جاسکتا تھا، لیکن اسسٹنٹ نے بتایا کہ اس کی حالت بے پناہ خراب تھی اور وہ وہاں سے ہر قیمت پر بھاگ جانا چاہتا تھا، یہ بالکل اتفاقیہ امر ہے کہ ہمارے اس ڈسمنٹ میں جو واش روم بنایا گیا تھا اس کے دو دروازے تھے ایک اس طرف سے اور دوسرا ایک راہداری میں کھلتا تھا، راہداری کے اختتام پر زینہ تھا جہاں سے اوپر جایا جاسکتا تھا۔ فرید بیگ کی حالت زیادہ خراب ہو رہی تھی، ڈاکٹر اس عورت کا معائنہ کر رہا تھا کہ فرید بیگ نے کہا۔

"سر میں ابھی حاضر ہوا۔" یہ کہہ کر وہ واش روم کی جانب چل پڑا اور اس کے بعد دوسرے دروازے سے باہر نکل کر اس نے راہداری میں دوڑ لگائی اور اوپر پہنچ گیا، اوپر چند افراد موجود تھے اس نے رسپشنسٹ کو صورتحال بتائی اور کہا کہ ڈاکٹر قیصر شاہ خطرے میں ہے، ایک انوکھا وجود ان کے پاس ایک انوکھی کہانی لے کر آیا ہے، رسپشنسٹ کو اس برقع پوش عورت کے بارے میں علم تھا جو وہاں گئی تھی اس نے اسٹاف کے چند افراد کو جمع کیا اور وہ اصل راستے سے جہاں سے ڈاکٹر قیصر شاہ اندر داخل ہوا تھا ڈاکٹر قیصر شاہ کے اس معائنہ والے کمرے میں داخل ہوئے جس کا دروازہ بے شک اندر سے بند کر دیا گیا تھا لیکن وہ باہر سے کھولا جاسکتا تھا، وہ اندر پہنچے تو آپریشن روم میں معمول کے مطابق تیز روشنی ہو رہی تھی۔ لیکن اس بیڈ کے قریب ڈاکٹر قیصر شاہ مڑا تڑا پڑا ہوا تھا اور عورت غائب تھی اس کا برقع بھی موجود نہیں تھا جو اس نے معائنہ کے وقت اتار کر رکھ دیا تھا، وہ لوگ دوڑتے ہوئے ڈاکٹر قیصر شاہ کے پاس پہنچے۔ اسسٹنٹ فرید بیگ کا خیال تھا کہ ڈاکٹر قیصر شاہ بے ہوش ہو گیا ہے، لیکن جب انہوں نے جھک کر دیکھا تو ڈاکٹر قیصر شاہ ہلاک ہو چکا تھا، اسے گردن دبا کر ہلاک کر دیا گیا تھا، وہ لوگ واش روم کی جانب دوڑے تو واش روم کا دروازہ اسی طرح کھلا ہوا تھا، اس کا مقصد ہے کہ اس انسانی ڈھانچے نے اسی واش روم کے ذریعے راہ فرار اختیار کی تھی ایک ہلچل مچ گئی تھی۔

بعد کی تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس طرح کے ایک انسانی ڈھانچے نے ایک اور ڈاکٹر سے رابطہ کیا تھا جنہوں نے ڈاکٹر قیصر شاہ کا پتہ بتایا تھا ان سے معلومات حاصل کی جارہی ہے، میں یہ روح فرسا داستان پڑھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ مجھے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ میری شامت نے مجھے آواز دی ہے

اور اب میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے اور میرا اندازہ درست نکلا۔

دوسرے ہی دن کے اخبارات میں میرے بارے میں تفصیل شائع ہوئی تھی چونکہ بات ایک بہت نامور اور بڑے ڈاکٹر کے قتل کی تھی اس لئے پولیس نے باقاعدہ اس سلسلے میں تحقیقات کا آغاز کیا تھا اور چونکہ ایک ایسے انسانی ڈھانچے کو سب سے پہلی بار ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں دیکھا گیا تھا جو ایک کمرے سے نکل کر بھاگا تھا اور اس کے بعد سبزی کے ایک ٹرک پر چڑھ کر وہاں سے رفو چکر ہو گیا تھا۔

جس کمرے سے نکل کر وہ بھاگا تھا وہ ذیشان عالی نامی ایک مشہور مصنف نے حاصل کیا تھا جو عام طور سے تاریخی داستانیں لکھا کرتا تھا، اس کے کچھ پراسرار ناول بھی منظر عام پر آچکے تھے۔ ذیشان عالی کے بارے میں تحقیقات کر کے پولیس ان پبلشرز تک پہنچی جو اس کی کتابیں وغیرہ چھاپتے تھے۔ وہاں سے اس کے گھر کا پتہ معلوم ہوا وہ اپنے گھر میں موجود نہیں ہے، پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ اس دن سے گھر واپس ہی نہیں آیا۔ پولیس کو ذیشان عالی کی تلاش ہے تاکہ وہ اس پراسرار انسانی ڈھانچے پر کچھ روشنی ڈال سکے۔ میرے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا، مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں ایک بہت بڑے جنجال میں پھنس گیا ہوں جو مجھے پتہ نہیں کہاں سے کہاں تک لے جائے گا، میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور میں بری طرح سہم گیا تھا، اب کیا کروں، ظاہر ہے میری بے شمار تصاویر میری کتابوں وغیرہ پر شائع ہو چکی تھیں اور پھر اگر پولیس میرے گھر تک پہنچ گئی ہے تو وہاں پر بھی اسے ایسے کئی البم ملیں گے جن میں میری تصویریں موجود ہیں، گویا مجھے اشتہاری قرار دے دیا جائے گا۔ کیا کروں ایک ترکیب یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود کو باقاعدہ پولیس اسٹیشن میں پیش کر دوں اور سارا واقعہ ان کے گوش گزار کر دوں، لیکن کیا اس پر یقین کیا جاسکے گا۔ یقین کیا بھی جاسکتا ہے، کیونکہ وہ کوٹھی اور اس میں موجود پتھر کی کتاب

آگ کے شعلے......!

ایک بار بغداد کے کسی محلے میں خوفناک آگ لگی جس سے کئی افراد جل کر مر گئے۔ کسی رئیس کے دو غلام بھی اسی آگ کے شعلوں میں گھر گئے تھے۔ اس نے اعلان کیا کہ جو شخص میرے غلاموں کو آگ سے نکال لائے گا اسے ایک ہزار دینار انعام میں دیئے جائیں گے۔ اتفاقاً حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ ادھر سے گزر رہے تھے۔ آپؒ نے یہ اعلان سنا تو رئیس بغداد سے فرمایا۔

''کیا واقعتہً تم اس شخص کو اتنا گرانقدر انعام دو گے جو تمہارے غلاموں کو بچائے گا؟''

''کسی کو میری بات پر شک نہیں ہونا چاہئے۔'' رئیس بغداد نے پرزور لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے غلاموں کی زندگی کے عوض اسی وقت یہ رقم دینے کو تیار ہوں۔''

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرف دیکھا اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد انسانی ہجوم نے یہ ناقابل یقین منظر دیکھا کہ حضرت شیخ نوریؒ دونوں غلاموں کو لئے ہوئے آگ سے اس طرح باہر آگئے کہ آپؒ کا جسم مبارک بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں کے اثرات سے محفوظ رہا اور دونوں غلاموں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

رئیس بغداد نے حسب وعدہ ایک ہزار دینار آپؒ کی خدمت میں پیش کئے۔ حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ نے دولت کے اس ڈھیر کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔ کیونکہ تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں دولت کی حرص سے آزاد ہوں اور میں نے دنیا کو آخرت سے تبدیل کر لیا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے مجھے یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے کہ آگ کے شعلے میرے جسم کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

میرے بیان کی تصدیق کرے گی، میں دل ہی دل میں ہنس پڑا، اگر تصدیق کنندگان کو میں اس کتاب کے ذریعے ماضی کے کسی دور میں لے جاؤں تو مزہ ہی آجائے گا، وہ بھی کیا یاد کرے گا۔

چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ڈھارس دی ساری باتیں مذاق میں سوچنا اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صورت حال بے حد سنگین ہوگئی تھی اور مجھے اس کا مقابلہ کرنا پڑے گا، لیکن ابھی کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ پہلا قدم کیا اٹھاؤں، آیا پولیس اسٹیشن پہنچ کر اپنے آپ کو ظاہر کردوں یا پھر روپوش ہونے کی کوشش کروں، میں اپنے کمرے تک ہی محدود رہا حالانکہ کوئی ایسی بات نہیں تھی، میں باقاعدہ کمرے سے باہر نکل کر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بھی پہنچ جاتا تھا، کھانا وغیرہ وہاں کھاتا تھا، لیکن اب میں ایک دم محتاط ہوگیا تھا، رات کا کھانا میں نے اپنے کمرے ہی میں طلب کیا اور اس وقت رات کے تقریباً پونے گیارہ بجے تھے جب میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور میں ایک دم سہم کر رہ گیا۔ ویٹر تھوڑی دیر پہلے ہی برتن وغیرہ لے کر گیا تھا اور میں نے اس سے کوئی چیز طلب نہیں کی تھی۔ یہ دستک یقینی طور پر کوئی پراسرار حیثیت رکھتی تھی، دروازہ کھلا ہی ہوا تھا، دوسری بار دستک دی گئی اور اس کے بعد کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

کمرے میں مدہم روشنی ہو رہی تھی، لیکن اتنی کہ میں آنے والے کو دیکھ سکوں، وہ کوروتی ہی تھی۔ ایک بڑی چادر میں لپٹی ہوئی پراسرار انداز میں اندر داخل ہوئی تھی، میں دہشت زدہ ہو کر اٹھ بیٹھا، وہ آہستہ آہستہ میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی تب اس کی آواز ابھری۔

”ذیشان عالی۔“

”کوروتی۔“ میں نے بھی آہستہ سے کہا۔

”تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں، کروگے؟“

”ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

اس نے ایک کرسی کھینچی اور اس پر بیٹھ گئی، کس قدر بھیانک لگ رہی تھی اسے دیکھ کر میرے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ رہی تھیں، وہ خاموشی سے اسی طرح بیٹھی رہی، پھر اس نے کہا۔

”ذیشان عالی! انسان ابتداء ہی سے خود غرض اور بے رحم رہا ہے، اس نے کبھی کسی اقدار کی پرواہ نہیں کی، میں اس وقت تمہارے بارے میں بات کر رہی ہوں، کتنا خوبصورت وقت گزارا ہے ہم دونوں نے ایک ساتھ ذیشان عالی! میری زندگی کو تو صدیاں گزر چکی ہیں، اور یہ گوتم بھنسالی ہمیشہ ہی میرا تعاقب کرتا رہا ہے، وہ اس کوشش میں مصروف رہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی دور میں آکر میرے دل میں اس کے لئے محبت پیدا ہو جائے، اس نے کبھی میرے لئے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو میرے وجود کو کوئی نقصان پہنچا سکے، ویسے بھی میں نے تمہیں بتایا کہ اس نے بے شمار علوم ضرور سیکھے ہیں، لیکن وہ مجھ سے زیادہ ذہین نہیں ہے، اپنے پراسرار علوم میں، میں اس سے کہیں آگے رہی، لیکن جانتے ہو پہلی بار اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا ہے؟“ وہ سوالیہ انداز میں خاموش رہی، اور جب میں کچھ نہ بولا تو کہنے لگی۔

”صرف اس لئے کہ پہلی بار میرے دل میں کسی کے لئے پریم پیدا ہوا ہے اور جس کے لئے میرے دل میں پریم پیدا ہوا ہے وہ تم ہو ذیشان عالی، میں تمہیں بالکل سچ بتا رہی ہوں تم کئی جگہ رقابت کا شکار ہوئے۔ تمہیں یہ احساس ہوا کہ میرا بدن کسی اور کے تصرف میں آیا ہے، میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے، لیکن میں نے پورے اعتماد سے تمہیں سمجھایا کہ وہ میں نہیں تھی، وہ تاریخ کا ایک کردار تھا اور جو کچھ ہوا اس کے ساتھ ہی ہوا، میں تو صرف ایک راہ گزر تھی ایک سڑک تھی میں جس پر سے تاریخ گزرتی چلی گئی اور تم بھی تو وہ نہیں تھے جو تم تھے، مجھے بتاؤ ماضی کے کسی دور میں تم نے کسی کو اتنی قربت میں پایا کہ تم محسوس کرسکو کہ تم تاریخ میں اصل حیثیت سے ہو؟“

وہ پھر سوالیہ انداز میں خاموش ہوئی، سوال بہت

پراثر تھا، واقعی ایسا نہیں ہوا تھا، میں تو صرف ایک دیدہ ور رہا تھا، بہت سے احساسات سے عاری، سو میں نے گردن ہلائی۔

''نہیں کوروتی، ایسا نہیں ہوا۔''

''گویا تمہیں میری بات پر یقین ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔''

''لیکن یہی کیفیت گوتم بھنسالی کی رہی وہ مختلف روپ دھار کر میرے پاس آیا لیکن تاریخ کے کرداروں میں الجھ کر رہ گیا اور بے بسی کا شکار ہو گیا، زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ میں اس دور کے ایک نوجوان سے متاثر ہو گئی اور میں نے اپنا وجود اس کے حوالے کر دیا، ہاں میں تمہیں بالکل سچ بتا رہی ہوں ذیشان عالی! کہ میں نے اپنی جذباتی زندگی کا پہلا دور تمہارے ساتھ شروع کیا، پہلی بار میں ان تمام حقیقتوں سے آشنا ہوئی جو کسی مرد کی محبت دل میں پیدا کرتی ہیں پہلی بار صدیوں کی عمر پانے کے باوجود میں نے ایک ایسے انسان کو اپنی قربت میں محسوس کیا جو میرے دل میں تھا۔ ذیشان عالی میں نے پہلی بار محبت کی ہے، میں نے پہلی بار اپنا وجود کسی کو دیا ہے اور وہ تم ہو، میں نے اپنی جسمانی قربتوں سے پہلی بار آشنائی حاصل کی ہے، اس طرح تم سوچو کہ تم میرے لئے کتنا بڑا مقام رکھتے ہو، مگر ذیشان عالی مجھے دکھ ہے کہ میرے بارے میں سوچنے کے بجائے تم اپنی زندگی بچانے کے لئے سرگرداں ہو۔'' اس کی آواز ایک سسکی میں ڈھل گئی۔

صاحبو! ذرا غور کرو، ذرا غور کرو مجھ پر کہ کیا بیت رہی ہوگی، ارے بابا میں تو ایک معمولی سا انسان تھا، بس زندگی کی گاڑی دھکیل رہا تھا، میں اس صدیوں پرانے وجود کے لئے کیا کر سکتا تھا، اس سے انحراف مجھے خوف زدہ بھی کرتا تھا اور بہت سے احساسات میرے دل میں جاگزیں تھے، اس نے کہا۔

''ذیشان عالی میرا ساتھ دو، تم اس دور کے نوجوان ہو اور مجھے اس بات کا علم ہے کہ یہ سائنس نگری ہے، قدیم دور کا سارا جادو اس دور کی سائنس کے سامنے بے اثر ہے، اس دور میں سب کچھ ہو سکتا ہے، تم ایک مصنف ہو، کہانی کا آغاز کرتے ہو، اپنی ہی کہانیوں کے پھیلائے ہوئے جال میں الجھ جاتے ہو، پھر اس جال کو سلجھاتے ہو، اس میں راستے نکالتے ہو، میں تمہاری چاہنے والی کوروتی، میں تمہاری محبوب نہ سہی لیکن تم میرے محبوب ہو اور میں اتنا تو حق رکھتی ہوں کہ تم سے کہوں کہ میرے محبوب مجھے اس مشکل سے نجات دلا دو، مجھے اس جال سے نکالنے کی کوشش کرو اپنی بے پناہ ذہانت صرف کرو، اور مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں، میں اپنی زندگی واپس چاہتی ہوں، مجھے میری زندگی واپس دے دو۔'' وہ رونے لگی اس کا ڈھانچہ نما جسم ہل رہا تھا اور میں منہ پھاڑے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا، لیکن بہر طور کچھ بولنا تو ضروری تھا، میں نے اس سے کہا۔

''کوروتی خود کو سنبھالو، بات اصل میں یہ ہے کہ تم پراسرار قوتوں کی مالک ہو، تم اپنے اس ڈھانچے نما جسم کو لے کر کہیں بھی روپوش ہو سکتی ہو، میرے لئے تو موت ہی موت ہے، اخبارات میں، میں نے پڑھ لیا ہے کہ پولیس کو اب میری تلاش ہے اور میں یہاں آ چھپا ہوں کوروتی اگر پولیس نے مجھے پکڑ لیا تو مار مار کر میرا حلیہ خراب کر دے گی مجھ سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ وہ عورت کون ہے جس نے ڈاکٹر قیصر شاہ کو قتل کر دیا، قتل کا الزام مجھ پر بھی آ سکتا ہے اور اس کے بعد ......ارے...... باپ رے، میں نے اپنی کہانیوں میں بے شمار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے، انہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچایا ہے، لیکن اپنی گردن میں پھانسی کے پھندے کی سرسراہٹ محسوس کر کے میرا دم نکلا جا رہا ہے، کوروتی حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے لئے افسردہ ہوں اور تم بالکل سچ کہہ رہی ہو گوتم بھنسالی پہلی بار صحیح رقابت کا شکار ہوا ہے، اس سے پہلے کی صدیاں جو گزری ہیں ان میں تم ایک کردار تھیں اور وہ بھی ایک کردار ہی تھا، لیکن اس بار تم اصل میں میری قربت سے

سرشار ہوئی اور جسے وہ برداشت نہیں کر سکا، ایک سوال میں کروں تم سے کوروتی؟" میں نے کہا اور اس نے گردن ہلادی۔

"کیا گوتم بھنسالی کے دل سے تمہارا پیار ختم ہوگیا؟"

"کبھی نہیں ہوگا، کبھی بھی نہیں۔" اس نے بڑے وثوق اور اعتماد سے کہا۔

"تو پھر اس نے جو یہ عمل کیا ہے کیا اس کے پاس اس کا کوئی تدارک ہوگا؟" میرے اس سوال پر وہ خاموش ہوگئی، پھر کچھ دیر کے بعد بولی۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ مجھے اس مشکل سے نکال سکے گا؟"

"ہاں، تم نے انسانی ذہن کی سوچ کا ذکر کیا تھا، تم نے ابھی کہا تھا کہ میں اپنی کہانیوں میں جال بنتا ہوں، اور پھر اس جال میں پھنس جاتے والوں کو جال سے نکالتا ہوں، تو یہ خیال میرے ذہن میں آیا ہے کہ کیوں نہ تم گوتم بھنسالی سے لگاوٹ کا اظہار کرو اور اپنی شکست کا اعتراف کرو، اس سے کہو کہ تم اپنے کئے پر شرمندہ ہو اور اس سے رجوع کرنا چاہتی ہو وہ تمہیں اس مشکل سے نکال دے، ممکن ہے وہ ایسا کرلے؟"

جواب میں اس کی پھیکی ہنسی کی آواز سنائی دی اور اس نے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ میرا علم گیان اس سے کہیں آگے ہے، میں نے یہ بھی سوچا تھا اور اس پر بہت غور کیا تھا، وہ ایسا نہیں کرسکے گا، اس نے جو کچھ کیا ہے آخری عمل کے طور پر کیا ہے، گویا اس نے میرا شریر کھودیا میرے لئے بھی اور اپنے لئے بھی۔"

"اور اگر کبھی تم سچے دل سے اس کی جانب راغب ہوجاؤ تو پھر تمہارا یہ ڈھانچہ نما وجود اس کے کس کام آئے گا؟" مجھے کوروتی کی گہری سانس لینے کی آواز سنائی دی پھر اس نے کہا۔

"بس ...... منش کا اپنا خیال ہوتا ہے ذیشان عالی! ہم پریم بھاؤنا میں شریر کو سب سے بڑی حیثیت دیتے ہیں۔ بے شک ایک مرد کے لئے عورت کا شریر اور عورت کے لئے مرد کا شریر بنیادی حیثیت رکھتا ہے، دونوں ایک دوسرے کی طلب ہوتے ہیں، لیکن کہیں کہیں صدیوں کی آگ بڑی حیثیت رکھتی ہے، میں اسے کسی جانور کی شکل میں بھی مل جاؤں تو وہ مجھ سے پریم کرتا رہے گا اور ہر حیثیت میں مجھے سویکار کرلے گا۔"

میں کوروتی کے ان الفاظ سے متاثر ہوا تھا، ایک لمحے کے لئے میرے دل میں گوتم بھنسالی کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہوا تھا، غلط تو وہ بھی نہیں تھا، شکل وصورت کبھی بنیاد نہیں ہوتی، اس کا وجود تو کہیں اور سے ہی ہوتا ہے، لیکن کمبخت دل اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے، جدھر بھی راغب ہوجائے، گوتم بھنسالی بھی دل ہی کا مریض تھا، میں نے کہا۔

"لیکن کوروتی، تم نے ڈاکٹر قیصر شاہ کو قتل کردیا۔"

"بتایا نا تمہیں کہ مجھ پر دیوانگی سوار ہوتی جارہی ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ سب کو اپنے جیسا کردوں، قیصر شاہ کو میں نے کہا کہ وہ اتنا بڑا ڈاکٹر ہے، سائنسدان ہے میرے لئے کچھ کرے تو اس نے تلخی سے کہا کہ میں جہنم میں جاؤں مرکھپ کر اپنے وجود کو فنا کردوں، کچھ ایسا انداز اختیار کیا اس نے کہ مجھ پر وحشت سوار ہوگئی اور میں نے اس کی گردن دبادی۔"

"لیکن میرے لئے یہ کتنا خطرناک ثابت ہوا؟"

"ذیشان عالی، سنو میری بات سنو، میں تم سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ میرے لئے کچھ کرو، تھوڑے عرصے پہلے ہم جن حالات سے گزرے ہیں، میرا مطلب ہے وہ لڑکی جس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے تھے اور اسے کسی بنیادی اور علم والے نے بتایا تھا کہ کس طرح وہ ایسا تیل تیار کرے جس سے لڑکی کے ہاتھ پاؤں سیدھے ہوجائیں۔ وہ کہانی ایک دردناک انجام رکھتی ہے، لیکن اس تیل کی اہمیت برقرار ہے، اس نے بہر طور اپنا کام کر دکھایا تھا، وہ بے چاری تو بس پریم کے جال میں پھنس کر ماری گئی، تم میرا ساتھ دوگے ذیشان عالی، میرے لئے کوئی ایسا

عمل تلاش کرو گے جس سے میرے بدن کا گوشت واپس آجائے، میں یہ نہیں کہتی کہ تمہارے سامنے ایسا کوئی وجود ہے جو مجھے میری اس مشکل کا حل بتا دے، لیکن یہ میں جانتی ہوں کہ تمہاری اس دنیا میں بھی بڑے بڑے گیان والے ہیں اور کہیں نہ کہیں سے میرا کام بن جائے گا۔''

میں سوچ میں ڈوب گیا، ایک طویل عمل تھا یہ اور اس کے لئے مجھے غور کرنا تھا کہ کیا کیا جاسکتا ہے، درحقیقت وہ میرا پیار نہیں تھی، ایک کردار میرے سامنے آ گیا تھا اور مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا جس کے تحت میں کام کر رہا تھا، لیکن یہ سب کچھ اس قدر اہمیت کا حامل ہوگا یہ میں نے نہیں سوچا تھا اور اب جو اخبارات میں نے دیکھے انہوں نے میری جان نکال دی، میں تو باقاعدہ مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا، پولیس میرے راستے پر لگ گئی تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں، میری تلاش ہو رہی ہے، اس کی اس پیشکش پر میں غور ہی کر رہی تھا کہ ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی، میرے ساتھ وہ بھی چونک پڑی اور اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا، دستک ذرا مختلف قسم کی تھی، یعنی اگر ویٹر بھی آکر دروازہ بجاتا تھا تو بڑے نرم اور شریفانہ انداز میں، لیکن یہ دستک ایک دھڑ دھڑاہٹ سی تھی، وہ کرسی سے کھڑی ہوگئی اور میں بھی وحشت سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا، پھر میرے منہ سے ڈری ڈری آواز نکلی۔

''کک...... کون...... کون ہے، اندر آجاؤ۔''

دروازہ کھلا ہی ہوا تھا، جو لوگ اندر داخل ہوئے انہیں اس مدہم روشنی کے باوجود میں نے پہچان لیا، پولیس کی وردی تھی اور سب سے آگے جو دو افسران تھے انہوں نے اپنے ہاتھوں میں پستول سیدھے کئے ہوئے تھے، ان میں سے ایک کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

''ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔'' لہجہ بہت ہی بگڑا ہوا تھا، یعنی ایسا کہ اگر میں ہاتھ اوپر نہ اٹھاؤں گا تو مجھ پر گولی بھی چلائی جاسکتی ہے، اپنی کیفیت کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا، میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے، کوروتی میرے پیچھے تھی، میں دو قدم آگے بڑھا۔

''جی جناب۔''

''تم ذیشان عالی ہو؟'' آگے والے انسپکٹر نے سوال کیا۔

''جی سر۔''

''گرفتار کرلو اسے، ہتھکڑیاں ڈال دو اس کے ہاتھوں میں......'' انسپکٹر نے کہا اور اس کے برابر کھڑا ہوا ایس آئی ہتھکڑی کا جوڑا لئے ہوئے میری طرف بڑھا، میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، اس نے میرے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی، بمشکل تمام میں نے کہا۔

''لل...... لیکن...... لیکن جناب...... مم...... مجھے...... کک...... کیوں کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے؟''

''معلوم ہو جائے گا۔'' انسپکٹر نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مجھے آگے کو دھکا دیا اور میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے کوروتی کی طرف دیکھا، لیکن کوروتی وہاں نہیں تھی، میں نے چور نگاہوں سے کمرے کے دوسرے گوشوں میں دیکھا، لیکن کوروتی نظر نہیں آئی، یہ اچھا ہوا میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''چلو اور تم کمرہ سیل کردو، سپروائزر اس کمرے کو بالکل نہ چھوا جائے، ہم بعد میں اس کی تلاشی لیں گے۔'' انسپکٹر نے غالباً ہوٹل کے سپروائزر کو ہدایت دی تھی جو اس کے ساتھ ہی پیچھے موجود تھا، بہر طور مجھے ایک مجرم کی طرح کمرے سے نکالا گیا، رات کا وقت تھا، لیکن پولیس کی آمد کی اطلاع آس پاس کے مکینوں کو بھی مل چکی تھی اور لوگ دروازے کھول کھول کر میری گرفتاری کا منظر دیکھ رہے تھے، میرے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے، نجانے کیا کیا خیالات دل میں آ رہے تھے، ایسے مناظر بے شمار بار میں نے اپنی کہانیوں میں لکھے تھے، لیکن حقیقت میں کسی ایسے شخص کو جو پولیس کے چنگل میں آیا ہوا ہو اور اسے ہتھکڑیاں لگا کر لے جایا جا رہا ہو کیسی کیسی کیفیتوں سے گزرنا ہوتا ہوگا اس کا مجھے اب

احساس ہو رہا تھا، مجھے نیچے لایا گیا اور پھر پولیس کی وین میں بیٹھا دیا گیا۔

پولیس وین مجھے لے کر چل پڑی اور میں دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا ورد کر رہا تھا اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن لا کر مجھے نیچے اتارا گیا اور پھر لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ غالباً رات کی وجہ سے وہ مجھ سے ابھی تک کوئی تفتیش نہیں کرنا چاہتے تھے، میں نے پہلی بار لاک اپ کے ماحول کا جائزہ لیا اور ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خوشی کی ایک لہر اٹھی، میں نے اپنی کسی بھی کہانی میں جب لاک اپ کے بارے میں لکھا تھا تو اس کا ماحول یہی ہوتا تھا اور اس میں موجود شخص کے احساسات بھی بالکل میرے ہی جیسے تھے، اتفاق سے اس لاک اپ میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

پولیس والے دروازہ بند کر کے چلے گئے اور میں ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، لاک اپ کے باہر سنتری کے بوٹ کی کھٹ کھٹ سنائی دے رہی تھی، وہ لاک اپ کے سامنے سے گزرتا تھا اور پھر واپس آ جاتا تھا، اب کیا ہوگا، میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا، میرے اپنے حساب سے قیصر شاہ کے قتل کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی جائے گی، مجھ سے پوچھا جائے گا کہ ہوٹل میں جہاں میں نے قیام کیا تھا پہلی بار اور جہاں سے ایک انسانی ڈھانچہ نکل کر باہر بھاگا تھا اور اس نے افراتفری پھیلائی تھی پھر اس ڈھانچے نے قیصر شاہ کو قتل کیا تھا، وہ کون تھا اور یہ سارا قصہ کیا ہے۔

یہ کون سی سنسنی خیز کہانی لکھنے کے بجائے عمل میں لائی جا رہی تھی، مار بھی لگائیں گے وہ لوگ، مجھے اپنی ہڈیوں میں دکھن محسوس ہو رہی تھی، بس ایک عجیب سا احساس تھا، بار بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لاک اپ کی دیواروں کو دیکھ لیتا تھا، تو یہ ہوتی ہے لاک اپ کی زندگی، ان لوگوں نے رات کی وجہ سے مجھے صرف گرفتار کر کے لاک اپ کر دینے کی ضرورت محسوس کی تھی، صبح کو میرے خلاف عمل کیا جائے گا۔ آنکھیں جھپکنے لگتیں، نیند بھی آ رہی تھی اور ذہن پر بوجھ بھی سوار تھا کہ اچانک ہی مجھے باہر سے چیخوں کی آواز سنائی دی، لوگ چیخ رہے تھے، میں چونک پڑا، پتہ نہیں کیا ہوا تھا، پھر بھاگ دوڑ کی آوازیں بھی ابھرنے لگیں اور ایک عجیب سا ہنگامہ برپا ہو گیا، لاک اپ کے سامنے موجود سنتری بھی حیرت سے منہ پھاڑے ادھر دیکھ رہا تھا کہ اچانک میں نے ایک انسانی ڈھانچہ دیکھا، ہڈیوں کا وجود متحرک تھا، بس آنکھیں چمک رہی تھیں، گہری سرخ آنکھیں جو بجلی کے بلب کی طرح روشن تھیں، ڈھانچے کو دیکھ کر میرے ذہن میں کوروتی کا تصور ابھر آیا۔

اسی وقت انسانی ڈھانچے نے لاک اپ کے باہر پہرہ دینے والے سنتری کی گردن پکڑ لی اور اسے دیوار سے دے مارا، سنتری کی چیخ ابھری، ڈھانچے نے اس کی کمر میں لگی ہوئی بیلٹ سے لاک اپ کی چابی نکالی اور پھر لاک اپ کا دروازہ کھول دیا گیا، میں اچھل کر کھڑا ہو گیا، تبھی مجھے کوروتی کی آواز سنائی دی۔

”عالی! باہر آ جاؤ۔“

میرے بدن میں جیسے بجلی سی بھر گئی تھی، سوچے سمجھے بغیر بے اختیار لاک اپ کے دروازے کی جانب دوڑا اور تیزی سے باہر نکل آیا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب بھاگی، میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کا ساتھ دے رہا تھا، باہر پولیس والے موجود تھے، وہ لوگ چیخ رہے تھے اور اندر کی جانب اشارہ کر رہے تھے، جیسے ہی کوروتی ڈھانچے کی شکل میں مجھے لے کر باہر نکلی وہ چیخیں مارتے ہوئے ادھر سے ادھر بھاگ پڑے کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ہم پر گولی ہی چلا دیتا، کوروتی مجھے ساتھ لئے ہوئے باہر نکل آئی۔ تھانے کے گیٹ سے باہر پہنچنے کے بعد اس نے ایک طرف کا رخ اختیار کیا اور سڑک عبور کر کے دوسری جانب پہنچ گئی۔

یہاں ایک درخت کی جڑ میں ایک موٹا سا کھیس رکھا ہوا تھا، یہ وہی کھیس تھا جسے اوڑھے ہوئے اسے دیکھا جاتا تھا، اس نے وہ کھیس اٹھا کر اپنے بدن پر لپیٹا

چہرہ بھی ڈھکا اور مجھ سے بولی۔
"آؤ ذیشان عالی آجاؤ تیز رفتاری سے۔"
یہ کہہ کر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی، میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہوگئی تھیں، جو کچھ وہ کہہ رہی تھی میں اسی پر عمل کر رہا تھا، ہم تھانے کی عمارت سے کافی دور نکل آئے۔
اس دوران تھانے کے اندر پولیس والوں نے فائرنگ شروع کردی تھی، پتہ نہیں اب وہ کس پر گولیاں چلا رہے تھے، کوروتی مجھے لئے ہوئے ایسی جگہوں پر جانے لگی جہاں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ بہت دور نکل آئے تو اس نے کہا۔
"ہمیں اپنی کوٹھی کی جانب چلنا ہے، میرا مطلب ہے میری کوٹھی کی طرف۔ اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"
"نہیں۔"
"پیدل چل سکو گے؟" اس نے پھر سوال کیا
"ہاں۔"
"چلو، رفتار ذرا تیز کرو۔"
میں نے رفتار تیز کردی، وہ تو کسی چھلاوے کی طرح کافی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی اور میں حتیٰ الامکان اس کا ساتھ دے رہا تھا، کافی طویل فاصلہ طے کرنا پڑا اور آخر کار میں اس کے ساتھ اس پراسرار کوٹھی میں داخل ہوگیا جہاں ایک انوکھی کائنات موجود تھی۔ وہ اندر آگئی اور مجھے لے کر ایک کمرے میں پہنچ گئی۔
"ذیشان! میرے بارے میں تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ میری زندگی میں صدیوں کا تجربہ ہے، میں نے بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ کیا ہے، لیکن جن حالات سے اس وقت میں دوچار ہوئی ہوں ایسے پہلے کبھی نہیں تھے، ہمیں سوچنا پڑے گا غور کرنا پڑے گا۔ تم نے جو تجویز دی تھی کہ میں گوتم بھنسالی کو دھوکہ دوں اور اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کروں تو میں تمہیں بتاؤں کہ ایسا ممکن نہیں ہے، کچھ بھی ہے لیکن وہ مجھے اور میں اسے بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں، وہ میرے جال میں نہیں آئے گا۔

میں تھوڑا سا وقت سکون سے گزارنا چاہتی ہوں۔ میرے اندر کی جو کیفیت ہے میرا دل ہی جانتا ہے، حالانکہ اب تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میرا دل کہاں گیا۔ پگھل کر بہہ گیا یا کیا ہوا، لیکن میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میرے وجود کا ایک ایک انگ اسی انداز میں کام کر رہا ہے، جیسے میری صحیح جسمانی کیفیت میں۔ اس کا مقصد ہے کہ ان چیزوں کا وجود ہے میں سوچ بھی سکتی ہوں، دیکھ بھی سکتی ہوں، سن بھی سکتی ہوں، چل پھر بھی سکتی ہوں، میرا ہر احساس زندہ ہے، لیکن جو کھو گیا ہے میں اس کی واپسی چاہتی ہوں۔"
میں نے دکھی انداز میں کوروتی کو دیکھا اور کہا۔ "لیکن میرا جو کچھ ضائع ہوا ہے میں ساری زندگی اسے نہیں حاصل کر سکتا۔"
"کیا؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
"آہ میری کتاب، زندہ صدیاں، میں وہ سب کچھ اپنے ساتھ ہوٹل لے گیا تھا اور اب وہ پولیس کے قبضے میں ہوں گی، بس میں کیا بتاؤں میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔" میں نے غم آلود لہجے میں کہا تو اس نے اپنا استخوانی ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔
"نہیں۔ دوست ہوں میں تمہاری ایسے تمہاری محنت کو کیسے رائیگاں جانے دیتی۔"
"کیا مطلب؟" میں حیرت سے اچھل پڑا۔
"ہاں جب پولیس آئی تھی اور اس نے تمہیں گرفتار کیا تھا تو میں تمہارے پیچھے موجود تھی، لیکن میں چھپ گئی تھی، ان لوگوں کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہاں تمہارے علاوہ اور کوئی بھی ہوگا چنانچہ وہ تمہیں لے کر باہر نکل گئے تو میں نے تمہارے وہ تمام کاغذات تمہاری اس کتاب کا مسودہ اور چیزیں جو تمہارے لئے اہمیت کی حامل ہوسکتی تھیں، سنبھالیں اور انہیں لے کر خاموشی سے باہر نکل آئی وہ تمام چیزیں لے کر میں یہاں اپنی اس کوٹھی میں پہنچی اور میں نے انہیں محفوظ کردیا۔ پھر اس کے بعد میں تمہیں پولیس کے قبضے سے نکالنے کے لئے چل پڑی اور وہاں جو واقعات پیش آئے وہ تمہارے علم میں ہیں۔"

میں خوشی سے اچھل پڑا تھا، ساری باتیں اپنی جگہ اس کا یہ احسان میرے اوپر احسان عظیم تھا، میری کتاب بچ گئی تھی، میری زندہ صدیاں......

میرا دل خوشی سے سرشار تھا اور یہ خوشی میرے چہرے سے جھلک رہی تھی، وہ میرے سامنے ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی، ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ حقیقت یہ ہے کہ اگر مجھے اس کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم نہ ہوتیں تو ایسے کسی ڈھانچے کو دیکھ کر میں بھی چیختا ہوا فرار ہو جاتا، پراسرار کہانیوں میں جن بھوت پریاں اور نجانے کیا کیا آسانی سے لکھا جاسکتا ہے، ان کا ایک تصوراتی خاکہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے اس طرح کہ لوگوں کو یقین آجائے کہ بھیرو کے دو سینگ ہوتے ہیں اور کالی کے بارہ ہاتھ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی انسانی ڈھانچے کو ایک دلآویز انداز میں صوفے پر پاؤں رکھے بیٹھے دیکھ کر کسی کی جو حالت ہوسکتی ہے میری بھی وہی حالت تھی۔

البتہ احساسات جاگ رہے تھے اور مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت غم زدہ ہے، زندہ صدیاں مل گئی تھی، اس کا مسودہ مل گیا تھا، یہ میرے لئے خوشی کی بات تھی لیکن اب اتنا بھی مناسب نہیں تھا کہ میں اپنی خوشی کا اظہار کرتا رہوں اور وہ جو اپنا بہت کچھ کھو چکی ہے خاموش بیٹھی مجھے دیکھتی رہے، بمشکل تمام میں اپنے چہرے پر دکھ کے آثار پیدا کئے اور ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''آہ کوروتی، کاش میں تمہیں اپنا بدن دے سکتا، کاش میں اپنی روح تمہاری روح میں ڈال سکتا، کاش۔''

''ایک منٹ ایک منٹ ایک منٹ۔'' اس نے اپنا استخوانی ہاتھ اٹھا دیا اور میں خاموش ہوگیا۔ وہ اسی طرح ہاتھ اٹھائے دیر تک بیٹھی رہی پھر بولی۔

''بات تو تم نے بہت عجیب کردی ہے، بہت ہی عجیب۔'' میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا کچھ لمحوں کے بعد وہ بولی۔ ''تم نے ابھی کہا تھا کہ کاش میں اپنا وجود تمہیں پیش کرسکتا، یعنی یہ کہ میں تمہارے وجود میں پھر سے ایک انسان کی حیثیت پا جاتی۔'' اس نے سرسراہٹ بھرے لہجے میں یہ بات کہی لیکن اس کے لہجے کی سرسراہٹ میرے پورے وجود میں سرسراہٹ بن گئی، یہ میں کیا کہہ بیٹھا، ارے باپ رے تو کیا وہ میرے بدن میں آنے کے بارے میں سوچ رہی ہے، تب اس کی آواز ابھری۔

''میں نے تمہیں اصنا کیہ کے بارے میں تفصیل بتائی تھی، سقراط، افلاطون، بطلیموس اور دوسرے لوگوں نے سکندر اعظم کے لئے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں اصنا کیہ کے وجود میں آجاؤں اور سکندر کو اصنا کیہ کی تحقیق پیش کروں اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دوسرے وجود میں آنے کے لئے کیا کرنا پڑا تھا، میں دوسرے وجود میں آسکتی ہوں ذیشان عالی، میں دوسرے وجود میں آسکتی ہوں۔''

میرے تو ہاتھ پیروں کی جان نکل گئی تھی تو وہ میرے وجود میں آنے کے بارے میں سوچ رہی ہے، میں ہکا بکا اس کی صورت دیکھتا رہا، لیکن پھر وہ خود ہی مایوس لہجے میں بولی۔

''لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتی، ماضی کی بات اور ہے، ماضی کی بات میں، میں صرف ایک خیال کی حیثیت اختیار کرلیتی تھی، ایک خیال ہوتی تھی میں کسی بھی کردار کو اپنے اوپر مسلط کرلیتی تھی، لیکن آزاد ہوتی تھی اور میں اس خیال کے لئے ایک دیدہ ور کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اب صورت حال دوسری ہے، اب مجھے اپنا یہ وجود کسی اور کے وجود میں منتقل کرکے اپنے آپ کو صرف ایک ڈمی کی حیثیت سے زندہ رکھنا ہوگا، یہ ممکن نہیں ہے ذیشان عالی یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ گوتم بھنسالی مجھے ہر روپ میں پہچان لے گا، یہ الگ بات ہے کہ تھوڑے بہت وقت کے لئے میں کسی جسم کو اپنالوں، صرف اس خیال سے کہ میری اس ہولناک بیماری کا علاج ہوسکے۔

وہ اپنی دھن میں بولے جارہی تھی اور ذیشان عالی دل ہی دل میں شکر کررہا تھا کہ کوروتی کے ذہن سے اس کا جسم حاصل کرنے کا خیال ٹل گیا تھا۔

(جاری ہے)

خونی سفر

مدثر بخاری۔ شہر سلطان

پرہول سناٹا ہر سو طاری تھا اور ایک کار سبک رفتاری سے سڑک پر رواں دواں تھی، ماحول لرزا دینے والا تھا، کار کی لائٹ سڑک پر پڑ رہی تھی کہ اچانک ایک خوفناک لحیم شحیم کالا بلا چھلانگ لگا کر ادھر آیا اور پھر......

ضد، ہٹ دھرمی اور بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھانا خطرناک ہی نہیں جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے

سیاہ رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں خاموشی کا سکوت طاری تھا۔ رات جتنی اندھیری تھی اتنی ہی سرد بھی تھی، دسمبر کا موسم، دھند اور خوفناک ٹھٹھرتی ہوا، دبیز دھند کی تہہ کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہ دے رہا تھا۔ میرے کمرے میں موجود ہر چیز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی، البتہ میری رائٹنگ ٹیبل پر موجود لیمپ کی مخصوص روشنی میری کتاب پر پڑ رہی تھی۔ وہ انگریزی کتاب تھی۔ جس کے سسپنس اور پرلطف تجسس نے مجھے اس امر پر مجبور کر دیا تھا کہ اینڈ کرنا پڑا، کہانی واقعی تمام پہلوؤں سے مزین تھی، تبھی تو آدھی رات ہونے کو تھی اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی...... وہ اس کتاب کا آخری صفحہ تھا کہ ایکا ایکی میرے سیل فون کی مترنم گھنٹی بج اٹھی۔

وہ طاہرہ کا فون تھا...... طاہرہ میری بہن تھی۔ دو سال پہلے اس کی شادی وقار احمد سے ہوئی تھی اور شہر میں مقیم

تھے وہ لوگ جبکہ ہم برسوں سے زمینوں سے جڑے ہوئے گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ طاہرہ کا رات کے ایک بجے فون آنا حیرت انگیز تھا۔ شہر کے لوگ، گاؤں کے لوگوں کی نسبت، بہت دیر سے سوتے ہیں، اس کا احساس مجھے بھی تھا، مگر پھر بھی اتنی رات گئے فون کرنا...... حیرت ناک تھا......

''ہیلو طاہرہ......!'' میں نے کال اٹینڈ کی۔

''شاہ نور...... جتنی جلدی ہو سکے، شہر آ جائیں۔ وقار احمد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ہم اس وقت کارڈیالوجی میں ہیں......'' وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی آواز میں رنج و غم کی گہری لغزش پنہاں تھی۔

''اوہ...... تم گھبراؤ مت...... میں ابھی آتا ہوں۔ حوصلہ رکھو، خدا خیر کرے گا۔'' میں نے اسے حوصلہ دیا۔

شاہ نور...... میں آپ کو ہرگز تکلیف نہ دیتی، مگر ہم عورتیں تنہا بھلا کیا کر سکتی ہیں...... مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کروں......'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

''طاہرہ...... اگر تم ہمت ہار دو گی تو جمال اور وقار کو کون سنبھالے گا۔ میں فوراً نکل رہا ہوں، تم خدا پر مکمل یقین رکھو اور دعا کرو......!''

''دعا...... آپ پلیز جلدی آ جائیں...... مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے......''

وہ واقعی بہت پریشان تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وقار احمد اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور وقار کے ابو کا پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا۔ ہارٹ اٹیک ہمارے خاندان کا موروثی مرض تھا۔ ہمارے آباؤ اجداد قریب اسی مرض سے ابدی دنیا سدھار گئے تھے اور اب وقار کے ساتھ بھی ہارٹ اٹیک کا معاملہ درپیش آنا...... بات واقعی فکر مندوالی تھی۔

میں نے سیل فون اوور کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا...... تب تک میری بیوی بھی جاگ چکی تھی...... وہ نیند سے اٹھی تھی۔ مجھے اس طرح کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو وہ خاصی پریشان ہو گئی۔

''آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں......؟'' اس کی آواز میں خمار اور شک کا عنصر بھی تھا۔

''طاہرہ کے خاوند وقار احمد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور طاہرہ اکیلی اسپتال میں موجود ہے اور سخت پریشان ہے، میرا جانا لازمی ہے......'' میں نے گاڑی کی چابی ٹیبل سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اوہ......! کیا زیادہ سنجیدہ معاملہ ہے......؟'' وہ بولی۔

''ہاں......! تم دروازے اندر سے بند کر لو۔'' میں صبح تک لوٹ آؤں گا۔'' میں پورچ تک آ چکا تھا۔

''واٹ......؟ آپ اکیلے جائیں گے، نیور...... میں بھی ساتھ چلوں گی...... حالات خراب ہیں، میں آپ کو اکیلے نہیں جانے دوں گی......''

''آپ ضرور چلیں...... مگر میں بچہ نہیں ہوں، بچپن سے گاؤں میں رہتے آ رہے ہیں، یہاں کا ہر فرد ہمارا مرید ہے۔ بہت قدر کرتے ہیں، لیکن آپ چلنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں......!'' میں نے کہا۔ اور پھر چند منٹوں میں میری بیوی، نائلہ چادر اوڑھ کر آ گئی تھی۔ میں گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا، نائلہ میرے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی تھیں۔ اتنی دیر میں ملازم شرفو گیٹ کھول چکا تھا۔

ہم حویلی سے باہر نکل آئے تھے۔ دھند بہت گہری تھی۔ میں نے ہیڈ لائٹ نارمل رکھی ہوئی تھی۔ سردی کی کی گاڑی کے ہیٹر نے اپنا کام کر دیا تھا۔ دھند نے ڈرائیونگ خاصی مشکل بنا دی تھی۔ مگر سفر جاری تھا۔ سست روی سے......

ہمیں 40 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ گاؤں سے ایک پکی سڑک شہر کی طرف جاتی تھی اور اسی سڑک پر ہم موجود تھے۔ اگر نارمل رات ہوتی اور دھند نہ ہوتی تو یہ فاصلہ میری ڈرائیونگ سے صرف پندرہ منٹ میں طے ہوتا۔ مگر دھند نے معاملہ گڑبڑ کر دیا تھا۔

پچھلے ایک گھنٹے میں صرف پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا تھا۔ اور یہ سب سے سست ترین رفتار تھی۔ اگر اسی رفتار سے ڈرائیونگ رہتی تو صبح کا سورج روشن ہو جاتا تھا...... مگر پھر جیسے قدرت کو ہم پر رحم آنے لگا تھا۔ اچانک دھند چھٹ گئی تھی راستہ صاف ہو گیا تھا۔ میں نے اسپیڈ بڑھا دی تھی اور یہ وقت کی ضرورت بھی تھی کیونکہ میرے سیل پر طاہرہ کی

بے شمار مسڈ کالز آ چکی تھیں مگر ابھی کچھ اور امتحان باقی تھے۔

اچانک ہی بادل گرجے اور پھر ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ گاڑی کے بونٹ، اور ڈیش بورڈ پر زوردار قسم کی ژالہ باری شروع ہوگئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی ہتھوڑوں سے گاڑی کی باڈی پر حملہ آور ہوگیا ہو......

بارش تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی اب مجھے خطرے کا احساس ہوا کہ اس بیابان میں سے نکلنا بہت دشوار ہوتا جارہا تھا۔

پہلے ہاتھ کو ہاتھ نہ دکھائی دینے والی خطرناک دبیز دھند نے پریشان کررکھا تھا اور اب یہ بارش...... اور وہ بھی خوفناک......!

''آپ پلیز سائیڈ پر گاڑی روک دیں، کسی درخت کے نیچے...... بارش رکنے کا انتظار کرنا ہی بہتر آپشن ہے......'' نائلہ بولی۔

''کیا مصیبت ہے...... پہلے دھند اور اب بارش...... طاہرہ کتنی پریشان ہوگی۔ اس صورت میں ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہئے...... یہ بارش پتہ نہیں کب رکے......'' میں نے جواب دیا۔

''ہم اپنے آپ کو اس طرح مصیبت میں ڈال کر اس کے پاس کیسے پہنچ سکتے ہیں...... آپ جو بھی فیصلہ کریں ہم سب کے حق میں بہتر ہو۔'' وہ بولی۔

میں نے واقعی ایسا فیصلہ کرنا تھا جو ہم سب کے حق میں بہتر ہو۔ بارش تیز اور تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ پیچھے مڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اب کچھ بھی ہو، ہمیں ہر صورت آگے بڑھنا تھا۔

گاڑی ست روی سے سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی۔ بجلی کی چمک اور تیز موسلا دھار بارش نے ایک عجیب سا سماں پیدا کردیا تھا۔ دائیں اور بائیں گھنے درخت ایک لمبی قطار میں موجود تھے۔ مجھے ایک ایسے درخت کی تلاش تھی جو گھنا اور سایہ دار ہو۔ اور تلاش سے وہ بھی نظر آ گیا۔ وہ شیشم کا لحیم شحیم درخت تھا جس کے ساتھ جڑا ایک اور درخت بھی تھا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ اور ان کی اس کنڈیشن نے خاصی حد تک بارش کو زمین پر آنے سے روک رکھا تھا اور یہ ہمارے لئے فائدہ مند تھا۔

میں نے گاڑی اس انداز میں ان دونوں درختوں کے نیچے کھڑی کی کہ ہم بارش سے بچے رہیں، نائلہ خاصی گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔

وہ بولی۔ ''میرے خیال میں ہمیں سفر جاری رکھنا چاہئے۔ اس خوفناک درخت کے نیچے ٹھہرنے سے تو بہتر تھا۔''

''تمہاری سوچ کی دھاریں کسی ایک سمت تشریف رکھیں گی...... کبھی کہتی ہو گاڑی روک لو۔ کبھی کہتی ہو رکنا ٹھیک نہیں......؟'' میں بولا۔

''اتنی رات ہے اوپر سے خوفناک بارش...... کبھی کبھی فیصلہ کرنا بھی بہت مشکل ہوجاتا ہے۔''

خدا خدا کرکے بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ بادل خوب برسے تھے۔ جم کر برسے کہ مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ گاؤں کی کچی اور پکی سڑکیں دونوں ہی کیچڑ زدہ ہوگئی ہوں گی۔

''میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہئے۔ اب مجھے رکنا نہیں ہوگا۔ بہت دیر ہوگئی۔'' میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ مگر گاڑی کے انجن نے جواب دے دیا۔ میں نے اگنیشن میں چابی دوبارہ گھمائی مگر اس دفعہ بھی انجن ٹس سے مس نہ ہوا۔ کئی دفعہ کوشش کے باوجود بھی گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی۔

یہ نئی مصیبت تھی۔ گاڑی کو اچانک کیا ہوگیا تھا؟''

''نائلہ...... آج امتحان زوروں پر ہے۔ یہ سفر تو کافی طویل ہوگیا ہے۔ دھند، بارش اور یہ گاڑی کی سرد مہری......؟''

''آپ طاہرہ کو تسلی دیں، کم از کم وہ ہمارے لئے پریشان نہ ہو......!''

میں نے سیل فون نکالا...... اور طاہرہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

مگر نیٹ ورک پرابلم ہوگیا۔ کال اینڈ ہوگئی۔ میں نے سگنل چیک کئے مگر سگنل موجود نہ تھے۔

''اوہ...... سگنل نہیں...... تم ملاؤ...... مگر

سوری...... تمہارے سیل کے سگنل بھی نہیں ہوں گے......'' میں نے کہا۔

نائلہ نے سیل اپنے پرس سے نکالا...... اس نے سگنل چیک کئے۔ مگر وہ اچھل پڑی......

''حیرت ہے کہ ہم دونوں کی موبائل کمپنیاں ایک ہی ہیں۔ تمہارے سگنل نہیں ہیں اور میرے سگنل ہیں...... یہ دیکھو......'' اس نے سیل دکھایا۔ اس کے سگنل واقعی تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے سیل لے لیا۔ اور طاہرہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ مگر نیٹ ورک پرابلم...... اب نائلہ کے سیل فون پر بھی سگنل ڈراپ تھے......

''لو جی...... تمہارا سیل بھی جواب دے گیا...... یہ لو......'' اس کے سگنل بھی اڑ گئے تھے...... میں نے اسے سیل واپس کرتے ہوئے کہا۔ اس نے سیل واپس لیا۔ پھر بولی......

''غور سے دیکھیے شاہ صاحب...... سگنل موجود ہیں......'' اور واقعی سگنل موجود تھے...... ایک خیال کے تحت میں نے اپنا سیل نائلہ کو دے دیا۔

''سگنل آئے میرے سیل پر......؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... آگئے...... یہ کیا راز ہے؟'' نائلہ بولی۔

''سمجھ آگئی ہے۔ یہ جگہ جہاں میں موجود ہوں، بھاری ہے اسی وجہ سے سگنل بھی اڑ رہے ہیں اور گاڑی بھی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔''

نائلہ ہنس پڑی تھی۔ گو کہ اس کی ہنسی غیر متوقع تھی اور نہ ہی یہ ہنسنے کا وقت تھا۔

''مجھے بھاری چیزوں پر کوئی یقین نہیں ہے۔ خدا پر بھروسہ میرا ایمان ہے۔ بسم اللہ پڑھ کر گاڑی چلاؤ...... اللہ کرم کرے گا۔''

میں نے بسم اللہ پڑھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی واقعی اسٹارٹ ہوگئی اور یہ اچھی بات تھی۔

میں نے گاڑی ریورس میں ڈالی اور دائیں طرف ٹرن لے کر گاڑی شہر کو جانے والی پکی سڑک پر ڈال دی۔ بارش تھم چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سناٹا اور خاموشی، آسمان پر اندھیرا کچھ اس لئے بھی چھایا ہوا تھا کہ چاند، ستارے بادلوں کے پیچھے چھپ گئے تھے......

ہم اندھیری رات کے مسافر ایک مرتبہ پھر سفر کی صعوبتوں کے ساتھ رواں دواں تھے...... میرے لبوں پر صرف ایک ہی دعا تھی کہ ''یا اللہ مزید کوئی دشواری پیش نہ آئے...... اور یہ سفر جلد ختم ہو جائے......''

اگر ہم طاہرہ کے پاس وقت پر نہ پہنچے تو اس سفر اور تکلیف کا کوئی فائدہ نہیں......! مگر ابھی سفر کے امتحان اور بھی تھے۔ میری آنکھوں نے ایک کالے سیاہ خوفناک بلے کو دیکھا۔

وہ بلا عین سڑک کے درمیان میں موجود تھا۔ اور اس کی تیز چمکدار آنکھیں خوفناک حد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کالا بلا بہت موٹا تھا۔ میں نے ہارن دیا۔ مگر بلا ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہٹ دھرم بلا اپنی جگہ پر قائم و دائم رہا۔

وہ بلا ہماری طرف دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے اسپیڈ ہلکی کر لی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہٹ دھرم بلا اپنی زندگی کی بازی ہار جائے۔ مجھے اس کو ہر صورت بچانا تھا۔ یہ اخلاقی فرض تھا میرا......! وہ خاصی تیز رفتاری سے گاڑی کی طرف بھاگتا آ رہا تھا۔ فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا...... ایسا لگتا تھا کہ وہ بلا خوفناک عفریت بن کر گاڑی پر حملہ کرنا چاہتا ہو۔ مگر کیوں؟''

''آج یہ بلا مارا جائے گا......؟'' میں بولا۔

''کیا ہوا شاہ نور...... کدھر ہے بلا......؟'' نائلہ حیرت زدہ تھی۔

''ارے...... تم اپنی آنکھوں کا معائنہ کراؤ۔ وہ دیکھو ایک کالا بلا بڑی تیزی سے ہماری طرف دوڑا چلا آ رہا ہے۔ اس کے ارادے خطرناک معلوم ہوتے ہیں......''

میں نے بات مکمل کی تھی کہ وہ بلا خوفناک طریقے سے میری گاڑی کے ونڈ اسکرین سے آ ٹکرایا۔ وہ ٹکراتی خوفناک اور زوردار تھی کہ گاڑی ہل گئی تھی اور پریشر ونڈ اسکرین بھی کریک ہوگئی تھی...... بلا ٹکرانے کے بعد بونٹ پر گرا پھر اچھلتا ہوا دھڑام سے پکی سڑک پر۔

''اوہ نو...... وہ مر چکا ہوگا۔'' میں نے اچانک

بریک لگائے...... میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور یخ بستہ رات کے خوفناک ماحول میں باہر نکل آیا۔ فضا میں خنکی تھی اور ٹھنڈی ہوا نے میرے جسم کے انگ انگ کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔ میں جلدی سے گاڑی کے فرنٹ کی طرف پہنچا جہاں میرے سامنے بلاونڈ اسکرین سے ٹکرانے کے بعد زمین پر جا گرا تھا۔ اور پھر مجھے حیرت کا زوردار جھٹکا لگا۔ کیونکہ وہ خاموشی سے سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

اتنی خوفناک ٹکر کے بعد تو بلا موت کے منہ میں جا چکا ہوتا، مگر یہ بلا عجیب قسم کا بلا تھا۔ ہلکی سی چوٹ بھی نہیں آئی تھی۔ الٹا تاؤ بھی کھائے جا رہا تھا...... اور پھر وہ ہوا جس کی مجھے ذرا برابر توقع نہ تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور میرے اوپر آ گرا۔ اس کی غراہٹ، کرب انگیز اور ڈرا دینے والی تھی۔ مجھے لگا وہ میری آنکھیں نکال دے گا مگر اس کا نشانہ شاید چوک گیا تھا۔ داہنی آنکھ سے ذرا نیچے اس کا تیز دھار پنجہ ہلکا سا پڑا۔ تکلیف کے احساس سے میں بلبلا اٹھا۔

میں اس اچانک حملے سے خود کو بچا نہ پایا تھا۔ میرے لئے بہتر یہی تھا کہ گاڑی میں بیٹھا جائے۔ اور جلد از جلد شہر پہنچا جائے۔ میں نے تکلیف کی وجہ سے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے اس کالے بلے سے میری نظر ہٹ گئی تھی۔ میں نے دیکھا اب وہاں بلا موجود نہ تھا۔ شاید بھاگ گیا تھا...... مگر اس کی آنکھوں میں اترا خون مجھے لرزا گیا؟ میرے جسم میں خوف سے سرد لہر دوڑ گئی تھی...... اس کی آنکھیں ڈراؤنی خوفناک اور سرخ تھیں...... مگر وہ اس طرح کدھر بھاگ گیا......؟ میں نے اسے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اسی لمحے نائلہ دوسری طرف سے باہر نکل آئی تھی......

”کیا ہوا...... مجھے بتائے بغیر آپ باہر نکل آئے اور یہ آپ نیچے اس طرح پریشان کیوں بیٹھے ہیں؟“

”نائلہ...... وہ خوفناک بلا مجھے مارنا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون تھا۔ یہ دیکھو میرے گال پر اپنا تیز دھار پنجہ بھی مار گیا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے نائلہ کو بتایا۔

”آپ گاڑی میں چلیں...... میں نے کسی بلے کو نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی مجھے آپ کے چہرے پر کسی پنجے کا نشان نظر آ رہا ہے۔ ہم بہت لیٹ ہو چکے ہیں بھلا کیا ضرورت ہے اس طرح خوفناک ماحول میں گاڑی سے باہر نکلنے کی...... چلیں۔“ وہ مجھے گاڑی کے اندر بیٹھا کر خود دوسری طرف سے اندر آ بیٹھی۔ میں نے اندر کی لائٹ آن کردی اور سائیڈ مرر سے اپنے زخمی گال کو دیکھا مگر حیرت انگیز تکلیف موجود تھی۔ اور پنجے کا نام و نشان تک نہ تھا......

”میری بات کا یقین کرو...... وہاں ایک خوفناک خونی بلا موجود تھا۔ سب سے پہلے وہ مجھے سڑک کے عین وسط میں نظر آیا اور پھر میری طرف دوڑ پڑا۔ کیا تمہیں تھوڑی دیر پہلے ایک زوردار جھٹکا لگا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا۔ تم کس خوفناک بلے کی بات کر رہے ہو؟ اور کون سا جھٹکا...... میرے سامنے واضح سڑک ہے۔ مجھے کوئی بلا نظر نہیں آیا...... اور نہ ہی کوئی جھٹکا لگا...... شاہ نور...... خود کو سنبھالو......؟“ نائلہ بولی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ میری بیوی اس بلے کو نہ دیکھ پائے اور پھر میرے چہرے پر نشانات اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟ جو میں دیکھ رہا ہوں اور میری بیوی دیکھنے سے قاصر ہے...... یہ معمہ بھی پیچیدہ تھا......

نائلہ نے منرل واٹر کی بوتل سے تھوڑا سا پانی ڈسپوزایبل گلاس میں نکال کر مجھے دیا۔ جسے میں غٹا غٹ پی گیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرلی تھی۔ پہلے گیئر میں ہلکی اسپیڈ سے گاڑی آگے روانہ ہو گئی...... میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب تھی۔ آنکھوں کے آگے وہی خوفناک آگ اگلتی زہریلی آنکھوں والا بلا آ جاتا تھا۔ وہ مجھے واقعی مار دینا چاہتا تھا۔ مگر کیوں؟...... اور پھر اس کیوں نے مجھے واقعی پریشان کر دیا تھا۔

گیدڑوں اور کتوں کی آوازیں ماحول کو خوفناک بنا رہی تھیں۔ گاڑی اندھیری رات میں، درختوں کے جھنڈ سے گزر رہی تھی۔ جب اچانک ہی سامنے ایک مرغی نظر آئی۔ وہ مرغیوں کا غول تھا جب میں نے غور سے دیکھا...... وہاں عین سڑک پر مرغیوں کا غول موجود تھا۔

چار بڑی مرغیاں اور باقی تمام چھوٹے چھوٹے چوزے تھے۔ اور ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ سفید اور کالے پروں والے خوب صورت چوزے، سڑک پر گھوم رہے تھے...... میں ان کے نزدیک جاکے رک گیا۔ بریک لگنے سے نائلہ بول اٹھی۔

"اب کیا ہوا؟" وہ جھنجلائی ہوئی تھی۔

"نظر نہیں آرہا...... وہ مرغی کے بچے...... ان کو کچل دوں کیا؟" میں بولا۔

"شاہ نور...... آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ کبھی آپ کو بلے نظر آتے ہیں تو کبھی مرغیوں کے چوزے...... وہاں کچھ بھی نہیں ہے...... پلیز! آگے چلیں...... اس قدر اندھیری رات میں گھر سے نکلنا بھی بیوقوفی تھی۔

"تم غور سے دیکھو۔ وہاں واقعی چوزے موجود ہیں۔ ورنہ تم خود بتاؤ میں کیوں رکوں؟ کیا ضرورت ہے مجھے اتنی رات کو اچانک اس خوفناک اور بیابان جنگل میں گاڑی روکنے کی۔

"تم یقین کرو نائلہ...... جو میں دیکھ رہا ہوں، وہ حقیقت ہے۔ وہاں مرغیوں کے چھوٹے چھوٹے چوزے ہیں۔ وہ گزر جائیں پھر ہم نکل پڑتے ہیں۔ اس طرح ان کو کچل دینا، انسانیت نہیں......" میں نے کہا۔

"آپ کہہ رہے ہیں تو مان لیتی ہوں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے بھی کچھ نہیں نظر آرہا۔ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ وہ واقعی میری نظروں سے اوجھل ہے اور یہ حقیقت کہ نائلہ کو واقعی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

مرغیاں آہستہ آہستہ گاڑی کی جانب بڑھتی آرہی تھیں۔ ان کا درمیانی فاصلہ گھٹتا جارہا تھا۔ فاصلے اگر مشکل مزاجی سے کم ہوتے رہیں تو منزل مل جاتی ہے۔ مرغیاں جانے کس منزل کی طرف گامزن تھیں۔ کیونکہ وہ میرے سامنے ہی گاڑی کراس کرگئی تھی۔ مگر اس وقت میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جب ننھے چوزے ڈیش بورڈ کے سامنے ایک قطار کی صورت موجود تھے۔ ان کی کل تعداد پندرہ تھی، وہ ایک قطار بنا چکے تھے اور پھر انہوں نے اپنے پر پھیلا دیئے۔ جیسے ونڈ اسکرین پر ایک ساتھ حملہ کرنا چاہتے ہوں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا......

وہ سب ایک ساتھ ہوا میں اچھلے اور پوری قوت سے ونڈ اسکرین سے ٹکرائے۔

ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ کریک مرر، ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی چونچوں نے ڈرل مشین کا کام کیا تھا۔ وہاں سوراخ ہوگئے تھے۔ وہ ایک بار پھر منظم ہورہے تھے اور پھر ایک زبردست ٹکر نے چھناکے سے ونڈ اسکرین اڑادی تو اب کی بار نائلہ چیخ اٹھی۔

شیشہ چکنا چور ہوگیا تھا۔ اور تمام چوزے عجیب و غریب آواز کے ساتھ ونڈ اسکرین کے درمیان بننے والے راستے سے اندر آنے لگے تھے۔ ان کے تیور خطرناک تھے۔

"شاہ نور...... تم ٹھیک کہتے ہو، کوئی نادیدہ مخلوق ہے جو ہمیں تنگ کررہی ہے۔ یہ ونڈ اسکرین اچانک کیسے ٹوٹ گئی۔" یہ تو شکر تھا کہ نائلہ کے سامنے طلسم ٹوٹ چکا تھا ورنہ اس نے کبھی یقین ہی نہ کرنا تھا کہ میں واقعی وہ سب دیکھ رہا تھا جو وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ونڈ اسکرین سے ٹھنڈی یخ بستہ ہوا ایک دم ہی گاڑی کے اندر داخل ہوگئی تھی۔ اور چوزے نئی آفت بن کر ہم پر ٹوٹ پڑے تھے۔

"نائلہ تم پیچھے چلی جاؤ، یہاں بیٹھنا خطرناک ہے۔" میں نے نائلہ سے کہا اور نائلہ پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی......!

چوزے میرے پاؤں اور پھر ٹانگوں کو کھرچ رہے تھے۔ ان کی چونچیں تیز دھار چاقو کی مانند تھیں...... گاڑی بند ہوچکی تھی اور چوزے مجھے زخمی کرنے میں مصروف العمل تھے۔ میرے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ چوزے اپنی چونچ سے میری ٹانگوں کا گوشت نوچ رہے تھے۔ کچھ چوزے میرے جوتوں کو کھرچ کر میرے پاؤں کی کھال نکالنے میں مصروف تھے۔

تبھی نائلہ نے زوردار چیخ ماری...... مین نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک کالا بلا...... اپنی خوفناک سرخ آنکھوں

کے ساتھ نائلہ کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھا اور نائلہ نے شاید اسی کو دیکھ کر چیخ ماری تھی۔

☆......☆......☆

ان کا نام نجانے کیا تھا؟ مگر سب انہیں زیدی کے نام سے بلاتے تھے۔ زیدی صاحب کا ڈربہ ہمارے گھر کے ساتھ ہی واقع تھا۔

وہ صبح کتنی اذیت ناک تھی جب میرے گھر میں تین عدد مرغیاں بمعہ فیملی داخل ہو گئیں۔ جگہ جگہ بیٹ پڑی تھی اور پورے گھر میں اودھم مچا رکھا تھا۔ میں مرغیوں کی مخصوص آواز سن کے کمرے سے باہر نکل آیا تھا اور آنگن میں اچھلتے کودتے چوزے دیکھے تو خطرے کی گھنٹی بجی۔

ہمارے گھر کے ساتھ ایک مکان کافی عرصہ سے خالی پڑا تھا۔ عرصہ دراز سے اس کے مکین کسی دوسری جگہ شفٹ ہو گئے تھے۔ اس گھر کا نظارہ میں اپنی سیڑھیوں سے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اب وہاں چڑیا گھر آباد ہو چکا تھا۔ ایک عجیب رونق تھی وہاں، آنگن میں ایک کناری سے بندھا پڑا تھا۔ وہ سفید کتا تھا۔ جس کے بال کافی لمبے تھے۔ ساتھ ہی ایک بلی گھوم رہی تھی۔ وہ خاصی موٹی بلی تھی۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر کبوتروں کا ڈبہ تھا۔ تھوڑے فاصلے پر جنگلے لگے تھے اور قریباً تین گز تک کے لمبے پلاٹ میں شتر مرغ ٹہل رہے تھے۔ ان کی لمبی گردنیں اور مخصوص آواز......!

برآمدے میں ایک پنجرہ لٹکا تھا۔ جس میں تیتر کھڑا تھا۔ بلکہ قید تھا کہیں تو زیادہ بہتر ہے۔ وہ ہر دو منٹ کے بعد زوردار آواز میں بولتا تھا۔ اس کی آواز بہت تیز تھی۔ مجھے اس کی آواز سے کوفت ہو رہی تھی اور سر میں ہلکا سا درد بھی ہونے لگا تھا......

پھر ایک اور پنجرہ بھی نظر آیا۔ اس میں ایک خوب صورت طوطا قید تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چونچ سے کچھ کھا رہا تھا۔ غالباً چوری ہی کھا رہا ہوگا۔ اس کی آواز بھی خاصی تیز تھی۔

دوسری طرف بطخ کا جوڑا نظر آیا...... سفید لمبی گردن والی بطخیں مٹی میں کھیل رہی تھیں۔ وہاں تالاب تھا۔ جس کی چکنی مٹی ان کی خوراک تھی۔

میں نے وہاں ایک مور بھی دیکھا۔ اس نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھا۔

آپ نے چڑیا گھر کی سیر کرنی ہو تو اس گھر میں چلے جائیں...... واہ جی واہ...... کمال کے مکین تھے اس گھر کے۔ پہلے تو سنسان رہتا تھا اور خاموشی رہتی تھی۔ سکون بھی میسر تھا۔ مگر آج سے سارا سکون غارت...... یہ بہت خطرناک تھا۔ ان دنوں نائلہ، میرے گھر میں نئے مہمان کی طرح تھی۔ ہماری شادی کو ایک ہفتہ ہوا تھا اور نائلہ کو ان تمام چیزوں سے سخت نفرت تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے شور سے نفرت تھی۔ سمجھنے کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے مگر وہ مجھے اپنی پسند اور ناپسند سب ہی بتا چکی تھی...... اور مجھے خود بھی اس طرح کے شور اور دھم دھڑکے سے سخت نفرت تھی...... اور پھر ان کی مرغیاں بمعہ چوزوں کے ہمارے گھر موجود تھے۔ میرے گھر کا صحن گندا ہو چکا تھا اور نائلہ کو یہ سب ناپسند تھا......

میں نے ملازم شرفو کو آواز دی......

"شرفو سب سے پہلے تو ان مرغیوں اور چوزوں کو گھر سے باہر نکالو اور پھر فرش صاف کر دو...... اور ہاں ذرا پتہ کرو کہ ہمسائے کون آئے ہیں......؟"

"جی صاحب!"

اس نے بڑی مشکل سے مرغیاں اور ان کی فیملی باہر نکالے۔ ان کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اس کا سانس پھول گیا تھا...... وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ جیسے تیسے اس نے سب کو باہر نکالا۔ پھر سارا فرش صاف کیا...... تب تک نائلہ بھی کمرے سے باہر نکل آئی تھی......

"فرش کس خوشی میں صاف کیا جا رہا ہے؟" اور یہ آواز کس جانور کی تھی؟" میرے بولنے سے پہلے شرفو بول پڑا......

"بی بی جی...... ساتھ والے گھر میں چڑیا گھر آباد ہو گیا ہے۔ ان کی مرغیاں سارا فرش گندا کر گئی ہیں۔ فرش صاف کر رہا تھا اور بولتا ہی جا رہا تھا......

"چڑیا گھر سے مراد......" نائلہ بولی۔

"ساتھ والے گھر میں نئے مکین آئے ہیں اور ساتھ میں جانور اور پرندے بھی لائے ہیں۔ شاید شوقین مزاج لگتے ہیں......" میں نے بتایا۔

"اوہ...... مگر یہ لوگ ہی کون......؟" وہ نائلہ بولی۔

"پتہ نہیں۔ .... اچانک ہی آوارد ہوئے ہیں۔ معلوم کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ تیتر اور طوطے کی آواز دوبارہ آئی تو نائلہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

"کتنی تیز آواز ہے۔..... کیسے برداشت کرتے ہیں یہ لوگ؟" وہ ڈسٹرب مائنڈ لگ رہی تھی......

"تم کمرے میں چلو...... میں دیکھتا ہوں......!" میں نے کہا۔

☆......☆......☆

رات مزید خوفناک ہوگئی تھی۔ کیونکہ میری ٹانگ بری طرح زخمی ہوچکی تھی۔ ظالم اور خوفناک چوزے اپنی قینچی جیسی چونچ سے میری داہنی ٹانگ زخمی کرچکے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کا بھبکا اندر آچکا تھا اور ادھر نائلہ چیخ رہی تھی اور جمپ لگا کے میرے ساتھ آگئی تھی۔ کیونکہ پچھلی سیٹ پر وہی خوفناک کالا بلا موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون تھا۔ اور وہ کافی غصے میں نظر آرہا تھا۔

"وہ بلا مجھے مارڈالے گا۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے......" وہ زورزور سے بول رہی تھی...... اور یہ حقیقت تھی بلے کی خونی نگاہوں کا مرکز نائلہ ہی تھی۔ وہ ایک سیکنڈ کے ہزارویں لمحے میں سیٹ سے اچھلا اور نائلہ کے دائیں کندھے پر اپنا پنجہ گاڑ دیا تو نائلہ کی چیخ بلند ہوئی۔

پھر بلا اچانک غائب ہوچکا تھا۔

نائلہ خوف سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ میری ٹانگ بری طرح زخمی تھی۔ یہ سب آناً فاناً ہوا تھا۔ البتہ ونڈ اسکرین کا ایک حصہ ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اندر کی لائٹ آن کی اور نائلہ کو ہوش میں لاتے کے لئے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ .... چند لمحے توقف کے بعد نائلہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں، وہ خوف زدہ تھی۔ "وہ خونی بلا مجھے مارڈالے گا...... بچاؤ......"

اس کے ذہن پر خوف طاری تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ نروس بریک ڈاؤن ہوسکتا تھا۔

"بلا چلا گیا نائلہ...... پلیز! اپنے آپ کو سنبھالو...... اب کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی......

وہ بری طرح رورہی تھی...... "الٰہی یہ کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں ہم ہماری مدد فرما......" میں نے دعا مانگی...... مگر ابھی امتحان باقی تھے۔

نائلہ دوسری سیٹ پر جا پہنچی...... اس نے پانی پیا...... تو اس کے اوسان کچھ بحال ہوئے...... یہ خوش آئند بات تھی کہ وہ نارمل ہوگئی تھی۔ ورنہ حالات مزید خراب بھی ہوسکتے تھے۔

میں نے اپنی چادر سے ونڈ اسکرین کے متاثرہ حصے کو ڈھانپ دیا...... میں نے فیصلہ کیا تھا کہ گاڑی کو جلدی جلدی سے اس جگہ سے نکال کر شہر لے جاؤں...... میں نے گیئر ڈالا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ گاڑی بڑی تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ مگر پھر مجھے اچانک بریک لگانی پڑی...... میری ٹانگ کی تکلیف بھی رفو چکر ہوچکی تھی...... سب کچھ ٹھیک جارہا تھا۔ مگر میں نے ایکسیلیٹر سے اچانک پاؤں اٹھالیا اور بریک دبادیئے۔ سامنے سڑک پر ایک انسان موجود تھا۔ وہ میرے سامنے ہی جھاڑیوں سے نکلا تھا۔ اس کا پورا لباس سفید تھا...... اور چہرے پر نقاب تھا۔ .... مجھے تو وہ نقاب پوش مردہ بھی لگا تھا۔ کیونکہ اس وقت میرے دائیں جانب قبرستان موجود تھا...... میری گاڑی رک چکی تھی اور وہ نقاب پوش مردہ میری جانب بڑھا چلا آرہا تھا۔

☆......☆......☆

زندگی کبھی کبھی بہت زیادہ ڈسٹرب ہوجاتی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے زیدی صاحب کے چڑیا گھر سے واسطہ پڑنے کے بعد ہوا تھا۔ جب سے وہ اس سنسان گھر میں آوارد ہوئے تھے۔ ایک لمحے کا سکون میسر نہ تھا۔ کبھی طوطے کی آواز میرے سکون کو غارت کررہی تھی تو کبھی شیر

کی آواز مجھے ڈسٹرب کرتی...... کبھی ان کی مرغیاں ہمارے گھر بمعہ فیملی آجاتیں تو مسئلہ مزید بڑھ جاتا تھا۔
اس دن نائلہ خاصی خوفزدہ ہوگئی تھی جب کچن میں کالا سیاہ بلا دودھ کی ہانڈی خالی کرنے کے بعد بڑے آرام سے باہر نکل گیا تھا...... میں فوراً ساتھ والے گھر گیا...... جہاں دنیا جہاں کے پرندے اور جانور رہائش پذیر تھے...... ملازم شرفو میرے ساتھ تھا۔
دوسری دستک پر ایک ادھیڑ عمر صاحب باہر تشریف لائے...... وہ سفید کاٹن کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ فرنچ کٹ داڑھی اور سفید لمبے بال متاثر کن شخصیت تھی ان کی......!
''جی میں شاہ نور ہوں...... آپ کے ساتھ والے گھر میں رہتا ہوں......!'' میں بولا۔
''شاہ صاحب! سلام عرض...... حضور مجھے بلا لیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا۔'' ان کی آواز میں مٹھاس تھی۔ مسحور کن آواز۔
''ایسی کوئی بات نہیں...... دراصل ہم نے آپ کے بارے میں کچھ جاننا تھا۔ آپ نئے آئے ہیں۔ سوچا سلام دعا ہی کر آئیں......؟''
''ضرور صاحب...... میرے غریب خانے پر تشریف لایئے، شکریہ۔'' اس شخص کا خلوص قابل دید تھا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی۔
اس نے خوش آمدید کہا تو ہم اس کے گھر میں داخل ہو گئے......
گھر کا نقشہ وہی جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں...... گھر وسیع تھا اور اس میں تین بڑے کمرے تھے......
میرا نام انصار زیدی ہے۔ لوگ پیار سے زیدی کہتے ہیں۔ شادی نہیں کی۔ ان پرندوں سے محبت ہے، شہر کی فضا ان کے لئے ناموافق تھی۔ یہ میرے بھائی صاحب کا مکان ہے۔ ان سے گزارش کی کہ اپنا مکان مجھے دے دیں۔ یہ پرندے میری محبت ہیں۔ زندگی ان کی خدمت میں گزر جائے گی...... تو آ گیا......''
''آپ بہت اچھے ہیں زیدی صاحب، مگر انتہائی ادب سے گزارش ہے کہ آپ کی مرغیاں ہمارے گھر کو گندا کر جاتی ہیں......؟''
''اوہ...... میری مرغیاں...... بے زبان ہیں جی...... میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ باہر نہ جائیں۔ مگر آئندہ ایسا نہ ہوگا......'' وہ شرمندہ تھا۔ وہ شخص بہت سادہ اس کا انداز گفتگو کمال کا تھا۔ میں اٹھنے لگا تھا وہ بولا۔
''محترم...... چائے چلے گی یا ٹھنڈا......؟''
''نہیں...... شکریہ......!'' ہم وہاں سے اٹھ آئے...... زیدی کا دل محبت سے لبریز تھا۔ اسے مزید کچھ کہنا اچھا نہ لگا......
اس رات نائلہ کا دماغ بہت الجھا پڑا تھا۔ کیونکہ چڑیا گھر سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی طوطے کی آواز، تو کبھی تیتر، تو کبھی مور کی پھڑ پھڑ، کبھی بلے کی غراہٹ، تو کبھی چھوٹے کتے کی آواز...... ''کیا مصیبت ہے...... جینا حرام ہو گیا ہے...... آپ ان کو کچھ کہتے کیوں نہیں......! بہت تنگ آ گئی ہوں ان سے......'' وہ جھنجھلائی ہوئی تھی......
''آج کی رات سونے کی کوشش کرو۔ کل صبح دیکھیں گے......!'' میں نے کہا۔
''اس چڑیا گھر میں کون سو سکتا ہے......'' وہ بولی۔
''وہ پھر بڑی کوشش کے بعد کمبل لپیٹ کے سو گئی مگر میرا دماغ ایک خطرناک منصوبہ بنا چکا تھا...... اور صرف وقت کا انتظار تھا......!

☆......☆......☆

سفید مردہ مخصوص چال سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ نائلہ نے اس کو دیکھ لیا تھا وہ حواس باختہ ہو گئی تھی۔
''یہ کون ہے؟ پلیز شاہ نور بریک مت لگاؤ اور بھاگو، اس سے بات مت کرو......!'' وہ بولی۔
مگر گاڑی خود بخود رک گئی تھی اور وہ مردہ سائیڈ شیشے کی طرف آ چکا تھا۔
وہ کچھ کہہ رہا تھا...... میں نے شیشہ نیچے کیا...... میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں...... اس نے نقاب الٹ دیا تھا۔ وہ شخص کفن میں ملبوس میرے

سامنے تھا۔ وہ زیدی تھا...... مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جسم پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا...... خوف سے میری گھگھی بندھ گئی تھی......

''یہ زندہ کیسے ہوگیا؟...... یہ کیسے ممکن تھا......؟''

لیکن وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے حقیقت میں خون کے آنسو تھے۔ پھر وہ بولا۔

''افسوس! تم نے میرے سارے پرندے مار ڈالے...... ظلم کیا ان پر...... چاہوں تو ایک لمحے میں تمہیں ابدی نیند سلا دوں۔'' وہ خوفناک انداز میں بول رہا تھا۔

''ہمیں معاف کردو...... ہم نے واقعی ظلم کیا......'' مجھے صرف اتنا سوچ کر معافی مانگنا مناسب لگا......

''میں معاف کردوں...... کیسے......؟ تم نے اپنے نام کی لاج تک نہ رکھی۔ مجھے کیا ہوتا، میں وہ گھر چھوڑ کر اپنے پرندوں کے ساتھ کہیں دور چلا جاتا، اگر تمہارے بچے کو تمہارے سامنے قتل کیا جائے تو تم پر کیا گزرے گی...... ہر جاندار کے دل میں احساس ہوتا ہے اور اسے محبت کہتے ہیں...... تم کیسے انسان ہو......؟ ایک جاندار ماں کے ننھے بچوں کا خون کیسے معاف کردوں......'' وہ رو رہا تھا۔ اس کی آواز میں دنیا جہان کا خوف اور سوزش دل تھا، اس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی......

''جاؤ تم......! تمہارا سفر مزید خونی اور ہیبتناک ہوجائے گا، میرے جانور ہی تم سے انتقام لیں گے......''

گاڑی میں ٹھنڈک تھی مگر دل تھا کہ ابھی باہر نکلنے والا تھا۔ زیدی وہاں سے دور ہٹ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے دوبارہ قبرستان کی جانب جا رہا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے شاہ نور...... زیدی تو مر گیا تھا...... تو پھر یہ کون تھا جو جانوروں کی دھمکی دے گیا؟'' نائلہ بولا......

''یہ غالباً زیدی کی روح تھی...... کچھ روحیں بھٹکتی رہتی ہیں۔ ..... یہ بھی بھٹکتی ہوئی روح تھی......'' میں نے اپنے اوسان بحال کیے اور نائلہ کو جواب دیا۔

نائلہ خاموش ہوگئی تھی۔ ہم دونوں کی حالت قریباً ایک جیسی تھی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ مگر تبھی ایک پالتو کتا انتہائی تیزی سے بھاگتا ہوا ونڈ اسکرین کے ٹوٹے ہوئے حصے سے اندر آ دھمکا، چادر ہٹ گئی تھی۔ یہ حملہ اتنا تیز اور اچانک تھا کہ سامنے بیٹھی ہوئی نائلہ کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا...... اور کتا اس کے شانے سے جا ٹکرایا۔ نائلہ کی چیخ بلند ہوئی تھی، اس نے اپنے ہاتھ غیر ارادی طور پر اس کتے کو ہٹانے کے لئے ادھر ادھر چلائے، اسی غیر ارادی حرکت نے کتے کو زوردار طریقے سے باہر اسی ہول سے، بونٹ پر پٹخ دیا، کتا بونٹ پر گرتے ہی غائب ہوگیا تھا......

اسی لمحے ایک تیز آواز آسمان سے آئی، وہ تیتر کی آواز تھی۔ وہ خاصی تیز تھی۔ ہم نے آسمان پر اڑتے اس بڑے پروں والے پرندے کو دیکھا۔ اس کے لمبے پنجے اور بہت بڑے پر تھے۔ وہ آندھی اور طوفان کی مانند فضا میں ایک دائرے کی شکل میں اڑ رہا تھا۔ اس کے اڑنے سے درخت زوردار انداز سے لہرانے لگے تھے۔ وہ پرندہ ہماری گاڑی کے اوپر سے ایک تیز آواز کے ساتھ گزرا تو ہماری گاڑی کسی کھلونے کی مانند سڑک پر کھسکتی چلی گئی...... اگلی دفعہ جب وہ ہمارے قریب آیا تو گاڑی دائیں جانب الٹ کر سیدھی ہوگئی تھی......

یہ خوفناک افتاد کہاں سے اتر پڑی تھی...... اس کی آواز خاصی زوردار تھی۔ اس کی پھڑپھڑاہٹ دل ہلا دیتی تھی۔ ہم اگر گاڑی کے اندر بیٹھے رہتے تو زندہ بچنا مشکل تھا۔ میں نے سامنے چند فٹ کے فاصلے پر ایک بڑا درخت دیکھا۔ اس کے تنے میں خاصا بڑا خلا تھا، میں اس درخت کے بارے میں اتنا جانتا تھا کہ اس میں دو آدمی با آسانی پناہ لے سکتے ہیں۔ مگر پرندے کی پھڑپھڑاہٹ ایک بار پھر سنائی دی اور اس کے پنجے گاڑی کی چھت پر لگے تو چھت ایک جھٹکے سے اڑ گئی اور ساتھ میں نائلہ بھی غائب تھی۔

☆......☆......☆

میرا دماغ اس چڑیا گھر کے حوالے سے ایک منصوبہ ترتیب دے ڈالا تھا۔ بس عمل کرنا رہ گیا تھا۔

اس دن کالا بلا ہمارے گھر آیا تو واپس نہ جاسکا۔

کیونکہ ہم دونوں نے اس کے لئے موت کا جال بچھا رکھا تھا۔ وہ کچن میں داخل ہوا اور سیدھا دودھ کی جانب لپکا۔ زہریلے دودھ نے اسے چند لمحوں میں تڑپا تڑپا کے مار ڈالا تھا۔ اور ہمارے ملازم شرفو اسے بہت دور پھینک آیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک خونی کو نہایت آسانی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

"جان چھٹی...... ہر روز ہمارا دودھ خراب کر جاتا تھا......" "اب ہمیں اس کے دوسرے جانور ذبح کرنے ہیں......" میں نے کہا......

اسی شام مرغیاں اس کی ہمارے گھر آ وارد ہوئیں۔ شرفو اور میں نے تمام مرغیوں کو بڑی مشکل سے پکڑا اور گردن پر چھری پھیر دی...... اس دن کا کھانا ٹیسٹی تھا۔ تمام پروں کو دبا دیا......

اسی رات زیدی نے ہمارے گھر اپنے کالے بلے اور مرغیوں کا پتہ کیا...... مگر ہم نے لاتعلقی اور لاعلمی کا اظہار کیا۔ زیدی کی حالت بہت زیادہ دیگر گوں تھی۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی تھی......!

"ابھی تو بیٹا...... تمہارے سارے جانور موت کے منہ میں جائیں گے...... آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔" زیدی چلا گیا مگر میں نے دل ہی دل میں خوشی محسوس کی...... اور دھمکی بھی دے ڈالی تھی......

اگلی رات میں نے تیتر اور طوطے کو زہر کا انجکشن لگا دیا تھا...... صبح وہ بھی مردہ پائے گئے تھے...... زیدی کہتا پھر رہا تھا...... "میرے پرندے بے موت مر رہے۔ لوگو! پرندے خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ انہیں مارنا گناہ ہے۔ مگر کوئی بھلا ان بے زبانوں کو کیوں مارے گا......! رات تو اچھے بھلے تھے۔ صبح مردہ ملے......" اس کی آنکھوں میں ویرانی اور اداسی تھی۔ جانوروں سے اس کی محبت مثالی تھی۔

نائلہ اور میں دل ہی دل میں خوش تھے اور کیوں نہ ہوتے، خاموشی اور سکون واپس آ گیا تھا......

اس سے اگلی رات میں نے پیٹرول چھڑک کر سارے کبوتر جلا دیے...... غٹرغوں غٹرغوں کی آواز بھی انجام کو پہنچ گئی تھی...... اس دن زیدی کی آنکھوں میں آنسو تھے...... وہ رو رہا تھا...... ایک ہفتے کے اندر اس کے بہت سے پرندے اور جانور مر چکے تھے۔

وہ اتوار کا دن تھا جب ہم نے گلی میں ایک وین دیکھی۔ زیدی کے باقی ماندہ جانور اس وین میں سوار ہو رہے تھے......

"نور صاحب...... یہ جگہ مجھے راس نہیں آئی۔ میں جا رہا ہوں، اپنے تمام جانوروں کے ساتھ...... کوئی تکلیف ہوئی ہو تو معذرت......" وہ بہت اداس تھا......

مگر پھر کچھ عجیب سا ہوا۔ اس کے سینے میں درد اٹھا۔ شدید ہارٹ اٹیک کا حملہ ہوا تھا...... وہ زمین پر گرا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کی سانس زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ اسے اپنے جانوروں کا افسوس تھا اور یہی اس کی موت کا سبب بنا تھا۔

گاؤں کے لوگوں نے کارروائی کے بعد اسے قبرستان میں دفن کر دیا...... اور اس کے جانور آزاد کر دیے گئے، جہاں انہیں چڑیا گھر کی زینت بنا دیا گیا۔

☆......☆......☆

نائلہ گاڑی کی چھت کے ساتھ ہی اڑ گئی تھی۔ میں نے بغور دیکھا وہ خوفناک پرندہ نائلہ کو پنجوں میں لئے فضا میں اڑ رہا تھا۔ نائلہ پرندے کی مانند اس کے پنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف آندھی اور طوفان کا زور تھا۔ گاڑی میں سے اکثر چیزیں اڑ کر کھیتوں میں جا گری تھیں۔ کافی مشکل سچوئیشن پیدا ہو گئی تھی...... اچانک وہ پرندہ میری طرف آیا...... اور بے ہوش نائلہ کو چھوڑ کر اڑ گیا۔

"یا اللہ...... میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں، میری غلطیوں کوتاہیوں اور گناہوں کو معاف کر دے، ہمیں اس مصیبت سے نکال...... ہمیں ایک بار موقع دے دے۔ ہم برائی کے راستے پر کسی صورت نہیں جائیں گے......؟" میری زبان پر دعا تھی اور سچے دل سے مانگی ہوئی دعا ضرور رنگ لاتی ہے۔

پرندہ چلا گیا تھا اور کھٹارہ گاڑی بھی اسٹارٹ ہو چکی

تھی..... میں نے نائلہ کو سیٹ پر پڑا رہنے دیا اور گاڑی کو لے کر شہر آ گیا.....

صبح ہونے کو تھی۔ میں نے اسپتال میں طاہرہ کو فون کیا اس کا سیل آف ملا۔ میں نائلہ کو بانہوں میں اٹھا کر آگے بڑھا تھا کہ میری زخمی ٹانگ خطرناک طور پر فریکچر شدہ چٹاخ کی آواز سے گھٹنے سے ٹوٹ گئی۔ خاصی تکلیف ہوئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔

☆......☆......☆

جب جگنو سا دماغ میں چمکا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسپتال کا بیڈ تھا۔ نرس انجکشن، ڈرپ میں انجیکٹ کر چکی تھی۔

"اوہ..... آپ کو ہوش آ گیا....." نرس بولی۔

"میں..... یہاں کیسے پہنچا..... اور نائلہ کہاں ہے؟"

"آپ اور ایک خاتون ہمیں گیٹ کے باہر بے ہوش ملے، فوری طور پر آپ کو ایمرجنسی میں داخل کیا گیا....."

"میرے ساتھ جو خاتون تھی وہ کہاں ہیں.....؟"

وہ ہوش میں آ چکی ہیں۔ مگر افسوس ان کا دماغ کام نہیں کر رہا اور وہ کافی ڈری ہوئی ہیں"

"اوہ..... شکر ہے وہ زندہ تو ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔ اسے پلیز میری خیریت دے دیجئے اور ہو سکے تو ڈاکٹر سے میری ملاقات کرا دیں۔"

"ضرور..... آپ کی ہدایت پر عمل ہوگا۔" وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر اندر آیا۔

"ہیلو..... کیسے ہو تو جوان۔" ڈاکٹر بولا۔

"بس ٹھیک.....! ڈاکٹر صاحب یہاں ایک مریض رات ایڈمٹ ہوا ہوگا، وقار احمد کے نام سے.....!"

"نہیں..... یہاں کوئی وقار احمد ایڈمٹ نہیں آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ آپ کی ایک ٹانگ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی ہے..... ہم نے کافی سوچ بچار کے بعد ٹانگ کاٹ دی۔"

مجھے پہلے سے شک تھا..... ہم زندہ تھے اتنا کافی تھا۔ میری دعا رنگ لائی تھی۔

"آپ پلیز، ایک نمبر ڈائل کریں..... یہاں میری سسٹر ہیں۔ میں انہیں انفارم کرنا چاہتا ہوں....."

ڈاکٹر نے نمبر ڈائل کر کے فون مجھے دے دیا، دوسری گھنٹی پر طاہرہ نے کال اٹینڈ کی۔

"ہیلو..... طاہرہ..... شاہ نور بات کر رہا ہوں..... اسپتال سے..... وقار احمد کی طبیعت کیسی ہے اور تم لوگ کہاں ہو اس وقت؟" میں نے پوچھا۔

ہم سب بالکل ٹھیک ہیں..... وقار احمد تو دبئی گئے ہوئے ہیں۔ آپ اسپتال میں..... مگر سب خیریت تو ہے؟' وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

میرا ماتھا ٹھنکا..... "اوہ.....!" میں نے مختصراً سارے حالات اسے بتائے.....

اس رات کس نے فون کیا تھا کہ وقار احمد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اس کا کوئی جواب نہ ملا کیونکہ وقار بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور ایک ہفتہ سے دبئی گیا تھا.....

آج اس واقعہ کو چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ میری ٹانگ بالکل ناکارہ ہو چکی تھی جبکہ نائلہ کا ذہن کچھ عرصہ بعد ٹھیک ہو گیا..... مگر ہم مکمل بدل گئے۔ نائلہ سادہ مزاج بن گئی۔ اس میں عاجزی عود آئی۔ اب تو ہم نے اپنے گھر کو چڑیا گھر بنالیا ہے..... ہر قسم کے پرندے اور جانور ہمارے گھر میں موجود ہیں ان کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازم بھی رکھا ہوا ہے۔ میرا دل لگ گیا ہے ان ننھے جانوروں سے محبت ہو گئی ہے..... تیتر جب بولتا ہے خدا کی بڑائی بیان کرتا ہے مور جب مستی میں ہوتا ہے تو جھومنے لگتا ہے۔ مرغیاں انڈے دیتی ہیں اور سارا فرش گندا کر دیتی ہیں کوئی پرواہ نہیں..... میری کوئی اولاد نہیں مگر یہ جانور اور پرندے میری اولاد کی طرح ہیں اور کوئی ان کو تکلیف دے۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" سچ ہے کہ وقت کے ساتھ خیالات اور انداز بھی بدل جاتے ہیں۔"

ڈھائی بجے

عروج سنبل طحہ - راولپنڈی

قبرستان میں اچانک گرد و غبار کا طوفان اٹھا اور ایک قبر کے پاس موجود دلکش و دلنشین دوشیزہ پر منوں مٹی پڑنے لگی اور پھر دوشیزہ کی سانس حلق میں دب کر رہ گئی، چند منٹوں میں اب وہاں مٹی کا ڈھیر تھا کہ اچانک......

ناقابل یقین اور حیرت میں ڈالتی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو خوف میں مبتلا کردے گی

آسمان پر چمکتے سفید ستارے خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ پورے ماحول پر سکوت طاری تھا۔ فضاء نے جیسے پل پل کو اپنا سانس بند کرلیا ہو ٹنڈ منڈ درخت خاموش دیو کی طرح کھڑے تھے اور ان درختوں کے بیچ سفید لباس پہنے وہ نازک سا وجود خراماں خراماں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیر جوتوں سے بے نیاز تھے نازک سفید پیروں میں لپٹی چاندی کی پائلیں ہر اٹھتے قدم کے ساتھ دلکش آواز پیدا کرتیں۔ جیسے اسے آگے بڑھنے سے روک رہی ہوں۔ اس سفید دودھیا چہرے کی آنکھیں مکمل طور پر بند تھیں، مگر پھر بھی وہ ایسے چل رہی تھی جیسے بند آنکھوں کے پیچھے سے سب کچھ دیکھ رہی ہو۔

''عروج......'' سرسبز جنگل کے سکوت کو کسی کی پکار نے توڑا اور اس کے ساتھ ہی زناٹے دار تھپڑ عروج کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ ستم ڈھانے والے نے اس

پر بس نہیں کیا بلکہ پانی سے بھرا جگ بھی اٹھا کر عروج پر انڈیل دیا گیا۔ وہ کلبلاتی ہوئی نیند سے اٹھ بیٹھی اور آنکھیں کھول کر سامنے والے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی تاکہ جوابی حملہ کیا جا سکے۔

"حد کرتی ہو عروج تم بھی، سنا تو صرف گھوڑوں کا تھا مگر تم گھوڑے، گدھے چڑیاں، کبوتر، سب کچھ بیچ کر سوتی ہو۔" فریال کا غصے سے برا حال تھا۔

"کمال ہے یار! آج ہوسٹل میں آخری دن ہے۔ کیا آج بھی پرسکون نیند نہ سوؤں؟" عروج اکتاہٹ سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

"میری طرف سے تم جاؤ بھاڑ میں، میں تو چلی...... گھنٹہ بھر میں تمہیں جگا پائی ہوں مگر تم ڈھیٹ احسان مان کے نہیں دے رہی۔" فریال وہیں بیڈ کے کارنر پر بیٹھ گئی۔

"گرلز...... آپ سب جا سکتی ہیں، آپ کے گھر والے نیچے تشریف لا چکے ہیں۔" موٹے موٹے شیشوں والی عینک چڑھائے وارڈن کمرے میں داخل ہوئی، سب لڑکیوں نے بیگز اٹھائے اور خوشی خوشی نیچے جانے لگیں۔

☆......☆......☆

بارش تھم چکی تھی اور پانی برآمدے کی نالی دار چھت اور ڈھلائی چھت سے آنسوؤں کی طرح قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ آسمان پر ابھی تک سرمئی اور مٹیالے بادل چنگھاڑتے پھر رہے تھے ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر اپنا وجود گم کر دینے کا تلخ احساس تھا۔ شاید اسی لئے اب اپنی ہستی اور اپنی انفرادیت کے لئے یہ بادل ایک دوسرے سے لپٹ کر الگ ہو چکے تھے۔ سینہ چرخ پر ایک دوسرے سے بچتے بچاتے پھیل جانے کی کوشش میں ٹکرا رہے تھے اور گرج رہے تھے فضاء میں سرمئی سا غبار گھلا ہوا تھا۔ سیراب ہو کر نکھری ہوئی دھرتی کے سینے سے پھوٹتا ہوا سبزہ اور رنگا رنگ پھول نم آلود ہواؤں کی چھیڑ سے جھوم رہے تھے۔ برآمدے کے پھیلتے ستونوں سے لپٹی عشق پیچاں کی بیلوں سے کاسنی پھول ٹوٹ ٹوٹ کر برآمدے میں آن گرے تھے اور اب ٹھٹھری ہوائیں انہیں چپس کے چکیلے فرش پر ادھر سے ادھر لڑھکا رہی تھیں۔

"موسم کتنا اچھا ہو رہا ہے ناں......" انوشہ نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ جہاں سے برآمدہ واضح نظر آ رہا تھا۔

"میں نے تو جی بھر کے انجوائے کیا۔ خوب نہائی۔ بس ذرا سی سردی لگ رہی ہے۔" انوشہ اپنے بھیگے کپڑوں سے بے نیاز باہر کے منظر میں کھوئی ہوئی تھی اور اپنے خیالوں میں مگن تھی۔ اسے اتنا بھی نہ پتا تھا کہ جس سے وہ باتیں کئے جا رہی ہے وہ تو کب کا اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکی ہے۔

"رباب تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی؟" بالآخر تنگ آ کر اس نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر کسی کو کمرے میں نہ پا کر اس نے گھبرا کر دوبارہ کھڑکی سے باہر نظر ڈالی اور پھر جیسے کچھ سوچ ذہن میں آتے ہی وہ دیوانہ وار اس کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی صحن میں لگے درخت پر چگادڑیں الٹی لٹکی سو رہی تھیں۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ تین کمروں پر مشتمل اس پختہ مکان میں اس بالشت بھر لڑکی کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبے صحن میں وہ یوں پھر رہی تھی، جیسے اسے سب کچھ واضح نظر آ رہا ہو۔ سیاہ لمبے بال اس کی پشت پر بکھرے پڑے تھے۔ تین دن سے اس نے بالوں میں برش نہ کیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ آپس میں الجھے پڑے تھے۔ سحر زدہ انداز میں وہ صحن میں پھر رہی تھی اس کی چال میں سخت قسم کا تناؤ تھا۔

"رباب ...... رباب تم کہاں ہو...... میرے سامنے کیوں نہیں آتی......؟" اس کے لہجے میں منت شامل ہونے لگی تھی۔

اچانک موسم نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ ہوائیں تیز ہونے لگیں۔ سائیں سائیں کی آوازیں گونجنے لگیں انوشہ کے الجھے بال ہواؤں کے بل پر تتر

بتر ہونے لگے۔ درخت کی شاخیں بدمست دیو کی طرح جھول رہی تھیں وہ سیدھ میں چلتی ہوئی درخت کے بالکل پاس پہنچ گئی۔ تیز جھکڑ کے بل بوتے پر جھومتی درخت کی شاخیں یوں لگ رہی تھیں جیسے انوشہ کے پاس آنے کی خوشی میں جھوم رہی ہوں۔ ابھی وہ درخت کے پاس ساکن حالت میں کھڑی تھی کہ ایک سفید رنگ کی بڑی سی گٹھڑی درخت پر سے اس کے برابر میں آگری۔ وہ حیرت سے اس گٹھڑی کی جانب دیکھنے لگی تھی۔ رات کی سیاہ تاریکی میں یہ گٹھڑی ایک مدھم سفید ہیولے کی طرح نظر آرہی تھی۔

معاً گٹھڑی میں حرکت پیدا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے گٹھڑی نے ایک وجود کا روپ دھارلیا۔ سفید چوغے میں ملبوس وہ لڑکی اٹھ کر کھڑی ہوگئی انوشہ کو ذرہ بھی حیرت نہیں ہوئی بلکہ اس کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ آنے لگے۔ وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔

"رباب......تم آگئی......" وہ جوش سے آگے بڑھی۔ رباب سے گلے ملنے کو......مگر وہ ہوا سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی......اور سفید چوغے میں ملبوس رباب پیچھے رہ گئی......اس نے مڑ کر رباب کو دیکھا جواب اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اپنا چوغہ سنبھالتی پیچھے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"اوں......" اس نے روٹھنے والے بچے کی طرح منہ پھلالیا اور ایک بار پھر سے رباب کے پیچھے چلنے لگی۔ رباب گھر کے کھلے خستہ کوارٹر سے نکل کر باہر گلی میں آگئی۔ انوشہ بھی اس کے پیچھے چلتی ہوئی آگئی ہواؤں نے جانے کون سی ضد لگارکھی تھی کہ دم لینے کو بھی نہ رک رہی تھیں۔

رات کے ڈھائی بجے گلی میں ہو کا عالم تھا بس ہواؤں کے شائیں شائیں کی آواز گونج رہی تھی۔ کچے پکے مکانوں کے مکین اپنے بال بچوں کو دبکائے ہوئے سو رہے تھے۔ گلی میں جلنے والا ننھا سا بلب اونچے کھمبے پر ہونے کی وجہ سے تیز جھکڑ کے آگے اپنی زندگی کی بازی کب کی ہار چکا تھا۔ مگر تیز جھکڑ کی جیت کا جشن ابھی باقی تھا۔ اسی لئے وہ ننھے بلب کے ریزہ ریزہ ہوئے ٹکڑوں کو ادھر سے ادھر اڑائے پھر رہی تھی۔

سفید چوغے میں ملبوس رباب اپنی کمر کو خم دے کر مسلسل آگے بڑھے جارہی تھی۔ جھکنے کی وجہ سے سیاہ بال اس کی پشت پر بکھر کر خوفناک منظر پیش کر رہے تھے۔ اتنے میں جھکڑ کا ایک تیز بگولا اپنی مستی میں گھومتا ہوا ان دونوں کی طرف بڑھنے لگا رباب پل بھر کی بھی دیر لگائے بغیر اس بگولے میں داخل ہوگئی۔

بگولے کی آواز جھکڑ سے قدرے مختلف تھی اس میں مختلف شاپر ٹوٹی پھوٹی چیزیں گول چکر میں تیز تیز گھوم رہی تھیں۔

انوشہ ایک منٹ کے لئے اس بگولے میں داخل ہونے پر ہچکچائی بچپن میں جاری دادی اماں کی باتیں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔

"اری بیٹا! اندر آجا۔ جھکڑ کے تیز بگولے میں نہیں جاتے۔ سو طرح کی ہوائی چیزیں ہوتی ہیں اس میں جو انسان کو اپنے بس میں کر لیتی ہیں۔"

"انوشہ! تجھے سمجھ نہیں آئی۔ آنے دے تیرے ابا کو تیری تو آج خوب پٹائی کرواؤں گی ان سے۔ ارے جوان بچیوں کا یوں جھکڑ میں بال کھول کر کر پھرنا، اور بگولے میں جا کر کھڑے ہوجانا اچھا نہیں ہوتا۔"

مگر آج اس کے بال بھی پورے کھلے ہوئے تھے اور وہ بگولے میں جانے کے لئے بھی بے تاب ہو رہی تھی۔ آج وہ اپنی دادی کی کہی گئی ساری باتوں کو بالائے طاق رکھ رہی تھی کیونکہ تیز چلتے جھکڑ کے اس سے بھی زیادہ تیز گھومتے بگولے میں ساکت کھڑی رباب کی مدھم سی شبیہ نظر آرہی تھی۔ جو اپنی نیلی آنکھوں کو پھیلائے اسی کی طرف تکے جارہی تھی۔

یہ وہ رباب تھی جو انوشہ کی جان سے پیاری بہن تھی۔ جو اس سے چار سال بڑی تھی۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد انوشہ نے اسے بہت پیار دیا تھا انوشہ کے بغیر رباب ایک پل نہ رہتی تھی۔ اس کی ایک ایک خوشی پر اپنی جان تک نچھاور کردینے کا ارادہ رکھتی تھی۔

ابھی بھی وہ محبت پاس نظروں سے اسے تک رہی تھی انوشہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور رباب کی کھلی بانہوں میں سمانے کے لئے بگولے میں داخل ہوگئی یہ سوچے بغیر..... کہ رباب کو مرے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔

☆......☆......☆

"آج کھانے میں شاہی قورمہ خاص اہتمام کے ساتھ پکایا جائے۔ میری فریال کو بہت پسند ہے۔" ناہید خاتون نے خانساماں کو ہدایت جاری کی۔

"امی..... فریال آپی کے لئے ریڈ والا فراک نکال کر رکھ دیا ہے وہ آکر پہن لیں گی۔ انہیں بہت پسند ہے وہ" کشمالہ کپڑوں کی الماری بند کرتے ہوئے بولی۔

"کون سا؟ وہ جس کے اوپر سلور لیس سے کام ہوا ہے؟" ناہید خاتون فریال کے کمرے میں لگائے گئے قد آدم نئے پردوں کو سیٹ کرتے ہوئے بولیں۔

"جی..... وہی والا....." کشمالہ ریڈ اور سلور زرق برق فراک سنبھالے استری کرنے کی غرض سے باہر جانے والی تھی کہ اس کی سب سے چھوٹی بہن زرتاشہ آدھمکی، جو حیرت سے ریڈ اور سلور فراک کو دیکھ رہی تھی۔

"فری آپی کے لئے یہ ڈریس مت استری کرنا، میں ابھی ان کا فون سن کر آرہی ہوں، وہ آدھے گھنٹے میں پہنچنے والی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان کا سفید جوڑا نکال کر رکھیں جو انہوں نے پچھلی گرمیوں میں سلوایا تھا۔ مگر چھٹیاں جلد ختم ہونے کے باعث وہ اسے پہن نہیں سکی تھیں اور جلد لوٹ گئی تھیں۔ زرتاشہ نے ایک سانس میں اپنی بات مکمل کی۔

"بالکل سادا جوڑا ہے وہ تو..... دعوت پر آج اتنے رشتہ دار آرہے ہیں آخر میں بچی ڈاکٹری کی پڑھائی مکمل کر کے لوٹ رہی ہے۔ وہ سادا سا سفید جورا کوئی اچھا شگون نہیں۔" ناہید خاتون فکرمندی ہوئیں۔

"جیسا کہہ رہی ہے وہ ویسا ہی کرلو ورنہ آتے ہی پھر منہ بنالے گی۔"

شاہ نواز، جو کافی دیر سے، فریال کے بیڈ کے ساتھ موجود سائیڈ لیمپ کو درست کرنے کی کوشش میں مگن تھا۔ لیمپ اچانک جلتا دیکھ کر اور اپنی کوشش کامیاب ہوتے دیکھ کر گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"چلو اس کا کمرہ ریڈی ہو چکا ہے۔ اب سب باہر چلتے ہیں اور کشمالہ تم اس کمرے کو لاک کردو فریال اپنے آنے پر خود ہی اسے کھولے گی۔" ناہید خاتون نے اختتامی ہدایات دیں۔ کمرے کے دروازے پر گولڈن رنگ کا چھوٹا سا تالا لگ چکا تھا۔

☆......☆......☆

"ٹرن..... ٹرن..... ٹرن....." فریال کے موبائل پر اولڈ بیل سنائی دی۔

"پھر گھر سے فون ہے۔ بتایا بھی ہے کہ آدھے گھنٹے میں پہنچ رہی ہوں۔" فریال نے برا سا منہ بنایا۔ ڈرائیور نے اسی پل گاڑی روک دی۔

"او کے فریال! اب میں چلتی ہوں۔ ہمارا ساتھ بہت اچھا رہا۔ اب ہم اپنی ہاؤس جابز اسٹارٹ کریں گے۔ کاش تمہارے بابا آج زندہ ہوتے تو تمہیں کامیاب و کامران دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔" عروج دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بیگز اٹھا رکھے تھے۔

"نہیں عروج! شاہ نواز بھائی نے کبھی ہمیں بابا کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ ہم تینوں بہنوں سے بڑے ہیں وہ..... پر لگتا ہے کہ امی سے بھی بڑے ہیں۔ اتنا خیال رکھتے ہیں ہمارا۔ شاید اسی لئے بابا جلدی چلے گئے۔ جانتے ہوں گے کہ ان کا بڑا بیٹا ابھی اس دنیا میں ہے۔" فریال افسردہ ہوگئی اور آس پاس پھیلی قبروں پر جا بجا چھتوں کو دیکھنے لگی۔

"اچھا جناب، اداس مت ہو۔ میں چلتی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔ اور اس ویران قبرستان سے جلدی نکلو۔ میں نے سنا ہے کہ گرمیوں کی سنسان دوپہروں میں دو بجے یہاں پر روحیں رقص کرتی ہیں۔" عروج نے ڈرامائی انداز میں منہ بنایا اور ہنستے ہوئے ایک جانب کھڑی بلیک کرولا کی طرف بڑھ گئی جو اسے ریسو کرنے

کے آئی ہوئی تھی دیکھتے ہی دیکھتے بلیک کرولا فراٹے بھرتی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ فریال یونہی کھڑی دیکھتی رہی۔

گارڈ کی آواز پر یکدم چونکی۔ ''بی بی جی چلیں......؟'' گارڈ جو کہ ڈرائیور بھی تھا۔ استفہامیہ لہجے میں بولا۔

''نہیں...... گرمی بہت ہے، حلق سوکھ رہا ہے سامنے لگے نل سے پانی پی آتی ہوں۔ گاڑی میں پڑی پانی کی بوتل تو سورج کی طرح تپ رہی ہے۔'' فریال چھوٹی بڑی قبریں پھلانگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی نل کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ پانی ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر اس نے منہ پر ڈالا اور فرحت محسوس کی پیچھے مڑ کر اس نے دور کھڑی گاڑی پر نگاہ ڈالی ڈرائیور فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا گرمیوں کی لمبی دوپہریں یوں ہی ہوتی ہیں۔ نیند بھری...... اس نے اپنے قدم مزید آگے بڑھائے۔ شہر کی رونقوں سے واپس آکر یہ ویران جگہ اسے بہت بھلی معلوم ہورہی تھی۔ جلادینے والی گرمی کا احساس اب ختم ہوچکا تھا کیونکہ اندر کا موسم ہمیشہ باہر کے موسم پر حاوی ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

دونوں بازو فضاء میں پھیلائے وہ آنکھیں بند کیے آگے بڑھے جارہی تھی۔ دفعتاً اس کا پاؤں ایک گہرے کھڈ میں جاپڑا۔ اور دھپ کی آواز کے ساتھ وہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر میں جاگری۔ برسات کی وجہ سے انتہائی کچی ہونے والی اس قبر کا منہ سارا کھلا ہوا تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے اٹھ کر باہر نکلنے کی کوشش کی۔ مگر باہر اچانک جیسے کوئی طوفان آگیا تھا۔ اردگرد موجود تمام قبروں کی مٹی اڑ اڑ کر اس پر جمع ہورہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آکر اسے بے بس کررہی تھی۔ وہ ہمت سی ہار کر قبر میں گرگئی۔ مٹی اب اسے ڈھک رہی تھی اسے کھانسی کا شدید دورہ اٹھنے لگا۔ مگر باہر مٹی کا طوفان تھا کہ تھم نہیں رہا تھا مٹی زدہ آنکھوں کے ساتھ اس نے باہر دیکھا۔ مٹی کے اس زرد طوفان میں لہراتا ایک سفید لباس، وہ کوئی بہت نازک سی لڑکی تھی جس کے سیاہ بال ہوا کے دوش پر لہراتے بہت بھیانک لگ رہے تھے۔ اور اس نازک سی لڑکی کے ارادے بہت خطرناک دکھائی دے رہے تھے وہ اپنے ہاتھوں سے مٹی اٹھا اٹھا کر اس پر پھینکے جارہی تھی۔

حیرت انگیز طور پر اس کے دونوں ہاتھوں پر مٹی بہت بڑے تودے کی صورت میں جمع ہوتی اور اس پر آگرتی۔ بالآخر......اب اس ٹوٹی پھوٹی قبر کی جگہ مٹی کا بہت بڑا ڈھیر تھا۔ جیسے ابھی کوئی تازہ قبر بنائی گئی ہو اور اس قبر میں موت فریال کی زندگی کو ہرا کر قہقہے لگا رہی تھی۔ دور کھڑی گاڑی میں اونگھتے ڈرائیور کی کلائی پر بندھی گھڑی میں ڈھائی بج چکے تھے۔

☆......☆......☆

گرم دوپہر اب شام میں ڈھل رہی تھی۔ سب کے چہرے سوال زدہ تھے۔ فریال کی آمد پر جشن کی ساری تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ اتنے میں گاڑی ان کے گیٹ کے باہر آکر رکی۔ اس میں سے حیران پریشان ڈرائیور نکلا۔ گھر میں میوزک کی تھاپ پر پاپ گانے تیز آواز میں گونج رہے تھے۔

گھر کا مین دروازہ کھلا اور چار آدمی چارپائی پر سفید چادر ڈالتے کسی وجود کو لے کر داخل ہوئے۔ سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہاں سے ہنستی بستی جانے والی فریال بے جان جسم بن کر لوٹی تھی۔

شاہ نواز واش روم سے نہا کر نکلا تھا۔ پانی اس کے جسم سے ٹپک ٹپک کر نیچے گر رہا تھا۔

''یار میوزک آف کر۔'' پاس کھڑے کزن نے میت کی چارپائی زمین پر رکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔ ابھی کوئی یہ نہ جانتا تھا کہ میت کس کی ہے۔ شاہ نواز ہکا بکا سا سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ غم کی سحرزدگی کے عالم میں اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ ابھی وہ نہا کر نکلا ہے پانی سے گیلے ہاتھوں، گیلے جسم اور چپل سے عاری گیلے پیر جو ننگے فرش پر ایستادہ تھے ایسی حالت میں وہ ایک خطرناک وولٹ کے بورڈ کو چھو نہیں سکتا تھا۔

''Tomorrow never comes'' انگریزی گانا خوب گونج رہا تھا جب عین اسی پل اس کے کزن نے ڈرائیور سے مل کر میت کے

چہرے سے سفید کپڑا ہٹایا۔

"نہیں......" ایک چیخ شاہنواز کے منہ سے نکلی۔

بے اختیار اس نے دونوں ہاتھ بورڈ پر رکھ کر گونجتے تیز میوزک کو بند کر دینا چاہا خطرناک بورڈ سے بجلی کی لال اور نیلی برقی شعاعیں نکلیں اور شاہ نواز کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ پل بھر میں شاہ نواز ماہی بے آب کی طرح زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ شاہ نواز کی حالت سے بے نیاز، چھوٹی زرتاشہ، فریال کا بے جان چہرہ دیکھنے کے بعد بھاگی ہوئی کچن میں گئی جہاں ناہید خاتون شاہی قورمہ چڑھانے کے لئے چولہے کا بٹن کھول رہی تھیں۔ لائٹر ان کے ہاتھ میں ہی تھا۔

"امی...... امی وہ فری آپی۔" زرتاشہ سے کچھ نہ بولا گیا۔

"فری آپی اور شاہ نواز بھیا اس دنیا میں نہیں رہے......" کشمالہ...... کچن کی کھلی کھڑکی سے باہر کا سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ پیاز کاٹتے اس کے ہاتھ کب کے ساکت ہو چکے تھے۔

"یہ کوئی وقت ہے ایسے مذاق کا۔" ناہید خاتون چولہے کا بٹن کھول چکی تھیں لحہ بہ لحہ تیزی سے بڑھتی گیس لائٹر کے لئے بے تاب نظر آ رہی تھی اس سے پہلے کہ وہ لائٹر جلا کر چولہے کی آگ روشن کرتیں کشمالہ نے کچن کی کھڑکی سے انہیں باہر کا منظر دکھایا جہاں پڑوس سے آئے لوگوں کا جم غفیر اکٹھا ہو چکا تھا۔ لوگ شاہ نواز کو اٹھا کر فریال کے برابر رکھی گئی چارپائی پر ڈال رہے تھے۔

"تو یہ ہے کس طرح کی جوک پلاننگ کی ہے تم سب نے، کام سے فارغ ہو لوں پھر تم سب کو سیٹ کرتی ہوں۔" اسی دوران چولہے سے نکلتی گیس پورے کچن میں پھیل چکی تھی۔

"بہت بڑا ڈرامہ کر رہے ہیں یہ دونوں۔" کشمالہ مسکراتے ہوئے دوبارہ پیاز کاٹنے لگی۔ اتفاقیہ طور پر انہوں نے شاہ نواز کو کرنٹ لگتے نہیں دیکھا تھا۔

"زرتاشہ ان دونوں کو بولو، ایسا ناٹک نہیں کرتے اور ان لوگوں کو بھی بولو جو فریال اور شاہ نواز کے ساتھ مل کر ڈرامہ بازی کر رہے ہیں۔ ہمیں سب پتہ چل چکا ہے ان کی ڈرامہ بازی فلاپ ہو چکی ہے۔" ناہید خاتون نے لائٹر آن کر لیا۔ اور چولہے کی طرف کرنے ہی لگی تھیں کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ اور پورے کچن کو آگ کے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

زرتاشہ کو باہر نکلنے کا موقع نہ مل سکا۔ اور وہ تینوں وجود آگ میں زندہ جلنے لگیں۔

دس برس بعد

شام کی ہولناکیاں بڑھ رہی تھیں قبرستان پر ہو کا عالم طاری تھا۔ مگر گاؤں کے چند لوگ مٹی کے ٹمٹاتے دیئے کچھ قبروں پر رکھ رہے تھے یہ ناہید خاتون، شاہ نواز، فریال، کشمالہ اور زرتاشہ کی قبریں تھیں۔ جن کی حادثاتی اموات کو دس برس بیت چکے تھے۔ گاؤں والے آج تک نہ بھولے تھے۔ کہ کیسے فریال کے لیٹ ہو جانے پر مٹی کے ڈھیر کی اچانک موجودگی اور تازگی نے ڈرائیور کو فریال کا پتہ بتایا تھا۔ اور پھر کیسے خوشیوں کی تیاریاں کرتا یہ دن، ان سب کے جنازے اٹھنے کا دن بنا تھا۔ گاؤں والوں کا یہ معمول تھا کہ مغرب کے فوراً بعد وہ ان پانچ افراد کی قبروں پر دیئے روشن کرتے۔

ناہید خاتون کے گھر کو بھی مقفل ہوئے دس برس بیت چکے تھے گھر میں جگہ جگہ جالے لٹکے پڑے تھے چمگادڑوں اور جنگلی کبوتروں کا بسیرا ہو چکا تھا۔ فریال کے کمرے میں جالے لٹک لٹک کر زمین تک آ رہے تھے۔

کپڑوں والی الماری کا ڈور کھلا ہوا تھا جس میں موجود زنانہ کپڑے گرد سے اٹے ہوئے بخوبی دیکھے جا سکتے تھے۔ بیڈ پر بھی مٹی کی دبیز تہہ بچھی ہوئی تھی اور اس تہہ سے جھانکتا ریڈ اور سلور لیس والا فراک ابھی بھی اپنے ہونے کا پتہ دے رہا تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا گیا سفید جوڑا جو بالکل سادہ کاٹن کا تھا اب بے تحاشا گرد اور گھونسلے کے تنکے اس پر بکھرے پڑے تھے۔ قد آدم کھڑکیوں پر دھرے گئے پردے جو کسی زمانے میں بالکل نئے ہوں گے اب بارشوں، طوفانوں اور جنگلی کبوتروں اور پرندوں کے پھیلائے گئے گند کی وجہ سے

کراہیت آمیز لگ رہے تھے اور سب سے اہم چیز تھی دیوار پر لٹکا وہ وال کلاک، ساری چیزوں کی طرح وہ بھی مٹی میں اٹا پڑا تھا۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں سے مٹی ہٹی ہوئی تھی اور بجا ہوا ٹائم واضح نظر آرہا تھا اس کمرے میں بسیرا کرنے والے پرندے کبھی کبھی اپنے پروں کو تیزی سے پھڑپھڑاتے یہاں سے وہاں جاتے تو وال کلاک پر جمی گرد ہٹ سی جاتی اور رکا ہوا ٹائم مزید نظر آنے لگا۔ وال کلاک پر ڈھائی بج رہے تھے۔

☆......☆......☆

''ہائے بے چاری بچی...... بہن کے سوئم کی شام کو ہی چل بسی۔'' محلے کی عورتیں انوشہ کی میت کے ارد گرد بیٹھی بین کر رہی تھیں۔

''ویسے مرنے والے گھر میں جوان لڑکی کو یوں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہئے تھا۔'' ایک عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے ساتھ بیٹھی عورت سے کہا۔

''نہ جانے کیا ہوا بے چاری کے ساتھ رات کو......'' پیچھے بیٹھی خاتون گردن آگے کر کے بولی۔

''سنا ہے، فجر کے ٹائم لوگ نماز کے لئے گھروں سے نکلے تو گلی میں انوشہ کی بے جان لاش پڑی تھی۔'' ایک اور عورت درمیان میں بولی۔

قبر اور آخرت کے خوف سے بے نیاز خواتین آپس میں یونہی باتیں کئے جارہی تھیں جیسے وہ تو ہمیشہ کے لئے اس دنیا میں آئی ہیں کچھ دیر بعد جنازہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔ انوشہ کو اپنی بہن رباب کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔

انوشہ کے گھر افسوس کے لئے آنے والی خواتین اب ایک ایک کر کے جارہی تھیں۔ سب کے تاثرات الگ الگ تھے انہی خواتین میں موجود ایک سترہ سالہ لڑکی بھی تھی جس نے سیاہ عبایا پہن رکھا تھا۔ گھر سے باہر نکلتے وقت، کالے نقاب میں سے جھانکتی نیلی آنکھوں میں عجیب سا تفاخر تھا۔

وہ تمام خواتین جان بھی نہ سکیں کہ ان کے درمیان ایک غیر مرئی وجود تھا جو انوشہ کے گھر سے نکل کر ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ سیاہ عبایا والی اس پراسرار لڑکی پر کسی نے بھی شک نہیں کیا تھا۔

☆......☆......☆

انوشہ، رباب، فریال، ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ مرنے کے بعد ان کی قبریں بھی اتفاقیہ طور پر آس پاس ہی بنی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان قبروں کے بیچ ایک قبر، ایسی لڑکی کی ہے جس کا نام کتبے پر درج تھا۔

ڈاکٹر عنایہ ستائش

سال پیدائش 1970ء

سال وفات 1997ء

وقت وفات 2:30

ایک ایسی لڑکی، جس نے محض اس بات پر اپنے دونوں ہاتھوں کی کلائیاں کاٹ کر جان دے دی کہ اس کے ایم بی بی ایس فائنل ائیر کے نوٹس جسے اس نے ساڑھے چار سال کی محنت سے بنایا تھا اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے اس کی کلاس فیلو نے چرالئے تھے۔ تاکہ اسے خود نہ بنانے پڑے۔ اور اس کی بات کا کسی نے یقین نہیں کیا تھا۔ مجبوراً گرمیوں کی سنسناتی دوپہر ڈھائی بجے اس نے اپنی جان دے دی۔

جمعرات کا روز تھا۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگ معمول کے مطابق فریال، کشمالہ، ناہید خاتون اور شاہ نواز کی قبروں پر دیئے جلا کر جاچکے تھے۔ ان دیوں کی لو دیتی روشنی شام کی تاریکی میں آس پاس کی قبروں پر بھی پڑ رہی تھی۔ جس سے ان پر لگے کتبے نمایاں ہو رہے تھے۔

گاؤں کے لوگ بہت سادہ لوح ہوتے ہیں۔ آج تک یہ بات سمجھ نہ پائے تھے کہ فریال، رباب، انوشہ، کشمالہ، زرتاشہ، شاہ نواز اور ناہید خاتون کا وقت وفات ڈھائی بجے ہی کیوں تھا؟

''کیا ایسا اتفاق بھی ممکن ہے......؟''

عشق ناگن

ایم الیاس

قسط نمبر: 23

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کھلنے میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

ان خیالات اور احساسات سے اس کے سارے بدن میں سنسنی بجلی کی رو کی طرح بن کر رہ گئی۔ اس نے پھر سوچا کہ کیوں نہ دوڑ لگادوں؟ لیکن اس نے پھر اپنے آپ کو طعنہ دیا بزدلی اور نامردی کا...... وہ کیسا مرد ہے؟ پھر اس کے دل کے کسی کونے میں تجسس کی لہر آئی...... نادیدہ ہستی نے اس کے دل میں کسی کونے میں سرگوشی کی۔ اس لڑکی نے شاید تمہیں دیکھ لیا ہے؟ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو کہاں جاؤ گے بھاگ کر...... اگر یہ لڑکی جو چڑیل کے بہروپ میں ہے تمہیں دبوچ لے گی...... پھر وہ چڑیل کے روپ میں نمودار ہو کر تمہارا خون مزے لے لے کر پی جائے گی۔ چڑیلوں کو جانداروں میں صرف انسانوں کا خون بہت مزے کا اور ذائقہ دار ہوتا ہے...... تم نے چڑیل نہیں دیکھی ہے نا......؟ اس کے بارے میں سن رکھا ہے کہ اس کی بہت بڑی بڑی، خوف ناک اور شعلہ باز آنکھیں ہوتی ہیں۔ کرکٹ کی گیند سے کہیں بڑی...... لال لال جس میں خون دہکتا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی پیشانی پر دو آنکھیں ہوتی ہیں...... اس کی ناک کے نتھنے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ وہ لمبی سانس لے تو چڑیا، کبوتر اندر چلا جائے...... اور پھر اس کے منہ کا دہانہ بہت بڑا ہوتا ہے...... جس میں اوپر بیس اور نیچے بیس دانت ہوتے ہیں...... بہت لمبے اور خوفناک اور کسی خنجر کی طرح...... ان کی دھار اس قدر تیز، مہلک اور خطرناک ہوتی ہے کہ کسی تلوار، خنجر اور چاقو کی بھی نہیں ہوتی ہوگی...... دانت نوکیلے اور لمبے ہوتے ہیں۔ وہ لمحوں میں آدمی یا کسی بھی جان دار کا خون پی جاتی ہیں۔ ہونٹ بھی بہت موٹے، بھدے اور مکروہ ہوتے ہیں...... ان کے ہاتھ پیر نہ صرف الٹے بلکہ ان کی جسامت اور لمبائی ایک ایک فٹ سے کم نہ ہوگی۔ اس کی رنگت کوئلے سے کہیں کالی ہوتی ہے...... اس کی جلد دیکھ کر بڑی نفرت اور حقارت ہوتی ہے۔ جب وہ کسی آدمی کا خون پینے پر آتی ہے تو انتہائی حسین، نوجوان لڑکی کا بہروپ بھر لیتی ہے تاکہ آدمی اس پر ریشہ خطمی ہو کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ پھر وہ اس کی گرفت میں کسی پرندے کی طرح اس طرح کس جاتا ہے جیسے شکنجے میں جکڑ لیا گیا ہو۔ ان خیالات نے اسے بے جان سا کر دیا تھا۔

اس نے ان تمام دہشت انگیز خیالات کو اس طرح جھٹک دیا جیسے وہ کھن کھجورا ہیں۔ پھر دوسرا خیال یہ آیا کہ ہراساں ہونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسے حالات کا...... مقابلہ کرنا ہوگا۔ پھر تجسس نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ پھر اس نے گرد و پیش کا جائزہ

لیا۔ پھر سوچا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی نے اس لڑکی کو کسی آبادی سے اغوا کرکے اس دور افتادہ جزیرے پر لاکر اس لئے قید کیا ہوگا کہ سکون واطمینان سے جب تک اس کا دل نہ بھر جائے دل بہلاتا رہے۔ وہ اس وقت اس لئے دکھائی نہیں دے رہا ہوگا کہ شاید کسی کام سے جزیرے سے باہر گیا ہوا ہوگا۔ اس لڑکی کو قیدی بنا کے رکھا ہوگا...... لڑکی یہاں سے اس لئے فرار ہوکر نہیں جاسکتی کہ کنارے کوئی کشتی وغیرہ نہیں ہے...... تیر کے جانے سے رہی۔ وہ شاید کسی بھی لمحے آتا ہوگا۔ وہ یقیناً مسئلہ ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے دیکھ کر اس کی جان لینے کی کوشش کرے...... اس نے اپنی حفاظت اور لڑکی کو یرغمال بنا کے رکھنے کے لئے اسٹین گن، بندوق یا ریوالور رکھا ہوا ہوگا۔ اگر اسے اس شخص کے پاس اسلحہ ہوا تو وہ سراسیمہ نہ ہو بلکہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کرے اور اس کی نظروں میں نہ آئے۔

سورج مغرب کی وادی میں ڈوبنے لگا۔ کسی بھی افتاد سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ یہ جگہ چھوڑ دے اور کسی ایسی جگہ چھپ کے کھڑا ہوجائے کہ اس کی اس پر نظر نہ پڑسکے لیکن اس بدمعاش کو دیکھ سکے۔ وہ اپنے آپ کو چھپاتا ہوا اس مکان کے عقب کی جانب سرعت سے لپک گیا۔ یہ دیکھ کر اسے ایک طرح سے اطمینان ہوا کہ یہاں کوئی شخص موجود نہیں تھا نہ اس بات کا خوف و خدشہ تھا کہ کوئی آدمی ادھر آسکتا ہے۔ پھر وہ حوصلہ کرکے مکان کے عقبی حصے کی طرف آیا۔ گوکہ اس کا سینے میں دل دھڑک رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس خیال سے وہ لڑکی کی طرف بڑھا کہ وہ کوئی بھی ہو اس کی بلا سے......

اس لڑکی نے آہٹ سن کر سر اٹھایا تو ان دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔

آکاش کو جو خیال سب سے پہلے آیا وہ یہ تھا کہ یہ لڑکی اک دم سے چڑیل بن کر اسے دبوچ لے گی...... لیکن ایسا نہ ہوا۔ لڑکی نے کوئی ردعمل نہیں کیا تو وہ یہ سمجھ گیا کہ یہ لڑکی کے روپ میں چڑیل نہیں ہے۔

دوسرا اس کا یہ خیال تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی اچھل پڑے گی...... لیکن تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ اسے دیکھ کر نہ تو چونکی اور نہ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ نظر آیا۔ اس نے اس طرح سے دیکھا جیسے کسی عام گزرنے والے کو دیکھا جاتا ہے...... البتہ اس کے حسین اور پرتقدس چہرے کی دلکشی لمحے کے لئے متاثر ہوئی۔

گو وہ کسی نہ کسی طرح حوصلہ کرکے اس واہمہ کے سامنے آتو گیا تھا لیکن اس کے دل کے دھڑکنے کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ اس پر قابو دشوار ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ حسین آتما ایک انسان کو دیکھ کر دھواں ہوجائے گی اور شام کے دھندلکے کی آغوش میں سما جائے گی اور وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ جائے گا۔

لیکن آتما فضا اور دھندلکے میں تحلیل نہ ہوئی تو یہ بات ناقابل فہم تھی۔

ادھر اس کی حالت بڑی دگرگوں ہوئی جارہی تھی کہ وہ نجانے کیا کر بیٹھے......؟ اسے پچھتاوا سا ہوا کہ وہ کیوں اور کس لئے اس کے سامنے آیا...... لڑکی کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں نے حرکت کی...... اس نے شاید کچھ کہا تھا۔ لیکن ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑا۔ اس نے سوچا...... کہیں وہ منتر تو نہیں پڑھ رہی اس پر جادو کرنے کے لئے......

لڑکی یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی طرف دھیرے سے بڑھی۔ قریب آکر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

''تم نے مجھے پہچانا میری جان......!''

''کون ہو تم......؟'' آکاش نے حیرت سے پوچھا۔ ''میں نے تمہیں نہیں پہچانا؟''

''میں تمہاری محبت ہوں......'' اس نے اور قریب آکر جواب دیا۔

''میری محبت......؟'' آکاش نے کہا۔ ''مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا...... پہلی بار دیکھ رہا ہوں...... لہٰذا تم میری محبت کیسے ہوسکتی ہو......؟''

''تم نہ صرف مجھے بلکہ بچپن میں بھول گئے......''

وہ دل کش انداز سے مسکرائی۔

"تم اتنی خوب صورت ہو کہ پھر بھی یاد نہیں میرا بچپن تمہارے ساتھ کیسے گزرا......؟"

"ہم دونوں اس جزیرے میں جب آبادی تھی ایک گلی میں سنگ سنگ رہتے تھے...... ساتھ کھیلتے تھے...... بچپن بھی کیسا سنہرا دور ہوتا ہے...... ہم اس معصومیت کے دور کے ساتھی ہیں...... تم چوں کہ مرد ہو......اس لئے مجھے بھلادیا......میں چوں کہ عورت ہوں اس لئے بھول نہ سکی......دس برس پہلے کی بات ہے...... جب یہاں طاعون پھیلا تم اپنے گھر والوں کے ساتھ چلے گئے...... میں دس برس سے ہر روز تمہاری راہ دیکھتی آرہی ہوں کہ تم آج آؤ گے...... آخر تم آج آہی گئے...... جیسے صدیوں کربناک اذیت سے وقت گزارا ہے انتظار میں......"

پرکاش کو ماضی یاد آنے لگا......"تم......تم سنگیت ہو......!"

"ہاں...... میں سنگیت ہوں......" وہ سرشاری سے بولی۔

آکاش نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کرلیا پھر دونوں محبت سے ایسے سرشار اور جذباتی ہوگئے کہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگئے۔ محبت اور جذبات کی رو میں بہتے گئے۔

آکاش اپنا دوسرا جنم طلسمی گولے میں دیکھتا رہا۔ ایک پیار بھرا جیون تھا جو صدیوں پر محیط ہوگیا تھا۔

ہمارا جیون اور ماضی کتنا حسین اور یادگار تھا؟ پرکاش نے ایک گہرا سانس لیا۔"لیکن اب یہ جنم کیسا ہے!"

"میرے من کے دیوتا......!" سنگیت نے کوئی منتر پڑھ کر پھونکا تو ماضی یک لخت غائب ہوگیا اور طلسمی گولے میں اندھیرا چھا گیا۔وہ اس کا ہاتھ بڑے جذباتی انداز سے تھام کے چند ثانیوں کے بعد بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور سکوت درہم برہم ہوگیا۔"اب ماضی کو بھول جاؤ......یہ سمجھ لو کہ تمہارا دوسرا جنم اور اب جو گزرا ہے وہ ایک سپنا تھا۔ کالی راج دھانی میں جو ناگ بھون ہے ہماری دنیا کا ایک ڈراؤنا راز ہے...... اس کا نام سنتے ہی لوگ نہ صرف تھر تھر کانپنے لگتے ہیں بلکہ خوف و دہشت سے مر بھی جاتے ہیں...... اور تم بھی پراسرار قوتوں پر غالب آنے کے باوجود ناگ بھون کی نحوست سے نہ بچ سکے...... آکاش جی......! بھول جاؤ کہ تم نیلم کے سر کے تاج اور اس کی بے پایاں ایسی محبت ہو جس میں نہ تو کوئی تصنع ہے اور نہ ہی کھوٹ ہے اور پھر اب تم ایک لڑکے کے باپ ہو...... تمہاری کہانی میلا پور کی ویران حویلی کے جلے ہوئے ملبے اور سون مندر کے بے رحم درودیوار میں ہمیشہ کے لئے دفن ہوچکی ہے۔"

سنگیت کی آواز جذبات کی شدت سے کانپنے لگی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا طلاطم ہچکولے کھانے لگا اور وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ان آنکھوں کی زبان نے بہت کچھ کہا اور کہنا چاہ رہی تھی۔

"میں کیا دنیا کی کوئی لڑکی عورت اور امرتا رانی بھی نیلم کا خلا پورا نہیں کرسکتی......مگر زندگی رہی تو تم دیکھ لوگے کہ...... سنگیت کا خون گندا ہونے کے باوجود وفادار ہے......تمہارے چرنوں کی میں دھول بنی ہوں گی۔اس لئے کہ میں نے اپنی زندگی میں تم سے پہلا پیار کیا ہے...... پہلا پیار کیا ہوتا ہے عورت کا......تو صرف یہ عورت جانتی ہے...... مرد نہیں...... پہلا پیار امر ہوتا ہے......"

سنگیت یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نیلم سے کیسی محبت کرتا ہے اور اس خیال سے بھی افسردہ ہے کہ وہ نیلم کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ خلا پر کرسکتی ہے...... پھر بھی اس کی والہانہ محبت کیسی افسردگی ہوتے ہوئے بھی کتنی شدت اور گرم جوش ہے۔ایسی وارفتگی کہ اس کا دل ڈوبنے لگا...... آخر عورت جب کسی کو چاہنے پر آتی ہے تو وہ محبت میں اس قدر ڈوب کیوں جاتی ہے......؟ نیلم اس کی زندگی میں نہ ہوتی تو کیا وہ سنگیت کو اپنالیتا؟

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تو وہ اپنے ہونٹوں پر سنگیت کے لبوں کا لمس محسوس کیا۔

"میرے دیوتا......!اس میں نہ تو ہوس ہے اور نہ

ہی تمہیں محبت اور جذبات سے تمہارا دل جینا جیتنا چاہتی ہوں...... میری محبت نے مجھے مجبور کردیا کہ اپنے محبوب کو چوم لوں...... یہ ایک پاکیزہ بوسہ ہے...... اس میں میل نہیں ہے۔ صرف اور صرف محبت...... محبت کا اظہار پاپ تو نہیں ہوتا...... نہیں ہوتا نا؟"

آکاش نے ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کرلیں......

اس کے دل میں بھرا ہوا غبار پھٹ کے باہر نکلنے کے لئے کسی آتش فشاں کے لاوا کی طرح بے چین تھا۔

آنکھوں میں تھمے ہوئے آنسو بہہ نکلنے کے لئے اپناز ور صرف کررہے تھے...... اس کی حالت قابل رحم اور تشویش انگیز تھی...... اس کا پورا بدن تشنج کے عالم میں کانپا اور پھر وہ ایک بار بے ہوشی کے دلدل میں ڈوب گیا۔ اس مرتبہ اس کی بے ہوشی خیال اور اندازے سے کہیں زیادہ طویل ثابت ہوئی تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایسے بستر پر پایا جس میں ریشم کا سا گداز تھا اور سارا وجود ایک عجیب سی راحت محسوس کررہا تھا۔ سنگیت اس کے سرہانے سے لگی بیٹھی تھی۔ اس پر جھکی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسے ہوش میں لانے کے لئے جانے کیا کرتی رہی ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کی ناتوانی پریشان کن بھی تھی۔ اس کے سر پر چھت کا سایہ بھی موجود تھا۔ سنگیت کی سوجی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ پلک جھپکائے بغیر اس کے ہوش میں آنے کا اذیت سے انتظار کررہی تھی۔

"میں کہاں ہوں سنگیت......؟" اس نے نقاہت آلود لہجے میں اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟"

"سرن گڑھ......" اس نے بوجھل آواز میں جواب دیا۔ وہ ابھی بھی افسردہ سی تھی۔

وہ سمجھ گیا کہ سنگیت اسے اپنی پراسرار قوتوں کے سہارے اسے اس پناہ گاہ میں لائی ہے تاکہ اس کی خستہ حالی اور حد سے بڑھی ہوئی نقاہت کا علاج کرسکے۔ وہ اپنے کیے ہوئے عہد کو پورا کرنے کا عزم رکھتی تھی۔

"امرتارانی کی کوئی خیر خبر بھی ہے......!" آکاش نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے موہوم سی امید پر سوال کیا۔

"اسے بھول جاؤ میری جان!" وہ وحشت زدہ انداز میں آنکھیں پھاڑ کر ہذیانی لہجے میں چیخ پڑی۔ "سون مندر میں جانے شیوناگ کے دشمنوں نے آج تک کھلا آسمان نہیں دیکھا ہے۔ تمہارے تو ستارے ہی اچھے تھے کہ اس نے تمہیں خود باہر پھکوادیا...... آج تک کسی کے ساتھ ایسا رحم دلی کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ مجھے کسی طرح یقین نہیں آرہا ہے۔ اس نے شاید اس لئے ایسا کیا ہوگا کہ تم نے اپنی زندگی میں جو بھلائیاں کی ہیں اس نیکی اور بھلائی کی طاقت نے اسے باز رکھا۔"

آکاش نے سوچا کہ خاموشی ہی میں اس کی عافیت ہے۔ وہ سوالات کرکے کریدنے سے کچھ حاصل نہیں کرپاتا...... لیکن ایسے اس کا دل اندر ہی اندر ڈانواڈول ہورہا تھا...... وہ اس وقت انتقام اور مصائب کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا۔ فرار کی صورت تھی اور نہ ہی کوئی راہ...... اس بحر بیکراں میں صرف سنگیت کی ذات ایک ایسی ہستی تھی جو اس کے وجود اور زندگی کا واحد سہارا تھی...... گو کہ وہ بھی کچھ پراسرار قوتوں کی مالک تھی۔

لیکن اس کا سب سے بڑا دشمن شیوناگ موذی اس پر ہر طرح سے بھاری تھا جو اسے سسکا سسکا کر مارنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ اسی لئے اسے سون مندر سے ایک ویرانے میں پھکوادیا تھا کہ وہاں اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا۔ اب اس کے لئے سنگیت سہارا تھی لیکن یہ بھی یقین تھا کہ شیوناگ کے ہاتھ بہت دراز ہیں۔ وہ جب چاہے اس کی گردن دبوچ سکتا تھا۔ کیوں کہ امرتارانی کے بے بس ہوجانے اور ہاتھ سے منکہ نکل جانے کے بعد اس موذی عفریت سے روئے زمین پر کہیں بھی نجات ممکن نہیں تھی۔ دنیا میں ایسا کوئی خطہ نہیں تھا کہ وہ روپوش ہوکر اس سے محفوظ ہوسکے۔

"تمہیں نہ صرف مکمل آرام بلکہ بہترین مقوی غذاؤں کی ضرورت ہے۔" سنگیت نے اس کے بالوں کو بڑے پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی ذات کے

سوا ہر چیز کو بھول جاؤ۔ زندگی سے بڑھ کر انسانوں کے لئے کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔"

آکاش نے سوچا...... وہ اس کے دل میں جھانکنے پر دسترس رکھتی...... کاش! وہ جان سکتی کہ محبت کیا شے ہے اور وہ نیلم کی خاطر اپنی جان تک قربان کردینے کا جذبہ رکھتا ہے...... مگر وہ اس امر پر دسترس نہیں رکھی تھی اور وہ اس کی بات کاٹ کاٹ کر اس کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ صحیح معنوں میں وہ اس کے لئے دکھی تھی۔ پر خلوص اور ہمدرد تھی...... درد آشنا بھی تھی...... سب سے بڑھ کر اس کی محبت کا اثاثہ تھی۔

"میری جان ......! تمہیں بھی تو آرام کی سخت ضرورت ہے۔" آکاش نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر تمہیں کچھ ہوا تو میرے گھاؤ اور زخم اور گہرے ہوجائیں گے...... مجھے ہر لحہ تمہاری مدد کی، محبت اور قرب کی ضرورت ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے من مندر کے دیوتا......!" سنگیت نے دراز ہوکر اس کے سینے پر اپنا سر رکھدیا۔

پھر وہ اس کے چہرے پر جھکنے لگی تھی کہ عین اس وقت چوبی دروازے پر دستک ہوئی۔ سنگیت کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح اچھل کر کھڑی ہوگئی اس کی روح آلود نگاہیں وحشت سے کشادہ ہوگئی تھیں۔

آکاش کی نبضیں بھی یک بیک ڈوبنے لگیں۔ شاید شیوناگ کو اس کی حالت کے قدرے سنبھل جانے کی بھنک مل گئی ہوگی اور وہ ایک بار پھر اس کی جان کا آزار بننے اور اسے سکا سکا کر مارنا چاہتا ہے۔ اس لئے یہ موذی آپہنچا ہے۔

اس کی اور سنگیت کی نگاہیں چار ہوئیں۔ دروازے پر دستک اور تیز ہوگئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دروازہ کھولنے میں پل بھر کی تاخیر ہوئی تو آنے والا دروازہ بے دریغ توڑ کر اندر گھس آئے گا۔

دروازہ کھلتے ہی اس کی نگاہ سادھو مہاراج کے پر تقدس چہرے پر پڑی۔ ان کے باریش چہرے پر جو وقار، رعب اور تمکنت تھی اس کا امتزاج ایسا ثبت تھا کہ وہ ان سے نگاہیں چار نہ کرسکا اور مجرموں کی طرح سر جھکا کے اپنی جگہ پر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ وہ باوجود کوشش کے انہیں نمسکار نہ کرسکا۔

ادھر سنگیت...... شیوناگ سے ٹکراؤ کی توقع لے کر دروازہ کھولنے لگی تھی۔ خلاف توقع سادھو مہاراج کی رعب دار سحر انگیز شخصیت سامنے آئی تو وہ بے اختیار کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ نمسکار کر کے انہیں اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔

"آکاش......!" سادھو مہاراج کی دھیمی مگر پر ہیبت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"شیوناگ کی ظالمانہ اور اذیت ناک ایذا رسانی کی سزاؤں کے باعث اس وقت اس کی جسمانی حالت بہت زیادہ ابتر تھی۔ اس کے لئے ہلنا جلنا تک محال تھا...... لیکن سادھو مہاراج پر نگاہ پڑتے ہی وہ بے اختیار بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا...... یوں ہی انہوں نے اس کا نام پکارا اسے احساس ہوا کہ اس کی پنڈلیاں کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح اس کے بدن کے بوجھ سے کانپ رہی ہیں۔ اس نے مجرمانہ احساس کے ساتھ اپنی نظریں اوپر اٹھائیں تو سادھو مہاراج اسے ملامت بھری نظروں سے گھورنے لگے۔

"ایشور کو بھول کر جھوٹی رنگینیوں اور کھوکھلی قوت پر ناز کرنے والوں میں آخر کار ذلت ہی آتی ہے۔" وہ اپنی جگہ دہلیز پر کھڑے کھڑے کہہ رہے تھے۔ "میں نے تجھے سمجھایا تھا کہ عیاشیوں سے اپنا دامن آلودہ کئے بغیر اگر ناگ بھون سے اپنی معصوم بیوی کی رہائی کے منصوبے پر کام کرے تو تجھے اپنا راستہ صاف ملے گا لیکن تو موذی کیڑوں کے بہروپ کے سامنے اپنے نفس کی نرک خواہشوں پر قابو نہ پاسکا...... تیرا ہر لحہ ذہنی اور جسمانی آلودگیوں میں گزرا ہے۔ اور اسی لئے تو اس عبرتناک حال کو پہنچا ہے۔"

آکاش کے دل پر رقت طاری ہونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے چمکیلی دھند کی نیم جان پنڈلیوں کی

کپکی اتنی بڑھ گئی کہ وہ بے اختیار کسی کٹے درخت کی طرح بستر پر گر گیا۔

"بیٹی......! کیا میں اندر آ جاؤں......؟"

سادھو مہاراج کی نرم، میٹھی آواز آکاش کے کانوں میں گونجی تو آکاش حیران رہ گیا۔ اتنا بڑا سنیاسی کس قدر با اخلاق ہے جو سنگیت سے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہے تھے۔

وہ سادھو مہاراج کے چہرے مہرے اور رعب و دبدبہ سے پہلے ہی مرعوب ہو چکی تھی۔ ان کی شفقتیانہ آواز سنتے ہی حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے اپنی سماعت پر فتور کا سا احساس ہوا۔ اس لڑکی کے لئے گفتگو کا یہ مہذبانہ اور شائستہ انداز اجنبی تھا۔ کتنی عزت اور محبت تھی اس لہجے میں......

بیٹی کے تخاطب نے اسے جیسے بن مول خرید لیا...... وہ پھر اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکی اور پھوٹ پھوٹ کر کسی شیر خوار بچے کی طرح رونے لگی۔

"میں بڑی میلی کچیلی اور غلاظت سے بھری ہوئی ہوں بابا......! میں بازاری ہوں...... میں نے اپنی ماں کے پاپ کے کارن جنم لیا...... آپ بڑے مہا سادھو مہاراج ہیں...... میں ایسی پوتر نہیں ہوں کہ آپ مجھے بیٹی نہ کہیں...... آپ میرا خوب صورت شریر دیکھ کر آپ یہ نہ سمجھیں کہ......" وہ بری طرح روتی اور چیختی ہوئی سادھو مہاراج کی طرف لپکی اور ان کے سامنے پہنچ کر دیوانگی کے عالم میں اپنے کپڑے نوچنے لگی۔

سادھو مہاراج نے چند ساعتوں تک اسے یک ٹک دیکھا۔ پھر دوسرے لمحے سنگیت کے چہرے پر جو زناٹے کا تھپڑ پڑا اس کی ایک زوردار گونج نے فضا کو دہلا سا دیا۔

"ہوش میں رہو نادان لڑکی!" وہ گرج کر بولے۔

"بے حیائی میرے نزدیک ناقابل برداشت ہے۔ تو کیوں اپنے آپ کو اور تقیہ انہ اور حیوان کی طرح بنا رہی ہے...... کیا تو نہیں جانتی؟ مجھے پہچانا نہیں کہ میں کون ہوں......؟ کیا ہوں......؟ کیا تجھے حیوان کی حالت میں دیکھ کر میں بہک جاؤں گا؟"

سنگیت کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ...... "نہ میرے بابا...... میرے سادھو مہاراج......! گرو مہاراج......" کہتی ہوئی دہلیز پر ان کے قدموں سے دیوانہ وار لپٹ گئی۔ اس کے ہونٹ اور آنسو ان کے چرنوں کو بھگونے لگے۔

اپنے چرنوں پر سنگیت کی پیشانی، ہونٹ اور آنسوؤں کو محسوس کرتے ہی سادھو مہاراج کانپ اٹھے۔

پھر انہوں نے جھک کر اس کے دونوں کندھے تھام کے اسے اٹھایا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"اس سنسار میں جو لڑکی بھی جنم لیتی ہے وہ بیٹی اور بہن ہوتی ہے...... ایک پوتر ہستی...... لیکن ہوس کے پجاری اسے پاپ کی دلدل میں غرق کر دیتے ہیں مجھے خوشی ہے کہ تیرے اندر ایک پوتر عورت موجود ہے...... اور تیری آنکھوں میں وہ شرم و حیا باقی ہے جو عورت کا زیور اور تقدس ہوتا ہے...... جس کی آنکھوں میں اس کی رمق بھی موجود ہو تو ایک دن سچائی کو پا لیتی ہے۔ جس سے عورت ایک مہان ہستی بن جاتی ہے۔"

لیکن سنگیت تھی کہ روئے جا رہی تھی...... آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور بھیگی آنکھیں ان کے چہرے پر اس طرح جم گئی تھیں جیسے پتھرا گئی ہوں۔ چند ساعتوں کے بعد اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"میں نے چوں کہ تجھے بیٹی کہا ہے تو اب میں تیری چوکھٹ پر قدم رکھ سکتا ہوں۔" سادھو مہاراج اسے سہارا دے کر بستر کی جانب لے جاتے ہوئے بولے۔

"آج تو دل بھر کے رو لے تا کہ تیرے ضمیر کا بوجھ آنسوؤں میں بہہ جائے...... تو اندھیروں میں رہ کر بھی روشنی سے محبت کر رہی ہے...... ایشور کی سوگند تو معصوم اور بے گناہ ہے۔"

انہوں نے اسے بستر پر لٹا کے اس کے پھٹے ہوئے لباس پر چادر ڈال دی جس میں سے اس کا بدن جھانک رہا تھا۔

پنڈتوں اور پجاریوں نے بھی کبھی مجھے بیٹی نہیں کہا

تھا بابا......!" سنگیت کے سینے میں خلش جو ماضی کے خنجر کی طرح پیوست تھی۔ اسے جیسے نکالنے کے لئے اپنے کرب کو ظاہر کررہی تھی۔ "میری آتما بڑی زخمی ہے...... کیا بتاؤں...... میری زندگی میں جو آئے وہ سب بھیڑیے تھے......ان کے چنگل میں آئی ہوئی لڑکی...... بس صرف اور صرف لڑکی ہوتی ہے...... وہ تو کسی کو بہن بیٹی نہیں سمجھتے...... آپ پہلے مرد ہیں اور کیسے رشی ہو کہ میرے بدن کی تعریف نہیں کرتے...... مجھے اپنا اور اپنے دھرم کا پجاری بنالو......

آپ نے میرے من میں ایک ایسی پاکیزہ اور اچھوتی آگ بھڑکادی جس کا میرے وہم وگمان میں بھی تصور نہیں تھا......"

سادھو مہاراج کی زبان سے نکلے ہوئے ایک پاکیزہ اور اچھوتے لفظ نے سنگیت کے وجود میں طوفان جگادیا تھا...... وہ سنگیت جو لذتوں اور گناہوں کے سوا کسی نیک جذبے سے شناسا تک نہ تھی کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپ تڑپ کر روئے جارہی تھی۔ اس وقت اس کی حالت کسی ایسے اندھے کی طرح تھی جس نے کبھی روشنی نہ دیکھی ہو لیکن پھر بھی اپنے پرہول عظمت کدے کی فضا میں ہاتھ لہرا لہرا کے ٹھوکریں کھانے کے باوجود روشنی کی ایک اجنبی کرن کو تھام لینے کی کوشش کررہا ہو۔

آکاش جو بڑی خاموشی سے یہ سب دیکھ اور سن رہا تھا اس انقلاب پر دم بخود تھا۔

اس سمے تو وہ اپنی حالت کو بھی بھول چکا تھا بلکہ اسے اپنے وجود پر ندامت سی ہورہی تھی اور خود کو اپنی نظروں میں گرا ہوا محسوس کررہا تھا اور وہ سادھو مہاراج سے نظریں چرائے بستر پر بے حس وحرکت سا پڑا ہوا تھا۔

وہ اور سادھو مہاراج ایک ہی دھرم سے تھے اور اعلیٰ ذات کے تھے اور سنگیت نہ صرف نچلی ذات کی تھی بلکہ بیسیرن کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنی محبت، والہانہ پن اور وارفتگی اور خود سپردگی...... اپنی خوب صورتی، وجاہت اور سحر انگیز شخصیت سے نیلم کا خلا پر کرنے اور اپنا غم وصدمہ دور کرنے کی غرض سے سنگیت کو اپنا مہرہ بنایا ہوا تھا۔ وہ اس سے بچی محبت کرتی تھی اور اس پر بڑی مہربان تھی اور بڑی فیاضی سے نچھاور ہوتی چلی آرہی تھی اور اس کے لئے کسی بھی قربانی اور بھینٹ سے دریغ نہیں کرتی تھی۔

ادھر سادھو مہاراج سنگیت کی یہ کیفیت دیکھ کر انہوں نے مٹی کے کٹورے میں سے پانی پلایا اور اس کے سر پر ایک باپ کی سی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دلاسا دیا تو وہ پھر جذباتی ہو کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"بابا......! میں تو بن باپ کے پیدا ہوئی تھی مگر آج یوں لگ رہا ہے جیسے میں بن دھرم بھی ہوں...... جس دھرم کے رکھوالے اتنے گھناؤنے ہوں کہ پجاریوں کی سیج سے ہر رات جسموں کی خوشبو چرالیتے ہیں کیا یہ دھرم ان کا ہوسکتا ہے...... میں نے سنا ہے کہ دھرم تو انسان کو بہت کچھ سکھاتا ہے...... میں آج اور ابھی سے ہی آپ میں سے ہوں...... آپ نہ صرف میری ماتا بلکہ میرے بابا بھی ہیں...... کیا میں آپ کی بیٹی ہوسکتی ہوں۔"

چند ثانیوں تک گہرے گہرے سانس لینے کے بعد سنگیت نے غم واندوہ سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور بے اختیار سادھو مہاراج کے گلے سے لگ گئی۔ اس کے سارے جسم میں ایک راحت سی جنم لینے لگی۔ ان کے سینے میں جو راحت بسی ہوئی تھی اس کا لمس اس کی آتما کو سرشار کرنے لگا۔

"جو روشنی کی جستجو کرتے ہیں...... روشنی خود ان کا تعاقب کرتی ہے بیٹی......! ندامت کے آنسوؤں نے تیرے سارے داغ دھودیئے ہیں...... آج سے تو بھی پوتر انسانوں میں سے ایک ہے۔" سادھو مہاراج نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا اور پھر اس سے اشلوک پڑھوائے جن کی گواہی کائنات کا ہر ذرہ دے رہا تھا۔

سنگیت نے دل کی تمام اتھاہ گہرائیوں سے ایشور کی عظمت اور اس کے وجود کا اعتراف کیا تو سادھو مہاراج نے اسے بتایا کہ وہ سچائی کی اصل راہ پاچکی ہے تو فرط مسرت سے یک بارگی اس کا بدن کانپا اور اس نے سادھو مہاراج کی پروقار پیشانی اپنے ہونٹوں سے

عقیدت اور محبت کے جذبے سے چوم لیا اور پھر ساکت سی رہ گئی۔ پھر فرش پر گر گئی۔

سادھو مہاراج نے چند ثانیوں کے بعد اسے پکارا لیکن جواب ندارد...... اس کا بازو ہلایا۔ لیکن وہ کسی بے جان پتلے کی طرح زمین پر بے ترتیبی سے بکھری پڑی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھیں وجد کے عالم میں مندی ہوئی تھیں۔ لبوں پر سکون اور کچھ پالینے کی طمانیت اور ابدی مسکراہٹ کی صورت میں رقصاں تھی اور سانسوں کی لڑی ٹوٹ چکی تھی۔ اس پر ایک کربناک اذیت کسی جھونکے کی طرح آ کر گزر گیا تھا۔

سادھو مہاراج نے اس کے بدن کو چادر سے ڈھانپ دیا۔ ان کے ہونٹوں کے گوشے کپکپائے اور آنکھوں سے دو شفاف موتی سنگیت کے بے جان لاشے پر ٹپک پڑے۔

''تیری موت کس قدر رشک انگیز ہے بیٹی!''

وہ رندھی ہوئی آواز میں یہ کہہ کر تیزی سے دوسری طرف گھوم گئے۔ جیسے وہ اپنے آنسو آکاش سے چھپانا چاہتے ہوں۔ وہ بے حس و حرکت اپنی جگہ پر پڑا رہا۔ اس وقت حقیقی معنوں میں اسے اپنے وجود سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش...... ! زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ نہ زمین نے اسے قبول کیا اور نہ قدرت نے...... اس کی پرارتھنا قبول نہ ہوئی...... قسمت اس خواہش پر خنداں تھی اور وہ آنے والے دنوں سے بے خبر تھا...... اسے کیا معلوم تھا کہ اس لرزا دینے والے واقعے کے بعد اسے کیسے کیسے ہولناک واقعات سے گزرنا ہے...... کاش! اسے یہ معلوم ہو سکتا کہ وہ اس وقت سادھو مہاراج کے چرنوں میں تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا۔ اپنا سر کسی دیوار سے پھوڑ لیتا لیکن خود کو مصائب و آلام کے ایک طویل اور سنگین اور جان لیوا سلسلے سے بچا لیتا...... یہ تمام واقعات اس قدر دردناک اور روح فرسا تھے کہ اس سے موت ہی بہتر تھی۔ لیکن یہ تمام باتیں قبل از وقت سوچنا آدمی کے بس میں کہاں ہوتا ہے۔

سادھو مہاراج ابھی تک اس سے مخاطب نہیں ہوئے تھے...... لیکن اسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں وہ اپنے الفاظ کے نوکیلے نشتروں سے اس کے کردار کی دھجیاں بکھیر کے رکھ دیں گے۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ سادھو مہاراج نے اگر اس پر تیز و تند حملے کیے تو وہ اپنی حالت کا واسطہ دے کر ان سے رحم اور شما کرنے کی التجا کرے گا۔

وہ یہ سب سوچتا ہی رہا مگر انہوں نے دوبارہ اس سے کرخت لہجے میں بات نہ کی۔

چند لمحوں کے بعد سنگیت کے انجام سے جو فضا سوگوار سی ہو گئی تھی اس میں قدرے کمی ہوئی تو وہ اس کی جانب گھومے۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری حالت قابل رحم اور افسوسناک بھی ہے۔'' ان کی آواز بہت نرم اور دھیمی تھی اور اس میں ملامت کی ذرا بھی جھلک نہیں تھی۔

''بھگوان سے پرارتھنا کرو اور گڑگڑا کے اس سے اپنے پاپوں پر معافی مانگو...... اگر کچھ اشلوک یاد ہیں تو انہیں دہراؤ...... اپنی آنکھیں موند لو...... ایشور نے اگر چاہا تو تم بھی اپنی حالت میں لوٹ آؤ گے...... تمہاری کھوئی ہوئی توانائیاں لوٹا دینا اس کے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں...... صرف ذرا سی اشارے کی بات ہے۔''

آکاش نے ان کی ہدایت پر اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کے آنکھیں موند لیں...... اس کمرے کی فضا میں دھیمی اور پرسوز آواز ابھری اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے دل میں تر ازو ہو گیا اور وہ اشلوک پڑھے جا رہا ہے۔ جوں جوں وہ پڑھتے رہے ان کی آواز کا آہنگ بلند اور وجد سے سرشار ہونے لگا...... اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر یہی کیفیت رہی تو اس کا تیزی سے دھڑکتا دل کسی خنجر کی طرح کا سینے سے نکل آئے گا۔

پھر ایک مرحلے پر پہنچ کر اس کے دل و دماغ پر ناقابل بیان کیفیت و سرور سا طاری ہونے لگا۔ اسے اپنا وجود پھولوں کی طرح فضا میں آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا ہو اور اس کے چاروں طرف روئی کے گالوں کی

طرح سفید سفید پرندے اپنے پر پھیلائے اڑ رہے تھے۔

اب جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی ساری توانائیاں بحال ہو چکی تھیں۔ سادھو مہاراج کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ وہ بے اختیار مسہری سے اترا اور ان کے چرنوں میں گر پڑا۔

تو اپنے دھرم تک کو بھول چکا ہے؟" سادھو مہاراج اسے اٹھاتے ہوئے دکھ بھری آواز میں بولے۔ "میری حیثیت اور میرا مقام ایشور کے نزدیک کچھ بھی نہیں ہے...... میں ایک تچھ کیڑے سے بھی بدتر ہوں...... میں سائیں یا سادھو ہوا تو کیا ہوا......؟ تو میرے چرنوں کو چھو کر پاپی نہ بنا...... میں ایک منش ہوں...... منش ہی رہنے دے......"

"دعظیم اور مہان سادھو مہاراج......! مجھے سیدھا راستہ دکھایئے...... ! ایشور کے لئے میری رہنمائی کیجئے...... میں گھپ اندھیروں میں روشنی کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں...... مجھے کچھ بجھائی نہیں دے رہا ہے......؟ آپ جانتے ہیں کہ میری زندگی سرابوں میں گھری ہوئی ہے...... آپ ہی مجھے بتا سکتے ہیں کہ میں اپنی نیلم تک کیسے پہنچ سکتا ہوں......" اس نے بے اختیار ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"شیطان ہر طرف تیری گھات میں ہے۔" وہ پرسکون آواز میں بولے۔ "اپنے دامن کو گندگی سے بچائے رکھ اور یہاں سے سیدھا شاکر پور میں جو بھگت رام سائیں کی سادھی ہے چلا جا۔ وہیں ان کی آتما تیری رہبری کا سامان کر سکے گی۔"

سنگیت کا بے جان ابھی تک وہیں مسہری پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے ان کے چہرے سے بھانپ لیا کہ وہ خود ہی آخری رسومات انجام دیں گے۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

"سنگیت کی آخری رسومات کیا آپ انجام دیں گے؟"

"یہ آپ ہی غائب ہو کر پرلوک میں چلی جائے گی...... معلوم نہیں...... ایشور اسے وہاں رہنے دیں گے یا اس سنسار میں کوئی جنم دے دیں گے...... پھر سنگیت کے جنم میں ہی بھیج دیں۔ یہ ایشور جانیں۔"

"تم یہاں رک کر اپنا وقت ضائع نہ کرو...... ابھی اور اسی وقت شاکر پور روانہ ہو جاؤ۔ وہاں تمہاری رہبری کا بندوبست ہو جائے گا۔"

پھر انہوں نے اسے مختصر الفاظ میں بھگت رام کی سادھی کا محل وقوع سمجھا کے رخصت کیا۔

وہ کچھ دیر بعد مکان سے باہر آیا تو برگد کے درخت کے تنے سے ایک تازہ دم سفید گھوڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس کی پشت پر زین کسی ہوئی تھی اور ایک تھیلے میں ضرورت کا سامان بھی موجود تھا۔

سادھو مہاراج اس کے لئے مشعل ثابت ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کے دماغ کے تمام گوشے روشن کر دیئے تھے۔ اوہام اور وسوسوں میں گھری ہوئی اس کی پرہول کہانی...... عزم اور یقین کا ایک نیا موڑ لیتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایشور کا نام لیا اور گھوڑی کی راسیں تھام کر اس کی پشت پر مضبوطی کے ساتھ سوار ہو گیا۔

صبح کا تازہ دم سورج دھیرے دھیرے سرن گڑھ والوں کے لئے نئی سحر کی نوید لئے طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی گھوڑی بڑی جانفشانی کے ساتھ سنگلاخ زمین پر اپنے سموں ساز بجاتی شاکر پور کی طرف سرپٹ دوڑی جا رہی تھی۔ اس نے راسیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں۔ اسے بھروسا تھا کہ وہ جانور اسے بہ حفاظت منزل مقصود تک پہنچا دے گا۔

گنجان آبادی ختم ہوئی تو پھر سورج کی کرنوں میں حرارت پیدا ہونے تک اکا دکا مکانات کے سلسلے بھی عقب میں رہ گئے...... اور اس کی سفید گھوڑی سر جھکائے پگڈنڈی پر گھس گئی جو جنگل کے درمیان میں تھی۔

دوپہر آئی اور ڈھل گئی۔ گھوڑی مسلسل برق رفتاری سے دوڑی جا رہی تھی۔

جب سورج مغربی افق میں جھکنے لگا تو اسے قدرے پریشانی ہوئی۔ اس وقت وہ میدانی علاقہ چھوڑ کر شاکر پور کے اردگرد دور دور تک پھیلے ہوئے گھنے جنگلات میں سے گزر رہا تھا۔ جہاں بندروں اور بھیڑیوں کی خاصی

تعداد پائی جاتی تھی۔ اکا دکا گیدڑوں کی ہاؤ ہو بھی سنائی دے رہی تھی۔ اگر رات اسی جنگل میں بسر کرنا پڑ جاتی تو اس کے لئے بڑی جان گسل دشواریاں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس نے راسیں کھینچ کر گھوڑی کو ایڑ لگائی تو وہ بری طرح بدکی اور ایک جھٹکا لے کر پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ پڑی۔ اس کی سمت درست اور چال متوازن تھی ورنہ رفتار کی تیزی نے ایک ثانیے کے لئے اسے پریشان کردیا تھا کہ کہیں وہ بھڑک نہ گئی ہو۔

اسی دوران میں شام بھی ڈھلنے لگی۔ جنگل ابھی تک گھنا تھا اور آثار سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ اندھیرا پھیلنے تک وہ اس دہشت انگیز جنگل سے نہ نکل سکوں گا۔

سورج کی روشنی تیزی کے ساتھ ماند پڑتی جا رہی تھی اور وہ آنے والی رات کے دامن میں پوشیدہ خطرات سے بچاؤ کی تدبیروں میں الجھا ہوا تھا کہ جنگل کی نم ناک فضا ایک دہشت ناک نسوانی چیخ سے گونج اٹھی۔

آس پاس کے درختوں سے بے شمار پرندوں کے غول کے غول سراسیمہ انداز میں چیختے ہوئے آسمان کی جانب اڑ گئے۔ بندروں کی چیخیں فضا کو خوف آور بنانے لگیں۔ ان کی خیں خیں ہیبت ناک ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے آواز کی سمت کا اندازہ لگاتے گھوڑی کی باگیں کھینچ لیں اور وہ پچھلے پیروں پر اٹھ کر تیزی سے ہنہنانے لگی۔ اسی وقت کہیں قریب سے کسی عورت کی بچاؤ بچاؤ کی دردناک چیخیں سنائی دیں اور وہ بے اختیار گھوڑی کی پیٹھ پر سے کود گیا۔

اس کے نتھنوں سے گرم سانسوں کی آندھیاں خارج ہو رہی تھیں اور وہ بڑی بے چینی کے ساتھ بار بار اپنے سم زمین پر مارے جا رہی تھی۔ جیسے سفر کا یوں رک جانا اسے پسند نہ آیا ہو اس نے پھرتی کے ساتھ گھوڑی کی باگیں ایک درخت کے تنے سے باندھ دیں۔ اس وقت نامعلوم عورت کی چیخیں قریب ہی سنائی دیں۔ یوں لگ رہا تھا وہ جان کے خوف سے جنگل میں بھاگتی پھر رہی ہے۔ اسے نہ تو کہیں پناہ مل رہی ہے اور نہ بچاؤ کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔

وہ اس ستم رسیدہ عورت کی آواز سے سمت کا اندازہ کر چکا تھا۔ بندروں اور گیدڑوں کے شور میں بھی اب تسلسل کے ساتھ اس کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے بلاتامل بائیں جانب کی جھاڑیوں پر نگاہ ڈالی اور فوراً ہی ان میں گھس پڑا۔ بظاہر خاردار نظر آنے والی ان سخت بھوری جھاڑیوں کے سلسلے کو عبور کرتے ہی ڈھلان وار جنگل کے اوپری حصے پر نکل آیا اور اس کی نچلی ڈھلان میں دوڑتے ہوئے دو سایوں پر پڑی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں وہ زیادہ صاف تو نہ دیکھ سکا لیکن اسے یہ اندازہ ہوگیا کہ ان میں آگے آگے ایک عورت ہے اور اس کے تعاقب میں ایک جھلایا ہوا مرد اس عورت کو دبوچنے کے لئے کوندا بن کر لپک رہا ہے۔

اس نے اس ڈھلان پر نگاہیں دوڑا کر ان دونوں تک اترنے تک لئے اپنے راستے کا انتخاب کیا اور پھر محتاط ہو کر اور سنبھل سنبھل کر نیچے اترنے لگا۔ اس لئے کہ ذرا سی بداحتیاطی سے وہ پھسل سکتا تھا۔

وہ لڑکی دہشت زدہ آواز میں مسلسل چیخے جا رہی تھی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ چیخ کر اپنی مدد سے باخبر کردے۔ لیکن ایسی صورت میں وہ مرد ہوشیار ہو کر کسی طرف نکل جاتا۔ جب کہ وہ کسی قیمت پر اس بدمعاش کو فرار کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ لڑکی جھاڑیوں اور درختوں میں اس بدمعاش سے اپنے بچاؤ کی تدبیر کرتی پھر رہی تھی۔ ذرا قریب ہوتے ہی آکاش کی صورت حال کا صحیح اور واضح اندازہ ہوگیا تھا۔

وہ مضبوط کاٹھی کی کوئی قبائلی لڑکی تھی۔ اس کے بدن سے اس کا لباس جیسے نوچا جا چکا تھا اور شاید وہ زخمی بھی تھی...... وہ مرد بدمعاش اندھوں کی طرح...... جھلائے ہوئے انداز میں اس پر جھپٹ پڑنے کے لئے بے چین تھا۔ اس سے اس وحشیانہ مقابلے کا پس منظر واضح سے واضح ہوتا گیا تھا۔ چوں کہ مرد پر ہوس ناکی اور اس لڑکی کو قابو میں کر کے بے بس کرنے کا جنون سوار ہو چکا تھا۔ ناکامی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ جس نے اسے غضب ناک بنا دیا تھا۔ لڑکی تھی کہ اس بدمعاش کے

ہاتھوں درندگی سے بچنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا کر اپنی عزت بچانے کے لئے فرار ہو رہی تھی۔

ابھی وہ ان دونوں سے قدرے فاصلے پر ہی تھا کہ مرد کی متلاشی لڑکی کی متوحش نگاہوں نے اسے دیکھ لیا۔ پھر وہ ایک ہذیانی چیخ مار کر اس کی سمت دوڑنے لگی۔ مرد نے اوپر سے یوں دیکھا اور اس کی طرف لپکنے لگا۔ اس کا سیاہ اور مکروہ چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ سردی کے باوجود اس کی یہ حالت بتا رہی تھی کہ کافی دیر سے وہ اپنے شکار کے تعاقب میں ہے اور لڑکی ہے کہ اس کے ہاتھ کسی شکار کی طرح ہاتھ آ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

اس ڈھلان پر چڑھنا بہت دشوار تھا۔ لڑکی کے قدموں کی رفتار سست پڑنے لگی اور ایک جگہ وہ جونہی جھاڑیوں سے بچنے کی کوشش میں لڑکھڑائی اسی ہوناک بھیڑیے نے جست لگا کر اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور وہ لڑکی اسے خود سے دور رکھنے کی کوشش میں مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگی۔

آکاش نے غصے سے بے قابو ہو کر اس شخص کو للکارا۔ لیکن اس نے آکاش کی آواز کی پروا نہیں کی جیسے وہ بہرا ہو چکا ہو۔

پھر آکاش نے اس کے بازوؤں میں دبی ہوئی لڑکی کو زمین پر گرتے دیکھا۔ وہ مرد کسی خون خوار عقاب کی طرح اس پر سوار ہو گیا۔ لڑکی نے پہلو بدل کر اسے گرا دینا چاہا لیکن اس کی یہ کوشش بے سود رہی۔ وہ اس کے ہاتھوں میں بالکل بے بس ہو چکی تھی۔ پھر اس کے حلق سے اذیت میں ڈوبی ہوئی بے ساختہ چیخ نکل پڑی تو آکاش نے پاگلوں کی طرح چھلانگوں میں درمیانی فاصلہ کو عبور کر لیا اور پھر لڑکی پر چھائے ہوئے مرد کے چہرے پر ٹھوکر مار کر دوسری جانب تیزی سے نکل گیا۔

اس مرد کی چیخ بہت کریہہ تھی۔ اس کے پلٹنے سے قبل ہی وہ لڑکی کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں اور ناک سے خون کی دھاریں بہہ نکلی تھیں اور وہ ہاتھوں میں ایک بڑا پتھر اٹھائے اسے کچل دینے کی گھات لگا رہا تھا۔ لڑکی اپنی ٹانگیں سمیٹ کر تھکے ہوئے انداز میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ دہشت سے اس کا چہرہ بے لہو ہو گیا تھا اور بدن پر لرزہ طاری تھا۔

آکاش اپنے حریف کے مقابل کھڑا اس کی خونی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس نے دو تین مرتبہ قدم بدل کر اس کی پھرتی کا اندازہ لگایا اور پھر اچانک اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہوا پتھر آکاش کے سینے کی طرف اچھال دیا۔ اس وقت اگر آکاش سے لمحے بھر کی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ پتھر اسے ڈھلان کا لقمہ بنا دیا۔ وہ تیزی کے ساتھ زمین پر گرا اور وہ پتھر تیز آواز کے ساتھ نیچے لڑھکتا چلا گیا جو خاصا بڑا اور بہت سخت تھا جب کہ ایک ہی چوٹ سر کو پاش پاش اور جسم کی ہڈیاں سرمہ بنا سکتی تھیں۔ اس بدمعاش کا نشانہ خطا ہوا تو آکاش کی جان میں جان آ گئی۔

آکاش کے حریف کو پہل کا فائدہ مل چکا تھا۔ وہ زمین پر گر کر پتھر کی زد سے تو بچ گیا تھا لیکن اس کی وحشیانہ گرفت سے نہ بچ سکا تھا۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے لپک کر جونک کی طرح آکاش کے بدن سے لپٹ گیا۔

اب آکاش کے سامنے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اس نے تمام تر وقت قوت کو جمع کیا اور اس سے کام لے کر اس کا گلا دبوچا اور گھٹنے سے اس کے جسم کے سب سے نازک حصے پر ضرب لگائی تو اس کی گرفت کمزور ہو گئی اور وہ زمین پر جیسے ہی گرا آکاش اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اب دشمن کا نرخرہ اس کی مضبوط اور بے رحم انگلیوں کی گرفت میں تھا۔ جب اس کی انگلیوں کا حلقہ تنگ ہونے کے بعث اس کا دم گھٹنے لگا تو اس نے تڑپ کر آکاش کی کنپٹی پر ایک گھونسا پوری قوت سے رسید کیا جس کے باعث اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔

پھر ان جنگلاتی ڈھلانوں پر زندگی اور موت کی بربریت کی بھیانک جنگ چھڑ گئی۔ وہ دونوں بے رحمی کے ساتھ ایک دوسرے کا بدن نوچ رہے تھے درندگی سے..... حریف کا چہرہ تو پہلے ہی وار میں خون میں نہا گیا تھا لیکن اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی اور ایک گھونسے میں اس کا داہنا جبڑا ادھیڑ کے رکھ دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے درمیان جنگ بڑی دیر تک جاری رہے گی۔

سورج کی روشنی اب بہت زیادہ دھندلا چکی تھی۔ پورا جنگل بھانت بھانت کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ وہ لڑکی بدستور درخت کے تنے سے جونک کی طرح چمٹی کانپ رہی تھی۔ اس کے بشرے اور آنکھوں میں دہشت اور ویرانی دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اسے جیسے سکتہ ہوگیا ہو اور اسے آکاش کے بچنے کی قطعی امید نہ ہو۔ اسے اپنی نظروں کے سامنے اس کی عزت آبرو کا دشمن اس کا جو محافظ بن کر اس درندے سے لڑ رہا ہے اس کی کامیابی کی امید نہ رہی تھی۔ وہ بھاری پڑ رہا تھا اور اس کا غلبہ بڑھتا جارہا تھا۔ اگر درندہ صفت کامیاب ہوجاتا ہے تو نہ صرف اس کی عزت کا دامن تار تار کردے گا بلکہ اس کی زندگی کا خاتمہ بھی کردے گا۔ کیوں کہ اس نے اپنی عزت بچانے کی بھرپور کوشش کی...... مزاحمت اور دفاع بھی کیا تھا۔ اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے نہ صرف اس کا چہرہ نوچا تھا اور اپنے ناخنوں سے اس کی آنکھیں پھوڑنے کی کوشش بھی کی تھی۔ جب ناکام رہی تھی اس نے مزاحمت کرتے ہوئے اس درندے کی من مانیوں سے غصے میں آکر اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ تھوکتے ہی وہ اس کے چنگل سے نکل بھاگی تھی۔ اگر وہ اس کے منہ پر تھوکتی نہ تو اس کی عزت خاک میں مل چکی ہوتی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ بری طرح تھک کر ہانپنے لگا۔ اس کے سخت جان حریف کی حالت بہتر نہیں تھی۔ وہ ایک پیچھے ہٹ کر مفاہمانہ انداز سے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

"تم میرے دشمن ہو اور ایک لڑکی کی خاطر کیوں اپنی زندگی داؤ پر لگا رہے ہو...... تم مجھ پر غالب نہیں آسکتے...... اس کے باوجود میں ایک تجویز دے رہا ہوں تاکہ ہم آپس میں لڑ کے جان کی بازی نہ ہار دیں۔"

"کیا تجویز ہے......؟" آکاش نے غرا کے اسے گھورا۔ "تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتے ہو؟"

"ذرا تم اس لڑکی اور اس کی نوجوانی اور حسن کو دیکھو...... کس قدر حسین ہے......؟ ظالم بے پناہ کشش رکھتی ہے...... ہم دونوں مل کر کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھا کر جنگل میں منگل منائیں۔"

آکاش بڑا محتاط تھا۔ اس نے سنبھل کر نہ چاہتے ہوئے بھی لڑکی کی طرف لمحے کے لئے دیکھا۔ اس درندہ صفت نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنے حریف کی بات اور تجویز مان لیتا۔

میں نے عہد کیا ہوا ہے کہ میں ہر قیمت پر اس کی عزت تم درندے سے بچاؤں گا...... چاہے مجھے اپنی جان کیوں نہ قربان کرنا پڑے...... ایک شریف لڑکی کی عزت جان سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔" آکاش نے تڑ سے جواب دیا۔

"عورت اور اس کی عزت......" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "عورت اس لئے ہوتی ہے کہ اس سے دل بہلایا جائے......؟ بے وقوفی کی بات نہ کرو...... یہاں سے قدرے فاصلے پر ایک کٹیا ہے جہاں ہم چل کر اس سے کھیل سکتے ہیں۔"

"کیا تمہاری بہن بھی ایسی حسین ہے جس سے میں دل بہلا سکوں؟"

اس بدمعاش کو ایسا لگا جیسے آکاش نے اس کی کنپٹی پر زور سے کوئی پتھر دے مارا ہو۔

"کمینے...... تو میری بہن کا نام اپنی گندی زبان سے نہ نکال...... ورنہ......"

"تم نے ہی تو کہا تھا کہ عورت اس لئے ہوتی ہے کہ اس سے دل بہلایا جائے؟" آکاش نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "آخر یہ لڑکی بھی تو کسی کی بہن اور گھر کی عزت ہے...... اب تمہارا پارہ کیوں چڑھ رہا ہے۔"

"تو نے پھر میری بہن کا نام لیا تو تیری گدی سے زبان کھینچ لوں گا......" وہ کرخت لہجے میں بولا۔

"آکاش جانتا تھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ معاً اس کی نظر درخت کی ایک مضبوط ٹہنی پر پڑی جو جھاڑیوں میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے حرف کو سمجھنے کا موقع دیئے بغیر اس ٹہنی تک غیر محسوس انداز سے پہنچنے کا موقع تلاش کرنے لگا۔

اس بار اس نے آکاش کو غافل پا کر اس مہلت

سے فائدہ اٹھا کے اس کی پسلیوں میں ایک گھونسا مار کے اس کی ٹانگوں سے لپٹ جانے کی کوشش کی تو آکاش نے فوراً جھوک سے اس کا وار خالی جانے دیا اور پھر کوندا بن کر ٹہنی کی طرف لپکا تو وہ مضبوط ٹہنی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اسے ایسا لگا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی بندوق آ گئی ہو۔

اب آکاش دشمن سے دور رہ کر بھی اسے لہولہان کر سکتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ حریف بڑی ثابت قدمی کے ساتھ مقابلے پر جما رہا جیسے کسی محاذ پر ڈٹا ہوا ہو۔ لیکن پھر ٹہنی کی شدید ضربوں نے اسے حواس باختہ کر دیا تو وہ مقابلے سے جان بچا کر فرار کی راہ تلاش کرنے لگا۔ آکاش کی یہ تدبیر تھی کہ وہ ڈھلان کی نچلی جانب بھاگے تاکہ وہ اسے دھکا دے کر لڑھکا دے کر اس کا قصہ تمام کر دے۔ وہ دشمن اتنا احمق بھی نہیں تھا کہ اپنے حریف کی تدبیر کو سمجھ نہ سکے۔ اپنی ٹانگوں پر پے در پے ضربوں کی پروا کئے بغیر وہ ڈھلان پر اوپر کی جانب جتنی تیز رفتاری سے دوڑ سکتا تھا دوڑنے لگا۔ آکاش بھی اس کے تعاقب میں کوندا بن کر لپکا لیکن اس کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ وہ خاصی دور نکل چکا تھا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا ان کے درمیان خاصا فاصلہ ہے تو وہ رک گیا۔

دشمن، دشمن ہی تھا۔ وہ ایک محفوظ جگہ پر خاصے فاصلے پر پہنچ کر دوڑنے کے بجائے رک گیا اور پلٹا...... جب اس نے دیکھا کہ آکاش ابھی بھی اس کے تعاقب کے ارادے سے باز نہیں آیا ہے تو اس کی جانب پتھر لڑھکانے لگا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس سے دور ہوتا بھی گیا۔ کئی چھوٹے بڑے پتھروں نے اسے قدرے زخمی کر دیا تو آکاش پھر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ پھر اس خیال سے ایک دم رک گیا اس کا تعاقب فضول ہی ہے۔ اس لئے کہ وہ کافی بلندی پر پہنچ کر اس کی دسترس سے نکل چکا تھا۔

جب وہ اوپر جا کر اس کی نگاہوں سے روپوش ہو گیا تو وہ بڑے محتاط انداز سے سنبھل سنبھل کر نیچے اترنے لگا تاکہ اس مظلوم لڑکی کی خیر و عافیت معلوم کر سکے اس کی عزت و آبرو کو وہ دشمن پامال کرنا چاہتا تھا۔

جنگل میں جب سورج کی الوداعی کرنوں کی خون کی سرخی پھیلی ہوئی تھی...... فضا میں رچی ہوئی خنکی ہڈیوں میں سما جانے پر بے چین سی ہو رہی تھی تو اسے امید تھی کہ وہ لڑکی اس خطرناک جنگل میں رات کی سیاہی اور ناقابل برداشت سردی سے بچاؤ کے لئے کسی پناہ گاہ کی رہنمائی حاصل کر سکے گی جو اس کے لئے بے حد ضروری بھی تھی۔

وہ قریب پہنچا تو لڑکی ابھی تک اس حالت میں تھی اور درخت کے تنے کے سہارے ننگی ہوئی بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر خوف کی لکیر اور آنکھوں میں ویرانی سی تھی...... اس کے قدموں کی آہٹ سن کر بھی وہ بہری سی بنی بیٹھی رہی تھی۔ گم سم اور کھوئی کھوئی سی...... پھر اس نے قریب ہو کر لڑکی کا شانہ بڑی نرمی سے ہلایا۔

”سنو...... وہ کمینہ اور درندہ صفت فرار ہو چکا ہے۔ گھبراؤ نہیں...... خطرہ ٹل گیا ہے......“

وہ ایک ہذیانی سی چیخ مار کے اچھل پڑی۔ پھر گرد و پیش کا جائزہ لے کر اسے متحیرانہ نظروں سے دیکھا۔ اسے جب یقین آ گیا کہ وہ بدمعاش کہیں موجود نہیں ہے تو اس کے سینے سے لگ گئی۔

”تم کون ہو......؟ اس ویران اور سنسان جنگل میں کیسے......؟“ آکاش نے اس کے چہرے پر بکھرے بالوں کو ہٹایا۔

”یہاں سے تین میل کے فاصلے پر میرا گاؤں ہے......“ اس نے آکاش کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے جواب دیا۔ ”میں نیچے ترائی میں بہنے والے چشمے پر نہانے اور کپڑے دھونے کے لئے سردی کم لگی تو حسب معمول آئی تھی۔ میں نے کپڑے دھو کر زمین پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیئے...... میں نہانے کے لئے پانی میں اتری تھی کہ وہ پاپی کسی موذی ناگ کی طرح میری سمت نکل آیا...... میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں ہوس ناکی دیکھی......وہ مجھے بے ہودہ اشارہ کنایے کرنے لگا۔ میں نے اسے خوب سنائی اور کہا کہ میں غلط نہیں ہوں۔

اس کی بکواس سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ

گئی...... وہ مجھے دبوچنے کے لئے آگے بڑھا اور اس نے مجھے دبوچ لیا۔ میرے کپڑے پھاڑ دیئے...... پھر میں نے اس کا چہرہ لہولہان کیا اور اس کے چہرے پر تھوکا تو اس کی گرفت سے نکل سکی...... تم تو میرے لئے اوتار بن کر آگئے...... اگر تم نہ آتے تو میری عزت اس بھیڑیے سے نہ بچتی......

''تم فکر نہ کرو...... اگر اب اس شیطان نے ادھر کا رخ کیا تو وہ میرے ہاتھوں زندہ نہ بچ سکے گا۔''

اس لڑکی نے آکاش کی اس جسارت پر کوئی تعرض نہیں کیا۔ کیوں کہ اس میں کوئی میل نہیں تھا۔ ہوس نہیں تھی۔ پراگندگی نہیں تھی..... ایک پاکیزگی تھی، خلوص کا جذبہ تھا......

پھر آکاش کو سادھو مہاراج کی ناصحانہ باتیں یاد آئیں۔ انہوں نے اس سے کہا تھا کہ وہ خود کو پاپ سے اپنا دامن آلودہ ہونے نہ دے۔ اگر وہ غلاظت میں گر گیا تو یہ ایک ایسا دلدل ہے کہ اس سے نکلنا ناممکن ہوتا ہے۔ کیوں کہ جتنا نکلنے کی کوشش کرتا ہے وہ اتنا ہی دھنستا چلا جاتا ہے۔

''تم مسافر معلوم ہوتے ہو......؟'' لڑکی اپنی بے حجابی کی حالت پر ست سی رہی تھی۔

''ہاں......'' آکاش نے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ''میں اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا کہ تمہاری مدد کی پکار سن کر آ گیا۔'' پھر آکاش نے فوراً ہی اپنی چادر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

''اس سے اپنا بدن ڈھانپ لو...... اس درندے نے تمہارے کپڑوں کی دھجیاں بنا ڈالیں۔''

''کیا تم پیدل ہی اس جنگل سے گزر کر اپنی منزل کی طرف جا رہے تھے؟'' لڑکی تے اپنا بے حجاب بدن چادر سے ڈھک کر پوچھا۔

''نہیں...... میں گھوڑی پر جا رہا تھا۔'' آکاش نے جواب دیا۔ ''وہ جنگل میں موجود ہے میں تمہیں تمہارے گاؤں پہنچا دوں گا۔''

اور جب آکاش اوپر پہنچا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیوں کہ اس کی گھوڑی اس جگہ سے غائب تھی جہاں اس نے باندھا تھا۔ شام کے دھندلکے میں بھی زمین پر اس کے سموں کے نشانات صاف دکھائی دینے لگے تھے۔

پھر اس نے اس لڑکی کے ہمراہ آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا...... چپہ چپہ بھی دیکھ لیا لیکن وہ گھوڑی نظر نہ آئی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ رات کی سیاہ چادر تیزی کے ساتھ شام کے دھندلکے پر غالب آتی جا رہی تھی۔ جنگل جس قدر گھنا تھا اتنا ہی پر خطر بھی تھا...... اور اس لڑکی کا گاؤں کئی میل کی مسافت پر تھا۔ اسے شب گزاری کی فکر ستانے لگی۔

''تمہاری گھوڑی غائب ہے...... یہ تو بہت برا ہوا مسافر!'' لڑکی تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ ''اندھیرا بہت گہرا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا گھپ ہوتا جائے گا اور پھر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے گا...... ایسی صورت میں اپنے گھر کو پہنچنے سے رہی...... اندھیرا میں راستہ نہیں ملے گا۔ کس مشکل میں......''

''تم اس قدر پریشان اور متفکر نہ ہو۔'' آکاش نے حوصلہ دیا۔ ''بہر کیف یہ رات تو کہیں نہ کہیں بسر کرنی ہوگی؟''

لڑکی کو دلاسا دینے کے باوجود آکاش نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ تھکا ہوا سا انداز لئے ہوئے ہے۔

لیکن اب اس پر ایک نیا خوف مسلط ہونے لگا تھا۔ اس کی گھوڑی کی گمشدگی میں اس کے مفرور اور زخمی حریف کا ہاتھ تھا...... جنگل میں شب بسری کی صورت میں وہ بدمعاش کسی بھی وقت پشت سے وار کر کے اپنی شکست کا انتقام لے سکتا تھا۔ ایسی صورت میں نہ صرف یہ کہ وہ ہلاکت میں پڑ جاتا بلکہ وہ لڑکی بھی دوبارہ اس کے چنگل میں پھنس جاتی۔

''جس وقت میں نے کپڑے دھوئے اور نہانے والی تھی تب ہلکی سی سردی تھی...... لیکن وقت گزرتے گزرتے سردی بڑھتی گئی اور اب تو بہت زیادہ ہوگئی ہے...... جنگل میں سردی کی شدت اتنی ہو جائے گی کہ

رات گزارنا آسان نہ ہوگا۔"

لڑکی کے لہجے میں تشویش اور فکرمندی کے ساتھ ساتھ ایک انجانا خوف سا تھا۔

"لیکن تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے اس قدر ہراساں اور پریشان کیوں ہورہی ہو؟"

"اس لئے کہ یہاں بھیڑیے اور گیدڑ بھی بہت زیادہ ہیں؟" لڑکی نے جواب دیا۔ "اب رات گزارنے کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ کسی نہ کسی صورت سے چشمے پر پہنچیں...... وہاں کھلی جگہ ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا، محتاط اور ہشیار رہنا کہ بے خبری کے عالم میں کوئی جانور حملہ نہ کردے۔"

لڑکی نے بڑی معقول بات کہی تھی، جس میں اسے عذر کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ لڑکی جتنی حسین تھی اتنی ہی ذہین بھی...... اس نے آکاش کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لئے اور پھر تاریکی میں ڈوبے ہوئے جنگل میں ایک سمت چل دی۔

بسیرا کرنے والے پرندوں اور کمین گاہوں میں دبکے ہوئے جانوروں کا شور اب دم توڑ چکا تھا۔ ان کے قدموں کی آہٹوں پر آس پاس کے درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے خوف زدہ آوازوں میں شور مچانے لگتے تھے جس کے جواب میں کبھی کبھار بندروں کی خیں خیں سنائی دے جاتی تھیں۔

"تم کدھر جارہے تھے اجنبی مسافر......؟" لڑکی نے بوجھل خاموشی کو توڑتے ہوئے سوال کیا۔

لڑکی کو مترنم آواز نے اسے چونکا دیا۔

"تم کیا کہہ رہی تھیں......!" آکاش نے ہڑبڑا کے پوچھا۔ "میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہاری منزل کس طرف ہے؟" اس نے ایک گرے ہوئے درخت کے تنے کو عبور کرتے ہوئے سوال دہرایا۔

"شاکر پور......" آکاش نے قدرے توقف کے بعد مختصر الفاظ میں بتایا۔

"بیوی بچوں کے پاس جارہے ہوگے......؟" لڑکی نے تائید طلب لہجے میں دریافت کیا۔

"بیوی بچوں......؟" آکاش کے دل پر ایک صدمہ گھونسے کی طرح لگا۔ اس کے منہ سے ایک گہرا سانس بے اختیار نکلا۔ اس نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔ "میری بیوی مجھ سے حادثاتی طور پر بچھڑ چکی ہے۔ اسی کی تلاش میں در بدر کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں...... میری بدنصیبی کہ میں نہیں جانتا کہ میرا لڑکا اب کس حال میں ہوگا؟"

اس کے لہجے میں دل کا کرب نمایاں تھا۔ شاید اسے احساس ہوگیا کہ اس نے سوال پوچھ کر اس کے دل کے تار چھیڑ دیئے، اس لئے وہ خاموش ہوگئی اور اس کا چہرہ سپاٹ سا ہوگیا۔ اس موضوع پر لڑکی نے دوبارہ سوال نہیں کیا۔

"تمہارا نام کیا ہے......؟" ڈھلان سے اترتے سمے آکاش نے اس سے سوال کیا۔

"میرا نام ناجیہ ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "تمہیں شاید پیاس لگ رہی ہے...... تمہاری آواز سے ایسا لگ رہا ہے کہ تمہارا حلق بالکل سوکھا جارہا ہے...... بس اب تھوڑی دیر کی بات ہے۔ ہم چشمے پر پہنچنے والے ہی ہیں۔"

وہ اس کی بے وقوفی پر مسکرا کے رہ گیا...... وہ اس کا حلق خشک ہونے کا مطلب سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نے اندھیرے میں نگاہیں بھر کے اس کی جانب دیکھا۔ وہ سر جھکائے آگے بڑھتی جارہی تھی۔ تاریکی کے باعث اس کے چہرے پر ابھری بہکی بہکی تحریر کو پڑھ لینا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد پتھروں کے درمیان سے پانی بہنے کا دھیمہ دھیمہ گنگناتا ہوا شور سنائی دینے لگا جو بتدریج واضح ہوتا جارہا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد وہ پانی کے چشمے پر پہنچے۔

یہ کافی اوپر سے بہتا ہوا آتا ہے اور دن میں اس پر کسی آبشار کا سا دھوکا ہوتا ہے...... اس کا پانی گو کہ بہت ٹھنڈا ہے اور فرحت بخش ہے جتنا بھی پی لو جی سیر ہی نہیں

ہوتا ہے۔ تم اتنی دیر میں پانی پی لو میں اپنے کپڑے اکٹھا کرلوں۔ اب تک سوکھ چکے ہوں گے۔" وہ اتنا کہہ کر ایک سمت تیزی سے آگے بڑھ گئی اور اس کی چال میں ایسی مستانہ خرامی تھی کہ آکاش نے دل تھام لیا۔

اس چشمے کا پانی واقعی بہت سرد تھا۔ اس نے کئی چلو منہ میں ڈالے تو نہ صرف اس کے سارے بدن میں ایک سرور بخش فرحت دوڑ گئی اور بڑے سکون کا احساس ہوا۔ اس کا بدن اور چہرہ جذبات کی تمازت سے انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔

وہ کچھ دیر ہی میں لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھ میں کپڑوں کی جو گٹھری تھی اس سے لگتا تھا کہ اس میں بہت سارے کپڑے ہیں۔

"اس کمینے نے مجھے کپڑے پھیلانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ یہ سب گیلے ہیں۔" وہ کپڑوں کی گٹھری ایک طرف ڈالتے ہوئے بولی۔

"اب مجھے یہ رات چادر ہی میں بسر کرنی ہوگی...... تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی ہے؟"

"مجھے سردی سے زیادہ تھکان محسوس ہو رہی ہے...... چلو آؤ...... آرام کے لئے کوئی جگہ تلاش کریں۔" اس نے اس کی بانہہ تھامتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آرام کرنے سے سردی اتنی محسوس نہ ہو۔"

"آؤ...... ادھر ایک ٹیلہ ہے اور اس کی اوٹ میں ہم ہوا سے بچے رہیں گے۔" اس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ کسل مندانہ انداز میں جماہی لے کر زمین پر لیٹ گیا۔ لڑکی نے اس سے خاصی دور لیٹنا چاہا تو اس نے لڑکی کو قریب ہی بلالیا۔ "میرے قریب ہی لیٹ جاؤ تاکہ ہم بہتر طریقے سے ایک دوسرے کی حفاظت کرسکیں گے اور وہ بدمعاش قریب نہیں آئے گا۔" اس نے کوئی تعرض نہیں کیا اور آکاش کے داہنے بازو پر سر رکھ کے لیٹ گئی۔

"تمہارا بدن تو سرد ہو رہا ہے؟" آکاش نے اس کے شانے کو چھوتے ہوئے دانستہ جھوٹ کہا۔ "اس چادر میں تم رات کیسے گزارو گی؟ سردی سے ساری رات کانپتی رہو گی۔"

اس لڑکی نے سکڑ کے اس کی جانب کروٹ لی۔ "تم میری فکر میں ہلکان مت ہو...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔" پھر اس کا ہاتھ تھپ تھپایا۔

لڑکی کا لمس اور اس کا دعوت انجانی دیتا بدن اور اس کے وجود سے پھوٹتی مہک اسے پاگل کئے دے رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے من مانی کی تو وہ بھڑک نہ اٹھے۔ اسے اپنی عزت و آبرو بہت پیاری تھی۔ اس لئے اس نے اس بدمعاش کو کامیاب نہ ہونے دیا تھا۔ پھر آکاش نے دوسری طرف کروٹ بدل لی تاکہ جذبات قابو میں رہیں۔ لڑکی کی خاموشی نے اس کے حوصلوں کو زبان دے دی۔

"تم بہت خوب صورت اور پیاری سی گڑیا ہو ناجی...... میں تمہیں ناجی کہہ سکتا ہوں نا؟" اس نے لڑکی کا گال تھپتھپایا۔

آکاش کی حرکت پر اس پر جنون کا سا دورہ پڑ گیا۔ اس نے والہانہ انداز میں آکاش کا ہاتھ تھام لیا۔

پھر طوفان آگیا تو اس نے کے درمیان جو دیوار تھی وہ گر گئی۔ اس کے وجود میں سویا ہوا شیطان جاگ اٹھا۔

طوفان کی کیفیت گزرنے کے بعد اس پر پرانی شراب کا نشہ چھانے لگا۔ پھر وہ لڑکی کے زانو پر سر رکھ کے سوگیا۔ اس نے غنودگی کی حالت میں محسوس کیا تھا کہ لڑکی نے اس کی چادر اس کے بدن پر ڈال دی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس علاقے کی ٹھنڈ کی عادی ہوچکی ہے۔

چہرے پر براہ راست پڑنے والی سورج کی کرنوں سے ہڑبڑا کے بیدار ہوا تو لڑکی غائب تھی۔ وہ خاصی دیر تک خالی الذہن زمین پر پڑا رہا۔ پلکیں جھپکاتا رہا۔ کچھ خیال آیا تو اٹھ کے اسے تلاش کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں اس نے چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن وہ پراسرار طور پر روپوش ہوچکی تھی۔ اس کے کپڑوں کی گٹھری کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔

اس نے چشمے کے شفاف پانی سے منہ دھویا اور

خودی کے احساس کے ساتھ ایک سمت چل پڑا۔ اسے ناجی کی گمشدگی پر تشویش سے زیادہ حیرت تھی، حالات سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خود ہی غائب ہوئی ہے۔ اگر کسی کی گمشدگی میں اس کے ہاتھوں زخمی ہونے والے بدمعاش کا ہاتھ ہوتا تو وہ ناجی کو اغوا کرنے جانے سے قبل اسے سوتے میں قتل کر دیتا یا کم از کم اسے شدید زخمی کر کے کسی قابل نہ رکھتا...... معذور اور اپاہج کر دیتا۔ کاشی کو اپنے تجربے کی بنا پر اس شخص کے بارے میں اس کی یہی رائے تھی کہ وہ نہایت کینہ پرور اور دشمن کو معاف نہ کرنے والا بدمعاش ہے۔

وہ انہی خیالات میں غرق کافی دیر بعد اس مقام پر پہنچا جہاں اس کی گھوڑی غائب ہوئی تھی۔ کیوں کہ وہ اس مقام سے جہاں سے اس کی گھوڑی غائب ہوئی اپنے سفر کی راہ کا تعین کر سکتا تھا۔ اس روز اس نے مانوس قسم کے جنگلی پھلوں پر گزارہ کیا اور شام ہونے کے قریب ان جنگلات کو خاصا دور چھوڑ آیا۔ اب اس کے اندازے کے مطابق شاکر پور زیادہ مسافت پر نہیں رہا تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد بھی وہ چلتا ہی رہا۔ دن بھر پیدل چلنے کے باعث اس کے پیروں پر ہلکا ورم آچکا تھا۔ اور تکان سے جوڑ دکھ رہا تھا لیکن ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کی روشنی میں مٹی سے بنی ہوئی ایک بڑی سی عمارت کا ہیولا دیکھ چکا تھا اور اسے امید تھی کہ وہاں پہنچ کر وہ آرام سے رات بسر کر سکے گا۔

جیسے تیسے کر کے وہ رات کے دس بجے کے قریب اسی عمارت کے نزدیک پہنچا۔ وہاں پھیکی پھیکی یرقان زدہ روشنی کا راج اور رات کے گہرے سناٹے میں ہولناک پھنکاروں اور سیٹیوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر اس کے قدموں کی رفتار سست پڑنے لگی اور دل غیر یقینی حالات کے تصور سے ڈوبنے لگا...... ایک مرتبہ پھر سانپوں اور ناگوں کا کوئی پر ہیبت مسکن اس کی راہ میں حائل ہو چکا تھا۔

وہ اس عمارت کے مٹی سے بنے ہوئے احاطے کی دیواروں کے پیچھے ایک گنبد دار عمارت نظر آ رہی تھی۔ وہ پوری عمارت اور اس کا گنبد بھی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس پر گہرے رنگوں سے نقوش و نگار بنائے گئے تھے جو اب دھندلا کر اپنی انفرادیت کھو چکے تھے اور بدروحوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ عمارت کی خستہ حالی پر اور پھیکے رنگ اس کی صدیوں طویل کہانی سنا رہے تھے۔ اس اطراف میں دور دور تک کوئی مکان یا آبادی نہیں تھی اور سیاہ رات کی وحشت ناک سناٹے میں اندر سے ابھرنے والی پرہول پھنکاریں اور سیٹیاں رگ و پے میں خوف کی سنسنی دوڑا رہی تھیں۔

وہ کافی دیر تک باہر کھڑا رہا اور اندر جانے کا حوصلہ نہ کر سکا۔

امرتا رانی کے منکے سے محروم ہو جانے کے بعد اس نے پہلی بار خود کو اس کے ہم نسلوں کے قریب ایسی صورت حال میں پایا تھا تو اسے یقین تھا کہ منکہ نہ ہونے کے باعث اپنے اوپر حملہ آور ہونے والے کسی بھی سانپ کے زہر سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔

آخر کار اسے ایک تجویز سوجھی۔ اگر اس پرہول عمارت میں اگر کوئی انسان موجود تھا تو وہ یقیناً اس کی مدد کر سکتا تھا۔ اس نے چند ثانیوں میں اپنے حواس جمع کئے اور پھر پوری قوت سے چلایا۔

”کیا اس جگہ کوئی موجود ہے......؟ ہے تو جواب دے؟“

رات کے سناٹے میں اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔ اندر سے ابھرنے والی پھنکاروں اور سیٹیوں میں اس کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا کیوں کہ ان کے شور میں اس کی آواز دبتی رہی تھی۔

کئی لمحے گزر گئے۔ لیکن اسے اپنی آواز کا کوئی جواب نہیں ملا۔ جب وہ مایوس ہو کر وہاں سے چل دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو کچھ دور چوبی دروازے سے ایک ہیولہ باہر آتا دکھائی دیا۔

وہ اپنی سانس روکے اپنی جگہ کھڑا آنے والے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ وہ احاطے کے دروازے سے نکل کر اس کی جانب آ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں

لالٹین لٹکی ہوئی تھی جس کی روشنی بمشکل چند منٹ تک پھیل رہی تھی۔

جب وہ اس کے قریب آیا تو آکاش چونک پڑا۔ وہ جسیم بدن کا مالک تھا۔ رنگ نکھری ہوئی تھی۔ قدرے فربہی مائل بھی..... اس کے تن پر معمولی کپڑے کا پیوندوں والا لباس نظر آیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہ تھیں..... دراز زلفیں شانوں پر بے پرواہی سے بکھری ہوئی تھیں اور چہرے پر گھنی داڑھی بھی تھی۔ بالوں کی سفیدی سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی عمر پچاس برس سے کم نہیں ہے۔ اس کے گلے میں زرد سیاہ رنگ کی کئی لمبی لمبی مالائیں اور کلائیوں میں وزنی آہنی کڑے نظر آرہے تھے۔ وہ مجموعی طور پر کسی مندر کا پنڈت لگتا تھا۔

اس نے آکاش کے قریب آکر لالٹین قدرے اوپر اٹھالی..... اور اس کے سراپا کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس کے تیوروں پر بل پڑ گئے جیسے اسے آکاش کے چہرے پر کوئی ناپسندیدہ تحریر نظر آگئی ہو۔ اس نے پریشان ہوکر نظریں نیچی کرلیں۔

وہ بھاری اور تحقیر آمیز آواز میں بولا۔ ''تیرے چہرے پر پاپ کی تازہ کالک مجھے بہت کچھ بتارہی ہے۔''

''میں ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔'' آکاش نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تم آج کی رات مجھے پناہ دے سکو تو مجھ پر تمہاری بڑی دیا ہوگی۔'' آکاش کا لہجہ بے جان سا ہونے لگا۔

''ابھی تو میں بھی یہ دیکھ رہا ہوں کہ تو بھٹکا ہوا ہے۔'' اس قوی بوڑھے پنڈت کی آواز میں طنز نمایاں تھا۔ ''مگر میں اس مندر کی عمارت میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا..... کیا تو نہیں جانتا کہ اس میں کس کی سمادھی ہے؟''

اسے سمادھی کا سنتے ہی ایک جھٹکا سا لگا..... نادانستگی میں وہ سیدھا اپنی منزل مقصود پر آچکا تھا۔ آکاش نے ندامت سے بوجھل نگاہیں اس شخص کے چہرے کی طرف اٹھائیں اور التجا آمیز لہجے میں بولا۔

''میں اسی مندر پر آیا ہوں جس میں مہاسائیں کی سمادھی ہے..... میں بہت دکھی اور پریشان ہوں۔ میری رہنمائی سادھو مہاراج نے کی تاکہ میں یہاں رہنمائی حاصل کرسکوں۔''

''تیری ہر سانس میں اس پاپ کی بو آرہی ہے جسے تو نے رات کو آلودہ کیا..... اسے آلودہ کرنے سے پہلے اسے اپنی جان پر کھیل کر آلودہ ہونے سے بچایا تھا..... کیا میں غلط کررہا ہوں۔ تو نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ بگڑ کر بولا۔

''میں نے اس کی عزت بچانے کے لئے اس نیت سے اس کی مدد کی تھی۔'' آکاش نے اعتراف پاپ کرتے ہوئے صفائی پیش کی۔ ''میرا ارادہ ہرگز ایسا نہیں تھا کہ اس سے جی بہلاؤں..... لیکن اس لڑکی نے رات اور تنہائی سے فائدہ اٹھایا..... میں اس لئے خود کو قابو میں نہ رکھ سکا کہ میں مٹی کا تودہ نہ تھا۔ مرد تھا..... اور پھر وہ اس قدر حسین بدن کی پرکشش تھی کہ اس کی نوجوانی اور بے حجابی نے مجھے غلاظت کے دلدل میں گرادیا تھا..... آپ مجھے اس جرم کی جو سزا دینا چاہیں دے دیں..... میں اف نہ کروں گا.....''

''چوں کہ تو نے سچائی سے اپنے پاپ کا اعتراف کیا ہے اس لئے میں معاف کرتا ہوں اور ایشور بھی کرے.....'' وہ اسے گھورنے لگا۔ پھر کرخت لہجے میں مخاطب کیا۔ ''جس نے بھی تجھے یہاں بھیجا کیا اس نے تجھے یہاں کے آداب نہیں بتائے تھے۔''

''میں ان کا نام نہیں جانتا بلکہ ان کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں وہ سادھو مہاراج ہیں جن کی زندگی کا مشن نیکی، سچائی اور برائی کے خلاف ہے..... انہوں نے اپنی زندگی انسانیت کی سلامتی کے لئے وقف کررکھی ہے..... وہ بڑی پراسرار قوتوں کے مالک ہیں..... انہوں نے میری مصیبت اور پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے یہاں بھیجا..... راستے میں ایک شیطانی جال میرے راستے کا پتھر بن گیا تھا جسے میں ٹھوکر مارنے کے باوجود اس کو ہٹا نہ سکا اور سادھو مہاراج کی آگیا کو بھول گیا۔''

''میں تو سادھو مہارجا کے بھیجے ہوئے کتوں کو

روک دوں یہ میری شکتی سے باہر ہے۔" وہ بوڑھا جلدی سے بولا۔ "اس مندر کے دروازے تجھ پر کھلے ہوئے ہیں۔تو اندر آ سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر کسی غلام کے انداز میں مڑا اور اندر گھس گیا۔ آکاش بھی اس کے پیچھے گھس گیا۔

مندر کے احاطے سے اندر داخل ہوا تو اسے ایک وسیع میدان خودرو جھاڑیوں اور درختوں سے لپٹا ہوا نظر آیا۔ پھر اسے اچانک جھینگروں کا تیز شور گونجتا ہوا لگا۔ ان کی سائیں سائیں سمادھی کی عمارت سے آنے والے سانپوں کے شور سے مل کر ماحول کی ہیبت کو لرزہ خیز بنا رہی تھی۔

پھر وہ دونوں عمارت تک جا پہنچے۔ چبوترہ عبور کرتے ہی مٹی سے بنی ہوئی عمارت کا چوبی دروازہ سامنے آ گیا جس میں سے ملگجی اور زرد زرد سی روشنی باہر تک آ رہی تھی جس سے ماحول وحشت زدہ سا معلوم ہوتا تھا۔

پھر وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور پھر اس کے قدم لڑکھڑانے لگے تو وہ رک گیا۔

مٹی کے وسیع گنبد کے نیچے بنی ہوئی عمارت کے وسط میں ایک اونچی مگر سادہ سی سمادھی دکھائی دی تھی جس پر گلاب کے تازہ پھولوں کا انبار لگا ہوا تھا اور فرش پر بے شمار زندہ لکیریں، ہر رنگ اور جسامت کی لکیریں سہمے ہوئے انداز میں رینگ رہی تھیں۔ سمادھی کے نیچے رینگتے ہوئے وہ سانپ ہی تھے جو بے چینی سے پھنکار رہے تھے۔

سادھو مہاراج کی سمادھی کا پجاری اس کی نگاہوں کے سامنے بے خوف وخطر اندر داخل ہوا۔ اس کے بھاری قدم سانپوں پر پڑے۔ لیکن آکاش کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان میں سے کسی موذی نے پلٹ کر اس پر حملہ کرنے کی جسارت نہیں کی۔ وہ کچی زمین پر رینگتے ہوئے بے شمار سانپوں پر چلتا، روندتا ہوا سا گلاب کے پھولوں سے لدی سمادھی تک گیا۔ مودب انداز میں سر کو خم دے کر چند ثانیوں تک زیر لب کچھ پڑھتا رہا اور پھر سمادھی پر سے گلاب کا ایک پھول اٹھا کے واپس آ گیا۔

"اب تمہیں سب سے پہلے اشنان کرنا ضروری ہو گیا ہے؟" پجاری نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"وہ کس لئے......؟" آکاش نے حیرت سے کہا۔ "کیا یہ آداب میں شامل ہے!"

"اس لئے کہ تم نے رات ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ خود کو آلودہ کیا تھا۔" اس نے زہر خند جواب دیا۔ "میلا شریر ان کی آتما کو غضب ناک بنا دے گی...... اس لئے اپنا شریر پاک کر کے سمادھی پر آنا اوش ہو گیا ہے۔"

آکاش نے جواب نہیں دیا۔ بڑی خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

"تیرے دل کا حال تو ایشور ہی جانتا ہے...... میری کوٹھری میں نہانے کی جگہ موجود ہے۔ وہاں اشنان کر کے سمادھی پر آنا۔"

آکاش ایک طویل چکر کاٹ کر اس پجاری کی کوٹھری میں پہنچا جو بڑی کشادہ روشن تھی۔ اس میں ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ پجاری نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا جہاں نہانے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ ایک نل تھا۔ اس کے سامنے ایک چبوترہ جس پر بیٹھ کر اطمینان سے اشنان کیا جا سکے۔ نل کے نیچے ایک بڑی سی پیتل کی صاف صاف ستھری، چمک دار اور مضبوط بالٹی تھی، جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ پیتل کا ہی مگ تھا۔ صابن دانی بھی تھی۔ دیوار پر جو نصب ہینگر تھا اس پر ایک نیلے رنگ کا بڑا سا تولیا تھا۔ ایک ٹاٹ کا پردہ تاکہ آزادی سے نہایا جا سکے۔

آکاش نے کپڑے اتار کر ہینگر کے ہک میں لگا دیئے۔ پھر اس نے ایک مگ پانی جسم پر ڈالا تو خنکی سی لگی لیکن فرحت سی بھی تھی۔ بالٹی کے نیم گرم پانی ہو گا اسے یقین نہیں آیا۔ بوند بوند سے نہ صرف اس کی کسل مندی دور ہو گئی تازگی بھی محسوس ہونے لگی۔ اس نے کبھی تالاب یا کسی غسل خانے میں نہانے اور اشنان کرنے میں ایسا لطف اور فرحت بھی محسوس نہیں کی۔ جی چاہ رہا تھا کہ بس وہ نہاتا رہے۔ آخر اچھی طرح نہا کر نکلا تو اس نے اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا اور تازہ دم سا محسوس کیا۔

جب وہ دستر خوان پہ آیا تو اس نے دیکھا کہ بوڑھے پجاری نے دستر خوان پر کھانا چنا ہوا تھا۔ نرم نرم گیہوں کی روٹیاں، آلو کی ترکاری اور تازہ پکی ہوئی ماش کی دال کے ساتھ وہ آکاش کا منتظر تھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں، ایک کونے میں باورچی خانہ تھا جس کے چولہے میں پڑی ہوئی سرد راکھ سے ظاہر تھا کہ اس میں کئی پہر سے آگ نہیں جلی۔

اس نے پہلے کھانے، چولہے اور پھر پجاری کی طرف حیرت اور تجسس اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ سادھوؤں اور پجاریوں کے کھیل ہیں بالک!'' بوڑھے پجاری نے بڑی سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔ ''اس مندر میں سادھو مہاراج پنڈت بھگت رام کی سادھی ہونے کے باعث بھی کسی وقت کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی ہے۔''

اس نے کریدنے اور سوال و جواب کے بجائے خوب سیر ہو کر شائستگی کے ساتھ بھوجن کیا۔ اسے بڑے زور کی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد قہوہ پینے کے دوران پجاری نے کہا۔

''ایسا لگ رہا ہے کہ تم کسی بڑی مصیبت میں بری طرح پھنس گئے ہو؟''

''میں کئی مہینوں سے اپنی بیوی کے فراق میں جل رہا ہوں۔'' آکاش نے بڑے کرب ناک لہجے میں بتایا۔ اس وقت اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس نے چاہتے ہوئے بھی ناگ بھون کا نام زبان پر نہ لایا۔

پجاری کی آواز نرم اور لہجہ ہمدردانہ تھا۔ ''کیا تمہاری پتنی زندہ سلامت ہے؟''

''تمہیں یہاں شانتی ملے گی بالک!''

''میں کچھ نہیں جانتا......؟ کچھ کہہ نہیں سکتا......؟ صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ میرے بدترین دشمنوں کی قید میں ہے...... لیکن وہ کہاں قید میں ہے۔ یہ میں بھول چکا ہوں......؟ سادھو مہاراج سے ملاقات تک مجھے خوب یاد تھا کہ وہ ایک اجنبی اور خوف ناک دنیا ہے...... وہاں موذیوں کی حکمرانی ہے...... اف! میں اس جگہ کا نام بھی بھول چکا ہوں۔'' آکاش اپنا ماتھا پیٹنے لگا۔ کوشش کے باوجود نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے نہ تو ناگ بھون...... کالی راج دھانی...... ناگ حویلی...... یہ جو تین چار نام تھے ان میں سے اسے کوئی نام نہ یاد آ کر دے رہا تھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ دماغ معطل کیوں ہو گیا ہے...... اسے نہ ہی اس پجاری سے مندر میں نظر آنے والے سانپوں کے بارے میں بات کرنے کی ہمت پا رہا تھا۔

''جاؤ...... تم جاؤ...... مہا سادھو مہاراج پنڈت بھگت رام کی سادھی پر......'' پجاری اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''وہاں جا کر تمہیں شانتی ملے گی...... نہ صرف تمہاری جسمانی بلکہ ذہنی حالت بھی ابتر لگ رہی ہے۔''

وہ سخت کوفت اور الجھن کے عالم میں وہاں سے اٹھا...... اس کا ذہن ابھی تک اس پراسرار، خوف ناک اور وہشت انگیز دھرتی کے نام کی تلاش میں سرگرداں تھا جہاں اس کی پیاری پتنی قید تھی...... اسے یقین تھا کہ اس کے نابکار دشمن، شیو ناگ نے اپنی ماورائی قوتوں کے ذریعے اس دھرتی کے جو جو بھی نام تھے حادثے سے مٹا دیئے تھے تاکہ وہ وہاں کی کہانیاں عام نہ کر سکے۔ اسے اپنی کہانی کا ہر کردار اور ہر مقام بخوبی یاد تھا جیسے سنگیت اور اس کی حسرت ناک بھرے اچھی طرح یاد تھی۔ امرتا رانی کی آخری اور شیو ناگ کی بدمست گستاخیاں بخوبی یاد تھیں لیکن خوف ناک اژدھوں اور زہریلے ناگوں کے بھیانک مسکن ناگ بھون کا نام بھی بھول چکا تھا۔

وہ حالات کے بے رحم منجدھار میں پھنس کے بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔

نیلم ناگ بھون میں قید تھی اور اس کے لڑکے کو یرغمال کے طور پر لینے کے لئے جل کماری کے گرگے نیلم کے عقوبت کدے میں پہنچ چکے تھے...... نیلم کی عصمت کو داغ دار کرنے کے لئے کالا ناگ راجہ چکر پوجا جشن منانے کے لئے تیاری کر رہا تھا...... امرتا رانی سون مندر میں شیو ناگ کی قید میں ذلت اور تحقیر کے عذاب میں مبتلا

کر کے پامال کی جا رہی تھی...... اس کا بے شمار پراسرار قوتوں والا منکہ بلاپور کی ویران حویلی کے جلے ہوئے ملبے میں دبا پڑا ہوا تھا جس کی نگہبانی...... شیو ناگ کے خون آشام کر کے کر رہے تھے...... انسانی نسل سے تعلق رکھنے والی پراسرار قوتوں کی مالک سنگیت اپنی ذات کی عظمت کو پا کر زندگی اور اس کے بکھیڑوں سے نجات پا چکی تھی اور اس کی حالت اس قدر رحم انگیز تھی کہ وہ کالی راجدھانی کے تمام نام بھول جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

وہ ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں میں سادھی پر جا پہنچا۔

اندر گلاب کے پھولوں سے لدی ہوئی سادھی کے نیچے فرش پر زندہ سانپ ابھی تک پھنکاریں مارتے رینگ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے قدم اندر رکھا۔ اس کے قدموں کے نیچے آنے والے سانپ کلبلا کر رہ گئے۔ پھر وہ ان زندہ سانپوں پر چلتا ہوا سادھی تک پہنچا۔ وہاں سے خوشبوؤں کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ مٹی کی اس عمارت کا ماحول اس قدر پراسرار اور ڈراؤنا تھا کہ اس پر رقت طاری ہونے لگی۔ اس نے سادھی کے پہلو سادھو مہاراجا کے بتائے مخصوص اشلوک یاد کر کے دہرائے...... سادھی میں اچانک دھماکا اور وہ جیسے شق ہو گئی۔ اس نے خوف زدہ ہو کر سر اٹھایا لیکن وہاں ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ کہیں بھی زمین شق ہونے یا کوئی حصہ زمین بوس ہونے کا آثار نہیں تھے۔

وہ چند لمحوں تک سہا سہا ہوا سا کھڑا رہا۔ پھر کسی تائید غیبی کے تحت آہستہ آہستہ سادھی کی جانب بڑھنے لگا۔

اور قریب پہنچ کر اس کے دل کی دھڑکن یک بیک تیز ہو گئی۔ سادھی کے سرہانے بنے ہوئے خالی چبوترے پر ایک متحرک سا سایہ نظر آیا جس کے خدوخال کسی پھنکے سے سانپ سے مشابہ تھے۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے ہر طرف دیکھا لیکن کہیں بھی کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے وہ سایہ پڑنے کا گمان ہو۔

نہ صرف یہ کہ وہ زمینی سایہ کسی زندہ سانپ کی طرح ہلکورے لے رہا تھا بلکہ اس کے منہ سے بار بار زبان کا سایہ باہر لپکتا نظر آیا تھا۔ اس نے اس پر غور کیا تو وہ لرز اٹھا۔ اس سائے میں سے پھنکاروں کی آواز بس خارج ہو رہی تھیں۔

”آکاش! تیرے اعمال تیرے اعصاب پر مسلط ہیں۔“ اچانک اس کے کانوں میں کوئی نادیدہ آواز گونجی۔ ”تو نے سانپوں کے حصار میں اور ناگنوں کے بستر پر جو دن گزارے ہیں وہ وہم بن کر تیرا تعاقب کر رہے ہیں...... یہاں کوئی سانپ ہے نہ سانپ کا سایہ...... یہ سب تیری گناہ گار آنکھوں کا فریب ہے جس سے نجات کا ملنا آسان نہیں ہے۔“

پھر اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں میں رینگتے ہوئے سانپ اس کے بدن پر چڑھ رہے ہوں۔ اس نے ان کے جسموں کی کراہت انگیز لس اپنی ٹانگوں پر محسوس کیا...... پھر وہ اس کے پیٹ اور پشت پر رینگتے ہوئے بے شمار سانپ اس کے بدن میں گھستے جا رہے ہوں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ دبا کر پے در پے چیخیں ماریں اور پھر فرط دہشت سے بے ہوش ہو گیا۔

جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو وہ مندر کے فرش پر پڑا ہوا تھا اور سورج کی شعاعیں دن کو منور کر رہی تھیں۔ سادھی بدستور گلاب کے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ فرش پر دور دور تک کسی سانپ تو کیا کیڑے کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ تازگی کے احساس سے اٹھا اور سادھی کے سرہانے نظر ڈالی تو وہاں بھی مٹی کے چبوترے پر کوئی پراسرار سایہ نہیں تھا۔

رات کے پرہول تجربے اور نادیدہ ندا کے بعد مندر کا یہ منظر اس کے لئے بے حد مسرت افزا تھا۔ اسے اپنا وجود کسی پھول کی طرح ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ دماغ پر کسی نامعلوم زندان سے رہائی کا لطیف احساس طاری تھا۔

اس نے پلٹ کر سادھی پر پڑے ہوئے گلاب کے تازہ پھولوں میں سے ایک اٹھانا چاہا لیکن اس کے ہاتھ

کے لمس سے وہ سارے پھول ببول کے کانٹوں کی طرح بن گئے...... اور فضا میں ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور مندر میں دھول کا طوفان سا آ گیا۔ نتھنوں میں مٹی گھسنے کے باعث اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

جب غبار کا طوفان صاف ہوا تو وہ سادھی تھی اور نہ اس کی نشانی تھی...... نہ ہی چھت تھی۔ سر پر کھلا آسمان نظر آیا تھا۔ مٹی کے دواروں میں گھرے ہوئے اس نے وحشت زدہ نظریں گھمائیں تو رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ دروازے پر شیوناگ بڑے سکون سے کھڑا ہوا تھا۔

"احمق آدمی...... ! شاکر پور یہاں سے چھ سات میل کے فاصلے پر ہے۔" وہ اس کی بدحواسی سے لطف اٹھاتے ہوئے زہر آلود لہجے میں بولا۔ "راستے میں ناجی نام کی وہ لڑکی بلاسبب نہیں ملی تھی...... عورت تیری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میرا یہ وار بھی بہت کامیاب رہا۔ تو نے جنگل کی تنہائی میں اس لڑکی سے خوب فائدہ اٹھایا اور اب پھر تجھارہ گیا...... تجھ جیسے پاپی کی مدد سادھو مہاراج کے بس کی بات بھی نہیں۔"

آکاش پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں بڑی بے چینی کی کیفیت میں اندھے شیوناگ کے چہرے اور اس کے بالوں کی جگہ باریک باریک سانپ اگے ہوئے تھے۔

میں تیری راہ پر لگ چکا ہوں اور تو لکھ کر رکھ لے کہ میں تجھے سسکا سسکا کر ماروں گا۔ اب تو ہر طرح اور لحاظ سے میرے شکنجے میں کسا جا چکا ہے۔" وہ استہزائیہ انداز سے قہقہہ مار کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

اب سارا کھیل آکاش کی سمجھ میں آ چکا تھا۔ اسے بہکا کر سادھو مہاراج کی ہدایت کی خلاف ورزی کرانے کے لئے شیوناگ نے جنگلات میں ایک جھوٹا ناٹک رچایا تھا۔ حالات ایسے پیدا کئے گئے تھے کہ وہ اس لڑکی کے فریب میں آ گیا تھا اور اسے شک تک نہ ہو سکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شیوناگ نے ہی اس کی گھوڑی غائب کی تھی تاکہ تنہائی میں وہ اس لڑکی کے ساتھ بہک جائے۔ آلودہ ہونے کے لئے مجبور ہو جائے۔ اس کے بعد سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوا اور اس نے مندر کا نام استعمال کر کے بے وقوف بھی بنایا تھا اس میں قید کر دیا تھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تو اذیتوں کے باوجود زندہ بچ گیا...... واقعی تو آسانی سے مرنے والوں میں سے نہیں ہے۔ تیری جان اور دل کی رانی...... سون مندر کی کوٹھری میں بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ اس کے بدن سے خون جاری ہے۔ اب وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل بھی نہیں رہی ہے...... اس کے بغیر تو نہ صرف سہارا بلکہ لاوارث ہو کر رہ گیا ہے......" شیوناگ نے اندر گھستے ہوئے سرد سفاک لہجے میں کہا۔

"آخر تو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟" آکاش نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ تو نے امرتا رانی اور منکے کے سہارے تو نے مجھے قدم قدم پر چوٹ دی ہے۔" وہ یک بیک خشونت بھرے لہجے میں بولا۔ "ہمارے بہت سے راز تو جان گیا تھا۔ مگر اب میں نے اپنی قوت کے سہارے وہ نام ہی تیرے ذہن سے مٹا دیئے ہیں۔ تیری پتنی تیرے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ امرتا رانی کا منکہ اب تیرے قبضے میں آ سکتا ہے اور نہ میرے پاس ہے۔ وہ میرے گرگوں کی نگرانی میں جلی ہوئی حویلی کے ملبے میں پڑا ہوا ہے۔ تیری اجازت کے بغیر میں نہیں لے سکتا...... تو وہ منکہ مجھے لینے کی اجازت دے دے تو میں تجھے چھوڑ دوں گا، تیرے لئے اتنی ہی سزا کافی ہے۔ لیکن ابھی تیری امرتا رانی...... یعنی ناگن رانی سے نمٹنا بھی باقی ہے۔ تیری خاطر اس نے اپنی جنم بھومی سے غداری کی ہے...... ناگ راجہ کو چھوڑ دیا ہے۔ پھر مجھ پر وار کئے ہیں...... میں اپنی پگھلی ہوئی آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتا...... اب بھی میں نے اسے بہت ذلیل کیا ہے لیکن منکہ قبضے میں لئے بغیر میں اس پر اپنی شکتیاں آزما نہیں سکتا...... اس وقت تک منکہ بالکل بے کار ہے...... نہ وہ تیرے کام کا ہے اور نہ ناگ رانی کے پاس آ سکتا ہے۔ اور نہ ہی میں اسے چھو سکتا ہوں۔ تو مجھے وہ دے کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔"

اس کی بکواس نما تقریر خاصی موثر تھی عہد خاصی طویل تھی۔

لیکن وہ خوب جانتا تھا کہ شیوناگ جھوٹا، مکار اور فریبی ہے۔ ایک مرتبہ منکہ ہاتھ میں آتے ہی وہ نہ صرف امرتا رانی بلکہ اسے بھی ناقابل بیان اذیتوں میں مبتلا کردیتا...... اب اس کے لئے زندگی کی موہوم سی امید اس حد تک باقی تھی جب تک منکہ شیوناگ کے ہاتھوں سے بچا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں ممکن تھا کہ سادھو مہاراج کی جانب سے اس کے پاپ کو نظر انداز کیا جاتا اور وہ کسی طرح اس مندر پہنچ جاتا جہاں پنڈت بھگت رام سادھو مہاراج کی سادھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس مہا سادھو مہاراج سے اس کے مصائب کا خاتمہ ہوجائے۔

''وہ منکہ وہیں رہے گا اور اسے وہیں رہنے دو......'' آکاش نے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''امرتا رانی کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ اس کے بدن پر تجھ جیسے آوارہ، دغاباز اور مکار کا تصرف ہے۔''

''تیرے دماغ میں کیڑے ابھی تک کلبلا رہے ہیں۔'' وہ غضب ناک انداز میں دہاڑا۔ ''تو اب تیار ہوجا...... چکر پوجا اسی جگہ ہوگی۔ اور تو اپنی آنکھوں سے ناگ راجہ کے ہاتھوں اپنی پتنی کی آبرو لٹتی دیکھے گا تو موت کی آرزو کرے گا۔ لیکن تو زندہ رہے گا۔ یہاں انسانوں کا روپ بدلنے والے ناگ اور ناگنیں جمع ہوں گی۔ ان کے جھرمٹ میں تیری نسل کی خوب صورت لڑکیاں اور کڑیل جوان بھی ہوں گے اور پھر یہاں عیش ونشاط کی محفل جمے گی۔''

''نہیں...... نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ کر بولا۔ ''تو نہیں جانتا میری پتنی کو...... کمینے...... ذلیل اور پاجی...... وہ کسی بھی ناگ اور دنیا کا کیسا ہی خوب صورت، وجیہہ اور تصوراتی محبوب کیوں نہ ہو اسے میرے سوا کسی کو قریب نہ آنے دے گی...... نہ ہی ناگ راجہ کو...... اسے کیا ہر مرد کے منہ پر تھوک دے گی۔''

بڑے سفاکانہ انداز سے ہنسا۔ پھر قہقہے مارتا اور ہنستا رہا۔ پھر استہزائیہ انداز سے بولا۔

''ناگ راجہ ایک ایسا کڑیل اور خوبرو جوان ہے کہ ہر وہ ناگنیں جو لڑکیوں، عورتوں کا روپ بدلتی ہیں اس کی آغوش کی تمنا کرتی ہیں اور تڑپتی ہیں...... اور وہ تیری نسل کی کوئی بھی لڑکی عورت...... اسے مرد کے روپ میں دیکھا کہ خود کو اس کے گرم جوشی سے سپرد کردیا...... اس لئے کہ وہ ایک نوجوان عورت ہے...... جب ناگ راجہ ایک کڑیل کے مرد کے بہروپ میں آکر اسے شراب پلائے گا تو وہ اس کے نشے میں آکر اپنے آپ کو بے لباس کرکے اس کے سپرد کردے گی...... عورت کیسی ہی پارسا کیوں نہ ہو وہ مرد سے بے نیاز زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتی...... یہ عورت کی فطرت ہے...... تو دیکھے گا تو خاکستر ہوکر رہ جائے گا۔''

''تو جھوٹا ہے...... یہ ہرگز نہیں ہوگا...... اگر ایسا ہوا تو میں نیلم کو خود اپنے ہاتھوں سے ماردوں گا۔'' آکاش پر وحشت سوار ہوگئی تھی اور اس احساس نے صدمہ سے دو چار کردیا تھا اور اس کی آواز بھرانے لگی۔

ایک پل کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے تاروں کی کہکشاں کوندی اور ذہن پر رینگ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار شیوناگ سے اس کا دست بدست مقابلہ ہوچکا تھا لیکن اس بار اس اندھے موذی کا رویہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے اس کا حریف کوئی نہ سمجھ جوشیلا بچہ ہو۔ وہ اس کی پنڈلیوں سے لپٹا اسے زمین پر گرادینے کی سرتوڑ کوشش کرتا لیکن یا تو غصے اور خوف کے باعث اس کی توانائی منتشر ہوچکی تھی یا اس بار وہ زیادہ شہ زور ہوچکا تھا کہ اس کے قدم نہ اکھاڑ سکا اور وہ زور زور سے پاگلوں کی طرح ہنستا رہا۔

پھر شیوناگ نے نیچے جھک کر اس کے بال اپنے ہاتھ کی مٹھی میں جکڑے...... اس کے منہ سے مغلظات اور کرب میں ڈوبی ہوئی چیخوں کا طوفان امڈ پڑا لیکن وہ آکاش کو اوپر ہی اٹھاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس کے قدم زمین سے اٹھ گئے اور اس کے بال اس کی مٹھیوں میں دبے ہوئے تھے اور بدن فضا میں معلق تڑپ رہا تھا۔

آکاش نے اس کے جابجا پھولے ہوئے سیاہ چہروں پر نظر ڈالی۔ اس کے بصارت سے محروم...... پھٹی ہوئی آنکھوں کا رخ اس کی ہی جانب تھا جیسے اس کی حالت کو بھانپ رہا ہو اور تیور دیکھے جا رہا ہو۔

آکاش سے رہا نہیں گیا تو اس نے تکلیف سے تڑپ کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا...... چٹاخ کی آواز کے ساتھ ہی اس کے چہرے کی سیاہی کچھ اور زیادہ گہری ہوگئی۔ اس کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے تو وہ بدنما، مکروہ اور کریہہ ہوگیا۔ کسی آدم خور کی طرح دکھائی دینے لگا۔ آکاش کے تھپڑ نے اسے دہلا کے رکھ دیا تھا۔

پھر اس شیوناگ نے بے رحمی کے ساتھ آکاش کو فرش کے وسط میں اچھال دیا اور خود مزید کچھ کہے بغیر تیز تیز قدموں سے لوٹ گیا جیسے آکاش سنبھل کر پھر اس کے چہرے کا جغرافیہ نہ بگاڑ دے۔

لیکن آکاش میں اتنی ہمت اور سکت کہاں تھی کہ تھپڑ تو درکنار ہاتھ کو حرکت دے سکے۔ کیوں کہ شیوناگ نے اسے کسی قابل ہی نہ چھوڑا تھا...... زمین پر گرنے کے بعد وہ کئی لمحوں تک اٹھ نہ سکا۔ اس کی کمر اور کولہے کی ہڈیوں پر شدید ضرب آئی تھی۔ آخر اس نے کراہتے ہوئے سر گھمایا تو مٹی کی اس عمارت کا دروازہ غائب ہوچکا تھا۔ جس سے پچھلی رات میں وہ اور تھوڑی دیر قبل شیوناگ آیا تھا۔ مٹی کی اونچی اونچی دیواروں پر ناقابل بیان ویران اور ڈراؤنے پن کا راج تھا۔ جاڑوں کا سردی سے کانپتا ہوا سورج کھلی چھت میں سے چمکتا نظر آیا تھا۔

وہ کافی دیر تک کوشش اور جدوجہد کے بعد لنگڑاتا ہوا زمین پر سے اٹھا تو درد کی شدت نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ حالات کی بے رحمی اور اپنی بے بسی اور صدمات کے احساس سے اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس کا سینہ کٹ رہا تھا۔ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ خیال اس کا دل مروڑ رہا تھا کہ نیلم کی محبت ابھی تک اس کے دل میں عزم کی مشعل کو فروزاں کئے ہوئے تھی۔

''اوہ میرے ایشور میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں؟'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس کی آواز گلے میں رندھ رہی تھی۔ ''کیا تو مجھے اس گرداب سے نکال نہیں سکتا......؟ آخر مجھے کسی جرم کی اس قدر بھیانک سزا مل رہی ہے......؟ کیا اپنی پتنی کو تلاش کر کے بازیاب کرنا سنگین جرم ہے؟''

''اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی تو وہ چکرا کے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

وہ خاصی دیر تک یوں ہی زمین پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اچانک محسوس کیا کہ اس کے شریر پر کراہیت آمیز سرسراہٹیں رینگنے لگی ہیں...... اس نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنے جسم کی طرف دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تو وہ ایک دم سے ایک جھٹکے سے کھڑے ہو کر ایک سمت اندھا دھند دوڑ پڑا۔

مٹی کے اس احاطے میں زمین سے مکروہ حشرات الارض کے لمحوں کے غول اُمڈ پڑے تھے۔ کئی کئی انچ لمبے، کلبلاتے ہوئے سرخ اور سیاہ کن کھجورے اس کے بدن پر چڑھ کر اپنے نوکیلے پنجے گاڑ دیئے تھے۔ بڑی بڑی خون آشام جونکیں اس کے بدن سے چمٹ پڑی تھیں۔ ان کی چیخیں دردناک تھیں۔

وہ کرب اور خوف سے چیختا ہوا بے بس رحم احاطے میں اندھوں کی طرح دوڑتا رہا لیکن اس کی آواز اس ویرانے میں ڈوبتی رہیں۔ وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی مظلومیت پر رحم کھاتا۔

آخر کار وہ بری طرح تھک ہار کے ہانپتا ہوا زمین پر گر پڑا۔

خون آشام کیڑے اس پر فتح پا چکے تھے۔ اس کے ہاتھ پیروں کی مزاحمت انہیں روک نہ سکیں اور وہ کیڑے اس کی تمام شریانوں میں دوڑتا ہوا گرم گرم زندہ خون چوسنے لگے...... ناقابل برداشت ٹیسیں اس کے بدن میں سرایت کرنے لگیں۔ نقاہت کی چادر تیزی کے ساتھ اس کے حواس کے گرد لپٹتی جا رہی تھی اور اسے شیوناگ کے بھیانک عزائم پورے ہوتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

(جاری ہے)

گڑیا

فلک زاہد۔ لاہور

کھلونے کے پشت پر لگے بٹن کو پش کرتے ہی اندر سے آواز خارج ہونے لگی جسے سنتے ہی خوبرو حسینہ دہشت سے لرزا بر اندام ہو کر تھر تھر کانپنے لگی اور پھر وہ ہوگیا جس کا تصور ناممکن تھا۔

عجیب وغریب خوفناک اور جسم کے رونگٹے کھڑے کرتی ایک ظالم کی خون میں لت پت کہانی

مسٹر اینڈ مسز مائیکل کو اپنے گھر کی صفائی ستھرائی کے لئے کسی ملازمہ کی تلاش تھی۔ یہ معمر جوڑا امریکا کے شہر شکاگو میں رہتا تھا اور بے اولاد تھا۔ بالآخر بہت دنوں کی تلاش کے بعد مسٹر میڈیکل کو اپنے دوست کے توسط سے گھر کے لئے ایک ملازمہ مل گئی جس کا نام مارگریتا تھا، مارگریتا خوبرو جواں سال لڑکی تھی جو یتیم ہونے کے ساتھ غریب بھی تھی۔ لہٰذا اس نے معمر جوڑے کے گھر کام کرنے کو ترجیح دی کیونکہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے اسے کام کی سخت ضرورت تھی۔

معمر جوڑے نے اپنی طرف سے مارگریتا کی تسلی کی اور مطمئن ہو کر اسے اپنے گھر کی صفائی ستھرائی کا کام سونپ دیا۔

مسٹر مائیکل کی بیوی کو گڑیوں کا بے حد شوق تھا، اسی شوق کی بنا پر ان کے گھر کا ایک مکمل کمرہ گڑیوں

سے بھرا پڑا تھا ہر قسم کی نئی اور پرانی طرز کی گڑیاں جمع کرنا مسز مائیکل کا شوق ہی نہیں بلکہ جنون تھا چونکہ وہ بے اولاد تھیں لہٰذا گڑیوں کو اپنے بچے سمجھ کر ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

مارگریتا کا کام گھر کی صفائی ستھرائی کے علاوہ گڑیوں کو ہفتے میں ایک بار صاف ستھرا کرنے کا بھی تھا۔

مسز مائیکل نے مارگریتا کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ گڑیوں کا خاص خیال رکھے اور ان کی صفائی ستھرائی میں کوئی کوتاہی نہ برتے۔ مارگریتا نے سعدت مندی سے ان کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کیا۔

مارگریتا کو گڑیوں سے بے انتہا نفرت تھی، کیوں نفرت تھی، وہ خود نہیں جانتی تھی پہلے پہل یہ نفرت صرف خوف تک محدود تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مارگریتا کا گڑیوں سے خوف نفرت میں تبدیل ہوگیا گڑیوں کو دیکھتے ہی مارگریتا پر جنون طاری ہونے لگتا تھا، اسے گڑیوں سے گھن آتی تھی۔ گڑیوں سے اتنی نفرت شاید وہ پیدائش کے وقت سے ساتھ لے کر آئی تھی اس لئے تو وہ کبھی بچپن میں بھی گڑیوں کے ساتھ نہیں کھیلی تھی۔

بچپن کا وہ سنہری دور جب بچیاں بڑے شوق سے گڑیوں کے بال بناتی ہیں انہیں کپڑے پہناتی ہیں۔ یہ سب مارگریتا نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس نے آج تک کسی گڑیا کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا گویا اس کے ہاتھ لگانے سے کسی بڑی آفت کا اندیشہ ہو۔ مگر اب جبکہ وہ غریب تھی اور یتیم بھی لہٰذا پیسہ کمانے کے لئے اسے یہ نوکری قبول کرنی پڑی۔

مارگریتا کا بچپن اور لڑکپن یتیم خانے میں گزرا جو اس کی زندگی کا سب سے کٹھن دور تھا، وہ کس کے گناہوں کی نشانی تھی وہ نہیں جانتی تھی کیوں اور کون اسے یتیم خانے میں پھینک گیا وہ کچھ نہیں جانتی تھی نہ ہی اس نے کبھی ان سوالوں کے جھنجھٹ میں خود کو ڈالنے کی کوشش کی۔

دن گزرتے رہے اور ان تمام دنوں میں مسٹر اینڈ مسز مائیکل کو مارگریتا نے کسی بھی طرح کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ دونوں مارگریتا سے خوش تھے اور مارگریتا بھی ان کے گھر کام کر کے مطمئن تھی کیونکہ معمر جوڑا اسے اچھی تنخواہ دیتا تھا جس وجہ سے اس کا گزارہ اچھا ہوتا تھا۔

آج پورا ایک ہفتہ ہوگیا تھا جس کا مطلب تھا کہ گڑیوں کو صاف کرنے کا دن آ گیا تھا چنانچہ مارگریتا اس کمرے میں آئی جہاں ہر قسم کی بے شمار گڑیاں شیلفوں پر آویزاں تھیں۔

گڑیوں کو دیکھتے ہی مارگریتا کا موڈ آف ہوگیا اس نے نفرت بھری نگاہ گڑیوں پر ڈالی اور ایک گہری سانس خارج کر کے لمحے بھر کے لئے گڑیوں کے متعلق ان تمام باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا جو وہ گڑیوں کے متعلق سوچتی تھی۔

مارگریتا ایک کپڑے کی مدد سے گڑیوں پر لگی گرد صاف کرنے لگی۔ صرف پیسے کے لئے مارگریتا اپنے دل پر پتھر رکھ کر گڑیوں کی صفائی ستھرائی برداشت کر رہی تھی ورنہ وہ ہاتھ لگانا تو در کنار کسی گڑیا کو غور سے دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی تھی۔

آج زندگی میں پہلی مرتبہ ڈرتے ڈرتے مارگریتا نے گڑیوں کو ہاتھ لگایا تھا اس سے پہلے ایسا کبھی اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ گڑیوں سے خوف مارگریتا کا بے جا بھی نہیں تھا کیونکہ بہت سے لوگوں نے گڑیوں کے متعلق بہت سی عجیب و غریب باتیں منسوب کر رکھی ہیں۔

مثال کے طور پر گڑیوں کے اندر "آسیب، جنات یا پھر انسانی روح سما جاتی ہے۔" وغیرہ وغیرہ ایسی اور بہت سی باتیں جنہیں لے کر فلم بنانے والوں نے بھی بڑھ چڑھ کر کامیاب فلمیں بنائی ہیں۔

قسمت کے کھیل بھی نرالے ہیں قدرت نے مارگریتا کو اسی جگہ سے روزی عطا کی تھی جس کے بارے میں مارگریتا نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، نہ ہی سوچ سکتی تھی کہ وہ ایک دن گڑیوں کو صاف کرنے کے عوض پیسہ کمائے گی جن سے اسے کسی قدر نفرت تھی یونہی باری

باری ایک ایک گڑیا کو صاف کرتے کرتے مارگریتا ایک ایسی گڑیا کے پاس آئی جو دوسری گڑیوں سے بالکل الگ اور عجیب تھی۔

مارگریتا پہلے تو کچھ لمبے بڑے غور سے اس گڑیا کو دیکھتی رہی جو شیلف پر بے حس و حرکت سامنے کی جانب آنکھیں کھولے بیٹھی تھی مارگریتا نے ہمت کر کے اس گڑیا کو اٹھا ہی لیا گڑیا کے سنہری بال تھے اور نیلی آنکھیں تھیں جو سیدھا مارگریتا کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور منہ ہنسنے کے سے انداز میں تھوڑا سا کھل ہوا تھا کافی دیر اس عجیب گڑیا کو یونہی دیکھنے کے بعد مارگریتا اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی کہ معاً مارگریتا کی نظر گڑیا کے پشت پر لگے بٹن پر گئی جسے دیکھتے ہی مارگریتا سمجھ گئی کہ یہ گڑیا محض عام گڑیوں کی طرح نہیں بلکہ بولنے والی گڑیا ہے جو یقیناً سیل سے چلتی ہے۔

مارگریتا میں دلچسپی بڑھی اور اس نے گڑیا کی پشت پر لگا بٹن دبا دیا۔ جس کے دبتے ہی وہ گڑیا بچوں کی سی آواز میں بولی۔ ''ہیلو'' گڑیا کے لب ہلے اور گول مٹول نیلی آنکھیں ادھر ادھر گھوم کر ساکت ہوگئیں۔

مارگریتا نے گڑیا کی پشت پر لگا بٹن ایک بار پھر دبا دیا۔ ''میں اپنی ماما سے بہت پیار کرتی ہوں۔'' گڑیا بچوں کی سی آواز میں کہہ کر ایک بار پھر بے حس و حرکت ہوگئی۔

مارگریتا نے بغیر کسی تاثر کے اس بولتی گڑیا کو صاف کر کے واپس اسے اس کی جگہ پر رکھ دیا اسے اس بولتی گڑیا نے بھی متاثر نہیں کیا تھا اس کے نزدیک معمر خاتون کسی قدر بے وقوف عورت تھی جو اتنی عمر ہو جانے کے باوجود گڑیوں کا شوق رکھتی تھی، لیکن شوق کا کوئی مول نہیں اس سوچ کے پیش نظر مارگریتا نے اپنا سر جھٹکا اور اس منحوس کام سے جلد فراغت پانے کے لئے باقی بچی گڑیوں کو صاف کرنے کی غرض سے ان کی جانب بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

اگلے چند ہفتے آرام و سکون سے گزر گئے۔ آج پھر ایک اور ہفتہ آن وارد ہوا جس کا مطلب تھا گڑیوں کی صفائی ستھرائی والا دن۔ مارگریتا حسب معمول گڑیوں

راجہ چوک

ایک نشئی، نشے میں دھت راجہ چوک میں کھڑا ہو کر ٹیکسی والے سے مخاطب ہوا، مجھے راجہ چوک جانا ہے، کتنے روپے لوگے، ٹیکسی ڈرائیور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔

''پچاس روپے۔'' نشئی بولا۔ ٹھیک ہے جائز مانگے ہیں اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کھڑی گاڑی کو زور سے ریس دی اور ایک منٹ کے بعد ڈرائیور بولا۔ جناب راجہ چوک آگیا ہے۔ نشئی بولا۔ لو جناب! اپنا کرایہ پچاس روپیہ میری ایک بات لازمی مانا کہ گاڑی ذرا آہستہ چلایا کرو۔

(محمد اسحاق انجم۔ کنگن پور)

کے کمرے میں آ کر ایک ایک کر کے کپڑے سے گڑیوں پر لگی گرد و غبار صاف کرنے لگی جب ہی غلطی سے اس کی کہنی شیلف پر پڑی ایک گڑیا پر جا لگی جو دھڑام سے فرش پر گر کر کرچی کرچی ہوگئی اس اچانک حادثے پر مارگریتا بوکھلا کر رہ گئی۔ وہ اس حادثے کے لئے تیار نہیں تھی جو ہوا تھا محض ایک غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔

مارگریتا نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا تھا گڑیا کے ٹوٹنے کی آواز معمر خاتون نے اپنے کمرے تک سنی اور یہ جاننے کے لئے کہ کیا ہوا ہے؟ اس کمرے میں آئی جہاں فرش پر بکھرے ہوئے گڑیا کے ٹکڑوں نے اس کا استقبال کیا۔ اپنی پیاری گڑیا کو یوں فرش پر بکھرا دیکھ کر معمر خاتون کے چہرے پر نہایت کرب و اذیت کے آثار نمودار ہوئے جنہیں دیکھ کر مارگریتا فوراً سے پہلے گھبرا کر ٹوٹے لفظوں میں بولی۔ ''مجھے معاف کر دیجیے یہ سب غلطی سے ہوا ہے میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا

میرا یقین کیجیے۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہے میرا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

مارگریتا کی بات سن کر معمر خاتون نے اسے کھاجانے والی نظروں سے گھورا جسے دیکھ کر مارگریتا سہم کررہ گئی۔”میں نے تم سے کہا تھا کہ ان کا خاص خیال رکھنا پھر یہ سب کیسے ہوگیا؟“ معمر خاتون حلق پھاڑ کر چلائی۔

مارگریتا کانپ کررہ گئی۔”جی......وہ......“

”کیا وہ......؟ کیا جی...... وہ؟ جب میں نے کہا تھا تم سے تو تم اتنی لاپروہ کیسے ہوسکتی ہو؟“ معمر خاتون دھاڑی۔ مارگریتا خوف زدہ سی ایک طرف کوسمٹی ہوئی کھڑی تھی، معمر خاتون کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی اسی وقت مارگریتا کو چلتا کردے گی مگر وہ ایسا کرنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ پہلے ہی انہیں بڑی مشکل سے مارگریتا ملی تھی اسے کھو کر انہیں مزید کئی دن نئی ملازمہ کے لئے خوار ہونا پڑتا اس لئے معمر خاتون اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔”میں تمہیں ایک ہی شرط پر اس نوکری پر رکھوں گی اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ تم پہلے سے بھی زیادہ گڑیوں کا خاص خیال رکھوگی۔“

مارگریتا نے سہم کر جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔”جی میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ ان کا پہلے سے بھی زیادہ بہت خیال رکھوں گی۔“

معمر خاتون نے ناگواری سے مارگریتا کو دیکھا اور سخت لہجے میں فرش پر بکھرے گڑیا کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔”ایک منٹ سے پہلے پہلے انہیں صاف کرو اور اب جاؤ یہاں سے کل آجانا۔“ معمر خاتون غصے سے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ جبکہ مارگریتا وہیں کھڑی پیچ وتاب کھاکررہ گئی اسے اس وقت معمر خاتون کتنی زہر لگ رہی تھی یہ وہ اور اس کا خدا ہی جانتے تھے۔

جو ہوا تھا محض ایک حادثہ تھا اس میں مارگریتا کی کسی بھی طرح کی سازش کا عمل دخل نہیں تھا لیکن پھر بھی معمر خاتون نے مارگریتا کو محض ایک گڑیا کی خاطر اس قدر ذلیل کیا تھا کہ مارگریتا سے برداشت نہیں ہورہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی اسی وقت معمر خاتون وجان سے ماردے مگر وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی اس نے نفرت بھری نگاہ فرش پر ٹوٹی ہوئی گڑیا پر ڈالی اس کا دل معمر خاتون سے خراب ہوگیا تھا، اتنا خراب ہوا کہ وہ بیٹھے بیٹھے نفرت میں بدل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نفرت نے اس قدر شدت پکڑی کہ انتقام کا روپ دھار لیا، اب اس نے معمر خاتون سے انتقام لینا تھا اپنی بے عزتی کا انتقام۔ اسی انتقام کے زیر اثر اس کے دماغ نے ایک شیطانی منصوبہ بنایا جس کے آتے ہی مارگریتا کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

مارگریتا کو اس معمر جوڑے کے گھر کام کرتے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے تھے اور ان تمام ہفتوں میں اس نے کبھی اس جوڑے کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا لیکن آج محض ایک غلطی کی وجہ سے معمر خاتون نے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔

اب مارگریتا اپنی توہین کا بدلا ہر حال میں لینا چاہتی تھی اب اسے صرف صحیح موقع کی تلاش تھی اسے رہ رہ کر معمر خاتون پر غصہ آرہا تھا اس کا بس چلتا تو وہ ابھی اسی وقت معمر خاتون کو ابدی نیند سلا دیتی مگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ معمر خاتون کو اسی کے ہتھیار سے تکلیف پہنچانا چاہتی تھی جس ہتھیار کی خاطر معمر خاتون نے اسے تکلیف دی تھی۔ اپنے شیطانی منصوبے کی وجہ سے مارگریتا کا غصہ ٹھنڈا تو ہوگیا مگر نفرت اور انتقام ہنوز برقرار رہا۔ وہ فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر جھاڑو اور کچرا اسٹینڈ کی مدد سے گڑیا کی کرچیاں صاف کرنے لگی۔

اگلے دن مارگریتا معمر جوڑے کے گھر اکیلی تھی دونوں میاں بیوی فلم دیکھنے سینما گئے ہوئے تھے۔ مارگریتا کا موڈ آج بھی بہت خراب تھا وہ ابھی تک اپنے اوپر گزری ہوئی زیادتی کو نہیں بھلا پائی تھی۔ اس نے اپنے دل میں معمر خاتون کے لئے بغض پال لیا تھا وہ کسی بھی قیمت پر معمر خاتون کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

وہ اس وقت کچن میں بیٹھی معمر جوڑے کی چاکلیٹ کھارہی تھی جب ہی اس کے دماغ میں اس کا بنا

شیطانی منصوبہ آیا جس کے آتے ہی مارگریتا کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ دوڑ گئی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ اچھا موقع تھا۔

چنانچہ وہ کچن سے اٹھ کر اس کمرے میں آئی جہاں بے شمار تعداد میں رنگ برنگی گڑیاں شیلفوں پر آویزاں تھیں ان کو دیکھتے ہی مارگریتا کا خون کھول اٹھا وہ چلتی ہوئی ایک گڑیا کے پاس آئی اور اسے ہمت کر کے اٹھالیا براؤن بالوں اور سبز آنکھوں والی وہ گڑیا بہت ہی عجیب تھی۔

"بڑھیا تو نے مجھے محض ایک گڑیا کی خاطر اتنا ذلیل کیا اب میں تجھے بتاؤں گی کہ کوئی بھی چیز انسانی جان سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔" مارگریتا نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا اور پوری قوت سے اس گڑیا کو فرش پر دے مارا، فرش پر گرتے ہی گڑیا کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھر گئے جس پر مارگریتا مسکرانے لگی گڑیا کو توڑ کر اسے عجیب سی مسرت کا احساس ہوا اس کی کرچیوں کی آواز پر اس پر عجیب سا نشہ چھا گیا اس کی آنکھیں نشیلے انداز میں بوجھل ہونے لگیں جن گڑیوں سے اسے اس قدر نفرت تھی آج اسے توڑ کر مارگریتا کو بے پناہ سرور محسوس ہو رہا تھا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی برسوں کی پیاسی روح کو تسکین مل گئی ہو۔

اسی لمحے مارگریتا نے ایک اور گڑیا کو شیلف سے اٹھایا اور اسے دیکھتے ہوئے نفرت سے بڑبڑائی۔ "وہ بڑھیا تم سب سے بہت پیار کرتی ہے ناں؟ لیکن مجھے تم گڑیوں سے اتنی ہی نفرت ہے۔" مارگریتا نے حقارت سے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس گڑیا کو بھی نفرت سے فرش پر دے مارا گڑیا کی کرچیوں کی آواز پر مارگریتا کے جسم میں سرور کی لہریں دوڑنے لگیں اسے یہ سب کرتے ہوئے بے پناہ تسکین اور خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

مارگریتا نے شیلف پر سے ایک اور گڑیا اٹھائی "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن مجھے اسی چیز کی وجہ سے اتنا ذلیل ہونا پڑے گا جس سے مجھے اس قدر نفرت ہے جبکہ اس منحوس گڑیا کے ٹوٹنے پر میرا کوئی قصور بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ بڑھیا مجھ پر چلائی کیوں؟" مارگریتا نے نفرت و غصے سے چیختے ہوئے وہ گڑیا بھی فرش پر دے ماری جو فرش پر گرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

"میں پوچھتی ہوں کیوں کیا اس نے ایسا۔" مارگریتا غصے سے چلا رہی تھی اس پر جنون طاری ہونے لگا تھا۔ "کیوں کیا اس نے میرے ساتھ ایسا۔" وہ پاگلوں کی طرح چلاتی ہوئی ایک ایک گڑیا کو فرش پر پھینکتی جا رہی تھی۔

اسی اثناء میں معمر جوڑا کمرے میں داخل ہوا، وہ شاید فلم دیکھ کر لوٹ آئے تھے اور غالباً مارگریتا کے چلانے کی آوازیں سن کر یہاں آئے تھے انہوں نے جو مارگریتا کو گڑیوں کو توڑتے دیکھا تو معمر خاتون غم و غصے سے حلق پھاڑ کر چلائی۔ "یہ کیا کر رہی ہو تم۔" معمر خاتون کی آواز سن کر مارگریتا جہاں تھی وہیں رک گئی۔

معمر جوڑے کے یوں اچانک چلے آنے سے مارگریتا بالکل بھی نہیں گھبرائی گو کہ اسے ان کے جلد آجانے کی قطعی کوئی امید نہیں تھی مگر پھر بھی اس کے چہرے پر شرمندگی یا پھر ڈرے سہمے سے کوئی آثار نہیں تھے گویا اس نے جو کیا تھا ٹھیک کیا تھا۔ اسے اپنے کئے پر کوئی ندامت نہیں تھی، ہوتی بھی کیسے معمر خاتون نے کون سا محض ایک گڑیا کی خاطر اسے ذلیل کرنے سے پہلے کچھ سوچا تھا لہٰذا وہ بڑی سفاکی کے ساتھ دونوں کے سامنے مطمئن کھڑی تھی۔

معمر خاتون نے مارگریتا کو نہایت قہر آلود نظروں سے گھورا اور دوسرے ہی لمحے اپنی پیاری گڑیوں کو دیکھا جو اسے اسی طرح عزیز تھیں جس طرح ایک ماں کو اپنے بچے عزیز ہوتے ہیں۔

معمر خاتون جذباتی ہو کر فرش پر بکھری اپنی پیاری گڑیوں کی جانب لپکی اور فرش پر گھٹنے ٹیک کر گڑیوں کی کرچیاں اپنے گرد جمع کرنے لگی معمر خاتون کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس کے شوہر مسٹر مائیکل بھی اپنی بیگم کے برابر بیٹھ کر انہیں دلاسے دینے لگے۔ معمر خاتون کو اس حالت میں دیکھ کر مارگریتا

کوانجانی خوشی محسوس ہوئی۔ اس نے معمر خاتون سے اپنی بے عزتی کا اچھا انتقام لیا تھا۔ اس نے معمر خاتون کواس کے ہتھیار سے ٹھیس پہنچائی تھی جس کی خاطر اس نے مارگریتا کو ذلیل کیا تھا۔

معمر خاتون نے قہر برساتی نگاہوں سے مارگریتا کو دیکھا اور روتے ہوئے نفرت و غصے سے چلائی ۔''کیوں کیا تم نے ایسا۔'' مسٹر مائیکل سیدھے سادھے سے شریف آدمی تھے وہ اپنے گھر کوئی تماشہ کھڑا نہ کرنا چاہتے تھے انہوں نے جو اپنی بیوی کو شدید غصے اور نفرت میں دیکھا تو فوراً سے پیشتر مارگریتا کو چلے جانے کے لئے کہا۔''تمہیں نوکری سے نکالا جاتا ہے چلی جاؤ یہاں سے دوبارہ یہاں قدم بھی مت رکھنا آئی سمجھ اگر دوبارہ مجھے یہاں نظر آئی تو تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم زندگی بھر یاد رکھوگی۔'' مسٹر مائیکل نے سخت آواز میں کہا اور ساتھ ہی اپنی بیگم کو سمجھانے لگے۔

مارگریتا نے نفرت سے دونوں میاں بیوی کی جانب دیکھا اور اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں سمیٹ کر معمر جوڑے کے گھر سے چلتی بنی۔ پہلے اس کے دل میں صرف معمر خاتون کے لئے بغض تھا مگر اب مسٹر مائیکل کے لئے بھی اس کے دل میں نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی سے اپنی بے عزتی کا اس سے بھی بہتر بدلا لینا چاہتی تھی لہٰذا وہ ایک بار پھر شیطانی منصوبہ ترتیب دینے لگی۔

☆......☆......☆

آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ گلیاں سڑکیں سنسان و ویران تھیں ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ چاند اور ستاروں سے آسمان مکمل صاف تھا چار سو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایسے میں ایک ہیولہ متواتر اپنی منزل کی جانب چلا جارہا تھا۔ وہ ہیولہ نجانے کب سے چل رہا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ ہیولہ ایک گھر کے سامنے ایستادہ تھا۔ ہیولے نے ایک نظر احتیاطاً ادھر ادھر دیکھا ہر طرف پرہول اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چاروں طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ ہیولہ چلتا ہوا گھر کے پچھلی جانب آیا اور گھر کے پیچھے پڑے بے شمار پتھروں میں سے ایک پتھر کے نیچے سے چابی اٹھائی اور گھر کا پچھلا دروازہ کھول کر خاموشی سے اندر داخل ہوگیا۔

گھر کے اندر بھی مکمل اندھیرے اور خاموشی کا راج تھا۔ وہ ہیولہ اندھیرے سے بے نیاز دروازہ بند کرکے یوں آگے بڑھ گیا جیسے اسے اس گھپ اندھیرے میں بھی دن کی روشنی کی طرح نظر آرہا ہو۔ شاید وہ ہیولہ گھر کے کونے کونے سے اچھی طرح واقف تھا جبھی تو اس گھپ اندھیرے میں بھی بغیر کسی رکاوٹ کے کچن تک آن پہنچا اور کچن کی شیلف سے گوشت کاٹنے والی بڑی تیز دھار چھری اٹھالی اس تیز دھار چھری کو دیکھ کر اس ہیولے کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ ایک بار پھر اندھیرے کو شکست دیتا با آسانی بیڈ روم تک آیا جس کا دروازہ اس نے بغیر کسی آواز کے اندر کو دھکیل دیا۔ دروازہ کے کھلتے ہی اس ہیولے کو بیڈ پر دراز دو انسانی جسم بے خبر سوتے دکھائی دیئے۔ وہ ہیولہ دبے قدموں کمرے کے اندر داخل ہوگیا اور اگلے ہی لمحے وہ ان دونوں کے سر پر سوار تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن صبح کا سورج مسٹر اینڈ مسز مائیکل کے لئے آفت ناگہانی بن کر نکلا دونوں میاں بیوی اپنے بستر پر مردہ پائے گئے دونوں کو سب سے پہلے اس حالت میں دیکھنے والے ان کے سب سے قریبی دوست مسٹر جیراڈ تھے جو اپنی فیملی کے ساتھ اس معمر جوڑے کے گھر چند دن رہنے کے لئے دوسرے شہر سے آئے تھے مگر جب کئی بار بیل بجانے پر معمر جوڑے نے دروازہ نہ کھولا تو انہیں تشویش لاحق ہوئی۔

وہ ابھی کھڑے کچھ سوچ ہی رہے تھے جب ان کے سب سے چھوٹے بیٹے نے انہیں گھر کا پچھلا دروازہ کھلا ہونے کی اطلاع دی، جب وہ اپنی فیملی سمیت پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو انہیں یوں محسوس ہوا

جیسے گھر میں کوئی نہ ہو کیونکہ دن دہاڑے گھر میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا مگر جب وہ گھر کے ہر کمرے سے ہونے کے بعد بیڈ روم میں داخل ہوئے تو ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی معمر جوڑے کی لاش بیڈ پہ بے سدھ پڑی تھی۔

مسز جیراڈ کی بیوی کی تو چیخ ہی نکل گئی جب کہ چھوٹے معصوم بچے رونے لگے۔ مسٹر جیراڈ نے فوراً سے پیشتر اپنی فیملی کو کمرے سے باہر نکالا اور پولیس کو اطلاع کردی۔

پولیس کا پورا عملہ اطلاع ملتے ہی زبردست ہوٹر بجاتا ہوا جائے وقوعہ پر پہنچ گیا اور پورے گھر کو اپنے گھیرے میں لے لیا آس پاس کے پڑوسی دور ہی سے یہ سب دیکھ رہے تھے اور معمر جوڑے کے قتل پر اظہار افسوس کررہے تھے۔

میڈیا والے بھی جائے وقوعہ پر موجود تھے اور اس قتل کی تمام تفصیل کی کوریج کررہے تھے۔ پولیس نے باری باری سب کا بیان قلم بند کیا جن میں مسٹر جیراڈ کی فیملی کے علاوہ آس پاس کے کچھ پڑوسی بھی تھے، ان سب کے خیالات معمر جوڑے کے بارے میں اچھے تھے۔

اسی بھیڑ میں وہ دوشیزہ بھی موجود تھی جس نے خود کو معمر جوڑے کی ملازمہ کے طور پر پیش کیا۔ پولیس نے اس کا بیان بھی قلم بند کیا اس کا کہنا تھا کہ ''میں مسٹر اینڈ مسز مائیکل کے گھر کام کرتی تھی دونوں میاں بیوی بہت اچھے خیال کرنے والے اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنے اچھے لوگوں کا بھلا کون دشمن ہوسکتا ہے۔ مجھے ان کی موت کا کس قدر دکھ ہے میں بیان نہیں کرسکتی، یوں سمجھ لیجیے میں نے بہت اچھے دوست کھودیئے ہیں۔'' مارگریتا یہ کہہ کر چپ ہوگئی جبکہ پولیس والا متواتر سفید کاغذ پر کچھ لکھتا جارہا تھا۔

''میں دیکھ کر آتی ہوں کہ کہیں اس قاتل نے مسز مائیکل کی قیمتی گڑیوں کو تو نقصان نہیں پہنچایا جنہیں وہ اپنی جان سے بھی بڑھ کر چاہتی تھیں۔''

پولیس آفیسر نے لکھتے ہوئے سر کو ہلکی سی ہاں

لفظ لفظ موتی

مضبوط انسان وہ ہے جو تمہاری خوبیوں کے ساتھ تمہاری خامیوں پر بھی نظر رکھے۔

اپنے اندر برداشت پیدا کرو کیونکہ برداشت کا مادہ ہی کامیابی کا ذریعہ ہے۔

کسی کا دل توڑنے سے پہلے سوچ لو کہ تمہارے سینے میں بھی اک دل باقی ہے۔

انسان کو صرف دل سے نہیں بلکہ دماغ سے بھی کام لینا چاہئے اور جذباتی بن کر کام کرنے سے پہلے سوچنا چاہئے۔

ظلم کی انتہا چاہے کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو آخر ختم ہوجاتی ہے کیونکہ ہر رات صبح پر آکر ختم ہوتی ہے۔

(بلقیس خان، پشاور)

میں جنبش دی اور مارگریتا آہستگی سے آگے بڑھ گئی۔

مارگریتا چلتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوئی اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی اس نے معمر جوڑے سے اپنی بے عزتی کا بدلا بہت اچھے اور صفائی سے لے لیا تھا۔ جس پر وہ بہت خوش تھی رتی برابر بھی اس کے دل میں پچھتاوے کے کوئی آثار نہیں تھے گڑیوں کی وجہ سے اپنی بے عزتی پر اس کا انتقام اس حد تک جاچکا تھا کہ قتل جیسا گھناؤنا جرم کرتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ لمحے بھر کو نہ کانپے نہ ہی اس کے ضمیر نے اسے خبردار کیا وہ ایک دم مطمئن اور پرسکون تھی گویا دنیا فتح کرلی ہو۔ وہ تو اپنے انتقام کو لے کر اس قدر پاگل ہوگئی تھی کہ صحیح اور غلط کی تمیز تک بھول گئی تھی اگر اسے کچھ یاد تھا تو صرف اتنا کہ محض ایک دو کوڑی کی گڑیا کو اس پر ترجیح دی گئی۔ جس کا بدلا وہ ہر حال میں لے کر رہے گی۔ اس نے اپنی بے عزتی کا بہت

بڑا بدلا لیا تھا۔ اگرچہ گڑیوں کی توڑ پھوڑ کے بعد اس کا انتقام ختم ہو جانا چاہئے تھا۔

جس دن مسٹر مائیکل نے غصے سے مارگریتا کو گھر سے چلتا کر دیا تھا اسی دن سے مارگریتا نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہر صورت معمر جوڑے کو سبق سکھا کر رہے گی، بے شک اس کا انجام ان کی موت ہی کیوں نہ ہو۔ اسے نوکری سے نہیں نکالا جائے گا تو کیا اس کی پوجا کی جائے گی۔

مارگریتا نفرت و انتقام میں اتنی آگے جا چکی تھی کہ وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک ملازمہ ہے اور ہر مالک کو اپنی چیز نوکروں سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔

خیر معمر جوڑا اب مر چکا تھا اور مارگریتا کو سکون میسر آ گیا تھا اس کی برسوں کی پیاسی روح کو جیسے چین مل گیا تھا۔ اس نے گڑیوں کی توڑ پھوڑ کے بعد معمر جوڑے کو مار کر یہ قصہ ہی ختم کر دیا تھا۔

وہ چلتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں معمر خاتون کی بے شمار گڑیاں آویزاں تھیں مارگریتا نے موجود گڑیوں میں سے وہی بولتی گڑیا اٹھائی جس کی پشت پر بٹن تھا۔ مارگریتا نے بٹن دبایا تو گڑیا میں حرکت ہوئی اور گول مٹول نیلی آنکھیں اوپر سے نیچے گھومنے لگیں ''ہیلو'' گڑیا یہ کہہ کر ساکت و جامد ہو گئی۔

مارگریتا نے ایک بار پھر بٹن دبایا تو گڑیا میں ایک بار پھر سے جنبش ہوئی اور وہ بولی۔ ''تم نے میری ماما کو کیوں مارا؟'' حیرت انگیز الفاظ مارگریتا کی سماعت سے ٹکرائے تو وہ وحشت زدہ سی ہو کر بے یقین نظروں سے گڑیا کو دیکھنے لگی۔

''ابھی...... ابھی...... تم نے ...... کیا کہا؟''

مارگریتا نے حیرت سے ٹوٹے لفظوں میں پوچھا۔

''تم نے میری ماما کو کیوں مارا؟'' گڑیا نے مارگریتا کو گھورتے ہوئے کہا۔

گڑیا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مارگریتا حواس باختہ ہو گئی۔ خوف کی سرد لہر اس کے رگ وپے میں سرایت کر گئی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے سر پر بے تحاشہ ہتھوڑے برسا دیئے ہوں۔ وہ ناسمجھنے کے سے انداز میں گڑیا کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگی اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔

اب خوف مارگریتا کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا وہ وحشت زدہ ہو کر گڑیا کے پشت پر لگے بٹن کو بس دباتی چلی گئی جبکہ گڑیا کے منہ سے نکلا ہر لفظ مارگریتا کو جھنجوڑتا چلا گیا۔ تم نے میری ماما کو کیوں مارا......؟ وہ بہت اچھی ماما تھیں...... مجھے ان سے بہت پیار تھا...... کیوں مارا تم نے میری ماما کو؟''

اچانک مارگریتا بٹن بند کر دیا جس کے ساتھ ہی وہ گڑیا بھی ساکت و جامد ہو گئی۔

مارگریتا نے غور سے گڑیا کی آنکھوں میں جھانکا جب ہی وہ گڑیا مارگریتا کے بٹن دبانے پر بھی پوری قوت سے چلائی۔ ''کیوں مارا تم نے میری ماما کو۔''

بے اختیار مارگریتا کے ہاتھوں سے گڑیا گر کر فرش پر جا گری اور حواس باختہ مارگریتا کمرے سے باہر کو دوڑی وہ پاگلوں کی طرح بھاگتی ہوئی گھر سے باہر نکلی اور پولیس اور دیگر لوگوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے کو بھاگتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

اگلے دن مارگریتا اپنے بستر پر مردہ پائی گئی، اس کی بانہوں میں وہی سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی بولتی گڑیا موجود تھی۔ تفتیش کے دوران ایک جواں سال پولیس آفیسر نے مرحوم مارگریتا کی بانہوں سے اس بولتی گڑیا کو اٹھایا اور یونہی اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا تو اس کی نظر گڑیا کی پشت پر لگے بٹن پر گئی تو اس نے یونہی وہ بٹن دبا دیا۔

جس کے ساتھ ہی سنہرے بالوں والی گڑیا میں حرکت ہوئی اور وہ بولتی چلی گئی......'' اس نے میری ماما کو مارا تھا...... اس نے میری ماما کو مارا تھا...... اس نے میری ماما کو مارا تھا، اور میں نے اس کو مار دیا۔'' اور پھر اچانک گڑیا ٹوٹ کر کرچیوں میں تبدیل ہو گئی۔

ادھورا انتقام

حسنین حیدر شاہین۔ لالیاں

اچانک چاندنی رات میں ایک مہیب ہیولہ نمودار ہوا اور اس نے نوجوان کی گردن دبوچ لی، اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ نوجوان کی آنکھیں ابلنے لگیں اور عنقریب تھا کہ نوجوان کی روح اس کا جسم چھوڑ دیتی کہ پھر چشم زدن میں......

خوف و ہراس کے سمندر میں غوطہ زن، جسم کے رونگٹے کھڑے کرتی اور رگوں میں لہو منجمد کرتی کہانی

رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ سلطان پور آنا ہی چاہتا تھا۔ سیاہ دیوپیکر انجن پندرہ بوگیوں کو کھینچتا ہوا منزل کی طرف اڑا چلا جارہا تھا۔ ٹرین کی دھڑ دھڑاہٹ رات کا سناٹا مجروح کررہی تھی۔ باہر میدانی ہوائیں درختوں سے ٹکرا کر عجیب سا بے ہنگم شور کررہی تھیں۔ جیسے بہت ساری ارواح سر جھکائے بین کررہی تھی اور اپنے آپ کو کوس رہی تھیں۔ میں نے دھندلی روشنی میں ڈبے کا جائزہ لیا۔ سارے مسافر سو چکے تھے۔

میں ایک بار پھر خیالات میں کھو گیا۔

پورے بیس سال بعد میں امریکہ سے واپس لوٹ رہا تھا۔ جب میری عمر آٹھ برس تھی تو ابا جان کی خواہش پر مجھے سات سمندر پار جانا پڑا۔ وہیں میری تعلیم اور پرورش ہوئی۔ مجھے اپنے والدین کی شکلیں ذرا ذرا سی یاد تھیں۔ امریکہ میں مجھے ابا جان کے خطوط ملتے رہے۔

کچھ عرصے بعد خطوط آنے بند ہوگئے۔ دوبارہ جو خط ملا تو وہ ابا جان کے بجائے ہمارے خاندانی ڈاکٹر زاہد مشتاق کا تھا۔ اس نے ابا جان کی پراسرار موت کی خبر دی تھی۔

مجھے یاد آیا اس سے پہلے دادا جان اور چچا جان بھی کچھ اسی نوعیت کی موت کا شکار ہوئے تھے۔ اب سوائے میرے اور امی جان کے خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں بچا تھا۔ امی جان حویلی میں تنہا رہ گئی تھیں اور میں ان سے ہزاروں میل دور تھا۔ ابا جان کی موت کے کچھ ہی عرصے بعد ڈاکٹر زاہد مشتاق کا ایک اور خط ملا۔ یہ ان کا آخری خط تھا۔ اس خط کو پڑھ کر جیسے میرے اندر سے کسی نے روح ہی کھینچ لی ہو۔ میں کسی بت کی طرح ایک جگہ گڑ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر کا خط حسرت و یاس کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ پھر گویا ایک دم مجھ میں جان آ گئی میں چیخنے لگا۔ دھاڑیں مار مار کر، لیکن اس وقت مجھے کوئی دلاسہ نہیں دینے والا نہ تھا۔ میں حیرانگی سے خط پر نظر دوڑانے لگا۔ ڈاکٹر زاہد نے لکھا تھا۔

''عزیزم چھوٹے مالک گلزار! کچھ عرصے سے میں ایسے ناگوار فرائض انجام دے رہا ہوں جس پر میں خود متاسف اور نادم ہوں، مگر کیا کیا جائے مجبوریاں پھر مجبوریاں ہوتی ہیں۔ انسان جبر سے آزاد نہیں ہے۔ آپ کے ابا حضور کی ناگہانی موت ہی کیا کم تھی۔ وہ سانحہ نہیں بھولا تھا کہ ایک دوسرا صدمہ سامنے آ گیا۔

اب...... مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اب آپ کی امی حضور داعی اجل کو لبیک کہہ گئی ہیں۔ ان کی رحلت بھی دوسرے افراد کی طرح غیر معمولی ہے۔ اب جاگیر کی دیکھ بھال اور حویلی کی نگرانی کے لئے میں تنہا رہ گیا ہوں۔ خود کو تنہا پا کر بڑی بے بسی اور بے چارگی محسوس کرتا ہوں۔

آپ کے سوا خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں رہا اور اب آپ کا یہاں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ میری خدمات بہر حال حاضر ہیں مگر آپ کی موجودگی بھی بہت ضروری ہے۔ ٹکٹ ساتھ ہی منسلک ہے۔ آپ پہلی فرصت میں سلطان پور کے لئے روانہ ہو جائیں۔

خیر اندیش

ڈاکٹر زاہد مشتاق

ڈاکٹر کا خط ملنے کے بعد ایک ایک پل گزارنا دو بھر ہو رہا تھا۔ میں پہلی پرواز سے وطن کے لئے روانہ ہو گیا۔ اور اب سلطان پور قریب آ رہا تھا، میں ایک بار پھر ماضی میں چلا گیا۔

ابا جان اور امی جان کے چہرے نظروں میں گھوم رہے تھے وہ چہرے جو میں نے آٹھ سال کی عمر میں دیکھے تھے۔ میرے لوح ذہن پر وہ منظر روشن ہو گیا جب وہ مجھے اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تھے، ابا جان بہت بجھے بجھے اور رنجیدہ خاطر تھے۔ امی جان دوسری طرف چہرہ کئے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ انہیں شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ پھر ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔

سلطان پور کے اسٹیشن پر ٹرین ایک منٹ کے لئے رکی اور آگے بڑھ گئی۔ میں سلطان پور کے اسٹیشن پر اترنے والا واحد مسافر تھا۔

میں پلیٹ فارم پر کھڑا ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ کسی ذی روح کا دور دور تک نام و نشان تک نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق حویلی یہاں سے خاصی دور تھی۔

اچانک سائبان کے نیچے کوئی حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ قریب آیا تو میں نے دیکھا، سفید لباس میں ملبوس دراز قامت ایک شخص تھا۔ پچاس کے لگ بھگ عمر ہو گی۔ صحت اچھی تھی۔ قریب آ کر اس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا اور مسکراتے ہوئے سوٹ کیس میرے ہاتھوں سے لے لیا۔

''مجھے ڈاکٹر زاہد مشتاق کہتے ہیں۔''

اسٹیشن کے باہر پرانی ساخت کی گاڑی کھڑی تھی۔ ڈاکٹر نے میرے لئے دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر جم گیا۔ گاڑی ناہموار اور نیم پختہ سڑک پر دوڑنے لگی۔ میں ایک بار پھر خیالات میں کھو گیا۔

آخر وہ ایسی کیا بات تھی کہ میرے والدین اتنے طویل عرصے کے لئے مجھے جدا کرنے کے لئے مجبور ہوگئے تھے۔ مانا کہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجا گیا تھا، مگر صرف آٹھ سال کی عمر میں، پھر انہوں نے ایک طویل عرصے کے لئے مجھے واپس نہ بلانے کا عہد کیوں کیا تھا۔ کیا انہیں کوئی اندیشہ تھا؟

میں نے ڈاکٹر زاہد کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔ ''آخر ابا جان اور امی جان یکے بعد دیگرے کیسے مرے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''یہاں لوگ مرتے نہیں، مار دیئے جاتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔

''کس نے مارا میرے ماں باپ کو؟''

...... میں مشتعل ہوگیا۔ لیکن ڈاکٹر نے مجھے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کے لئے کہا اور میں تملاتا ہوا خاموش ہوگیا۔ لیکن میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ میں آخر کار صبر سے کام لینے لگا۔

چند میل آگے جاکر حویلی کا پراسرار ہیولہ نظر آنے لگا۔ کھلی چاندنی میں وہ حسین خواب کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ بے توجہی کے باوجود اس کی شان و شوکت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ حویلی کے گیٹ پر ایک معمر شخص نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ پستہ قد اور کریہہ صورت تھا۔ آنکھیں بے انتہا سرخ تھیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے پھاٹک کھولا اور ایک طرف ہوگیا۔

''یہ نادر ہے۔ حویلی کا چوکیدار۔'' ڈاکٹر زاہد نے آہستہ سے کہا۔ اندر پہنچ کر ڈاکٹر نے ایک اور شخص سے تعارف کرایا۔ یہ خانساماں رحمت تھا۔ رحمت نے بڑے گہرے انداز سے میرے سراپے کا جائزہ لیا اور سر ہلاتا ہوا اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ میرے علاوہ یہی تین افراد تھے جو حویلی میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے میرا کمرہ دکھایا اور خود آرام کرنے چلا گیا۔ کمرہ بہت صاف ستھرا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کمرے میں ابا جان سوتے تھے۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے

سربلندی

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا۔ کیا میں تمہیں وہ بات نہ بتلادوں جس سے اللہ تعالیٰ سربلندی عطا کرتا ہے اور درجات بلند فرماتا ہے۔

صحابہ نے عرض کیا۔ ''ضرور ارشاد فرمایئے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو تمہارے ساتھ جہالت سے پیش آئے۔ تم اس کے ساتھ بردباری کا رویہ اختیار کرو۔ جو تم پر ظلم کرے تم اسے معاف کردو، جس نے تمہیں محروم کیا، تم اسے عطا کردو، اور جو تم سے رشتہ توڑے تم اس سے جوڑلو اور صلہ رحمی کرو......

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

سگریٹ سلگا کر تفکرات میں کھو گیا۔

میرے ذہن میں ڈاکٹر کی تحریر گھوم رہی تھی۔

''اب جاگیر کی دیکھ بھال کے لئے میں تنہا رہ گیا ہوں۔ خود کو تنہا پاکر بڑی بے بسی اور لاچارگی محسوس کرتا ہوں، آپ کے خاندان میں سوائے آپ کے کوئی باقی نہیں رہا۔ آپ کا یہاں ہونا لازمی ہے...... بے حد لازمی۔''

میرے ذہن میں کئی سوالات گردش کررہے تھے۔ ''کیا ڈاکٹر کسی سے خوفزدہ تھا؟ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ یہاں لوگ مرتے نہیں مار دیئے جاتے ہیں۔'' یہ اس کا خدشہ، تنبیہ یا دھمکی تھی؟ حویلی میں آتے ہی اس نے مجھے سو جانے کے لئے کہا تھا۔ یہ بات اس نے میرے آرام کی غرض سے کہی تھی یا کوئی مصلحت درپیش تھی۔''

میں سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا اور سوچتا رہا۔ میرا ذہن میرے والدین کی طرف منتقل ہوگیا تھا۔ اس

وجہ سے میں اپنی بدنصیبی پر کڑھنے لگا۔

میں نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ میری نظریں دیوار پر آویزاں ایک تصویر پر آ کر جم گئیں۔ یہ ابا جان کی تصویر تھی۔ بڑا روشن اور کتابی چہرہ تھا۔ آنکھیں بڑی اور مونچھیں گھنی تھیں۔ وہ خاندان کے روایتی لباس میں تھے۔ مجھے ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔

پھر محسوس ہوا جیسے ان کے ہونٹ ہل رہے ہیں، مگر کچھ کہہ نہیں سکتے۔ آپ اسے میرا وہم کہہ سکتے ہیں۔ مگر مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہوں مگر کسی نادیدہ طاقت کے زیر اثر مجبور تھے۔

اس حویلی میں کہیں امی جان کی بھی خواب گاہ ہوگی۔ امی جان کا خیال آتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ بے چینی اور اضطراب سے میرا سینہ زخمی ہوا جا رہا تھا۔ دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ چاک کر کے باہر آ جائے گا۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ پوری حویلی وحشت اور ویرانی کے عالم میں اونگھ رہی تھی۔ یہاں سے وہاں تک سناٹے کا راج تھا۔ اپنی یادداشت کے سہارے میں ایک طرف کو چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کمرے کے سامنے میں کھڑا تھا۔

یہ امی جان کی خواب گاہ تھی۔

میں نے کنڈی سرکا کے دروازہ کو آہستہ سے دھکا دیا۔ ایک ناگوار آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ اندر خنکی تھی۔ خوابگاہ میں داخل ہوتے ہی محسوس ہوا۔ جیسے بڑی پرسکون اور آرام دہ جگہ پر آ گیا ہوں۔ میں یہ آرام اور سکون امی جان کی گود ہی میں محسوس کرتا تھا۔ میرا اضطراب یک لخت تھم گیا۔ تاریکی کے باوجود میں کمرے کی ایک ایک چیز دیکھ سکتا تھا۔

میں نے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا۔ میری بے قرار اور تجسس نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ پھر میری نگاہیں ایک بڑے سے سنگھار میز پر آ کر جم گئیں وہاں امی جان کی بڑی سی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ میں تصویر کے قریب پہنچا تو خود کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے۔ امی جان کا مسکراتا چہرہ یک لخت تاریک ہوگیا۔ حزن وملال نے ان کے چہرے کو دبوچ لیا۔ جیسے انہیں میری کیفیت سے دلی تکلیف پہنچی ہو۔ میں آنسو پونچھ کر تصویر پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

اچانک محسوس ہوا کہ میرے علاوہ بھی کوئی کمرے میں موجود ہے۔

سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”میں بے اختیار پلٹا۔“

دروازے پر ڈاکٹر زاہد مشتاق کھڑا تھا۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں پر کھڑا تھا۔ ذرا دیر تک مجھے وہ گھورتا رہا۔ پھر نپے تلے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا میرے قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ایک نظر امی جان کی تصویر پر ڈالی اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”آپ کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی، جیسے کمرے میں کوئی موجود نہیں۔

ڈاکٹر دوبارہ بولا۔ ”جا کر سو جائیں۔“

میں مرے ہوئے قدموں سے باہر نکل آیا۔ پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر سناٹے میں ڈاکٹر کے قدموں کی آواز گونجنے لگی۔ میں بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ ہاتھ بڑھا کر میز سے پیکٹ اٹھایا اور سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ اسی وقت میری نظریں دروازے پر پڑیں۔ کوئی جھانک رہا تھا۔ پھر وہ چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ خانساماں رحمت تھا۔ مجھے جاگتا دیکھ کر واپس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ناشتہ لے کر آ گیا۔ ناشتہ خاصہ تفصیلی تھا۔ توس پر مکھن لگانے کے لئے چھری تلاش کی مگر چھری موجود نہیں تھی۔ میں نے سر اٹھا کر رحمت کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ سٹپٹا گیا۔ ”چھری نظر نہیں آئی۔“ میں مکھن کی ٹکیہ سنبھالتے ہوئے بولا۔

''اچھا صاحب۔'' وہ ہڑبڑا کر بولا۔ پھر چھری جیب سے نکال کر ٹرے میں رکھ دی۔

میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چھری جیب میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

ناشتہ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ڈاکٹر زاہد آ گیا۔ وہ مختلف موضوعات پر باتیں کرتا رہا۔

زیادہ تر باتیں حویلی اور جاگیر کے انتظام اور انصرام کے متعلق تھیں۔

مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ نہ صرف جاگیر کا منتظم اور نگراں ہے بلکہ ہمارا خاندانی ڈاکٹر بھی ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ''مہمان خانے میں انسپکٹر نوید آپ کا انتظار کر رہا ہے۔''

اور میں مہمان خانے میں آ گیا۔ انسپکٹر نوید بھاری بھرکم جسم اور ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ مگر اس کے چہرے پر پولیس کے دوسرے لوگوں جیسی رعونیت اور کرختگی نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ بہت ہنس مکھ اور شگفتہ نظر آتا تھا۔ اس وقت وہ سادے لباس میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی استقبال کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔ میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔

انسپکٹر مجھے تجسس اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ''آپ کے آنے کی بڑی خوشی ہوئی مسٹر گلزار۔'' انسپکٹر بولا۔ ''مگر آپ کے آنے سے ایک ٹیڑھا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔''

انسپکٹر نے تائید کے لئے ڈاکٹر زاہد کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر زاہد نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے بیٹھا رہا۔

انسپکٹر دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ جاگیر میں کوئی آپ کے خاندان کا جانی دشمن موجود ہے۔ وہ کسی وجہ سے انتقام کی دیوانگی میں مبتلا ہے۔ اس نے ایک ایک کر کے آپ کے خاندان کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب صرف آپ باقی رہ گئے ہیں۔'' انسپکٹر یہ بتا کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''آپ کے خاندان کا دشمن جو کوئی بھی ہے، اس کے جنونی مزاج اور خوفناک انتقام جوئی کے پیش نظر یہ سوچنا غلط نہیں کہ حملہ آپ پر بھی ہوگا۔

آپ خاندان کے آخری فرد ہیں۔

آپ کا دشمن ہر حال میں آپ کو ختم کرنا چاہے گا کیونکہ آپ کے مرتے ہی اس کا انتقام پورا ہو جائے گا۔

اب وہ سارا زور آپ پر صرف کر دینا چاہے گا۔ دوسری طرف میں اس کام پر معمور ہوں کہ ہر طرح سے آپ کی حفاظت کروں، مگر اکیلے میرے لئے یہ کام بہت مشکل ہے۔ میں اپنے فرض کی تکمیل اس وقت کر سکوں گا۔

جب آپ بھی ہمارے ساتھ تعاون کریں تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ آپ میری اور ڈاکٹر زاہد کی ہدایات پر عمل کریں۔ آپ کو علم نہیں کہ دشمن بہت عیار اور شاطر ہے۔''

ڈاکٹر زاہد بالکل ہی خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے انداز سے یہ پتا نہ چلتا تھا کہ اسے اس گفتگو سے دلچسپی ہے بھی یا نہیں۔ میں نے درمیان میں کچھ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ انسپکٹر نے پہلو بدل کر پھر گفتگو کا آغاز کیا۔ ''موت کا سلسلہ آپ کے دادا جان سے شروع ہوا تھا۔ اس وقت کی رپورٹ کے مطابق وہ ایک پہاڑی سے گر کر ہلاک ہوئے تھے۔ ثبوت ایسے تھے کہ جیسے کسی درندے نے ان کے جسم کو نوچ نوچ کر پہاڑی سے دھکا دے دیا ہو۔

ان کی آنکھوں میں منجمد حیرت و خوف کچھ اسی بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ چونکہ کسی کی دشمنی کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اس لئے کیس کو حادثہ سمجھ کر دبا دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد آپ کے چچا جان زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جب ان کی لاش کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تو اس خیال کی تردید ہو گئی۔ ان کے جسم کا گوشت نوچ نوچ کر علیحدہ کیا گیا تھا۔''

دفعتاً مجھے سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ میں نے

پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ جلا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔

''اور یہ ہی صورت حال آپ کے والد صاحب کے ساتھ پیش آئی۔'' انسپکٹر نوید گفتگو کا سلسلہ جوڑتے ہوئے بولا۔''ان کی لاش جنگل میں گھنی جھاڑیوں سے درمیان دریافت ہوئی تھی۔

نرخرہ ادھڑا ہوا تھا۔ چہرہ خون سے تر بتر تھا۔ جسم پر بے شمار خراشیں اور زخم تھے۔ انتہائی درندگی اور زندگی کا مظاہرہ تھا۔ ابتداء میں یہ خیال ہوا کہ یہ کسی درندے کی کارستانی ہے۔ اگر ایسا تھا تو اس نے لاش کو منہ کیوں نہیں لگایا تھا۔ یوں ہی کیوں چھوڑ دیا۔

پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس طرف کے جنگلات میں صرف چھوٹے جانور ہی پائے جاتے ہیں۔ شیر چیتے وغیرہ کا اس علاقے میں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ پھر آپ کے والد صاحب کو کس نے ہلاک کیا تھا۔ اس سوال کے ساتھ ذہن اس نامعلوم شخص یا اشخاص کی طرف چلا جاتا ہے جنہوں نے آپ کے چچا اور دادا جان کو ہلاک کیا تھا۔''

مجھے ان اموات کا پہلے ہی سے علم تھا مگر انسپکٹر نوید جس تفصیل اور پیرائے میں بیان کر رہا تھا اس کا مجھ پر شدید اثر ہوا۔ میری نظر میں مرنے والوں کی بے بسی گھوم گئی۔

جنونی قاتل نے کس بے رحمی اور سنگدلی سے ان کو موت کے گھاٹ اتارا۔

''اور آپ کی والدہ بھی اسی جنون اور انتقام کا شکار ہوئیں۔'' انسپکٹر نے ایک دفعہ پھر مجھ سے گفتگو کی۔

''چونکہ وہ باہر نہیں نکلی تھیں۔ اس لئے انہیں حویلی میں ہی ٹھکانے لگا دیا گیا۔ ان کی موت گلا دبانے سے ہوئی۔ ان کے سینے سے دل نکال لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر زاہد نے خود معائنہ کیا تھا۔''

میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ میرا دل اندر ہی اندر سے بیٹھا جا رہا تھا۔ درندگی کے یہ واقعات پراسرار بھی تھے اور خوفناک بھی۔ مگر اس کی تہہ میں بھوت پریت یا کسی درندہ صفت انسان کا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا۔

آخر میرے خاندان نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ کیا میرے خاندان کی تباہی میں حویلی کے کسی ایک فرد کی گناہ کی سزا تھی؟

''اور اب مسٹر گلزار، آپ حویلی میں آگئے ہیں۔'' انسپکٹر فکرمند لہجے میں بولا۔''

''آپ کی واپسی اور حویلی میں قیام ہمارے لئے ایک چیلنج ہے۔ ہم اپنی پوری توانائی اور صلاحیتیں اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ قاتل کا ہاتھ آپ تک نہ پہنچے۔''

''ایک بار سامنے تو آئے۔ پھر بات ہوگی۔'' میں نے دل میں سوچا اور انسپکٹر سے گویا ہوا۔

''کسی پر شبہ نہیں کیا گیا۔''

''قطعاً نہیں۔ سچ پوچھئے تو قاتل نے اس قدر غیر متوقع طور پر اتنے غیر معمولی قتل کئے کہ ہمیں کچھ کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔''

''پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ کیا توقع رکھتے ہیں کہ میں قاتل سے پوچھ کر یہ بتاؤں کہ وہ مجھے کب قتل کرنا پسند کرے گا۔'' میں نے طنزیہ اور غم کی ملی جلی مسکراہٹ سے کہا۔

ڈاکٹر زاہد مجھے تیکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ناگواری مترشح تھی۔

''اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ آپ محتاط رہیں۔ تنہا گھومنے پھرنے سے اجتناب کریں۔'' انسپکٹر گھمبیر لہجے میں بولا۔

انسپکٹر نوید چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر بھی اٹھ گیا۔ میں کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

سامنے چوڑی سڑک تھی۔ اس کے دوسری طرف گھنے اور تناور درختوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ سلطان پور سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ کسی زمانے میں میرے کسی بزرگ کو یہ علاقہ اورنگ زیب عالمگیر کی طرف سے انعام کے طور پر دیا گیا تھا اور اس وقت سے

یہ ہمارے خاندان کے قبضے میں چلا آرہا ہے۔ اس علاقے میں گھنے جنگل تھے اور طرح طرح کے پرندوں اور بے ضرر جانوروں سے بھرے ہوئے میدان تھے۔

یہاں سے قیمتی لکڑی اور شہد بھاری مقدار میں برآمد ہوتے ہیں۔

دو دن تک میں حویلی میں قید رہا۔ یہ دن میرے لئے بڑے پریشانی اور اضطراب کے تھے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کہاں امریکہ کے ہنگامہ خیز اور متحرک رہنے والے ماحول میں پلا بڑھا نوجوان اور کہاں یہ دور افتادہ ویران اور سنسان حویلی۔ میرا دل گھبرا کر رہ گیا تھا۔ میں خود کو بیمار سا محسوس کرنے لگا۔

تنگ آکر تیسرے دن میں نے رائفل سنبھالی اور باہر نکل کھڑا ہوا۔ گیٹ پر ڈاکٹر مل گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے آنے کے لئے کہا...... میں اس کے پیچھے چلتا ہوا اس کے کمرے میں چلا گیا۔

ڈاکٹر کا کمرہ بہت سادہ اور تکلفات سے عاری تھا۔ چند لمحے تک وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔ ''میں تم کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''کس چیز کی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''باہر نکلنے کی۔ گھومنے پھرنے کی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''مم...... م...... مگر...... اس طرح تو گھٹ کر مر جاؤں گا میں۔''

''کچھ بھی ہو۔'' وہ قطعیت کے ساتھ بولا۔ ''یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تم خاندان کے آخری فرد ہو اور دشمن تمہاری گھات میں ہے۔ اگر میں تمہیں بھی کھو بیٹھا تو میرے لئے سوائے خودکشی کے کوئی چارہ نہ ہوگا۔''

ڈاکٹر کے لہجے میں دکھ کا عنصر غالب تھا۔

میں اس کے خلوص اور اپنائیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں حویلی میں بالکل تنہا نہیں ہوں۔

''مگر کیا تم مجھے تھوڑی دور جانے کی اجازت بھی نہ دو گے ڈاکٹر۔ میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔'' میں التجا آمیز لہجے میں بولا۔

ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''اچھا خیر۔ مگر جنگل کے زیادہ اندر جانے کی کوشش نہ کرنا۔''

میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ مجھے پیار سے اپنا ہاتھ میرے سر میں ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں حویلی سے باہر نکل آیا۔ سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ شفق پھوٹی ہوئی تھی اور پرندوں کی ڈاریں آسمان پر منڈلا رہی تھیں۔ عجیب طرح کے شور سے جنگل گونج رہا تھا۔ مگر اس شور میں ایک خاص قسم کا لطف تھا۔ ہلکی دھوپ کی حرارت نے میری رگ و پے میں تازگی و توانائی پھونک دی۔ امریکہ کی کہرآلود اور گھٹی ہوئی فضا میں یہ بات کہاں تھی۔ حرکت و حرارت سے بھرپور ایشیائی اور پاکستانی شام نے میرے وجود میں ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا۔ مختصراً چکر لگا کر میں واپس آگیا تھا۔ بلاشبہ حویلی ویران اور سنسان تھی مگر اس کے باہر کی دنیا بڑی دلفریب اور پرکیف تھی۔ اس دنیا سے لاتعلق ہو جانا کفران نعمت تھا۔ اس رات مجھے بڑی گہری اور پرسکون نیند آئی۔

صبح بڑی خوب صورت اور خوشگوار تھی۔ شام ہونے والی تھی کہ میں حویلی سے نکل کھڑا ہوا۔ سڑک سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی الگ ہو کر جنگل کے اندر چلی گئی تھی۔ میں اس پگڈنڈی پر ہولیا۔ کافی آگے جانے کے بعد ہارل کا ایک جوڑا اڑتا ہوا نظر آیا۔ میں نے نشانہ لے کر رائفل داغ دی۔ ہارل بھرا مار کے ایک طرف ہو گئے۔ میرا نشانہ خالی گیا۔ مجھے اپنے نشانے کی ناکامی سے زیادہ ہارل کے بچ جانے کی خوشی تھی...... وہ نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں منہ میں حیرت سے انگلی

رہا ہے دیکھ رہا تھا۔

"اچانک کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔"

محسوس ہوا جیسے نقرئی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ پھر ایک سریلی آواز ابھری۔ "کون ہو تم۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

حسن کا ایک نمونہ میرے سامنے تھا۔ سرخ گلابی ہونٹ اور سرمگیں بڑی بڑی آنکھیں۔ ایسے لگ رہا تھا کہ دنیا میں جنت کی کوئی حور اتر آئی ہے۔ میں اس کے خیالوں اور اس کے سراپا حسن میں کھو گیا۔

"بے زبانوں کو مارتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" وہ مصنوعی برہمی سے بولی۔

میں یک لخت خیالوں سے واپس جیسے لوٹ آیا۔

"شرم تو بہت آتی ہے مگر میں نے شکار کیا ہی کب ہے۔ صرف ڈرایا تھا۔ کیا کوئی پرندہ زمین پر پڑا نظر آ رہا ہے؟" میں تفہیمی انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

"کون ہے نرگس بیٹا۔" کسی کی آواز آئی۔ پھر جھاڑیوں کے درمیان سے ایک بوڑھا نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں کچھ پودے دبے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور اس لڑکی کی طرف جس کو اس نے نرگس کہہ کر پکارا تھا دیکھنے لگا۔

نرگس نے کوئی جواب نہیں دیا وہ ہونٹ سکوڑ کر رہ گئی۔ میں اس کے ہونٹوں کے دلکش خم میں کھو گیا۔

بوڑھا کچھ دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر نرگس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آؤ چلیں، شام ہو رہی ہے۔" بوڑھا سر جھکا کر چلنے لگا۔ نرگس اس کے پیچھے چل دی۔

جاتے جاتے اس نے ایک بار مجھے پلٹ کر دیکھا اور جلدی سے سر گھما لیا۔

☆......☆......☆

امریکہ میں قیام کے دوران کوئی خوب صورت لڑکیوں سے میں متاثر نہ ہوا تھا مگر یہ لڑکی جس کا نام نرگس تھا، اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس جنگلی پھول کی خوشبو دوسرے پھولوں سے بہت مختلف اور منفرد تھی۔ اس رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ کروٹ پر کروٹیں بدلتا رہا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کا سراپا حسن میرے دماغ و دل میں سمایا ہوا تھا۔ نہ جانے کب آنکھ لگ گئی اور نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہو گئی۔

دوسرے دن پھر میں اس طرف نکل گیا۔ مگر وہ بوڑھا اور وہ دشمن جاں نظر نہ آئی۔ میرے ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی۔ اور سر پر خوش رنگ پرندوں کا ایک جھنڈ منڈلا رہا تھا۔ مگر میں ان سے بے نیاز ہو کر جھاڑیوں کی سمت تک رہا تھا۔ میری نظریں ان جھاڑیوں پر جمی ہوئی تھیں، مگر وہاں ہوا کی سرسراہٹوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

میں اس رات بالکل نہ سو سکا۔ نرگس کا شوخ اور متبسم چہرہ بار بار میرے تصور میں جھانکتا رہا۔ کیا ضروری ہے کہ اس نے بھی میرے لئے وہ ہی جذبات محسوس کئے ہوں جو میں محسوس کر رہا ہوں۔ رات کے نجانے کس پہر میری آنکھ لگ گئی۔ پھر فوراً ہی کسی کھٹکے سے کھل گئی۔ کہیں سے کوئی آواز آئی تھی۔ غالباً حویلی کے کسی دور افتادہ گوشے سے۔ میں مسہری سے اترا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

راہداری دور تک سنسان پڑی تھی۔ پھر یہ کیسی آواز تھی میں چلتا ہوا حویلی کے عقبی حصے میں آ گیا۔ سامنے صحن تھا۔ صحن کے اختتام پر اونچی سی دیوار تھی۔

دفعتاً مجھے کسی بو کا احساس ہوا۔ کسی چیز کے جلنے کی بو آ رہی تھی۔ میں صحن میں آیا۔ سامنے سگریٹ کا ٹکڑا پڑا سلگ رہا تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے تین بجے تھے۔ اس وقت کون سگریٹ نوشی کر رہا تھا۔ میں سگریٹ اٹھانے کے لئے جھکا۔

اسی وقت ایک سایہ لہرایا اور تیزی سے دیوار کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں ششدر رہ گیا۔ پھر تیزی سے سائے کی طرف جھپٹا، مگر اس عرصے میں وہ دیوار پھلانگ چکا تھا۔

میں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا۔ دوسری طرف گھنا اور تاریک جنگل دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔

صبح رحمت ناشتہ لے کر آیا تو میں بے اختیار پوچھ

بیٹھا۔ ''کون سا سگریٹ پیتے ہو؟''

وہ قدرے بوکھلا گیا اور گھبرا کر بولا۔

''ج...... جی...... ی...... جی میں تو بیڑی پیتا ہوں۔''

''سگریٹ پیا کر۔'' میں نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

رات والا سگریٹ کا ٹکڑا میری جیب میں پڑا ہوا تھا۔ اور میں یہ جاننے کے لئے بے قرار تھا کہ حویلی میں کون شخص اس براڈ کا سگریٹ پیتا ہے؟

دوپہر کو کھانے پر ڈاکٹر زاہد سے ملاقات ہوگئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ڈاکٹر زاہد سے ایک سگریٹ طلب کیا۔

ڈاکٹر نے مجھے عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

''میں سگریٹ نہیں پیتا، مجھے اسموکنگ سے سخت نفرت ہے۔''

میں شرمندہ ہوگیا۔ واقعی میں نے ڈاکٹر کو سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔

شام ہوتے ہی میں جنگل کی طرف نکل گیا۔ اس وقت سگریٹ کا ٹکڑا میرے ذہن سے محو ہوگیا تھا اور میں نرگس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

رائفل میرے ہاتھ میں تھی مگر مجھے شکار سے اس وقت کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

سامنے سے خوب صورت طوطوں کی ڈار اڑتی چلی گئی۔ میں حیرت سے اس خوب صورت منظر کو تکتا رہا۔

اچانک عقب سے کسی کی آواز ابھری۔ ''پھر آ گئے۔''

یہ سنتے ہی میں اچھل پڑا۔

''ڈر گئے؟'' آواز پھر آئی اور ساتھ ہی ہنسنے کی آواز۔

میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ یہ وہی آواز تو تھی جس کا میں منتظر تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا میرے سامنے نرگس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف شوق اور دلچسپی سے دیکھتا پا کر اس کی نظریں جھک گئیں۔ وہ انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔

''کیا اکیلی آئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بابا کل سے بیمار ہیں۔'' اس کے لہجے میں دکھ کا عنصر تھا۔

''تم شاید اپنے بابا کو بہت چاہتی ہو۔''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ وہ ہی تو میرے سب کچھ ہیں۔ ماں کے بعد انہوں نے ہی تو میری پرورش کی ہے۔''

''تم لوگ جنگل میں کیا کرنے آتے ہو۔'' میں نے اس کے دکھ کو دور کرنے کی وجہ سے سوال بدل دیا۔

''تمہاری طرح جان لینے نہیں آتے۔ ہم تو لوگوں کو زندگی دیتے ہیں۔ میرے بابا حکیم ہیں۔ ہم جڑی بوٹیوں کی تلاش میں یہاں آتے ہیں۔'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔

''کیا تم بھی مریضوں کو دیکھتی ہو؟'' میں مسکرا کر بولا۔

''نہیں۔ میں بابا کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''کسی دن میں اپنا علاج کروانے آؤں گا۔ تم غالباً پرانی بستی میں رہتی ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ٹوکری اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اچھا چلتی ہوں۔ بابا راہ دیکھ رہے ہوں گے۔''

''کل آؤ گی؟'' اچانک میرے منہ سے نکلا۔ میں خود حیران تھا کہ میرے منہ سے یہ الفاظ کیسے نکلے۔

''جی...... ی...... ی ی ی ی ی...... اس نے جی کی ''ی'' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس کی خوب صورت پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اس کا لہجہ درشت اور تیکھا تھا، مگر وہ ہونٹوں پر آئی ہوئی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپانے میں ناکام رہی تھی۔

''میرا مطلب ہے۔'' میں سنبھل کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے بس یوں ہی۔''

"مگر کیوں؟" وہ شرارت اور شوخی سے بولی۔

"چلو اچھا میں تمہارے مطب میں آجاؤں گا۔" میں گڑبڑا کر بولا۔

میری بوکھلاہٹ پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے موتیوں جیسے سفید دانت کوند گئے۔

"مگر تم ہو کون؟ تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔ کہاں رہتے ہو؟" مارے شوق اور تجسس کے اس نے بیک وقت کتنے سوالات داغ دیئے اور جب میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ٹوکری چھوٹ کر زمین پر گرتے گرتے بچی۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ اس خوف کی وجہ کیا تھی۔ غالباً وہ میرے خاندان کے حشر سے واقف تھی۔

"اتنی بڑی حویلی میں ڈر نہیں لگتا؟" وہ بڑی مشکل سے بولی۔

"ڈر تو نہیں لگتا مگر تھوڑا دل گھبراتا ہے۔"

"زیادہ دل گھبرایا کرے تو مطب پر آجایا کرو۔ بابا بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ میں تمہیں کچھ شربت بھی دوں گی۔ تمہارا دل نہ گھبرائے گا۔"

اگلے دن صبح ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ نادر نے اطلاع دی کہ ایک لڑکی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ "اسے اندر بھیج دو۔" جب وہ لڑکی کمرے میں داخل ہوئی تو میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ یہ نرگس تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کی مخصوص ٹوکری تھی۔ وہ میری حیرت سے بڑی لطف اندوز ہوئی۔

"نرگس تم!" میں اتنا ہی کہہ سکا۔

"کیا تم میری آمد سے خوش نہیں ہوئے۔ میں نے سوچا بڑے آدمی ہو۔" "معلوم نہیں مطب میں آنا پسند کرو گے کہ نہیں۔ اس لئے خود ہی حاضر ہوگئی۔ میں تمہارے لئے شربت لائی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹوکری میز پر رکھی اور ایک بوتل نکالتے ہوئے بولی۔ "یہ سکون قلب کے لئے بہت مفید ہے۔"

میں بوتل اٹھا کر دیکھنے لگا۔ جان بوجھ کر بولا۔ "بڑے آدمی سے ملنے آئی تھیں، سو ملاقات ہوگئی، اب چلتی پھرتی نظر آؤ۔"

"میرے یہاں آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ وہ جلدی سے بولی۔" "آج تم جنگل کی طرف آتے تو ملاقات نہ ہو پاتی۔ بابا کی طبیعت ابھی تک خراب ہے۔ آج میں اس طرف نہیں جاؤں گی۔ اس لئے بتلا دیا۔" البتہ اس نے جاتے جاتے ایک خاص ادا سے مسکراہٹ میری طرف پھینک دی۔ میں نے اسے روکنا چاہا مگر وہ نہ رکی۔

حویلی کے کچھ فاصلے پر پرانی بستی آباد تھی جو کہ ہماری رعایا میں شامل تھی۔ بابا کا مطب تلاش کرنے میں زیادہ پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ بابا واقعی بیمار تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے آواز دے کر نرگس کو بلایا۔ مجھے دیکھ کر نرگس ٹھٹھک گئی وہ یقیناً حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ بالکل اس طرح جس طرح میں آج صبح اس کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔

"اب ہمارے مطب پر بہت اونچے لوگ آنے لگے ہیں۔" بابا ہنستا ہوا بولا۔ میں اور بابا باتوں میں مصروف ہوگئے۔ نرگس خاطر مدارت میں لگ گئی۔ کئی سوالات ہوئے اور کئی جوابات ملے۔ زیادہ حکمت پر گفتگو رہی۔ پھر گفتگو کا رخ نرگس کی ذات کی طرف مڑ گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

بڑی مشکل سے قلبی کیفیت چھپانے میں کامیاب ہوا۔ شکر ہے کہ گفتگو یہاں آکر محدود ہوگئی کہ بابا نرگس کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے پریشان تھے۔

واپسی پر مجھے نرگس بستی سے باہر چھوڑنے آئی۔ اس نے بتایا کہ "کل وہ اور بابا مخصوص جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دوسری جگہ جائیں گے وہ جگہ جنگل کے قلب میں واقع ہے۔

تم پگڈنڈی پر چلے آنا۔ کافی دور نکل آنے کے بعد پگڈنڈی دائیں طرف مڑ جائے گی۔ ہم وہیں کہیں

جھاڑیوں میں تمہیں مل جائیں گے۔ مگر خیال رکھنا دائیں طرف مڑنا ضروری ہے، سیدھے مت چلے جانا، آگے دلدل ہے کہیں اس میں پھاند پڑو۔ وہاں تمہاری یہ بندوق وغیرہ کام نہیں دے گی۔" نرگس ہنس کر بولی۔

"تمہارے بابا تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔" میں بولا۔

"تو تمہیں اس سے کیا۔" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

پھر شاید اس نے میری افسردگی کو جانچ لیا تھا۔

وہ سنجیدہ ہوگئی اور نظریں جھکا کر بولی۔

"کیا تم مجھے چاہنے لگے ہو۔"

"بہت زیادہ۔" میں اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے نرم لہجے میں بولا۔

☆......☆......☆

حویلی میں انسپکٹر نوید میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تیر کی مانند میری طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ گلزار صاحب آج وہ موذی میرے ہاتھ آتے آتے رہ گیا۔"

"کون؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی آپ کا ازلی دشمن، درختوں کے جھنڈ میں دکھائی پڑ گیا۔ دیکھتے ہی بھاگنے لگا۔ ہاتھ سے جاتا دیکھ کر میں نے فائر کردیا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی، لیکن وہ دیکھتے ہی دیکھتے قریبی جھاڑیوں میں روپوش ہوگیا۔ خیر جائے گا کہاں تک، میرے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔"

انسپکٹر کی شیخی پر میں دل ہی دل میں ہنس پڑا، وہ اپنے ناکام فائر پر کس قدر نازاں تھا۔ انسپکٹر کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میز پر نظر پڑتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔

بوتل غائب تھی۔ میں نے ہر جگہ تلاش کی مگر ناکام رہا۔ میں سگریٹ جلا کر شربت کی گمشدگی کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر زاہد مشتاق اندر داخل ہوا۔

شربت کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔

"شربت زہر آلود نہیں ہے۔" ڈاکٹر بوتل کو میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "مگر میں تمہیں بتادوں کہ میری اجازت کے بغیر باہر کی کوئی چیز بھی تم استعمال نہیں کرو گے۔ "Its ok"

میں ڈاکٹر کے بے معنی اندیشوں اور بے جا پابندیوں سے کڑھ کر رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

میں سڑک سے کٹ کر جنگل کے اندر داخل ہونے والی پگڈنڈی پر گھنی جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔

کافی آگے جا کر پگڈنڈی دائیں سمت مڑگئی۔ یہاں قد آدم جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ اسی جگہ نرگس کو موجود ہونا چاہئے تھا۔

سامنے دور تک پھیلا ہوا قطعہ تھا جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا یہ دلدل ہے۔ نرگس نے اسی دلدل سے بچنے کی تاکید کی تھی۔ میں نے جھاڑیوں میں نظریں دوڑائیں، کسی متنفس کا پتا نہ تھا۔ خاصے انتظار کے بعد واپسی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور نرگس کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ تیزی سے میرے قریب آئی اور شگفتہ لہجے میں بولی۔

"میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کررہی تھی۔"

میں نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھا۔

"بابا نہیں آئے گا کیا؟"

"جھاڑیوں کے اندر ہیں۔" وہ میرے بہت قریب ہوکر بولی۔

"آؤ تم بھی ہاتھ بٹاؤ۔" ہم دونوں جھاڑیوں میں گھس گئے۔ کچھ دیر پہلے نرگس نے بتایا تھا کہ "بابا تمہیں بہت پسند کرتے ہیں، مگر ہمارے میل ملاپ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔" میں قدرے دل گرفتہ ہوگیا تھا۔ خیر ہم دونوں جھاڑیوں میں گھس کر ایک طرف چلے گئے۔ کچھ دیر بعد بابا بھی کچھ پتے اور گول گول سے پھل اٹھائے ہوئے وہاں آگئے۔

مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ

گئی۔ ہمارے درمیان مختصر اور رسمی گفتگو ہوئی۔

واپسی کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ یک لخت ایک ہولناک چیخ ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی ہمارے کانوں میں پڑی۔ ہم گھبرا کر جھاڑیوں سے باہر نکل آئے۔ دیکھا تو سامنے ایک آدمی دلدل میں لحظہ بہ لحظہ دھنستا جا رہا تھا۔

وہ باہر نکلنے کی کوشش میں ہاتھ چلا رہا تھا اس کی چیخیں ہمارے دل دہلائے ہوئے تھیں۔

بابا نے پھول پودے زمین پر پھینک دیئے اور متجسس نظروں سے اطراف کا جائزہ لینے لگے۔

وہ دلدل کے کنارے جھکے ہوئے درختوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ پھر مجھے اپنے ساتھ آنے کے لئے کہا۔

انہوں نے دلدل پر جھکی ہوئی ایک شاخ کو کھینچ کر آزمایا اور میری طرف مڑ کر بولے۔ ''آپ زور لگائیں یہ شاخ آدمی تک پہنچانی ہے۔''

میں نے اور بابا نے مل کر شاخ کو پوری قوت وطاقت سے جھکایا۔ تو شاخ آدمی کے ہاتھ تک پہنچ گئی۔

''شاخ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلو۔'' بابا آدمی سے مخاطب ہو کر پوری قوت سے چلائے۔

دلدل میں پھنسے ہوئے شخص کے چہرے پر کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جب اس نے شاخ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو بابا نے مجھے شاخ چھوڑ دینے کے لئے کہا۔ اور خود بھی پھرتی کے ساتھ ایک طرف ہو گئے۔ شاخ اس آدمی کو لئے تیزی سے اوپر آ گئی۔

وہ آدمی حیرت اور خوف سے نیم جان شاخ سے لٹکا ہوا تھا۔ بابا نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''شاباش! آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے تنے کی طرف آ جاؤ۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔''

وہ آدمی آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے تنے کے قریب آ گیا۔ تنے کے قریب پہنچتے ہی دھپ سے زمین پر گر گیا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ اب بے ہوش ہونے کی باری میری تھی۔

کیونکہ میرے سامنے انسپکٹر نوید آنکھیں بند کئے ہوئے گہری سانسیں لے رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد اس کے حواس بحال ہوئے اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک پڑا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''وہی تھا مسٹر گلزار!'' وہی تھا۔

''کون؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہی جسے کل میں نے زخمی کیا تھا۔'' آج پھر دکھائی دیا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ تیزی سے پلٹا اور مجھ پر ٹوٹ پڑا، پھر دھکا دے کر دلدل میں گرا دیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے ریوالور تک استعمال کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔

''اوہ میرے خدایا۔'' وہ گہری سانس لیتا ہوا دلدل کی طرف دیکھ کر خوفزدہ آواز میں بولا۔ ''آپ لوگ موجود نہ ہوتے تو آج میرا کام تمام تھا۔''

☆......☆......☆

وہ شام اچھی نہیں گزری۔ رات کو بستر پر لیٹا تو بھی ذہن الجھا رہا۔ کروٹیں بدلتے کی کیفیت میں خاصی رات گزر گئی۔ پچھلے پہر کی خنکی سے پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں کہ آنکھیں کھٹکے سے کھل گئیں۔

محسوس ہوا جیسے کوئی دروازے سے لگے ہوئے جھانک رہا ہے۔ رات کے گہرے سکوت میں اس کے سانس لینے کی آواز بہت واضح سنائی دے رہی تھی۔ میں خاموشی سے اٹھا اور دبے پاؤں دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

ذرا دیر تک میں خاموش کھڑا رہا، پھر آہستہ سے کنڈی گرائی اور ایک ہی جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

میرے سامنے حویلی کا چوکیدار نادر کھڑا تھا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔

''اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہا۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے نادر پر تھپڑ، گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ اس کے ناک اور منہ سے خون جاری

ہو گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' کسی نے غصہ بھری آواز میں پوچھا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ڈاکٹر زاہد مجھے ناگواری سے گھور رہا تھا۔

''اس سے پوچھیے، یہ اس وقت میرے دروازے کے ساتھ لگا ہوا کیا کر رہا تھا۔ میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ بھی کر رہا ہے درست کر رہا ہے۔ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔'' ڈاکٹر سخت لہجے میں بولا اس کی آنکھوں سے شدید غصہ چھلک رہا تھا۔

''اتنی رات گئے کسی کی خواب گاہ میں جھانکنا کس فرض کے زمرے میں آتا ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

''فضول باتیں مت کیجئے۔'' ڈاکٹر درشت لیکن باادب لہجے میں بولا۔ پھر نادر سے مخاطب ہوا۔

''آؤ میں تمہاری ڈریسنگ کردوں۔''

ڈاکٹر نادر کو لے کر چلا گیا۔ غصے اور جھلاہٹ سے میں پاگل ہو گیا۔ میں جھلایا ہوا واپس مڑا۔ اچانک میری نظر زمین پر پڑی سگریٹ کی ڈبیہ پر پڑی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ میں جلدی سے خواب گاہ میں آیا اور میز کی دراز سے سگریٹ کا وہ ٹکڑا اٹھایا جو چند دن قبل مجھے حویلی سے ملا تھا۔ ٹکڑے اور پیکٹ کا برانڈ ایک ہی تھا۔ نیند میری آنکھوں سے اڑ گئی۔ رات میں نے ٹہلتے ہوئے گزار دی۔

صبح انسپکٹر نوید ملاقات کے لئے آیا۔ میں نے اس کی موجودگی میں نادر کو بلوایا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر زاہد بھی چلا آیا۔

نادر کی حالت خراب تھی۔ میرے دیئے ہوئے زخم اس کے جسم اور چہرے سے چھلک رہے تھے۔

ڈاکٹر اور انسپکٹر مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جیب سے سگریٹ کا ٹکڑا نکالا اور اس کو دکھاتے

دوبارہ گنتی

ہوٹل کا منیجر۔ ''خان صاحب آپ نے بیس روٹیاں کھائی ہیں۔

خان صاحب۔ ''نہیں برادر ہم نے انیس روٹی کھایا ہے۔''

منیجر ضد کرتا رہا تو خان صاحب نے تنگ آ کر کہا۔

''ہم انیس بیس نہیں جانتا، اب ہم پھر سے کھانا شروع کرتا ہے اور تم گنتے جاؤ۔

(بشیر خان۔ کراچی)

ہوئے کہا۔

''اور یہ...... یہ مجھے چند روز پہلے رات کو صحن میں ملا تھا۔ رات کے تین بجے سلگ رہا تھا۔''

نادر بری طرح نروس ہو گیا۔ خوف کے مارے اس نے سر جھکا لیا۔ ''بتاؤ!'' میں چیخ کر بولا۔ ''وہ کون تھا جو دیوار پھلانگ کر بھاگا تھا۔ کیا تم تھے؟'' نادر چپ سادھے رہا۔ میں نے ایک مکا اس کی ناک پر رسید کیا۔

ناک سے خون کی ایک موٹی سی دھار پھوٹ پڑی۔

''رک جاؤ۔ ملازموں سے یہ سلوک اچھا نہیں۔'' ڈاکٹر تڑپ کر بولا۔ ''مجھے بتاؤ آخر بات کیا ہے؟''

میں نے رات کا تمام واقعہ دہرا دیا۔ انسپکٹر نوید چونک پڑا۔

''ڈاکٹر بڑی عجیب نظروں سے نادر کو گھور رہا تھا۔ اس نے نادر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی نرمی سے پوچھا۔'' کیا قصہ ہے نادر۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے؟''

نادر کے جواب دینے سے پہلے انسپکٹر نوید کھڑا ہو گیا۔ اور نادر کے قریب آ کر خونخوار لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''کیا وہ تم تھے؟'' نادر نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''پھر کون تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم سرکار!'' نادر کراہتے ہوئے

بولا۔

''اور وہ سگریٹ تمہاری تھی۔''

''جی سرکار۔''

''الو کے پٹھے۔'' انسپکٹر کا چہرہ یک سرخ ہوگیا اور ایک زوردار لات پیٹ پر رسید کردی۔ ''مجھے الو بنارہا ہے۔ مجھے یعنی انسپکٹر نوید کو۔'' نادر درد سے دہرا ہوگیا۔

ڈاکٹر زاہد بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ پھر نادر پر جھکا اور بڑی اپنائیت کے لہجے میں بولا۔

''نادر جو حقیقت ہے اگل دے۔ تو جانتا ہے۔ حویلی کے حالات کیا ہیں۔ تجھے اندازہ نہیں تو نے مجھے شدید الجھن میں ڈال دیا ہے۔''

نادر ڈاکٹر کے قدموں پر گر گیا اور بولا۔ ''سرکار وہ میرا سالا افضل تھا۔''

''کون افضل؟'' انسپکٹر بھنویں سکوڑ کر غراتا ہوا بولا۔

''حضور وہ جو قتل کا مفرور ملزم ہے۔'' نادر گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ''وہ دن کو جنگل میں چھپا رہتا تھا۔ اور رات کو حویلی میں آجاتا تھا۔ صاحب کی امریکہ سے واپسی پر میں نے اسے یہاں آنے سے منع کیا، لیکن وہ نہ مانا۔'' کہنے لگا۔ ''اتنی بڑی حویلی میں کسی کو کیا پتہ چلے گا۔''

انسپکٹر نوید نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور میری طرف مڑ کر بولا۔

''اس افضل نے عورت کے چکر میں پڑ کر ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ بہت دنوں سے روپوش ہے۔ پولیس نے یہ سمجھا ہے کہ افضل کہیں ولایت چلا گیا ہے اور کیس بند کردیا۔''

پھر نادر کی طرف دیکھتے ہوئے انسپکٹر گرج کر بولا۔

''تیری جان اس وقت چھوٹ سکتی ہے کہ تو اسے گرفتار کرانے میں ہماری مدد کرے۔''

نادر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے سرکار۔ میرا کہنا نہ ماننے کی سزا اسے بھگتنا ہی چاہئے۔''

پھر ایک رات افضل کو گرفتار کرلیا گیا۔ افضل پر نظریں پڑتے ہی انسپکٹر نوید کا خون کھول گیا۔

اس نے افضل کو مار مار کر ادھ موا کردیا۔ جنگل میں بار بار ٹکرانے اور دلدل میں دھکا دینے والا شخص افضل ہی تھا۔ افضل کے کوائف معلوم کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ عادی مجرم نہ تھا۔ اس قدر سوچی سمجھی اسکیم کے تحت قتل کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کی میرے خاندان سے کیا دشمنی ہوسکتی تھی۔ آخر وہ پراسرار قاتل کون تھا۔ جس نے میرے خاندان کو ختم کردیا۔

ابھی تک مجھ پر قاتلانہ حملہ نہیں ہوا تھا۔ کیا پتہ وہ قاتل زندہ بھی تھا کہ نہیں۔

☆......☆......☆

میں بڑے سکون اور آرام کی زندگی بسر کررہا تھا۔ نرگس سے میری ملاقاتیں بڑے جذباتی دور میں داخل ہوچکی تھیں۔

ایک چاندنی رات کو نرگس نے اپنی زلفیں میرے شانوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بابا کو راضی کرلیا ہے۔ مگر مجھے بڑے شاہ کے مزار پر عہد کرنا ہوگا کہ میں کبھی نرگس کو ٹھکراؤں گا نہیں۔''

''یہ بڑے شاہ کون ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہنسو نہیں!'' نرگس برہم ہوکر بولی۔ ''وہ بڑی طاقتوں کے مالک ہیں۔ وہاں کیا ہوا وعدہ پورا نہ کیا جائے تو عہد کرنے والا تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔''

''کل جمعرات ہے بھرپور چاندنی ہوگی چلیں گے۔''

دوسرے دن رات کو آٹھ بجے ہم بڑے شاہ کے مزار کی طرف روانہ ہوگئے۔

کائنات پر دودھیا چاندنی سایہ فگن تھی۔ ہر سو گہری خاموشی تھی۔ پورا جنگل سویا ہوا تھا۔ نرگس سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ بھرپور چاندنی میں اس کا ملکوتی حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی۔

ایک انہونی ہوگئی۔ اچانک درختوں کی اوٹ سے ایک سایہ نکلا اور وہ نرگس پر ٹوٹ پڑا۔

روپہلی چاندنی میں سائے کے ہاتھ پر چڑھا ہوا فولادی پنجہ چمکا اور نرگس کے چہرے کی طرف جھکا۔ پھر وہ پنجہ اپنی جگہ پر یک لخت رک گیا۔

''تم!......وہ کہاں ہے؟'' سناٹے میں غراہٹ

گونجی۔ پھر سائے نے دھکا مار کر نرگس کو ایک طرف دھکا دے دیا اور میری طرف مڑ کر دیکھنے لگا۔

حیرت، وحشت اور خوف سے میری رگوں میں خون جم کے رہ گیا۔

میرے سامنے نرگس کا بابا کھڑا تھا۔ اس کے لبوں پر سفاک مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔

''حیرت سے تک رہے ہو، کیوں؟'' وہ بولا۔ ''ہاں دیکھ لو میرے چہرے کو۔ اچھی طرح دیکھ لو...... میں خود بھی چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے مجھے اچھی طرح پہچان لو اور سب کچھ جان لو۔

کتنی شدت سے تمہارا انتظار تھا مجھے۔ بیس سال گزر گئے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں انتقام پورا کئے بغیر نہ مر جاؤں۔ اب میں آرام اور سکون سے مر سکوں گا۔ تم اپنے خاندان کے آخری فرد ہو۔ تمہارے مرتے ہی میرا انتقام پورا ہو جائے گا۔ دل کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

بابا ایک بار پھر بولا۔ ''مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرا انتقام ادھورا رہ جائے گا۔ لیکن نہیں اب میرا انتقام پورا ہو گا۔''

بابا ایک قدم آگے بڑھا۔ نرگس چیخ مار کر اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔

بابا نے ایک جھٹکے سے نرگس کو دور پھینک دیا۔ بابا کی طاقت اور توانائی حیرتناک تھی۔ وہ کمزور اور بیمار نظر نہیں آ رہا تھا۔ کمر بھی خمیدہ نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اعتماد کے ساتھ میری طرف بڑھا۔ اس کا فولادی پنجہ چاندنی میں چمک رہا تھا۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میں پلٹ کے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر خوف و دہشت سے میرے قدم نہیں اٹھ رہے تھے۔

''تم مجھے اس روپ میں دیکھ کر حیران ہو، مگر میں تمہاری حیرانگی ضرور رفع کروں گا۔ مرنے سے پہلے تمہاری حیرانگی ضرور دور کردوں گا۔ آج میرا عہد پورا ہو رہا ہے۔

میرا ادھورا انتقام پورا ہو رہا ہے۔ میری کہانی سننے کے لئے تم سے بڑھ کر اور کوئی موزوں نہیں ہو سکتا، کیونکہ تم اس خاندان کے آخری فرد ہو۔

بھاگو نہیں، غور سے سنو۔

آج سے بہت عرصہ پہلے تمہارے دادا نے جاگیرداری کے زعم میں میری چھوٹی بہن کو اغوا کر لیا تھا۔ سنا تم نے۔

پھر اس غریب نے عزت بچانے کے لئے پہاڑی پر سے کود کر جان دے دی۔

مجھے خوشی ہے کہ اس نے اپنی عزت کی خاطر جان دے دی۔

میں نے عدالت کچہری کا رخ نہیں کیا وہاں تو انصاف خریدا اور بیچا جاتا ہے اور اگر مجھے انصاف مل بھی جاتا تو ہماری خاندانی عزت و حرمت کس طرح واپس آ سکتی تھی۔ میں نے اسی وقت عہد کیا تھا کہ اپنے خاندان کی عزت اور چھوٹی بہن کی زندگی کی پوری پوری قیمت تمہارے خاندان سے وصول کروں گا۔

تمہارے خاندان کے چند ہی افراد کو ٹھکانے لگایا تھا کہ تمہارے والدین کو حقیقت کا علم ہو گیا۔ انہوں نے اپنے خاندان کو نابود ہونے سے بچانے کے لئے تمہیں امریکہ بھیج دیا۔

پہلے میں نے تمہارے دادا کو ہلاک کیا۔

پھر تمہارے چچا کو ہلاک کیا اور تمہاری ماں کا تو میں نے دل ہی نکال لیا اور تمہارے باپ کو اسی پنجے سے نوچ نوچ کر ہلاک کیا۔

میں چاہتا تو تمہیں پہلے ہی کسی طریقے سے ہلاک کر سکتا تھا۔ مگر نہیں، تم تو خاندان کے آخری فرد ہو۔

تمہارا خاتمہ شاندار طریقے سے ہونا چاہئے۔ میں تمہیں تمہارے باپ جیسی شاندار موت دینا چاہتا ہوں۔ تم کو مار کر میرا ادھورا انتقام پورا ہو جائے گا۔''

بابا کی آنکھیں دہشت اگلنے لگیں۔ دہانہ کف آلود ہو گیا۔ باچھیں چر گئیں۔ اس کی کیفیت جنونیوں کی سی ہو گئی۔

وہ وحشیانہ چیخ مار کر میری طرف جھپٹا۔ نرگس پھر

اس کے راستے میں آ گئی۔ مکروہ نرگس کو دھکیلتا ہوا میری طرف لپکا۔ میں پیچھے ہٹا۔ مگر وہ آہنی پنجہ تیغ کی مانند گھوما اور میرے بازو پر کھروںچے بناتا ہوا گزر گیا۔ میری چیخ نکل گئی۔ پنجہ پھر چلا اور اس بار میری کنپٹی پر سے گرم گرم خون ابل پڑا۔ میں خون کی حرارت محسوس کر رہا تھا۔ پنجہ ایک بار پھر لہرایا اور میرے بازو سے گوشت ادھڑ گیا، یوں معلوم ہوا جیسے آنکھوں سے حلقے باہر آ پڑے ہوں۔ رات کے بیکراں سناٹے میں میری چیخ اور بابا کا مکروہ قہقہہ ابھرا۔ ''میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ یہ تو ذرا تفریح لے رہا ہوں۔ تجھے وہی موت ملے گی جو تیرے باپ کو ملی تھی۔''

مجھے اس کا یہ جملہ تڑپا گیا۔ میں بھی اپنے خاندان کی موت کے انتقام میں تڑپ رہا تھا۔ میرا بھی ادھورا انتقام تھا۔ میں جوش سے چلایا۔ لیکن اس وقت پھر پنجہ گھوما اور میرے سینے پر آ کر جم گیا۔

مجھے اپنی سانسیں اکھڑتی ہوئی محسوس ہوئیں، میں نے بے بسی سے دونوں ہاتھوں کو باندھ کر بابا کے سینہ پر دے مارا۔ اس کا سینہ ڈھول کی طرح بج اٹھا اور وہ مکروہ انداز میں ہنس پڑا۔ پھر اس نے پنجہ اپنی طرف کھینچا تو معلوم ہوا کہ میری ہر رگ کھنچ رہی ہے۔ جسم و روح کا رشتہ منقطع ہو رہا ہے۔ میں نے وحشت کے عالم میں انگلیاں اس کی آنکھوں میں گھسیڑ دیں تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

میرے سینے اور بازو سے خون ابل رہا تھا اور نقاہت کی وجہ سے سر گھوم رہا تھا۔ آہستہ آہستہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔

بابا ایک بار پھر چیخ مار کر مجھ پر جھپٹا۔ میں پیچھے ہٹا مگر ایک خشک ٹہنی سے الجھ کر نیچے گر پڑا۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ بابا لپک کر پاس آیا اور جھک کر میرا جائزہ لینے لگا، میرے چہرے سے خون ٹپک رہا تھا۔

بابا میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی اطمینان اور آسودہ مسکراہٹ تھی جو عموماً بھوکے درندوں کے چہروں پر اس وقت نمودار ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے شکار کو قابو کر لیتے ہیں۔ بابا ایک بے بس چوہے کی مانند مجھ سے کھیلا اور اب یہ کھیل ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے زندگی کے آخری لمحات میں بھی بچی کھچی طاقت جمع کی اور تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اسی وقت بابا کا خونی پنجہ لہرایا اور میرے چہرے سے گوشت نوچتا چلا گیا۔ میں بے بسی سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور آنکھیں بند کر لیں۔ یہی نوشتہ تقدیر تھا اور تقدیر سے لڑنا لاحاصل تھا۔ بابا میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ بڑے شوق اور دلچسپی سے میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

دوسری طرف شدید غنودگی مجھے اتھاہ گہرائیوں کی طرف لئے جا رہی تھی۔

اچانک ایک فائر ہوا۔ پھر دوسرا فائر ہوا۔ میں ایک دفعہ پھر شعور کی دنیا میں واپس آ گیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ بابا کا بوڑھا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پنجہ بلند کر دیا۔ اور تیزی سے میرے نرخرے کی طرف لے آیا، لیکن بابا کا ہاتھ یک لخت ڈھیلا پڑ گیا۔ کیونکہ اسی وقت تیسرا فائر ہوا تو وہ آہستہ سے مجھ پر ڈھے گیا اور پھر بے بسی سے ادھورا انتقام چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے شانت ہو گیا۔ بابا کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔'' میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

میں دوبارہ ہوش میں آیا تو ڈاکٹر زاہد مشتاق انسپکٹر نوید مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔

اور قریب ہی نرگس اپنے گھٹنوں میں سر دے کر سسکیاں بھر رہی تھی، اب اس کا بھی اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ اور میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔

اس کا بابا ادھورا انتقام لے کر جہان فانی سے کوچ کر گیا تھا اور میں اس کے برعکس ادھورا انتقام لئے جینے کے لئے نئی زندگی کی طرف آ گیا تھا۔

لیکن میں ادھورے انتقام کو ادھورا سمجھ کر بھول گیا اور نرگس کو اپنا اور اپنے آپ کو نرگس کے لئے سہارا بنا دیا۔

حویلی میں اب رونق آ بسی تھی اور ہم دونوں نے نئی زندگی کی شروعات کر دی۔

☠

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

عید کی رات ہے برسات میری آنکھوں سے
لیجئے بس یہی سوغات میری آنکھوں سے
پھر نئے زخم لئے زیب بدن عید کے لئے
پوچھ لو کیسے کٹی رات میری آنکھوں سے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

اور بڑھ جاتی ہے بھولی ہوئی یادوں کی کسک
عید کا دن تو فقط زخم ہرے کرتا ہے
(رخسانہ......دیپالپور)

میں ترا حسن جہاں سوز مکمل کرکے
چند لمحوں کے لئے پیار سے تجھ کو دیکھوں
ایک انگلی سے اٹھاؤں تری ٹھوڑی جاناں
اور دھیرے سے تجھے عید مبارک کہہ دوں
(محمد عمران......کراچی)

پھول مہکے تھے بہاروں کے زمانے آئے
یار بھی آخر پھر دل جلانے آئے
جن سے تھی امید وفا پھر سے ہمیں
نقش یاروں کے وہ بھی مٹانے آئے
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

کعبہ کی طرف ہو اب میرا جو بھی سفر ہو
اس آرزو میں میری شب و روز بسر ہو
کوئی یہ پیغام دے حرم میں جاکر
کوئی بیٹھا ہے ظلمت میں اس کی بھی سحر ہو
(انتخاب:......قاسم رحمان، ہری پور)

میں ریزہ ریزہ ہوتا ہوں ہر شکست کے بعد
مگر نڈھال بہت دیر تک نہیں ہوتا
جواب مل ہی تو جاتا ہے ایک چپ ہی نہ ہو
کوئی سوال بہت دیر تک نہیں رہتا
(شان ملک......ٹنڈو آدم)

ہمارے بغیر بھی آباد ہیں ان کی محفلیں وسی
ہم ناداں سمجھتے تھے کہ محفل کی رونق ہم سے ہے
(انتخاب: کلثوم ندیم......سعید آباد)

بھیگی راتوں میں اکثر تجھے یاد کرتا ہوں
اندھیرے راستوں میں اکثر روشنی کو تلاش کرتا ہوں
امید کی کرن روشن آج بھی اس دل میں
ان راستوں پر تیرا انتظار آج بھی کرتا ہوں
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

ملتے رہتے ہیں بہت لوگ تمہارے جیسے
یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میں ہی کیا ہے
میں نے یہ سوچ کے روکا نہیں جانے سے اسے
بعد میں بھی یہی ہوگا تو ابھی سے کیا ہے
(اسحاق انجم............کنگن پور)

میری آنکھوں کے سمندر میں تھکن کیسی ہے
آج پھر دل کو تڑپنے کی لگن کیسی ہے
میں تیرے وصل کی خواہش کو نہ مرنے دوں گا
موسم ہجر کے لہجے میں تھکن کیسی ہے
(شمس الحق......کراچی)

یہ دل کی راہ میں اڑتا غبار کس کا ہے
وہ جاچکا ہے تو پھر انتظار کس کا ہے
نہیں وہ اپنا مگر اس کی راہ بھی دیکھوں
دل و نظر پہ بھلا اختیار کس کا ہے
(محمد ذیشان......کراچی)

میری ہر سانس میں وابستہ ہیں باتیں تیری
زندہ رہنے کے لئے کافی ہیں فقط یادیں تیری
ہم تو تیری جدائی میں کب کے مرچکے
دل دھڑکتا ہی نہیں چلتی ہیں صرف سانسیں میری
(صبا محمد اسلم......گوجرانوالہ)

نہ جانے کیوں لوگ بیوفائی کرجاتے ہیں
پہلے جینے کے خواب دکھاتے ہیں پھر اچانک چھوڑ جاتے ہیں
پہلے یقین دلاتے ہیں کہ وہ صرف اور صرف ہمارے ہیں
خود کے دکھائے خواب پھر وہ خود ہی توڑ جاتے ہیں
(ارسلان ستار......شاہ پور چاکر)

☆☆

بھٹکے ہوئے راہوں کو منزل کب ملے گی
یہ شام غم کی ڈھلی رات پھر کب ملے گی
بے تاب تھے تجھ سے پھر ملاقات کے لئے
نہ جانے وفائے شمع پھر کب جلے گی
تمنا میں جس کی فریب کھاتے رہے ہیں ہم
صبا تیرے چمن کی رت کب میرے ساتھ چلے گی
اپنی انا کے لئے ہر کوئی جیتا ہے جہاں میں
راس نہ آئی ہم کو تیری یہ بے رخی یہ کب بدلے گی
خاموش ہیں میرے گلستاں کے سارے نظارے
ایک بار مسکرا دو میری زندگی میں یہ بہار کب آئے گی
واجد ہر کوئی جیتا ہے اپنی خوشیوں کے لئے
دل جلا کے دیکھا ہم نے قسمت میں تیرگی ملے گی
(پروفیسر واجد نگینوی...... کراچی)

اپنے ہی دوستوں سے غم ملتے رہے
خوشی کے لمحے آنسوؤں میں ڈھلتے رہے
ہم نے جس پہ بھی یہاں کیا ہے بھروسہ
لوگ سانپ بن کے ہمیں ڈستے رہے
زندگی دھوپ چھاؤں کا سفر ہے پھر بھی
بھری انجمن میں لوگ مل کے بچھڑتے رہے
بڑی مشکلوں سے کسی نے یہ مقام پایا ہے
خوشی کے ساتھ ساتھ غم بھی ملتے رہے
شب کی تنہائی اور تیری یاد بھی ہے
وفا کی راہوں میں چراغ جلتے رہے
یہاں حسن والوں کا کوئی بھروسہ نہیں جاوید
لوگ اپنا مطلب نکال کر بدلتے رہے
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

آسماں تسخیر کرکے دیکھنا ہے
آپ کو تقدیر کرکے دیکھنا ہے
چاند تارے سب ہمارے ہی ہیں لیکن
ان کو اب زنجیر کرکے دیکھنا ہے
رائیگاں ہوں کیوں مرے جذبات آخر
عشق پر تاثیر کرکے دیکھنا ہے
مجھ کو اب اپنے خیالوں کی چمک سے
چارہ گر تصویر کرکے دیکھنا ہے
سحر کرنا ہے نگہ سے اس طرح اب
زہر کو اکسیر کرکے دیکھنا ہے
جس قدر بھی خواب دیکھے میں نے خانم
سب کو اب تعبیر کرکے دیکھنا ہے
(فریدہ خانم...... لاہور)

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کردو
میں صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کردو
نہ تمہیں ہوش رہے نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کر چاہو مجھے پاگل کردو
تم ہتھیلی کو میرے پیار کی مہندی سے رنگو
اپنی آنکھوں میں میرے نام کا کاجل کردو
دھوپ ہی دھوپ ہو ٹوٹ کر برسو مجھ پر
اس قدر برسو میری روح میں جل تھل کردو
اس کے سائے میں میرے خواب دہک اٹھیں گے
میرے چہرے پہ مہکتا ہوا آنچل کردو
راہی گئی صدیوں سے بنا تیرے نامکمل ہے
ایک دفعہ بانہوں میں بھر کر راہی کو مکمل کردو
(محمد احمد نواز...... واں بھچراں)

برسات کی رات میں تمہاری یاد آتی ہے
چمکتی بجلی اور گھٹا تمہارا ہی نغمہ سناتی ہے
بیٹھے بیٹھے جو سو جاؤں تیری یاد میں
تو گرجتی اور چمکتی بجلی مجھے آکر جگاتی ہے
تجھے سوچ کر جب بھی میں اداس ہو جاؤں
تیرے کوچہ سے ہوا خوشیاں لاتی ہے
میں رات تصور میں قریب پاؤں تجھے

اس رات تیری تنہائی مجھ کو رلاتی ہے
(محمد بوٹا راہی......واں بھچراں)

گلاب آنکھیں شراب آنکھیں
یہی تو ہیں لاجواب آنکھیں
انہی میں الفت انہی میں نفرت
تو اب آنکھیں عذاب آنکھیں
کبھی نظر میں بلا کی شوخی
کبھی سراپا حجاب آنکھیں
کبھی چھپاتی ہیں راز دل کے
کبھی ہیں دل کی کتاب آنکھیں
کسی نے دیکھی تو جھیل جیسی
کسی نے پائیں سراب آنکھیں
میں سر بسجدہ تھا، میخانے میں
تمہیں ذہن و دل میں شراب آنکھیں
وہ آئے تو لوگ مجھ سے بولے
حضور آنکھیں جاناں آنکھیں
عجیب تھا گفتگو کا عالم احسان
سوال کوئی جواب آنکھیں
(احسان سحر......میانوالی)

پتھر بنادیا مجھے رونے نہیں دیا
دامن بھی تیری یاد میں بھگونے نہیں دیا
تنہائیاں تمہارا پتا پوچھتی رہیں
شب بھر تمہاری یاد میں رونے نہیں دیا
آنکھ میں آکے بیٹھ گئی اشکوں کی لہر
پر تم کو کسی خواب میں پرونے نہیں دیا
دل کو تمہاری یاد کے آنسو عزیز تھے
دنیا کا کوئی درد ہونے نہیں دیا
یوں اس کی یاد بھی ہاتھ تھام کے
میلے میں اس جہاں کے کھونے نہیں دیا
(عروج ماہین......سرگودھا)

چلو آؤ
وفا کی اک نئی بنیاد رکھتے ہیں
جو کبھی دنیا نے نا سوچی ہو
ایسی اک راہ چنتے ہیں
چلے آؤ
کہ دریا کی وہ لہریں ہمیں پکارتی ہیں
جن میں پاؤں رکھ کر ہم محبت کا لطف اٹھاتے تھے
پرانی محبتوں کو یاد کر کے ہم بھی کئی قسمیں اٹھاتے تھے
محبت کے جذبوں سے جو نا آشنا ہیں یہ لوگ
ان سے دور اک نئی دنیا بناتے تھے
چلے آؤ
وفا کی اک نئی بنیاد رکھتے ہیں
زمانہ بھول جائے ہیر رانجھا کو
ہماری بھی کہانی ایسی ہی سنائے اپنے لوگوں کو
مر کر بھی ہم جیسے امر بن جائیں
آؤ زمانہ کو بھول کر دونوں ہمسفر بن جائیں
(نامعلوم......)

کبھی تم دور نہ رہ پاؤ گے بچھڑو گے تو یاد آؤں گا
دکھ درد تمہارے سننے والا کوئی نہ ملا تو یاد آؤں گا
اب تو میں تمہیں ٹوٹنے پر بھی بکھرنے نہیں دیتا
دوست کبھی ٹوٹ کر بکھرو گے تو یاد آؤں گا
مجھے بھول کر بھی کبھی بھول نہ پاؤ گے تم
میری قربت کے لئے ترسو گے تو یاد آؤں گا
بھوت بن کر رہیں گی تمہارے ساتھ یادیں میری
میری یادوں کے ساتھ لڑو گے تو یاد آؤں گا
دکھ درد تو ہر کسی کی زندگی میں ہوتے ہیں دوست
ایسے دکھ تم سہہ نہ پاؤ گے تو یاد آؤں گا
اور ہاں! یاد رکھنا تم یہ سب باتیں حبیب کی
شعر یا غزل میری پڑھو گے تو یاد آؤں گا
(رانا حبیب الرحمٰن......سینٹرل جیل لاہور)

جب کثرت عشرت ہوتی ہے اک حشر بپا ہوجاتا ہے
ساحل کا سکوں بڑھتے بڑھتے طوفان بلا ہوجاتا ہے

بیتابی دل مٹ جاتی ہے، آرام سوا ہوجاتا ہے
ہاں موت اسی کو کہتے ہیں، غم دل سے جدا ہوجاتا ہے
میخانے میں ساقی کچھ بھی نہیں، ہم بات نبھانے آتے ہیں
پینے کو تو پیتے ہیں لیکن، غم اور سوا ہوجاتا ہے
کچھ اہل محبت جانتے ہیں، یہ راز زمانہ کیا جانے
جب ان کا تصور سامنے ہو، سجدہ بھی روا ہوجاتا ہے
تقدیر سے کچھ ان بن کرلیں گردش کو بلا کر دیکھ تو لیں
سنتے ہیں کہ انتیاز گردش میں سایہ بھی جدا ہوجاتا ہے
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

مبارک ہے دن ہر دل شاداں ہے عید آئی ہے
میرے بچپن کے ساتھی تو کہاں ہے عید آئی ہے
گلے احباب ملتے ہیں خوشی کے پھول کھلتے ہیں
جدائی تیرے میرے درمیاں ہے عید آئی ہے
پری چہرہ گلابوں کی طرح ہر سو مہکتے ہیں
مرا کوچہ بنا اک پرستان ہے عید آئی ہے
دیار غیر کے سب لوگ گھر کو لوٹ آئے ہیں
بسیرا تیرا جانے کس جہاں ہے عید آئی ہے
مہکتے پھول گجرے دوں کسے میں عید کا تحفہ
ملن موسم ہے آیا رت جواں ہے عید آئی ہے
بظاہر مسکرا کر دوستوں سے عید ملتا ہوں
جگر میں غم کا ہجر بیکراں ہے عید آئی ہے
کہے راہی محبت دوریوں سے کم نہیں ہوتی
کسی کی یاد دل میں جاوداں ہے عید آئی ہے
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

ہماری پلکوں پہ اشک لاکر وہ چل دیئے ہیں تو غم نہیں ہے
یہ باب سب خوب جانتے ہیں کہ اشک موتی سے کم نہیں ہے
ہوئے جو بیمار ہم کبھی تو ہر ایک اپنا پرایا خوش تھا
کفن وہ یوں لے کے آیا جیسے ہمارے پیکر میں دم نہیں ہے
چمن میں کوئی شگوفہ پھوٹا نہ کوئی غنچہ ہی گل بنا ہے
جو رنج پھولوں کو ہے تو یہ ہے کہ ان کو کوئی الم نہیں ہے
ہمیں یہ دنیا کے تجربے نے مشاہدے نے سکھا دیا ہے
سکون دل ہے حرام ان پر کہ جن کی آنکھوں میں نم نہیں ہے
ہماری برسوں کی آرزو تھی پئیں گے اور جھومتے رہیں گے
یہاں تکلف روا نہیں ہے، یہ دیر ہے یہ حرم نہیں ہے
(آصف شہزاد......فیصل آباد)

اکیلا ہوں میں اس بے درد دنیا میں
تنہائی کا غم کہیں مجھے پاگل نہ کردے
کوئی ہمدم ہمنوا تو مل جائے کہیں
زندگی تو مجھے کہیں رسوا نہ کردے
چاہتا ہوں تجھے حسین خیالوں میں
خواب گر ٹوٹے تو مجھے تنہا نہ کردے
کیسی کیسی چاہت سموئی ہیں دل میں
تیری یہ بے وفائی مجھے اکیلا نہ کردے
دور ان وادیوں کی گہرائیوں میں کہیں
میرے آنسو تجھے اداس نہ کردے
اس آس پر آج بھی جی رہا ہوں سلیم
میرے نالے تجھے کہیں بدنام نہ کردے
(سلیم بیگ ہمدانی......کراچی)

عشق وفا کا کوئی مذہب نہیں ہوتا
مردے میں کبھی دل دھڑکا نہیں ہوتا
آنکھ کا آنکھ سے تعلق کوئی کیا توڑے
دل سے گزرا نور مجسم نہیں ہوتا
کیوں چاک ہے دامن قبا ہے پھٹی ہوئی
دعا کو سے رب نے پوچھا نہیں ہوتا
حیثیت کے طوفان میں بچھڑ گئے کتنے اہل وفا
ٹوٹی کشتیوں کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا
جذبوں کی حدت سے چراغ بن کر جلے
پتھر کا صنم محبوب نہیں ہوتا
(وجیہہ سحر......جوہر آباد)

☆☆

زندگی خواب کی ہے صورت میں
خواب بھی آپ کی ہے صورت میں
دشمنوں کا جو ایک لشکر ہے
حلقۂ احباب کی ہے صورت میں
ایک چہرہ ہے جو نگاہوں میں
جیسے ماہتاب کی ہے صورت میں
اس طرح اس کا دیکھ کر ہنسنا
گہر نایاب کی ہے صورت میں
دیکھ آنکھوں کو پڑھ کے اے رانا
ورد سیلاب کی ہے صورت میں
(قدیر رانا.....راولپنڈی)

چمکتی ہوئی چاندنی رات ہو
میرے سامنے اک تری ذات ہو
شبِ وصل پھر لوٹ آئے وہی
وہی پھر سے اپنی ملاقات ہو
یہی چاہتے ہیں غمِ ہجر میں
کہ ہم پہ کسی کی عنایات ہو
دبائے ہوئے ہیں جو سینے میں ہم
بھلا کس طرح اُن سے وہ بات ہو
گذر جاؤں میں بحرِ آتش سے بھی
اگر مجھ کو حاصل ترا ساتھ ہو
اے راغب ڈبو دوں گا میں شہر کو
اگر میرے اشکوں کی برسات ہو
(راغب عثمان کیانی.....راولپنڈی)

تم جب بھی گھر پہ آتے ہو
اور سب سے باتیں کرتے ہو
میں اوٹ سے پردے کی جاناں
بس تم کو دیکھتی رہتی ہوں
اک تم سے ملنے کی خاطر
میں کتنی پاگل ہوتی ہوں
جب دروازے پر دستک ہو
یا فون کی گھنٹی بجتی ہو
میں چھوڑ کر سب کچھ بھاگتی ہوں
پر تم کو جب نہیں پاتی ہوں
جی بھر کے رونے لگتی ہوں
میں ایسی محبت کرتی ہوں

میں اپنے ہوش و حواس میں رہ کر
اک وعدہ کرتی ہوں تم سے
کہ جب تک......
جسم میں جان رہی
اور
ہونٹوں میں جنبش باقی
اس دل میں بھی
زبان پر بھی
آنکھوں کی گہرائیوں میں بھی
جسم کی روح میں بھی
بس......!
آپ کا نام ہی آئے گا
دل بس آپکو ہی چاہے گا
اک آپکی چاہت کی خاطر
ہر حد سے پار
گزر جاؤں گی
رکھ کر اپنی انا کو ایک طرف
میں سب کے پاؤں پکڑ لوں گی
یہ دنیا پھر بھی نہ مانی
میں دنیا کی ہر طاقت سے
بے خوف و خطر تنہا
لڑ جاؤں گی
میں اپنے خون میں نہا جاؤں گی
جو تم نہ ملے مر جاؤں گی
ذکیہ نہیں.....
محبت میں ذکیہ محسن کہلاؤں گی
(ذکیہ محسن.....میاں چنوں)

روکتے کس لئے ہو مرنے دو
آتشِ عشق میں اُترنے دو
دل کے آئینے میں اُترنے دو
زندگی کو مری نکھرنے دو
صبح دم تک رہو جھکائے سر
رات بے سود مت گزرنے دو
پلِ صراطِ وفا ہے روزِ جزاء
اس گنہگار کو گزرنے دو
زندگی تو اُجڑ گئی اپنی
نسلِ نو کو ابھی اُبھرنے دو
اس کا وعدہ فریب ہوتا ہے
وہ مکرتا ہے تو مکرنے دو
پھول ہو تو کھلے رہو راہی
میں ہوں خوشبو مجھے بکھرنے دو
(نجیب راہی.....کراچی)

یہ کون دیوانی ہے
راہ تکتی ہے راجا کا
کس دیس کی رانی ہے
کوئی سائے سے ڈرتا ہے
لپٹا ہوا بدلی میں
جب چاند نکلتا ہے
جذبات کا میلہ تھا
پھولوں کی نمائش میں
اک شخص اکیلا تھا
جوڑا کوئی سانپوں کا
یا ریل کی پٹری تھی
یاد ہم تھا آنکھوں کا
(عامر ملک.....راولپنڈی)

☆☆

بلیدان

شہزادہ چاندزیب عباسی-کراچی

پنڈت نے منتر پڑھنا چاہا تو اچانک اس کی زبان بند ہوگئی اور پھر آناً فاناً ایک دور پڑا تیز دھار خنجر زمین سے اوپر کو اٹھا اور اڑتا ہوا بڑی تیزی سے پنڈت کی طرف بڑھا اور چشم زدن میں پنڈت کی گردن دو حصوں میں بٹ گئی

خیر وشر کی بہت ہی دل گرفتہ حیرتناک، خوفناک، وحشت ناک، عجیب وغریب کہانی

شیکسپیئر نے کہا تھا۔ "دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اداکار ہیں جو باری باری اپنا کردار ادا کرکے دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔"

میری داستان حیات عام لوگوں سے بہت مختلف اور ناقابل یقین واقعات پر مبنی ہے۔ اور اگر یہ واقعات خود مجھ پر نہ بیتے ہوتے تو میں بھی اس داستان پر یقین نہ رکھتا۔

میرا نام آیان ہے اور تعلق جی ٹی روڈ سے متصل دینہ شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں ساغری سے ہے۔ میرے والد محمد عارف ایک قناعت پسند انسان تھے اور علاقے کے جاگیردار مظفر شاہانی کے منشی تھے ان دنوں میری عمر محض دس سال تھی جب میرے والد کا انتقال ہوا۔

والدہ عذرا خاتون ایک دس سالہ بیٹے کی ماں ہونے کے باوجود ایک خوبرو اور اسمارٹ خاتون تھیں وہ کہیں سے بھی دس سالہ بیٹے کی ماں نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد گھر کے معاشی نظام کی ذمہ داری ان پر آپڑی تو جاگیردار مظفر کے کہنے پر حویلی میں ملازم ہوگئیں مگر چند ماہ بعد ہی حویلی کی چھت سے گر کر ہلاک ہوگئیں۔

گاؤں کے کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کی موت میں جاگیردار کا ہاتھ ہے۔" لیکن زبردست کے آگے زبردست کی نہیں چلتی جاگیردار کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت کسی میں نہ تھی اور قانون اس کا زرخرید تھا۔

میں اپنے چچا گلزار احمد کے گھر رہنے لگا، فارینہ ان کی اکلوتی بیٹی جو کہ مجھ سے سال دو سال ہی چھوٹی ہوگی میرے وہاں آکر رہنے سے اسے کھیلنے کے لئے ساتھی مل گیا۔ ہنس مکھ اور خوبصورت لڑکی تھی۔ چچا اور چچی نے مجھے اپنی حقیقی اولاد کی طرح پالا اور گاؤں ہی کے ایک گورنمنٹ ہائی اسکول ساغری سے میٹرک کیا۔ اور پھر دینہ کے ایک گورنمنٹ کالج سے بمشکل انٹر تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد گاؤں کی پگڈنڈیوں پر اپنے آوارہ دوستوں رضوان اور عادل کے ساتھ سارا دن مٹرگشت کرتا رہتا۔ ہم تینوں دوست لاابالی اور شریر تھے۔ پورا گاؤں ہم تینوں کی حرکتوں سے نالاں تھا۔ کبھی کسی کی مرغی چرالی اور کسی سنسان مقام پر جاکر خشک ٹہنیوں کی مدد سے آگ جلا کر بھونی اور کھالی۔

اس کام کے لئے ہم نے گاؤں میں ایک ریسٹ ہاؤس منتخب کر رکھا تھا جہاں جاتے ہوئے گاؤں کے رہائشی ڈرتے تھے اس قدیم ریسٹ ہاؤس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں جنوں اور بھوتوں کا بسیرا ہے۔

ان ہی دنوں مجھے دیومالائی کہانیاں پڑھنے کی لت لگ گئی کہانیاں پڑھتے وقت میں خود کو ان ہی کہانیوں کا

ایک کردار سمجھنے لگتا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ کاش کوئی جادوگر مجھے مل جائے جس کا چیلا بن کر میں جادو سیکھوں یا کسی جن کو تسخیر کرلوں اور راتوں رات امیر بن جاؤں میں نے دینہ کے بک اسٹال سے ماورائی علوم کی چند کتابیں خریدیں اور اس سلسلے میں کافی کوشش کی مگر ناکام رہا رضوان اور عادل نے بہت سمجھایا کہ ماورائی علوم سیکھنے کے لئے ان علوم کے ماہر کی رہنمائی ضروری ہے ان کی سمجھائی ہوئی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

ان دنوں میری عمر محض بیس یا اکیس سال تھی۔

میں ایک روز گھر سے بغیر بتائے نکلا اور ماورائی علوم کے ماہر کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔ مجھے گھر سے نکلے ہوئے دوسرا روز تھا۔ اور اب تک مجھے اس سلسلے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ میں دن بھر ادھر ادھر گھومتا رہتا اور رات کو کسی نہ کسی مسجد میں پڑ کے سو جاتا، میرے ساتھ چند کپڑے اور ماورائی علوم سیکھنے کی چند کتابیں تھیں۔ تیسرے روز میں نے سوچا کیوں نہ دوبارہ خود ہی کچھ سیکھنے کی کوشش کروں ان کتابوں میں ایک کتاب تسخیر ہمزاد بھی تھی اس کتاب میں ہمزاد مسخر کرنے کے بہت سے عملیات درج تھے جن میں سے ایک ایک عمل مجھے قدرے آسان لگا۔ اس عمل کے لئے دریا کا کنارا ضروری تھا۔

شام ہوتے ہی میں دریائے جہلم کے کنارے جا پہنچا اور سورج کے ڈوبتے ہی کتاب میں دی گئی ہدایات کے مطابق دریا کے کنارے بیٹھ گیا۔ ابھی میں نے عمل شروع بھی نہیں کیا تھا کہ ''اللہ ہو'' کا نعرہ فضا میں گونجا۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا۔

وہ کوئی مجذوب تھا اس کا لباس میلا کچیلا اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا سر اور داڑھی کے بال جھاڑ جھنکار کی طرح بڑے تھے اس کا حلیہ بہت ہی خستہ حال تھا۔

وہ چلتا ہوا میرے قریب آیا اور اپنی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی نگاہیں مجھ پر مرکوز کردیں کچھ دیر بعد اس کے لب ہلے اور اس کی پرجلال ٹھوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''کمزور سہارے کیوں تلاش کرتا ہے اپنی امیدیں اس سے وابستہ رکھ جس نے تجھے پیدا کیا ہے۔ باقی سب دھوکہ ہے فریب ہے۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔ ''باباجی میں ہمزاد کو تسخیر کرنا چاہتا ہوں میری مدد کرو۔'' میں سمجھ چکا تھا کہ بظاہر دیوانہ لگنے والا وہ شخص کوئی نہ کوئی مقام رکھتا ہے۔

''بے وقوف مت بن ان چیزوں میں کچھ نہیں رکھا۔ دنیا کے پیچھے بھاگنے والے کو دنیا ٹھوکر مار دیتی ہے۔'' مجذوب نے مجھے اپنے قدموں سے الگ کرنا چاہا۔

''میں کچھ نہیں جانتا جب تک آپ میری مدد نہیں کریں گے میں آپ کے پیر نہیں چھوڑوں گا۔'' میں گریہ زاری کرتا ہوا بولا اور اس کے قدموں سے لپٹا رہا۔ اس نے مجھے سمجھانا چاہا مگر میں اپنی بات پر قائم رہا۔

''ٹھیک ہے تو دنیا ہی چاہتا ہے تو تیری مرضی لیکن ایک بات یاد رکھنا کامیاب ہونے کے بعد دوسروں کے کام آنا اور کسی کا دل مت دکھانا۔'' اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور میرا ہاتھ تھام کر ایک طرف چلنے لگا۔

کافی دیر بعد ہم آبادی سے دور ایک پرانے قبرستان میں جا پہنچے جو ویران اور سنسان تھا رات کے گیارہ بجے اس ویران اور سنسان قبرستان میں مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا مجھے خوف سا محسوس ہوا اس نے مجھے قبرستان کے ایک ویران گوشے میں بیٹھنے کی تاکید کی اور تسخیر ہمزاد کے موضوع پر سمجھانے لگا کہ ''اس عمل کے دوران مجھے کیا کرنا ہوگا''

پھر مجھے وہیں بیٹھے رہنے کی تاکید کرنے کے بعد وہ قبرستان سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی کچھ دیر بعد ہوئی اب اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی بوتل جس میں چنبیلی کا تیل موجود تھا اور چراغ نظر آ رہا تھا۔ قبرستان میں ہی بہت مخدوش حالت میں ایک خالی لاوارث جھونپڑی تھی اور جھونپڑی میں بیٹھنے کے لئے اس نے مجھ سے کہا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے ایک وظیفہ یاد کرواتا رہا۔ جب اس نے سمجھ لیا کہ وظیفہ مجھے اچھی طرح یاد ہو چکا ہے تو اس نے مجھے وظیفہ دہرانے کو کہا میں نے وظیفہ دہرایا پھر اس نے

میرے گرد حصار قائم کیا۔ اب مجھے چالیس روز اس کا بتایا ہوا وظیفہ پڑھنا تھا میری پشت پر چنبیلی کے تیل سے روشن کیا ہوا چراغ جل رہا تھا اور میری نظریں اپنے سائے کے رگ گلو پر جمی ہوئی تھیں اور میں مجذوب کا سکھایا ہوا وظیفہ پڑھ رہا تھا، میرے وظیفہ شروع کرتے ہی مجذوب جا چکا تھا۔

چند روز تک قبرستان کی ویرانی اور پراسرار ماحول نے میری محویت میں خلل ڈالا، میں شکستہ جھونپڑی میں تن تنہا بیٹھا رہتا اس اندھیری رات میں کسی ذی نفس کا نام ونشان تک موجود نہ تھا نہ کچھ کھانے کو تھا اور نہ کچھ پینے کو اور پھر مجذوب بھی جا چکا تھا پر وہ مجھے چلے کے دوران کبھی نظر نہیں آیا۔

دن تو کسی نہ کسی طرح گزر جاتا تھا پر رات کا مہیب سناٹا اکثر مجھے خوف زدہ کر جاتا تھا پہلے پہل تو میں بہت ڈرا اور سہا ہوا تھا، کبھی کبھار تو ایسا لگتا کہ ابھی قبروں سے مردے نکل کر مجھے دبوچ لیں گے یا کوئی بھوت یا چڑیل کہیں سے نمودار ہو کر میرا خون پی جائیں گے دن تو سکون سے گزر جاتا تھا لیکن رات ہوتے ہی قبرستان کا ماحول خوف ناک ہو جاتا تھا اگر کہیں کسی درخت کا پتہ بھی ہوا سے گرتا تو کسی بدروح کا گمان مجھے ڈرا دیتا مگر اس کے باوجود میں اپنے وظیفے میں مستغرق رہتا۔ ہمزاد کا عمل رات میں ہی کرنا پڑتا تھا، چراغ کی روشنی میں اور دن بھر میں ہمزاد کے تصور میں غرق رہتا تھا کسی سے ملنے اور بات کرنے کی ممانعت تھی۔

قبرستان میں مجھے تیسرا روز تھا کہ ایک شخص اپنے کسی قریبی عزیز کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا اور مجھ پر ایک نظر ڈالی اور فاتحہ پڑھ کر چلا گیا۔ تین یا چار گھنٹوں بعد وہ شخص دوبارہ قبرستان میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں کھانا اور پانی کی بوتل تھی۔ جو اس نے مجھ سے کچھ فاصلے پر رکھی اور واپس لوٹ گیا غالباً وہ مجھے کوئی پہنچا ہوا شخص سمجھا تھا جو انسانوں سے دور اس ویرانے میں عبادت میں مشغول تھا پھر تو یہ اس کا معمول بن گیا وہ مہربان شخص دن میں ایک دفعہ ضرور کھانا اور پانی لاتا اور مجھے مخاطب کیے بغیر ایک طرف رکھ کر چلا جاتا۔

اب میرا سایہ بھی متحرک ہو چکا تھا وہ ادھر ادھر ہلتا جلتا اور مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتا، بعض اوقات رات کو قبرستان خوف ناک چیخوں سے گونج اٹھتا مگر میں کوئی دھیان دیئے بغیر وظیفہ پڑھنے میں مشغول رہتا، دسویں روز نصف شب کے قریب جب میں اپنے سائے کے رگ گلو پر نظریں جمائے وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ مجھے چیخوں کی آواز سنائی دی یہ آواز مجھے سنا سا لگ رہی تھی میں نے بے اختیار آواز کی سمت دیکھا اور خوف سے لرز اٹھا۔

میری نظروں کے سامنے میرے چچا گلزار احمد تھے انہیں تین چار کفن پوش مردوں نے گھیر رکھا تھا اور چچا چیختے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”آیان مجھے بچاؤ۔“ پھر میری نظروں کے سامنے ان مردوں نے اپنے درانتی نما ناخنوں سے چچا کی شہ رگ کاٹ ڈالی اور بھیانک انداز میں چیختے ہوئے میری طرف دوڑے تو ڈر اور خوف سے میرا خون خشک ہو چکا تھا۔

قریب تھا کہ میں ڈر کر حصار سے باہر نکل جاتا مجھے مجذوب کی ہدایات یاد آ گئیں اس نے کہا تھا کہ ”جب تک میں حصار میں ہوں مجھے کوئی بھی بلا نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اگر میں وقت سے پہلے حصار سے باہر نکلا تو مارا جاؤں گا۔“ میں نے دوبارہ وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا کچھ ہی دیر بعد ماحول پر سکوت چھا گیا۔

چالیسویں روز میں اپنے سائے پر نظریں جمائے معمول کے مطابق وظیفہ پڑھ رہا تھا کہ میرے سائے نے مجسم انسان کا روپ دھار لیا وہ ہو بہو میرا ہم شکل تھا اور حصار سے باہر کھڑا غضب ناک نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا اس نے مجھے ڈرایا دھمکایا مگر میں اس پر کان دھرے بغیر وظیفہ پڑھتا رہا۔

رات کے آخری پہر، جب میرا چالیس روز کا عمل پورا ہوا تو ہمزاد کا چہرہ پر سکون ہو چکا تھا وہ میرے حصار کے قریب آ کر بولا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

میں نے مجذوب کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق جواب دیا۔ ”میں تمہیں اپنے بس میں کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“ ہمزاد نے پوچھا۔

”اس لئے کہ میں حسب ضرورت دشوار اور مشکل کاموں میں تم سے مدد لوں۔“

”کیا مجھے ہر وقت تمہارے سامنے رہنا ہوگا؟“ ہمزاد نے پوچھا۔

”نہیں جب میں تمہیں دل میں یا بلند آواز سے یاد کروں تو تم حاضر ہو جانا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلا سکو گے؟“ ہمزاد نے پوچھا۔

یہ سب سے مشکل سوال تھا اگر میں اس میں چوک جاتا تو ہمزاد کے ہاتھوں میں مارا جاتا کیوں کہ ہمزاد کی خوراک پوری کرنا کسی انسان بلکہ کسی جن کے بس کی بھی بات نہیں۔ میں اس بارے میں آگاہ تھا اس لئے اطمینان سے جواب دیا۔

”نہیں، میں تمہیں ہر روز صرف دو روٹیاں دوں گا، اگر مجھے میسر ہوئیں تو۔“

”تم مجھے کتنا عرصہ اپنا پابند رکھو گے؟“ ہمزاد نے پوچھا۔

”تیس سال۔“ میں نے جواب دیا۔ معاہدے کے بعد میں نے ہمزاد کو جانے کی اجازت دی اور حصار سے باہر نکلا۔

اب میں اپنے محسن اس مجذوب سے ملنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے مجھے تسخیر ہمزاد میں کامیابی حاصل ہوئی تھی چالیس روز کے چلے کے دوران وہ مجذوب مجھے نظر نہیں آیا تھا میں اس کا شکریہ ادا کر کے اسے اپنی کامیابی کی خبر سنانا چاہتا تھا، ارد گرد کا پورا علاقہ چھان لینے کے باوجود جب مجھے وہ مجذوب نظر نہیں آیا تو میں نے دل ہی دل میں ہمزاد کو پکارا تو وہ کسی جن کی طرح میرے سامنے حاضر ہوا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو وہ مجذوب کہاں ہے؟ جس سے میری ملاقات چلہ شروع کرنے سے پہلے ہوئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس کے چاروں طرف دھند ہی دھند چھائی ہوئی ہے۔“ ہمزاد نے جواب دیا۔

”میں نے تو پڑھا اور سنا تھا کہ انسان کا ہمزاد بہت طاقتور ہوتا ہے اس سے کوئی بھی چیز مخفی نہیں رہ سکتی۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ سچ ہے مگر وہ مجذوب کوئی عام انسان نہیں۔ ماورائی قوتوں کی بھی کوئی حدود ہوتی ہیں اور وہ نورانی قوتوں سے دور ہی رہتی ہیں۔“ ہمزاد نے جواب دیا۔

”مجھے دولت چاہئے میں راتوں رات امیر بننا چاہتا ہوں تم اس سلسلے میں میرے لئے کیا کر سکتے ہو۔“ میں نے اپنی برسوں پرانی خواہش ظاہر کی۔

”یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں، اس کے لئے تمہیں شہر جانا ہوگا تم صرف میرے کہنے پر عمل کرنا، دنوں میں امیر ہو جاؤ گے۔“ ہمزاد نے جواب دیا اور مجھے آنکھیں بند کرنے کو کہا تو میں نے آنکھیں بند کیں اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اس کے ساتھ ہی میرے جسم کو جھٹکا لگا، پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی پرندے کی طرح ہوا میں اڑ رہا ہوں، اس کی ہدایت کے مطابق میری آنکھیں بند تھیں، کچھ ہی دیر میں میرے پاؤں زمین پر لگے اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں ایک سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ کراچی شہر ہے۔“ اس نے جواب دیا اور میں حیرت سے اچھل پڑا گویا میں منٹوں میں جہلم سے کراچی پہنچ چکا تھا، یہ طلسماتی باتیں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں کوئی الف لیلیٰ طرز کی کہانی پڑھ رہا ہوں سب کچھ خواب لگتا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ابھی آنکھ کھلے گی اور میں بستر پر سو رہا ہوں گا۔

میں نے ہمزاد کے کہنے پر لاٹری کے ٹکٹ خریدے، جوا کھیلا تو میری جیبیں نوٹوں سے بھر گئیں میں حیران تھا، پھر میں گاؤں لوٹ گیا جاتے وقت چچا چچی اور فارینہ کے لئے کپڑے اور قیمتی تحفے لے گیا تھا، میں نے انہیں بتایا کہ ”مجھے شہر میں اچھی نوکری مل گئی ہے۔“

چند روز بعد میں اصرار کر کے انہیں اپنے ساتھ

کراچی لے آیا اور کرائے پر ایک پوش علاقے میں بنگلہ لے لیا، میری ہر خواہش پوری ہو رہی تھی بنگلے میں قیمتی فرنیچر سے لے کر ضروریات زندگی کی دیگر قیمتی چیزیں آچکی تھیں چچا چچی اور فارینہ بھی حیران تھے کہ نالائق آیان اتنی جلدی کیسے دولت مند بن گیا، میں اپنے لئے فارینہ کی نگاہوں میں چھپی پسندیدگی بھانپ چکا تھا۔ اور یہی بات تھی کہ وہ مجھے بھی پسند تھی میری زندگی کے شب و روز بڑی بے فکری سے گزر رہے تھے۔

ایک روز نصف شب کے قریب میری آنکھ کھل گئی میرا دل عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا اور بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا بالآخر جب کروٹیں بدل بدل کر اکتا گیا تو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا پھر بھی جب کیفیت میں فرق نہ آیا تو میں کمرے سے باہر نکلا اور کوریڈور میں آگیا ابھی مجھے وہاں کھڑے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک میں چونکا فارینہ کے کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا۔

میں نے دیکھا فارینہ کمرے سے نکلی اور ایک طرف چلنے لگی اس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں یا شاید اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مین گیٹ تک جا پہنچی پہلے میں نے سوچا اسے پکاروں پھر اپنا ارادہ بدل دیا، میں جاننا چاہتا تھا کہ رات کے اس پہر وہ کہاں جا رہی ہے۔ پھر اس کے چلنے کا انداز بھی غیر معمولی تھا آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو۔

سب سے عجیب بات اس کے پاؤں میں چپل بھی موجود نہ تھے وہ برہنہ پاؤں چل رہی تھی میں دبے قدموں اس کا پیچھا کرنے لگا وہ گھر سے باہر نکل چکی تھی اور اب سڑک کے کنارے چل رہی تھی رات کے ایک بجے سڑکیں بھی سنسان تھیں دسمبر کا مہینہ تھا سخت سردی کے باعث گلی کے آوارہ کتے بھی کونے کھدروں میں دبکے سو رہے تھے۔ جبکہ میں سردی سے ٹھٹھرتا ہوا اس کا پیچھا کر رہا تھا اور وہ اس سب سے بے نیاز سڑک پر چل رہی تھی مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں گشت پر مامور کوئی پولیس موبائل نہ آپہنچے ایسی صورت میں فارینہ اور میں دونوں مشکل میں پڑ جاتے۔ ہوسکتا تھا رات کسی تھانے کے لاک اپ میں بسر کرنا پڑتی۔

ہم گھر سے کافی فاصلے پر ایک ویران علاقے میں پہنچ چکے تھے کچھ ہی دور ایک قبرستان تھا اور میں اتنی دیر میں اس کی کیفیت سے اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ نیند میں چل رہی ہے میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اسے روک دوں۔ "فارینہ رکو کہاں جا رہی ہو؟" میں نے اسے پکارا مگر وہ بغیر جواب دیئے چلتی رہی، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہری ہو چکی ہے۔

"فارینہ رکو۔" میں اس بار چیخ پڑا مگر وہ رکے بغیر قبرستان کے قریب پہنچ چکی تھی میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔ "فارینہ ہوش میں آؤ تم کہاں جا رہی ہو؟ یہ قبرستان ہے۔" وہ جواب میں کچھ نہ بولی اور مڑ کر میری طرف دیکھا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔" اس کے حلق سے عجیب سی غیر انسانی غراہٹ نما آواز نکلی۔ اور میں ششدر رہ گیا اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا یا کچھ سمجھتا اس نے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے مجھے دھکا دیا میں تقریباً اڑتا ہوا سا پیچھے جا گرا۔ اس طرح اچانک گرنے سے نیچے پڑے کنکر اور پتھر میرے بدن میں چبھے اور تکلیف کی شدت سے میں بے اختیار چیخ پڑا۔ میں حیران و پریشان تھا کہ فارینہ جیسی نازک اندام لڑکی کے جسم میں اتنی قوت کہاں سے آگئی جو اس نے ایک معمولی سے دھکے سے مجھے گرا دیا تھا، فارینہ قبرستان میں داخل ہو چکی تھی میں نے اٹھ کر دوبارہ اسے روکنا چاہا اس بار فارینہ نے مڑ کر مجھے زوردار تھپڑ رسید کیا اس کا ہاتھ تھا کہ ہتھوڑا تھپڑ پڑتے ہی میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور چکر سے آگئے نچلا ہونٹ دانتوں سے ٹکرا کر زخمی ہو چکا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔ مجھے یہ کوئی اور ہی چکر لگ رہا تھا۔

اوسان بحال ہوتے ہی میں نے ہمزاد کو طلب کیا۔ "فارینہ کو روکو یہ کہاں جا رہی ہے؟" میں نے ہمزاد

کو حکم دیا فارینہ اس دوران کافی آگے جا چکی تھی، ہمزاد پلک جھپکتے میں اس کے قریب جا پہنچا اور فارینہ کے قدم رک گئے اب وہ ایک جگہ ساکت کھڑی تھی۔ ''اسے گھر پہنچا دو۔'' میں نے فارینہ کے قریب پہنچ کر کہا۔

اچانک ایک ہیولہ سا نمودار ہوا جس نے ایک دیوہیکل شخص کا روپ دھار لیا اس کا خوف ناک چہرہ دیکھتے ہی میرا رواں رواں لرز اٹھا۔

اس کی انگاروں کی مانند دہکتی آنکھوں سے درندگی اور سفا کی جھلک رہی تھی میں اس دہشت ناک مخلوق کو دیکھ کر خوف زدہ ہو چکا تھا۔ ''اپنی زندگی چاہتے ہو تو اس لڑکی کو بھول کر یہاں سے چلے جاؤ۔'' وہ گھر گھراتی ہوئی غیر انسانی آواز میں بولا اور میں نے ہمزاد کی طرف دیکھا جس کی نظریں اس خوفناک مخلوق پر جمی ہوئی تھیں۔ ''کک کون ہو تم؟'' میں ہکلاتے ہوئے بولا جب کہ وہ خوفناک صورت شخص آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا۔

ہمزاد کی موجودگی کے باوجود میرا خوف سے برا حال تھا ٹانگیں لرز رہی تھیں اور گھگھی بندھ چکی تھی اس خوف ناک صورت شخص نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا ہی تھا کہ ہمزاد نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا تو اس بلا کے جسم میں آگ لگ گئی اور قبرستان اس کی خوف ناک چیخوں سے لرز اٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ راکھ کی صورت میں زمین پر پڑا تھا۔

''یہ کون تھا؟'' میں نے ہمزاد سے پوچھا۔

''یہ خوف ناک بدروح تھی جو فارینہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔'' ہمزاد نے جواب دیا۔

اسی وقت میری نظر فارینہ پر پڑی وہ اپنے حواس میں آ چکی تھی اور سہمی ہوئی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی شاید اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ قبرستان میں کیسے پہنچی۔ ''یہ میں یہاں کیسے پہنچ گئی؟'' وہ خوف سے لرزتی ہوئی بولی۔

''تم نیند میں چلتی ہوئی یہاں آ گئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ہمزاد اب تک اپنی جگہ پر موجود تھا۔ ''تم جاؤ کہیں یہ تمہیں دیکھ کر خوف زدہ نہ ہو جائے۔'' میں نے دل ہی دل میں ہمزاد کو حکم دیا، میں جانتا تھا کہ منہ سے بولے بغیر میری آواز ہمزاد تک پہنچ جائے گی۔

''تمہارے علاوہ کوئی دوسرا نہ ہی مجھے دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی میری آواز سن سکتا ہے۔'' ہمزاد نے کہا اور غائب ہو گیا۔

میں نے خوف زدہ فارینہ کا ہاتھ تھاما اور قبرستان سے باہر نکلنے کے لئے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ ٹھٹھک کر رک گیا ہمارے سامنے ایک دراز قد دیوہیکل شخص موجود تھا، ماتھے پر قشقہ اور گلے میں مختلف اقسام کی مالائیں، دیکھتے ہی میں سمجھ گیا وہ کوئی ہندو سادھو ہے۔ ''کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کالی کا مہان سیوک رام دیال ہوں تم نے میرا راستہ کھوٹا کر کے اچھا نہیں کیا۔'' وہ اپنی انگاروں کی طرح دہکتی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

''میں نے تمہارا کب راستہ کھوٹا کیا ہے میں تمہیں جانتا تک نہیں۔'' میں نے حیرت سے کہا جبکہ فارینہ سہم کر مجھ سے چپک چکی تھی۔

''یہ لڑکی اماوس کی رات ایک خاص گھڑی میں پیدا ہوئی ہے۔ بدروح میرے حکم پر اس لڑکی کو میرے پاس لا رہی تھی کہ تم آ گئے تم نے چھایہ (ہمزاد) کی شکتی سے اس کا انت کر ڈالا۔'' رام دیال غضب ناک لہجے میں بولا۔

''اس معصوم لڑکی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' میں اس سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

''دیوی کے چرنوں میں اس کی بلی دینے سے میری شکتی میں اضافہ ہو جائے گا اگر تم اس لڑکی کو بچانا چاہتے ہو تو اپنے ہمزاد کو میرے حوالے کر دو ورنہ اس لڑکی کو تو میں لے کر جاؤں گا ہی پر تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ تند لہجے میں بولا۔

''او پجاری زیادہ گیدڑ بھبکی مت دو اور شرافت سے یہاں سے نکل جاؤ۔'' میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور رام دیال نے غصے سے میری طرف دیکھا اور زیر لب

کوئی منتر پڑھنے لگا۔

اچانک ہی ہمارے دائیں سمت بہت سے چھوٹے چھوٹے کتوں سے مشابہ جانور نمودار ہوئے اور غراتے ہوئے ہماری طرف لپکے تو میں نے دل ہی دل میں ہمزاد کو پکارا، میری نگاہوں کے سامنے بجلی سی چمکی اور ان جانوروں کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی۔ قبرستان خوف ناک چیخوں سے گونج اٹھا جبکہ فارینہ خوف ودہشت سے گر کر بے ہوش ہوچکی تھی کچھ ہی دیر بعد وہ جانور جل کر خاکستر ہوچکے تھے۔

میرا ہمزاد میرے قریب ہی نمودار ہوچکا تھا اور رام دیال کی قہر آلود نگاہیں ہم دونوں پر جمی ہوئی تھیں گویا وہ ہمزاد کو دیکھنے کی طاقت رکھتا تھا، خلاف توقع اس کے بعد اس نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی اور بولا۔ ”مورکھ یہ تو نے اچھا نہیں کیا، بہت جلد تو اس کا نتیجہ دیکھ لے گا۔“ اور اس کے ساتھ ہی پلک جھپکتے ہی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔

☆......☆......☆

میں فارینہ کو گھر لا چکا تھا۔ چچا چچی سب سے بے خبر اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ میں نے فارینہ کو اس کے کمرے میں بیڈ پر لٹایا اور بڑی مشکل سے ہوش میں لایا وہ اب تک خوف زدہ تھی میں نے اسے سمجھایا کہ اس واقعہ کا ذکر چچا اور چچی سے نہیں کرے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں رام دیال بھاگ چکا ہے میری تسلی کے باوجود اس کا خوف کم نہیں ہوا لیکن یہ بہتر ہوا کہ اس نے دوسرے روز اٹھتے ہی اپنے والدین سے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ رام دیال والے واقعہ کو کئی روز گزر چکے تھے پھر دوبارہ اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ فارینہ کا خوف بھی آہستہ آہستہ کم ہوتا جارہا تھا۔

ہمزاد کی مدد سے میری دولت میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا تھا میرا بینک بیلنس لاکھوں تک جا پہنچا تھا کار بھی خرید لی تھی اور میرے دن پھر چکے تھے مفت کی دولت سے میری حالت دیوانوں کی سی ہوچکی تھی میں مجذوب کی نصیحتیں بھلا چکا تھا جب روپیہ پیسہ بغیر کسی محنت کے مل رہا ہو تو انسان کی حالت دیوانوں کی سی ہوجاتی ہے اسے اس کی قدر نہیں رہتی اور وہ اخلاقی طور پر پست ہوجاتا ہے، میرے ساتھ بھی یہی ہوا، میں نت نئی چیزیں خریدنے لگا میری ہر رات عیش ونشاط میں گزرنے لگی حسین وجمیل لڑکیاں میرے قریب آنے لگیں اور میں زندگی کے ایک نئے مزے سے آشنا ہوگیا۔ اپنی عیاشیوں کے لئے میں نے ایک دوسرے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا، میں دن بھر گھر پر پڑا رہتا اور رات کو گھر سے باہر نکل جاتا۔

ایک شب میں ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ میری شناسائی ایک ہندو فیملی سے ہوگئی میاں بیوی عمر رسیدہ جبکہ ان کی دو لڑکیاں جو کہ خوبصورتی میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں ایک کا نام شاردہ اور دوسری کا نام کاجل تھا خیر میں ہمزاد کی مدد سے ان سب سے بے تکلف ہوگیا اچھی گپ شپ رہی میری توجہ کاجل پر مرکوز رہی اور پھر میں کاجل سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ ہمزاد نمودار ہوا، یہ خلاف توقع تھا وہ کبھی بھی بغیر بلائے حاضر نہیں ہوتا تھا۔ ”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”رام دیال اپنا وار کرنے میں کامیاب ہوچکا ہے۔ تمہارے چاچا اور چچی اس دنیا میں نہیں رہے اور فارینہ کو اغوا کرلیا گیا ہے یہ سب اس وقت ہوا جب تم نے مجھے ہوٹل میں طلب کیا تھا وہ شیطان ہماری لمحاتی کوتاہی سے فائدہ اٹھا گیا۔“ ہمزاد نے جواب دیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔

میں نہ جانے کس طرح گھر پہنچا۔ چوکیدار کوریڈور میں بے ہوش پڑا تھا اس کے سر پر شاید کسی بھاری چیز سے وار کیا گیا تھا کیونکہ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا چچا کی لاش ان کے کمرے کے فرش پر پڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر چچی کا بے حس وحرکت جسم بھی پڑا تھا دونوں کے جسموں پر خنجر کے زخموں کے نشان تھے فرش ان کے خون سے سرخ ہورہا تھا میں چیختا ہوا چچا کی لاش سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ہمزاد میرے قریب ہی

شرمندہ تعبیر کھڑا تھا۔ حالانکہ اس سانحہ میں اس کی غفلت کا نہیں میری بے وقوفی کا ہاتھ تھا۔ نہ میں اسے ہوٹل میں طلب کرتا اور نہ رام ریال ہماری اس غفلت سے فائدہ اٹھاتا۔ میں روتے روتے اپنے بال نوچنے لگا۔

اسی وقت میری نظر چچا کے بے جان جسم کے قریب پڑے خنجر پر پڑی جو خون آلود تھا غالباً اسی خنجر سے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا میں نے لپک کر خنجر اٹھالیا اور خنجر کی خون آلود دھار کو دیکھ کر ہذیان بکنے لگا۔ ”رام دیال میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔“ اور ساتھ ہی ساتھ روتا جارہا تھا میری آہ وزاری کے دوران ہمزاد غائب ہو چکا تھا میں سخت ذہنی صدمے سے دوچار تھا، ماں باپ کے بعد میرے آخری رشتے کو بھی وہ ظالم پجاری ختم کر چکا تھا، نہ جانے کتنی دیر بیتی مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔

اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی میں نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ نصف درجن پولیس اہلکار تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا چوکیدار بھی تھا میرا خون میں ڈوبا لباس اور ہاتھ میں خون آلود خنجر مجھے مشکوک بنا رہے تھے۔

”تم نے انہیں قتل کیوں کیا اور ان کی بیٹی کو اغوا کر کے کہاں رکھا ہے......؟“ انسپکٹر کے الفاظ میری سماعت سے بم کی طرح ٹکرائے۔

”یہ کیا بکواس ہے یہ میرے چچا اور چاچی تھے بھلا میں انہیں کیسے مار سکتا ہوں اور جس وقت ان کا قتل ہوا میں فلاں ہوٹل میں تھا۔“ میں ہزیانی لہجے میں چیخ پڑا۔

”مگر تمہارے ملازم کا بیان ہے کہ ان میاں بیوی کے قتل میں تمہارا ہاتھ ہے۔“ انسپکٹر کے الفاظ سن کر مجھے ایسا لگا جیسے زمین پھٹ گئی ہو اور میں اس میں سما چکا ہوں، میں نے حیرت سے اپنے ملازم عزیز کی طرف دیکھا۔ ”ہاں میری آنکھوں کے سامنے آیان صاحب گھر میں داخل ہوئے اور اپنے چچا اور چچی کو قتل کرنے کے بعد میرے سر پر کسی بھاری چیز سے وار کیا۔“ عزیز نے کہا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ عزیز مجھ پر جھوٹا الزام کیوں لگا رہا ہے اس وقت میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی میں عزیز پر جھپٹ پڑا اور اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ ”ذلیل نمک حرام مجھ پر جھوٹا الزام لگاتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔“ سپاہیوں نے مجھے گھسیٹ کر اس سے الگ کیا اور میرے چیخنے چلانے کی پرواہ کئے بغیر مجھے ہتھکڑی پہنادی۔

”یہ ظلم ہے میرے چچا چچی کی لاشیں لاوارثوں کی طرح پڑی ہیں اور تم مجھے بے گناہ گرفتار کر رہے ہو۔“ میں چیخنے چلانے لگا مگر ان ظالموں نے میری ایک نہ سنی اور رائفلوں کے بٹوں سے مجھے مارنا شروع کر دیا اور پھر کسی سپاہی کی رائفل کا بٹ میرے سر پر لگا اور میں ہوش وحواس سے عاری ہو گیا۔

مجھے ہوش آیا تو میں پولیس اسٹیشن کے لاک اپ میں موجود تھا مجھ سے کچھ فاصلے پر وہی انسپکٹر جس نے مجھے گرفتار کیا تھا دو سپاہیوں سمیت موجود تھا میں کراہتے ہوئے اٹھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ان ظالموں نے مجھے اس قدر بے رحمی سے مارا پیٹا تھا کہ میرا پورا بدن اب تک دکھ رہا تھا۔ ”ہاں کیا خیال ہے تمہارا دماغ ٹھکانے آیا کہ نہیں۔“ انسپکٹر نے میرے پہلو میں لات رسید کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا ناں کہ یہ مجھ پر جھوٹا الزام ہے۔“ میں کراہتے ہوئے بولا۔

”بچو انسپکٹر صاحب کے آگے تو پتھر بھی بولنے لگتے ہیں تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ سچ سچ بتا دو، ویسے بھی ایف آئی آر تمہارے نام کٹ چکی ہے اور تمہارا ملازم قتل کا چشم دید گواہ ہے تمہیں تو پھانسی ہوگی، اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم خود ہی اپنا جرم قبول کرلو۔ بہرحال میں تمہیں سوچنے کا ایک موقع دیتا ہوں شام تک اچھی طرح سوچ لو ورنہ کمرہ تفتیش میں جا کر تم وہ جرم بھی قبول کرلو گے جو تم نے نہیں کئے۔“ وہ مجھے ڈرانے دھمکانے کے بعد سپاہیوں سمیت لاک اپ سے چلا گیا یہ میرے لئے بہتر بھی تھا۔

خوش قسمتی سے لاک اپ میں میرے علاوہ کوئی

دوسرا ملزم نہیں تھا اور میرا ذہن بھی کام کرنے لگا تھا میں اگر چاہتا تو پولیس اہلکاروں کے سامنے ہی ہمزاد کو طلب کرکے انہیں سبق سکھا سکتا تھا لیکن یہ مناسب نہ ہوتا اور اس طرح میں ہر ایک کی نظر میں بھی آ جاتا۔ میں نے کچھ دیر بعد ہمزاد کو طلب کیا وہ لمحہ بھر میں میرے سامنے حاضر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں غصے اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ”تم اب تک کہاں تھے اور وہ مردود پجاری کہاں ہے اور اس نے فارینہ کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

رام دیال کے اطراف عجیب سی دھند چھائی ہوئی ہے میں نے تمہارے حکم کے بغیر ہی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اس کے اور میرے درمیان ان دیکھی دیوار حائل ہے اس لئے میں اس کی کھوج نہیں لگا سکا۔ لیکن تم فکر مت کرو بالآخر میں اس کا سراغ لگا ہی لوں گا“ ہمزاد نے جواب دیا۔

”تم اپنی ناکامی کا اظہار کر رہے ہو حالانکہ ہمزاد کی طاقت لامحدود ہوتی ہے۔“ میں اشتعال میں آ گیا۔

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو ماورائی قوتوں کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں اور ہر سیر پر سوا سیر موجود ہے اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا جہنم بن جائے۔“ ہمزاد نے جواب دیا۔

”اب مجھے ان آہنی سلاخوں کے پیچھے سے نکالو گے بھی یا یونہی باتیں کرتے رہو گے؟“ میں نے بیزار کن لہجے میں کہا۔

”یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔“ ہمزاد نے لاک اپ کے دروازے پر لگے تالے کی طرف اشارہ کیا اور تالا کھل گیا میں کھڑا ہوا ہی تھا کہ دروازہ بھی خود بخود کھل گیا۔ میں لاک اپ سے نکل کر کوریڈور میں آ گیا۔ جہاں دو سنتری کھڑے تھے۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ان کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ انہوں نے رائفلوں کا رخ میری طرف کیا ہی تھا کہ ہمزاد نے انگلی سے ان کی طرف اشارہ کیا اور وہ دونوں کسی مجسمے کی طرح ساکت ہو گئے۔ ”اب تم باآسانی پولیس اسٹیشن سے باہر نکل جاؤ میں نے کچھ دیر کے لئے یہاں موجود ہر شخص کو ساکت کر دیا ہے۔“ ہمزاد نے کہا اور میں اس کے ہمراہ ساکت کھڑے سپاہیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا پولیس اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

وہاں سے میں سیدھا گھر گیا نقدی اور زیورات سمیٹے اور فوراً وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے معلوم تھا شہر بھر کی پولیس میرے فرار کی خبر سنتے ہی میری تلاش میں سرگرداں ہو جائے گی اس لئے میں جلد از جلد اس شہر سے دور جانا چاہتا تھا۔ میں نے بہتر یہی جانا کہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بجائے گاؤں چلا جاؤں، خوش قسمتی سے بنا کسی رکاوٹ کے میں ٹرین میں سوار ہو گیا۔

جب میں دینہ کی حدود میں داخل ہوا تو رات کے دس بج رہے تھے ساغری کے گلی کوچے رات کے پہر سنسان تھے۔ میں بجائے گھر جانے کے ویران ریسٹ ہاؤس میں گیا۔ پورا ریسٹ ہاؤس گرد و غبار سے اٹا پڑا تھا۔ میں کوریڈور سے ہوتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں برسوں پرانا بیڈ پڑا تھا۔ میں نے بیڈ پر پڑے میٹرس کو جھاڑا اور اندھیرے میں ہی اس پر دراز ہو گیا اگر میں پہلے والا آیان ہوتا تو تنہا کبھی بھی اس ریسٹ ہاؤس میں رات نہ بسر کرتا۔ لیکن ہمزاد جیسی ماورائی قوت کی وجہ سے مجھے حوصلہ تھا۔ طویل سفر سے کافی تھک چکا تھا اس لئے جلد ہی نیند آ گئی۔

صبح جلد ہی آنکھ کھل گئی اس ویران ریسٹ ہاؤس کے قریب ہی پانی کا ایک قدرتی چشمہ تھا۔ وہاں نہایا اور ریسٹ ہاؤس میں لوٹ آیا ناشتے جیسے معمولی کام کے لئے ہمزاد کو زحمت دینا پڑی۔ کیونکہ فی الحال میں گاؤں میں کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہتا تھا سردست ریسٹ ہاؤس میرے لئے بہترین ٹھکانہ تھا کیونکہ ساغری کے رہائشی توہمات کی وجہ سے یہاں کا رخ نہیں کرتے تھے۔ رام دیال فی الحال روپوش تھا۔ فارینہ کے بارے میں سوچ سوچ کر دل بیٹھ رہا تھا کہ رام دیال نے اس کے ساتھ کیا کیا ہوگا۔

بیٹھے بیٹھے اچانک ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا میں بچپن سے سنتا چلا آ رہا تھا کہ

میری ماں حویلی کی چھت سے گر کر قدرتی طور پر نہیں مری تھی بلکہ اسے گرایا گیا تھا۔" کیوں نہ اس سلسلے میں ہمزاد سے معلومات حاصل کروں۔" میں نے فوراً ہی ہمزاد کو طلب کیا۔" میں جاننا چاہتا ہوں کہ برسوں پہلے میری ماں عذرا خاتون حویلی کی چھت سے کیسے گری تھیں؟" میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

ہمزاد نے بولنا شروع کیا۔" عذرا خاتون گاؤں کی حسین ترین عورت تھی۔ جاگیردار مظفر کی شروع سے ہی اس پر نظر تھی لیکن وہ اس پر اپنے ہاتھ اس طرح صاف کرنا چاہتا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو تمہارے باپ کے انتقال کے بعد اس نے عذرا خاتون کو حویلی میں ملازمت کی پیش کش کی جسے معاشی مجبوری کی وجہ سے اس نے قبول کرلیا اور مظفر مناسب موقع کی تاک میں رہنے لگا اس نے اپنے شیطانی مقصد کے حصول کے لئے حویلی کے کے نئے منشی خیردین کو اپنا شریک راز بنالیا ایک شام منصوبے کے مطابق خیردین نے عذرا خاتون کو حویلی کی چھت پر موجود کمرے کی صفائی کا حکم دیا۔

وہ حویلی کی بالائی چھت پر پہنچی اور ابھی کمرے کی صفائی کا آغاز کیا ہی تھا کہ خیردین اور مظفر اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے کمرے میں داخل ہوگئے عذرا خاتون نے مظفر کی آنکھوں میں ہوس دیکھ کر بھاگنا چاہا مگر ان دونوں نے اسے بے دست و پا کردیا، خیردین کمرے سے باہر نکل گیا اور مظفر اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے بعد کمرے سے نکلا۔ عذرا خاتون غیرت مند عورت تھی اسے معلوم تھا کہ مظفر کے خلاف زبان کھولنے کی صورت میں اس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا الٹا وہ خود بدنام ہوگی اس نے بہتر یہی جانا اور حویلی کی بلند و بالا چھت سے کود کر خودکشی کرلی۔

پولیس کا منہ جاگیردار کی دولت اور گاؤں والوں کا منہ اس کے خوف نے بند کردیا اس واقعہ کو حادثہ قرار دے دیا گیا۔"

ماں کی دردناک موت کی کہانی سن کر میرے سینے میں آتش انتقام کے شعلے بھڑک اٹھے، رام دیال تو میری دسترس سے باہر تھا لیکن میری ماں کا قاتل مظفر میرے ہی علاقے میں میری نظروں کے سامنے تھا۔ مظفر اپنی شاندار حویلی میں شان و شوکت سے رہتا تھا اس کی دو بیٹیاں صائمہ اور رخسانہ تھیں اور صرف ایک ہی بیٹا جمیل تھا جو ایب نارمل تھا اکثر اسے خطرناک دورے پڑتے تھے۔

"میں اپنی ماں کے قاتل کو عبرت ناک سزا دوں گا آج رات اس کی دونوں بیٹیوں کو حویلی سے اٹھا کرلے آؤ تاکہ اسے بھی پتہ چلے کہ بہن بیٹی کی عزت کیا ہوتی ہے؟" انتقام کے جذبے نے مجھے اس وقت اندھا کردیا تھا۔

"یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ انتقام کے چکر میں مت پڑو، ویسے بھی مظفر کو قدرت کی طرف سے اس کے گناہوں کی سزا مل چکی ہے اس کا بیٹا اس کی دولت و جائیداد کا وارث پاگلوں کی طرح زندگی بسر کررہا ہے اور تمہاری ماں کا دوسرا مجرم چند سال پہلے سانپ کے کاٹنے سے مرچکا ہے۔"

اس کا اشارہ منشی خیردین کی طرف تھا۔

'مجھے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں جیسا کہا ہے ویسا کرو۔" میں نے ہمزاد کو سخت تیوروں سے گھورا۔

نصف شب کے قریب ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں مظفر کی دونوں بیٹیاں موجود تھیں دونوں ہی حسن و جوانی میں یکتا تھیں ہمزاد انہیں میرے کمرے میں چھوڑ کر جاچکا تھا فی الحال وہ دونوں بے ہوش تھیں، میں نے ریسٹ ہاؤس کے تقریباً تمام دروازے بند کررکھے تھے کچھ ہی دیر میں وہ دونوں ہوش میں آگئیں اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگیں موسم کے تیور بھی بدل چکے تھے اور گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش ہورہی تھی میرے سینے میں انتقام کا طوفان تھا۔

"تم کون ہو اور ہم یہاں کیسے پہنچیں۔" رخسانہ نے ہکلاتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"میں تمہارے باپ مظفر کے ظلم کا شکار ہوں۔ اس نے برسوں پہلے جو ظلم میری ماں کے ساتھ کیا تھا وہ اب تم دونوں کو سہنا پڑے گا تاکہ وہ تمہیں دیکھ کر ساری زندگی روتا رہے۔" میں نے جواب دیا۔

''لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے جو کیا ہمارے باپ نے کیا۔'' صائمہ نے ممنائی، ان کے چہرے خوف وہراس سے زرد پڑ چکے تھے۔

سچ کہوں تو برسوں پرانی اس رات کو یاد کر کے مجھے اب بھی پشیمانی کا احساس ہوتا ہے جرم ان کے باپ نے کیا تھا اور سزا بیٹیوں کو ملی تھی۔ وہ دونوں اندھیرے کمرے میں گرتی پڑتی ادھرادھر بھاگ رہی تھیں اور میں کسی وحشی جانور کی طرح ان پر جھپٹ رہا تھا وہ اپنے بچاؤ کے لئے زبردست مزاحمت کر رہی تھیں اسی کش مکش کے دوران میں نے ایک کو دبوچ لیا دوسری نے اسے بچانے کی کوشش کی میں نے اسے زور سے دھکیلا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی اور ایک طرف گر پڑی کمرہ ان کی سسکیوں سے گونج رہا تھا اور میرے جذبہ انتقام کو تسکین مل رہی تھی وہ دونوں میرے اندھے انتقام کا شکار ہو چکی تھیں اور ایک طرف بکھری پڑی سسک رہی تھیں۔

رات کے تین بج چکے تھے، میں ان دونوں سسکتے وجود کے قریب بے سدھ پڑا تھا کہ اچانک چونک کر اٹھ کھڑا ہوا، ریسٹ ہاؤس کے باہر بہت سے افراد کے بھاگنے اور شور کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسی لمحے ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔ ''وہ راکھشش اس لمحے اندر ہے۔ ناریوں کو اس نے یہیں قید کر رکھا ہے۔''

اس آواز کو سنتے ہی میں جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ یہ میرے ازلی دشمن رام دیال کی آواز تھی۔

''دروازہ توڑ کر اندر جا گھسو۔'' ایک دوسری آواز سنائی دی، یہ مظفر تھا پھر دروازے پر ضربیں لگنے لگیں میں جانتا تھا کہ ریسٹ ہاؤس کا برسوں پرانا دروازہ ان کے حملوں کو نہ سہ پائے گا ایک بار وہ اندر داخل ہو جاتے تو میرا بچنا ناممکن تھا میں نے گھبرا کر ہمزاد کو پکارا مگر وہ حاضر نہ ہوا میری گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا میں چاروں طرف سے اپنے خون کے پیاسے دشمنوں میں گھر چکا تھا اور بار بار پکارنے کے باوجود ہمزاد حاضر نہیں ہوا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا اور کوریڈور میں بھاگتا ہوا زینے کی طرف بڑھا اسی لمحے دروازہ ٹوٹ گیا اور بہت سے افراد بھاگتے ہوئے کوریڈور میں داخل ہو گئے، ان میں سب سے آگے رام دیال اور مظفر تھے۔

میں جان بچانے کے لئے چھت پر موجود ایک کمرے میں جا گھسا۔ اور کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کر دیا میری جان کے دشمن چھت پر پہنچ چکے تھے۔ ریسٹ ہاؤس ان کی للکاروں سے گونج رہا تھا اور ساتھ میں رام دیال کی گونج دار آواز سنائی دے رہی تھی۔

''او راکھشش آج تیرا بچنا ناممکن ہے حویلی کے چاروں اطراف میرے پیر موجود ہیں۔ اب تیرا ہمزاد بھی تجھے نہیں بچا سکتا۔''

میں کمرے میں چھپنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا مگر میرے لئے کوئی جائے امان نہیں تھی ادھر میرے دشمن اس کمرے کے دروازے پر طبع آزمائی کر رہے تھے جس میں، میں روپوش تھا کمرے کا دروازہ کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا تھا۔ میں بائیں طرف موجود کھڑکی کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے پٹ کھول دیئے کھڑکی کے آگے دو فٹ کا چھجا تھا اور تقریباً پچیس فٹ نیچے ریسٹ ہاؤس کا احاطہ تھا میں کھڑکی پر چڑھا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ ٹوٹ گیا تو رام دیال اور مظفر سمیت آٹھ نو افراد کمرے میں داخل ہوئے ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں رائفلیں اور کچھ کلہاڑی تھامے ہوئے تھے۔ سوچنے کا وقت نہیں تھا میں راہداری میں کھڑا پچیس فٹ نیچے دیکھ رہا تھا میری مثال اس فاختہ کی طرح تھی جو درخت پر بیٹھی ہے اور نیچے شکاری رائفل سے نشانہ باندھے کھڑا ہے اور درخت کے اردگرد فضا میں عقاب پرواز کر رہا ہے اگر میں وہیں کھڑا رہتا تو میرے دشمن میرے جسم کے ٹکڑے کر دیتے اور اگر کودتا تو ٹانگیں بازو ٹوٹ جاتے اور دشمن لازماً مجھے دبوچ لیتے اس صورت میں بھی موت تھی۔

میں چھجے سے لٹک گیا اس طرح فاصلہ محض پندرہ فٹ رہ گیا تھا۔ ''پکڑو'' رام دیال کی آواز سنائی دی پھر کوئی کھڑکی میں چڑھا اور میں بلاخوف وخطر نیچے کود گیا۔ نیچے کودنے سے میری کلائیاں اور گھٹنے زخمی ہوئے میں ہمت کر کے لڑکھڑاتا ہوا احاطے میں دوڑا، بارش بدستور برس

رہی تھی کھلی فضا میں آتے ہی میں لمحوں میں بھیگ گیا۔ میں احاطے کی دیوار پھلانگ کر چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ بارش کے باعث ہونے والے کیچڑ میں پھسل کر گر گیا۔ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کے دوران تین حملہ آور مجھ تک پہنچ چکے تھے ایک کا ہاتھ حرکت میں آیا اور رائفل کا دستہ میرے سر پر پڑا تو نگاہوں کے سامنے سورج سا طلوع ہوا۔ ذہن پر دھندسی چھانے لگی میں نے ڈوبتے ہوئے ذہن سے دیکھا دوسرے دو افراد رائفلوں کی نال میری کنپٹی سے لگا کر ٹریگر دبا رہے تھے، میں نے ڈوبتے ہوئے ذہن سے دل کی گہرائیوں سے اللہ کو پکارا۔

اس آخری لمحے میں، میں ہمزاد کو بھول کر خالق حقیقی کو پکار بیٹھا تھا شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ انسان کو آخری وقت میں اللہ ضرور یاد آتا ہے۔ اور پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔

☆......☆......☆

میرا بدن یخ بستہ ہواؤں کی زد میں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میرے چاروں طرف برف ہی برف ہے لیکن یہ شدید ترین سردی بھی مجھ پر اثر انداز نہیں تھی۔ شاید میں مرچکا تھا اور میرے حواس معطل ہو چکے تھے۔ نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ ہی کسی تکلیف کا احساس تھا ویسے بھی میں نے سن رکھا تھا کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم ہر احساس سے عاری ہوجاتا ہے۔ ”کیا میں مرچکا تھا؟“ لیکن میں سوچ کیوں رہا تھا ”کیا مرنے کے بعد انسان سوچ بھی سکتا ہے......؟“ غرض کہ سوچوں کی یلغار میرے دماغ پر حاوی تھی ان میں سے ایک سوچ یہ بھی تھی کہ ”شاید رخسانہ اور صائمہ پر ظلم کرنے کی وجہ سے میں اس مصیبت میں پھنسا تھا۔“ غرض کہ طرح طرح کی سوچیں تھیں جو میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔

پھر نہ جانے کتنے دنوں بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”ڈاکٹر اس نے پلکیں جھپکتی ہیں۔“

یہ جملہ انگلش میں کہا گیا تھا میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں پہلے دھندلے دھندلے نقوش دکھائی دیئے کچھ دیر بعد صاف دکھائی دینے لگا۔ یہ کسی اسپتال کا کمرہ تھا۔ میرے قریب ہی ایک نرس کھڑی تھی جو شکل وصورت سے انگریز دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک انگریز ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ ”خدا کا شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔“ ڈاکٹر نے انگلش میں کہا اور میرا معائنہ کرنے لگا۔ میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرا پورا بدن بے حس وحرکت ہو چکا ہو۔ ڈاکٹر میرا ارادہ بھانپ کر بولا۔ ”فی الحال تم اٹھ نہیں سکتے عرصہ دراز سے ایک ہی جگہ پڑے رہنے سے تمہارا جسم بے حس وحرکت ہو چلا تھا۔ تمہارے سر پر شدید ترین چوٹ آئی تھی۔ اور تم کوما میں چلے گئے تھے ویسے شکل وصورت سے تم ایشیائی دکھائی دیتے ہو کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ......؟“ انگریز ڈاکٹر بولا اور میں حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگا اس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اسپتال کا شاندار A-C روم یہ ظاہر کر رہا تھا کہ یہ کوئی مہنگا اور جدید ترین اسپتال ہے لیکن اسپتال کے عملے کا انگریز ہونا سمجھ سے باہر تھا ان کا مجھے ایشیائی کہنا بھی الجھن میں ڈال رہا تھا۔

مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد تھا۔ ہمزاد کا تسخیر کرنا، رام دیال کا فارینہ کو اغوا کرنا میرے چچا چچی کو قتل کرنا، اور پھر میرا ساغری پہنچنا صائمہ اور رخسانہ پر ستم ڈھانا اور پھر مجھے ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا گیا تھا ہمزاد بھی میری مدد کرنے سے قاصر تھا اور پھر مجھے مظفر کے کارندوں نے گھیر لیا تھا اور شدید ترین چوٹ سے میں ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟ کہیں تمہاری یادداشت تو متاثر نہیں ہوئی ایسے کیسز میں اکثر ایسا ہوجاتا ہے۔“ ڈاکٹر رواں انگلش میں بات چیت کر رہا تھا جو بڑی مشکل سے میری سمجھ میں آرہی تھی۔

”ڈاکٹر صاحب میرا نام آیان ہے اور تعلق ضلع جہلم دینہ کے قریب ایک دیہات ساغری سے ہے میرے دشمنوں نے مجھ پر چند دن پہلے حملہ کیا تھا اور میں بے ہوش ہو گیا تھا ویسے مجھے اس اسپتال میں کون لایا ہے

اور میں کتنے دنوں بعد ہوش میں آیا ہوں شاید یہ کراچی کا کوئی اسپتال ہے؟" میں نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔

"جہلم، ساغری، کراچی۔" وہ استعجاب انگیز حیرت سے بولا پھر قدرے توقف سے کہا۔ "تم سر پر لگنے والی چوٹ کے باعث کوما میں چلے گئے تھے اور پورے دو سال بعد ہوش میں آئے ہو اور یہ لندن کا ایک اسپتال ہے، تمہیں یہاں مس میری نے ایڈمٹ کروایا تھا اور ہاں میرا نام ڈاکٹر اسمتھ ہے اور یہ سسٹر جولی ہیں۔" ڈاکٹر اسمتھ نے تفصیل سے میرے سوال کا جواب دیا اور میں ششدر رہ گیا۔

گویا مجھے 2 سال بعد ہوش آیا تھا۔ لیکن میں پاکستان سے لندن کیسے پہنچا اور یہ میری کون ہے؟" سوچ کا ایک نیا در کھل چکا تھا۔

ڈاکٹر نرس کو میرے بارے میں ہدایات کر کے جا چکا تھا۔ نرس نے کچھ دیر بعد مجھے ڈرپ لگائی اور کمرے سے باہر نکل گئی، کچھ دیر بعد جب میں آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا کہ ایک مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں، ہمزاد میرے قریب ہی موجود تھا۔

"میں یہاں کیسے پہنچ گیا اور ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ مجھے دو سال بعد ہوش آیا ہے۔" میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"ڈاکٹر سچ کہہ رہا ہے۔ تم نے انتقام کے چکر میں غلط قدم اٹھا لیا تھا۔ شاید یہ ان لڑکیوں کی بددعا تھی جو تمہیں لگی، رام دیال جو کہ تمہیں نقصان پہنچانے کے لئے موقع کی تلاش میں تھا اسے اپنے بیروں سے جیسے ہی پتہ چلا کہ تم کیا غلطی کر بیٹھے ہو۔ وہ لمحوں میں مظفر کی حویلی میں جا پہنچا۔ حویلی میں دونوں لڑکیوں کی گمشدگی سے کہرام مچ چکا تھا ایسے میں رام دیال مظفر سے ملا اور تمہیں اس ریسٹ ہاؤس میں گھیر لیا۔ وہ نہایت ہی عیار پجاری ہے وہ جانتا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس نے ریسٹ ہاؤس کے گرد مضبوط نادیدہ بندش کا جال بچھا دیا اس لئے میں تمہارے بار بار پکارنے کے باوجود ریسٹ ہاؤس میں داخل نہ ہو سکا۔

لیکن بہتر یہ ہوا کہ تم ریسٹ ہاؤس سے کسی طرح باہر پہنچ گئے، میں جب تک پہنچا تم بے ہوش ہو چکے تھے اور وہ تمہیں جان سے مارنے ہی والے تھے کہ میں نے تمہیں چشم زدن میں وہاں سے غائب کیا اور کوسوں دور نکل گیا۔

بعض معاملات ماورائی قوتوں کے بس کے نہیں ہوتے جیسے تقدیر اور قسمت، آگے کیا ہوگا یہ تو صرف خدا ہی جانتا ہے اور موت کے معاملے میں بھی ماورائی قوتیں بے بس ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم زندہ بچو گے یا نہیں لیکن تمہارا غلام ہونے کے باعث تمہیں بچانے کی جدوجہد کی۔ اور ایک بڑے اسپتال کی ایمرجنسی کے سامنے لے جا کر ڈال دیا۔ پھر میں اسی اسپتال سے ایک سینئر ڈاکٹر کے دماغ پر قابض ہو کر اسے تم تک لایا تمہاری زندگی تو بچ گئی لیکن تم کوما میں چلے گئے تھے میں بدستور اس ڈاکٹر کے دماغ پر قابض تھا، مختلف قسم کے ٹیسٹوں سے ڈاکٹرز اس نتیجے پر پہنچے کہ تمہیں علاج کے لئے بیرون ملک منتقل کر دیا جائے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا۔ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن میرے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔

میں نے تمہیں چند ہی منٹوں میں اس ملک میں پہنچا دیا۔ اب مسئلہ تمہیں کسی اچھے اسپتال میں منتقل کرنے کا تھا۔ اس کے لئے کسی مقامی شخص کی ضرورت تھی۔ ایک بڑے شاپنگ مال کے سامنے میں نے تمہیں ایک رولز رائس کی عقبی نشست پر ڈال دیا۔ یہ مس میری کی گاڑی تھی جو امیر ترین شخص کی اکلوتی بیٹی ہے، کچھ ہی دیر میں وہ شاپنگ سینٹر سے باہر نکلی اور گاڑی میں بیٹھتے ہی تمہیں دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ میرے لئے اس کے دل و دماغ پر قابض ہونا مشکل نہ تھا۔ اس نے تمہیں اس اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا۔

کچھ روز تو میں اس کے دماغ کو اپنے قابو میں کئے رہا۔ پھر میں نے بھانپ لیا کہ میری ایک اچھی لڑکی ہے اور خلوص دل سے تمہارا علاج کروا رہی ہے اور وہ تم سے

متاثر بھی ہو چکی تھی۔ کچھ اسے میں نے بھی تمہاری طرف راغب کیا تھا۔ اور ہاں ڈاکٹر اسمتھ نے اسے فون پر اطلاع دے دی ہے کہ تم ہوش میں آچکے ہو بلکہ وہ اس اسپتال میں پہنچ چکی ہے اور تم سے ملنے کو بے تاب ہے۔" ہمزاد نے کہا اور کمرے کا دروازہ کھلا۔

ایک نوجوان دوشیزہ اندر داخل ہوئی میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ انتہائی خوبصورت اور درمیانے قد وقامت کی اس لڑکی کا جسم جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا مجھے اپنی طرف اس طرح دیکھتا پا کر وہ مسکرائی اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "میرا نام میری ہے۔ مجھے جیسے ہی اطلاع ملی کہ تم ہوش میں آچکے ہو تو میں تم سے ملنے چلی آئی اب تم اپنے بارے میں بتاؤ تم کون ہو اور تمہارے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا......؟"

اس کی آواز بھی اس کی طرح خوبصورت تھی۔

"اوہ تو تم میری ہو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں انگلش میں جواب دیا اگرچہ میں انگلش بول اور سمجھ سکتا تھا لیکن اس میں گرامر کی کافی غلطیاں ہوتی تھیں۔ میری بات کا مطلب سمجھ کر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "میرا نام میری ہے اب تم بتاؤ تم کون ہو؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"میرا نام آیان ہے اور میں پاکستانی ہوں مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ کچھ نامعلوم افراد نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو خود کو اس اسپتال کے بستر پر پایا۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"اوگاڈ یہ بہت برا ہوا، جب تمہیں اسپتال منتقل کیا گیا تو تمہارے پاس سے کسی بھی قسم کی کوئی دستاویز نہیں ملی جس سے اندازہ ہوتا کہ تم کون ہو اور اس ملک میں کیسے آئے؟ بہرحال گھبراؤ مت خدا بہتر کرے گا۔" اس بار اس نے اردو میں جواب دیا اور میں دنگ رہ گیا۔

"تمہاری اردو بہت صاف ہے ایسا لگتا ہے جیسے یہ تمہاری مادری زبان ہو۔" میں حیرت سے بولا۔

"میں نے دنیا میں بولی جانے والی بہت سی زبانیں سیکھ رکھی ہیں۔" اب وہ مجھ سے اردو میں ہی بات کر رہی تھی۔

"ایک بات کہوں اگر برا نہ لگے تو؟" میں نے اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم بہت بلکہ بہت ہی زیادہ خوبصورت ہو۔" وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسی۔ "شکریہ اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے یہ مشرق نہیں مغرب ہے یہاں کسی خاتون کی تعریف کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ویسے تم بھی کسی سے کم نہیں۔" ہمارے درمیان کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

اسی وقت دو پولیس افسران اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی۔ میں نے انہیں وہی جوابات دیئے جو میں میری کو اپنے بارے میں بتا چکا تھا انہوں نے میری سے مصافحہ بھی کیا تھا شاید وہ اسے جانتے بھی تھے ویسے بھی ارب پتی باپ کی بیٹی تھی مجھ سے تفتیش کے بعد وہ رخصت ہو گئے۔

اسی روز میرے سی ٹی اسکین سمیت بہت سے دوسرے ٹیسٹ بھی ہوئے نیز فزیو تھراپی سمیت مناسب علاج معالجے سے میری حالت میں بہتری آتی گئی۔ اس دوران میری بھی مجھ سے ملنے آتی رہی وہ بڑی ہنس مکھ اور مخلص لڑکی تھی۔ جو جلد ہی مجھ سے گھل مل گئی تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر بھی تھی کہ ایک بار تفتیش کے بعد پولیس یا کسی دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ میری کے ڈیڈی سر گورڈن بھی اسپتال میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔

جب بھی میں تنہا ہوتا تو بوریت سے بچنے کے لئے ہمزاد کو طلب کر لیتا اور اس سے مختلف نوعیت کے موضوع پر گفتگو کرتا۔ رام دیال کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ ڈھائی سال کے عرصے میں کٹھن جاپوں اور تپسیا سے اس کی شکتی میں کئی گناہ اضافہ ہو چکا ہے۔ شکتی میں اضافے کے بعد اس نے اپنے چاروں طرف موجود حصار ختم کر دیا تھا اس طرح وہ ہمزاد کی نظروں میں آ گیا تھا اور اس وقت وہ انڈیا کے ایک پہاڑی علاقے

رام گڑھ میں موجود تھا۔ فارینہ کو وہ اغوا کر کے رام گڑھ لے گیا تھا جہاں کالی کے چرنوں میں اس نے اس کی بلی دے دی تھی۔" یہ سنتے ہی میں بھڑک اٹھا لیکن فی الحال تو میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے دل ہی دل میں کڑھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

تقریباً تین ماہ بعد میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو چکا تھا اسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی میری مجھے اپنے گھر لے گی۔ اس کے محل نما گھر میں درجنوں کے قریب ملازم تھے۔ وسیع وعریض گیراج میں کئی اقسام کی قیمتی گاڑیاں موجود تھیں۔ سوئمنگ پول، ٹینس کورٹ اور جم سمیت دنیا کی ہر سہولت موجود تھی مجھے رہنے کے لئے جو کمرہ دیا گیا وہ بھی کم شاندار نہ تھا۔

میں نہا کر باہر نکلا تو ایک ملازم ڈینم کی پینٹ اور ہاف آستین کی شرٹ لا چکا تھا۔ میں لباس تبدیل کر کے بیٹھا ہی تھا کہ ایک دوسرا باوردی ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا، اس نے مودب انداز میں کافی اور دیگر لوازمات ٹیبل پر سجائے اور کمرے سے باہر نکل گیا کچھ دیر بعد میری اندر داخل ہوئی اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"ہاں تو آیان اب تم بتاؤ تمہاری اصلیت کیا ہے اور ہاں پہلے والی بوگس کہانی مت دہرانا سی ٹی اسکین اور دیگر میڈیکل رپورٹس سے ثابت ہو چکا ہے کہ تمہاری دماغی حالت بہتر ہے۔ تم یادداشت کھو جانے کا ڈھونگ کر رہے ہو۔ پولیس اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑتی، میرے کہنے پر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ سچ بولو تاکہ میں تمہارا دفاع کر سکوں۔" وہ گھمبیر لہجے میں بولی۔

"پہلے تم بتاؤ تم ہو کون؟ پولیس نے کیسے اتنی آسانی سے تمہاری بات مان لی۔" میں نے اسے شک آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

"میں اسکاٹ لینڈ کی اسپیشل ایجنٹ ہوں۔" اس نے جواب دیا اور میں حیرت سے اچھل پڑا۔ اور اپنی روداد سنا ڈالی، جسے وہ حیرت و دلچسپی سے سنتی رہی۔

پھر ناقابل یقین نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ہنس پڑی۔ "لگتا ہے تم اپنے معاشرے کی کوئی دیومالائی کہانی سنا رہے ہو۔ میں اس الف لیلیٰ داستان سے بہلنے والی نہیں۔"

"اگر تمہیں یقین نہیں تو، میں اپنی سچائی کا ثبوت دے سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" اس نے استفسار کیا۔ "ابھی تم خود بخود مجھ سے گلے ملوگی اور مجھے Kiss بھی کرو گی۔" میں شرارت سے مسکرایا۔

"امپاسبل مغربی معاشرے میں رہنے کے باوجود آج تک میں نے کوئی بوائے فرینڈ نہیں بنایا اور نہ ہی کسی کو قریب آنے دیا۔ میں نے عہد کر رکھا ہے کہ شادی سے پہلے کسی کو قریب نہیں آنے دوں گی۔ میں جن بھوت یا ماورائی قوتوں پر یقین نہیں رکھتی تم دروغ گوئی کر رہے ہو۔"

"ایسی صورت میں اپنی سچائی کا عملی ثبوت دوں گا۔" میں مسکرایا اور دل ہی دل میں ہمزاد کو پکارا وہ لمحہ بھر میں حاضر ہو گیا۔ میری اسے دیکھنے سے قاصر تھی میں نے دل میں ہمزاد سے اپنی خواہش کا اظہار کیا وہ مسکرایا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اگلے ہی لمحے میری بے خود ہو کر میری طرف بڑھی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری نے مجھ سے لپٹ کر اپنی مرمریں بانہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں اور اپنے جلتے بجھتے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور میں کسی بھنورے کی طرح گلاب کی پنکھڑیوں کا رس چوسنے لگا۔

ادھر ہمزاد نے اس کے ذہن کو آزاد کر دیا اور وہ کسمسا کر میری آغوش سے باہر نکل گئی، اب وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور کسی مشرقی دوشیزہ کی طرح شرما رہی تھی۔ "ناقابل یقین تم کوئی جادوگر ہو یا ٹیلی پیتھی کے علم میں مہارت رکھتے ہو۔" اس کی بات سن کر میں مسکرایا۔

"اب میں تمہیں تمہارے ماضی کے بارے میں بتاتا ہوں میں نے کہا اور ہمزاد نے بولنا شروع کیا۔ مجھے

معلوم تھا کہ ہمزاد کی آواز صرف میں ہی سن سکتا ہوں۔"
تمہاری ماں مسز مارگریٹ کینسر کے موذی مرض سے آج سے دس سال قبل وفات پا گئیں سر گوڈرن تم سے بہت پیار کرتے ہیں انہوں نے اس خیال سے دوسری شادی نہیں کی کہ کہیں سوتیلی ماں تم سے برا سلوک نہ کرے تم نے مارشل آرٹ کی تربیت جاپان سے حاصل کی تعلیم مکمل کرتے ہی تم اسپیشل پولیس میں چلی گئیں۔" میں اس کے ماضی کے بارے میں بتاتا چلا گیا جو ظاہر ہے مجھے ہمزاد بتا رہا تھا۔

"تم نے کلائی میں جو خوبصورت گھڑی پہن رکھی ہے اس میں چھوٹی سی ڈیوائس نصب ہے جس میں اس وقت ہماری باتیں ریکارڈ ہو رہی ہیں۔ لیکن ایک بات اور ضرور تمہاری دلچسپی کا سبب بنے گی چاہو تو چیک کرلو ہماری اب تک کی گفتگو کا ایک لفظ بھی ریکارڈ نہیں ہوا۔" اس نے اپنی گھڑی میں نصب ننھا سا بٹن دبایا اور ایک بار پھر ناقابل یقین نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "تم واقعی جادوگر ہو مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"ابھی کچھ دن میں یہیں تمہارے ملک میں ہوں تمہیں خود ہی مجھ پر یقین آجائے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تم چلے جاؤ گے......؟" وہ چونکی۔

"تو اور کیا میں ساری زندگی یہاں تو نہیں رہ سکتا۔ میرا اپنا وطن ہے جس کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو مجھے اپنی جان سے بھی پیاری ہے اور پھر میرا ازلی دشمن رام دیال اور مظفر زندہ ہے ہیں۔" میں نے کہا۔ اور محسوس کیا کہ میرے جانے کا سن کر لمحہ بھر کے لئے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ پھر اس نے بڑی خوبصورتی سے اپنے چہرے کے تاثرات چھپائے اور مسکرا دی۔

سر گوڈن اکثر کاروباری مصروفیت کے باعث گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔ اس لئے میری اور ان کی ملاقاتیں کم ہی ہوتی تھیں، میں جان چکا تھا کہ میری مجھے پسند کرنے لگی ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتی اس نے مجھے مختلف اقسام کا اسلحہ چلانے کی تربیت بھی دینا شروع کردی تھی، کچھ ہی دنوں میں میرا نشانہ بہتر ہونے لگا۔ پھر اصرار کر کے مجھے مارشل آرٹ کی تربیت دینے لگی۔

وہ واقعی مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔ مجھے وہیں رہتے ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے کئی بار جانا چاہا مگر ہمزاد نے روک دیا اور کہا کہ حالات موافق نہیں۔" اس لئے میں وہیں رکا رہا۔ اس طویل عرصے میں خاصی بے تکلفی کے باوجود میری نے مجھ سے خاصا فاصلہ رکھا تھا، میں میری سے مارشل آرٹ کی اچھی خاصی تربیت لے چکا تھا مگر کبھی کبھار ہونے والی آزمائش فائٹ میں اسے زیر کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔

ایک روز تفریح کی غرض سے مجھے وہ ایک کلب میں لے گئی یہ کلب صرف امراء کے لئے مخصوص تھا۔ اپر کلاس کے لوگ یہاں جوا بھی کھیلتے تھے۔ "کیا خیال ہے بازی کھیلو گی۔" میں نے سرگوشی کی۔

"نہیں میں ہار جاؤں گی کیونکہ میں نے آج تک جوا نہیں کھیلا۔" میری نے جواب دیا۔

"لو میرا یقین ہے کہ آج تم ضرور جیتو گی۔" میں نے کہا اور اس نے میرے اصرار پر کھیلنا شروع کر دیا۔

میں نے ہمزاد کو پکار کر اس بارے میں ہدایات دے چکا تھا۔ بھلا ہمزاد کے ہوتے ہوئے میری سے کون جیت سکتا تھا۔ پھر وہ جیتتی چلی گئی اس کلب میں موجود تمام افراد اسے مسلسل جیتتا دیکھ کر باری باری کھیلنے لگے اور ہارتے چلے گئے۔ جب ہم کلب سے رخصت ہوئے تو لاکھوں کی رقم ایک بریف کیس میں بند میری کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ارب پتی باپ کی اولاد تھی لاکھوں روپے کی اس کے لئے کوئی اہمیت نہ تھی لیکن جیت کی رقم لاکھ ہو یا دس روپے انسان کو مسرور کر دیتی ہے۔

"تم تو کمال کے انسان ہو اب تو مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔ تم انسان کے دماغ پر قابض ہو کر اس سے اپنی مرضی کے بہت سے کام لے سکتے ہو۔" میری نے رولز رائس آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"البتہ مجھے تم سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے

کیونکہ تم مارشل آرٹ کی ماہر ہو اور بہت خوبصورت بھی ہو۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو دل بے اختیار دھڑکنے لگتا ہے۔"

"ہونہہ میں عشق و محبت جیسی فضولیات میں نہیں پڑتی۔" وہ اترائی۔

"جھوٹ بولتے وقت تمہاری آنکھیں تمہارے لبوں کا ساتھ نہیں دے رہیں۔" میں نے اس کی نرم گداز ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اوہو بڑی خوش فہمی ہے صاحب کو۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا اور اچانک بریک پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ سڑک ٹائروں کی چرچراہٹ سے گونج اٹھی آگے ایک وین آڑی ترچھی اس طرح کھڑی تھی کہ ہمارا راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ خطرے کو بھانپتے ہی میری نے اپنے شولڈر بیگ میں سے پسٹل نکالا اور گاڑی سے باہر نکل گئی ...... میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہم محتاط انداز سے وین کی طرف بڑھے اور اندر جھانکا وین خالی تھی۔ "خبردار پسٹل پھینک کر ہاتھ سر سے بلند کرلو۔" ایک غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے مڑ کر دیکھا ہماری پشت پر دو سیاہ فام موجود تھے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں موجود تھیں ایک نے رائفل کی نال میری کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی جبکہ دوسرے نے مجھے گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ "چلو بے بی جلدی کرو۔ ہتھیار لڑکیوں کے ہاتھ میں اچھے نہیں لگتے۔" اسے گن پوائنٹ پر لینے والے نے کہا اور میری نے پسٹل ایک طرف پھینک کر ہاتھ سر سے بلند کر لئے۔

"اے ہیرو اسی طرح کھڑے رہو ہلنا جلنا مت۔" دوسرے رائفل بردار نے مجھ سے کہا اور الٹے قدموں رولز رائس تک گیا۔ دروازہ کھولا اور رقم سے بھرا بریف کیس اٹھا کر وین میں رکھنے لگا۔

میں نے ہمزاد کو پکارا ادھر دوسرے سیاہ فام نے میری کو عام لڑکی سمجھ کر اس سے دست درازی کرنا چاہی۔ ویسے بھی ہمیں نہتا دیکھ کر وہ شیر ہو گئے تھے میری برق سرعت سے تڑپی اور اس کی رائفل پر ہاتھ ڈالتے ہوئے بیک کک اس کے سینے پر رسید کی وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور رائفل اس کے ہاتھوں سے نکل گئی، میری فضا میں اچھلی اور قلابازی کھا کر کسی پھنکے کی طرح گھومی ہپ ہپ کی آواز کے ساتھ پے در پے کئی ککس اس سیاہ فام کے جسم پر لگیں وہ چکراتا ہوا گرا اور گر کر اٹھا ہی تھا کہ میری اچھل کر ایک پاؤں پر گھومی تین چار ککس اس سیاہ فام کی کنپٹی پر لگیں اور وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ یہ لمحوں کا کھیل تھا۔

ادھر دوسرے سیاہ فام سے ہمزاد کے نادیدہ ہاتھ رائفل چھین چکے تھے اب رائفل کا کندہ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر برس رہا تھا، میری ششدر کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی اسے صرف رائفل نظر آرہی تھی۔ رائفل چلانے والا نہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ سیاہ فام بھی نیچے گر کر ساکت ہو چکا تھا میری نے اپنے ڈپارٹمنٹ کو کال کر کے واقعہ کی رپورٹ کی۔ ان دونوں بے ہوش سیاہ فاموں کو حراست میں لے لیا گیا۔ اور میں میری کے ساتھ اس کے گھر لوٹ گیا۔

اس روز رات کو میں نے خواب میں چچا چچی اور فارینہ کو دیکھا وہ ایک صحرا میں پریشان حال کھڑے تھے چچا چچی کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا جب کہ فارینہ کی کٹی ہوئی شہ رگ سے خون بہہ رہا تھا۔ چچا کہہ رہے تھے۔ "آیان تم ہمیں بھول کر دنیا کی رنگینیوں میں کھو بیٹھے ہو۔" اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور منظر نگاہوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا رات کے تین بج رہے تھے پھر میں نے رات جاگتے ہوئے گزاری اب مجھے یہاں سے جانا تھا۔ اپنے وطن جہاں میرے بچپن کی یادیں تھیں جہاں میرے اپنے منوں مٹی کے نیچے سو رہے تھے۔

صبح ناشتہ کرتے ہی میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار میری سے کیا۔ میرے جانے کا سن کر وہ پریشان ہو گئی اس نے مجھے روکنا چاہا مگر میرا ارادہ اٹل تھا۔ اب مسئلہ صرف کاغذات کا تھا جو میری کی دولت اور اثر و رسوخ سے جلد ہی حل ہو گیا اور ایک نئے نام سے میرے

کاغذات بن گئے بالآخر وہ دن آپہنچا جب میں
ایئرپورٹ پر کھڑا تھا اور میری مجھے الوداع کہہ رہی تھی اس
کی آنکھیں نم تھیں میری کو الوداع کہہ کر میں چند قدم ہی
آگے بڑھا تھا کہ اس کی آواز سنائی دی۔ ”آیان رُو“
میں نے مڑ کر دیکھا وہ دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ
گئی۔ اور رونے لگی وہ رو رہی تھی اور اس کے آنسو میرے
گریبان کو بھگو رہے تھے میں نے اسے پوری قوت سے
بھینچا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ ”میری! اگر میں اپنے
مقصد میں کامیاب ہوگیا اور زندہ رہا تو تم سے ضرور ملوں
گا۔“

”میں تمہاری کامیابی کے لئے دعا کروں گی۔
لیکن مجھے بھولنا مت۔“ اس نے روتے ہوئے کہا اور مجھ
پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔ وقت کم تھا میں نے اسے
بمشکل خود سے جدا کیا اور آگے بڑھ گیا کچھ دیر بعد میں
پاکستان جانے والے طیارے میں بیٹھا تھا اور جہاز اپنی
منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ اور میں سوچوں میں گم
تھا۔

میں ہمزاد جیسی ماورائی طاقت کو حاصل کر لینے
کے باوجود رام دیال کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا بقول ہمزاد
کے ”رام دیال کی شکتی میں بے پناہ اضافہ ہوچکا تھا۔“
دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ انجام سے بے پرواہ ہوکر
رام دیال سے ٹکرا جاؤں لیکن یہ بہادری نہیں بے وقوفی
ہوتی۔

جہاز کو محو پرواز ہوئے نہ جانے کتنی دیر ہوئی تھی کہ
جہاز کو اچانک ایک شدید جھٹکا لگا اور وہ بری طرح
ڈگمگانے لگا۔ اس اچانک جھٹکے سے مسافروں کی چیخیں نکل
گئیں، بہت سے اپنی سیٹوں سے گر گئے۔ عجیب سی
افراتفری پھیل چکی تھی۔ لیکن سلسلہ یہیں پر رکا نہیں جہاز
بری طرح ڈگمگا رہا تھا۔ اسی وقت اسپیکر پر جہاز کے عملے کی
جانب سے اعلان کیا گیا۔ ”جہاز شدید طوفانی جھکڑوں
میں گھر چکا ہے۔ ہر طرف دھند ہی دھند چھائی ہوئی ہے
اور پائلٹ کو کچھ نظر نہیں آ رہا جہاز مسافروں سے
درخواست ہے کہ اپنے اپنے مذہبی طریقے سے جہاز کی
سلامتی کے لئے دعا کریں اور حفاظتی بیلٹس باندھ لیں۔“
اس اعلان سے مزید افراتفری پھیل گئی بہت سے کمزور دل
مسافر تو رونے لگ گئے تھے۔ ہر ایک چہرے پر خوف
و ہراس چھا چکا تھا۔ جہاز بری طرح ڈگمگا رہا تھا ایسے لگ
رہا تھا کہ کسی بھی لمحے زمین پر گر کر تباہ ہوجائے گا۔ یہ ایک
ایسی مصیبت تھی کہ میں بھی ہمزاد کو بھول کر اللہ کو پکارنے لگا
اور کانپتے ہاتھ دعا کے لئے بلند کردیئے۔

طوفان تھا کہ تھمنے کا نام ہی نہیں ـــ
میں نے تو سوچ لیا تھا کہ شاید میری موت فضائی حا
میں ہی لکھی ہے نظروں کے سامنے ماضی میں پڑھی ب
والی اخبار کی وہ سرخیاں آنے لگیں جن میں فضائی حادثوں
کے بارے میں پڑھا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر جہاز کو شدید
ترین جھٹکے لگتے رہے پھر جہاز کے جھٹکوں میں کمی آنے لگی
اور رفتہ رفتہ جھٹکے ختم ہوگئے۔

ایک بار پھر جہاز کی انتظامیہ کی طرف سے اعلان
ہوا۔ ”ہمارا جہاز طوفان سے نکل گیا ہے اب پائلٹ
کو صاف دکھائی دے رہا ہے۔ بہرحال آپ کی
دعاؤں اور خدا کی رحمت کی وجہ سے جہاز طوفان سے نکل
چکا ہے لیکن دھند کی وجہ سے جہاز اپنے راستے سے بھٹک
کر بھارت کی حدود میں داخل ہوچکا ہے لہٰذا ہمیں جہاز
انڈین ایئرپورٹ پر اتارنا ہوگا تاکہ وہاں جہاز کی مکمل جانچ
پڑتال کی جاسکے۔ اس کے بعد ہم روانہ ہوں گے۔“

کچھ دیر بعد جہاز انڈین ایئرپورٹ پر لینڈ
کرچکا تھا یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں جنہیں کوئی نہیں سمجھ
سکتا۔ انسان کچھ اور چاہتا ہے اور تقدیر کچھ اور کرتی ہے
متعدد سوالات اور وسوسے میرے ذہن میں تھے میں
بھٹک کر انڈیا پہنچ چکا تھا۔ جہاں بقول ہمزاد کے میرا ازلی
دشمن رام دیال موجود تھا۔ ایئرپورٹ سے ہمیں ایک
فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچا دیا گیا۔ جہاز کے مکمل چیک اپ
کے لئے تین روز کا وقت دیا گیا تھا ہوٹل میں مسافروں
کے قیام و طعام کا خرچہ جہاز کی انتظامیہ کے سپرد تھا۔
طوفان میں خوف زدہ ہوجانے والے مسافر اب چہک
رہے تھے میں کچھ دیر لابی میں بیٹھا رہا پھر اپنے کمرے

میں داخل ہو گیا دل چاہ رہا تھا کہ ہمزاد کو طلب کر کے رام دیال کے بارے میں پوچھوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے پھر یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ جب میں اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تو پھر اس کے بارے میں جاننا بے فضول تھا۔

شام تک کمرے میں پڑا رہا پھر اکتا کر کمرے سے باہر نکلا میرا ارادہ ہوٹل سے باہر نکل کر گھومنے کا تھا میں ہوٹل کے داخلی دروازے سے جیسے ہی باہر نکلا۔

ایک معمر سادھو اچانک میرے سامنے آ گیا اس کے سر اور داڑھی کے بالوں کے ساتھ ساتھ بھنوئیں بھی سفید تھیں کثرت عمر کے باوجود اسکی صحت قابل رشک تھی۔ اس کی انگاروں کی مانند دہکتی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ گونج دار آواز میں بولا۔ ''بالک منش کو اس لئے سنسار میں نہیں بھیجا گیا کہ وہ ناریوں کے پیچھے اپنا جیون بتا دے تم چھایہ (ہمزاد) کی جس شکتی پر اترا رہے ہو یہ تمہارے کام نہیں آنے والی اس سنسار میں ایک سے بڑھ کر ایک شکتی ہے اور ان شکتیوں سے بھی بڑی شکتی ایشور کی ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ ہمزاد کی شکتی سے لوگوں کے کام آتے۔ مگر تم مایا اور ناری کے چکر میں پڑ گئے۔'' اس کی کڑوی کسیلی باتیں کسی تازیانے کی طرح میرے ضمیر پر پڑ رہی تھیں اور احساس شرمندگی سے میرا برا حال تھا۔

''بابا رام دیال نے مجھ پر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ''مجھے معلوم ہے۔ سب جانتا ہوں اور وہ بھی جانتا ہوں جو تمہیں نہیں معلوم جس جہاز میں تم سوار تھے اس پر بھی اس کے بیروں نے حملہ کیا تھا مگر تمہیں بھگوان نے بچا لیا خیر جو ہوا اسے بھول جاؤ اور میرے ساتھ چلو تم شانت رہو گے۔''

''نہیں بابا مجھے اپنے وطن سے دور ہوئے عرصہ ہو گیا اب میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ اس کے اس انکشاف نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا کہ جس جہاز میں سوار تھا اسے تباہ کرنے کی رام دیال نے کوشش کی تھی۔

''تمہاری مرضی لیکن جب تم اتنے مجبور ہو جاؤ کہ تمہیں کوئی راہ نہ دکھائی دے تو رام گڑھ کے پہاڑی علاقے میں چلے آنا وہیں میرا استھان ہے۔'' سادھو نے کہا اور تیزی سے ایک سمت بڑھ گیا۔

میں کچھ دیر سڑک پر ٹہلتا رہا پھر اپنے کمرے میں آ کر ہمزاد کو طلب کیا اور اس سے سادھو کے بارے میں پوچھا۔ ''اس کا نام بھگوان داس ہے اور وہ بہت بڑا پجاری ہے وہ اتنا شکتی شالی ہے کہ اگر تمہارا ساتھ دے تو تم باآسانی رام دیال سے نمٹ سکتے ہو۔'' ہمزاد نے جواب دیا۔

رات آٹھ بجے کے قریب میں دوبارہ ہوٹل سے باہر نکلا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں کے مختلف مقامات پر گھومنے لگا تقریباً دو گھنٹے بعد ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے ہوٹل جانے کا حکم دیا اس وقت ٹیکسی ایک نسبتاً سنسان سڑک سے گزر رہی تھی کہ ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ ''ٹیکسی روکو۔'' میں نے ڈرائیور سے کہا اور ایک طرف ٹیکسی کے رکتے ہی اتر آیا۔

کچھ فاصلے پر ایک ہنڈا کار کھڑی تھی اس کے سامنے ایک بڑے ٹائروں والی جیپ کھڑی تھی جس نے ہنڈا کار کا راستہ مسدود کر رکھا تھا میں ٹیکسی سے اتر کر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ لڑکی کی چیخ کہاں سے سنائی دی تھی کار اور جیپ دونوں کی تمام نشستیں خالی تھیں۔

''صاحب پرائے پھڈے میں مت پڑو خواہ مخواہ مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔'' ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

اسی وقت ایک دوسری چیخ سنائی دی یہ چیخیں ایک جھاڑی کی آڑ سے ابھر رہی تھیں، میں انجام سے بے پرواہ جھاڑیوں کی طرف دوڑا۔ جھاڑیوں کی آڑ میں دو بدمعاش صورت افراد ایک لڑکی کو دبوچے ہوئے تھے میں نے ان میں سے ایک کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور زوردار گھونسہ اس کے جبڑے پر رسید کیا وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف گرا۔ دوسرا شخص لڑکی کو چھوڑ کر اٹھا اور اپنی بیلٹ میں اڑسا پسٹل نکال لیا۔ میں ایک پاؤں کی ایڑی پر گھوما اور زوردار ٹھوکر

اس کے پسٹل والے ہاتھ پر ماری۔ پسٹل اس کے ہاتھوں سے نکل کر ایک طرف جا گرا اسی وقت میری نظر جھاڑیوں سے نکلتی لڑکی کے چہرے پر پڑی اور میں ششدر رہ گیا۔

وہ کاجل تھی وہی کاجل جس سے پاکستان کے ایک ہوٹل میں برسوں پہلے ملاقات ہوئی تھی، کاجل کو دیکھ کر میں چند لمحوں کے لئے ان بدمعاشوں سے غافل ہو چکا تھا میری اسی غفلت سے نیچے گرنے والے شخص نے فائدہ اٹھایا اور اٹھتے اٹھتے اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر مجھ پر حملہ آور ہو گیا میری چھٹی حس نے مجھے بر وقت خبردار کیا اور میں بجلی کی طرح تڑپ کر ترچھا ہوا خنجر میرے شانے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں نے چشم زدن میں اس کا خنجر والا ہاتھ کلائی سے پکڑ کر موڑا اور جوڈو کا داؤ لگا کر نیچے پٹخ دیا۔ اسی اثناء میں دوسرا مجھ پر پشت سے حملہ آور ہوا میں نے زوردار بیک کک ماری ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ میں نے ڈبل پنچ اس کے چہرے پر سید کر دیا۔

میری کا سکھایا ہوا مارشل آرٹ اس کٹھن مرحلے میں میرے بڑے کام آ رہا تھا وہ دونوں با آسانی مجھ سے پٹ رہے تھے اس لئے میں نے ہمزاد کو زحمت نہ دی کچھ ہی دیر میں، میں نے ان کا حشر خراب کر دیا ایک بے ہوش ہو گیا اور دوسرا جان بچانے کے لئے بھاگ نکلا، کاجل دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ کر سسکنے لگی۔

”حوصلہ رکھو میں ہوں ناں! دیکھو ایک حقیر کیچوے کی طرح بے بس پڑا ہے اور دوسرا بھاگ گیا۔“ میں نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے کہا اس کے آتشیں جسم کی حرارت سے میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں ٹیکسی ڈرائیور مجھے ان بدمعاشوں سے لڑتا دیکھ کر خوف کے مارے بھاگ چکا تھا۔ ”چلو تمہیں گھر چھوڑ دوں پھر مجھے ہوٹل بھی جانا ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے ہمراہ اس کی گاڑی کی طرف بڑھا۔ ”تم انڈیا کب آئے؟“ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”کل ہی پہنچا ہوں تمہاری یاد ستا رہی تھی میں نے سوچا تم تو پاکستان آؤ گی نہیں میں ہی تم سے ملنے انڈیا پہنچ جاؤں۔“ میں نے اسے متاثر کرنے کے لئے جھوٹ بولا۔ اور اس کی خاطر خواہ اثر ہوا کاجل کا چہرہ کھل اٹھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں فطرتاً ہرجائی ثابت ہوا تھا۔ نہ جانے کتنی ہی لڑکیاں میری زندگی میں آئیں اور چلی گئیں اور میں نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا اب سوچتا ہوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔

گاڑی سنسان سڑک سے دور آ چکی تھی۔ ”یہ کون تھے اور تمہیں کیسے گھیر لیا؟“ میں نے پوچھا۔

”گھر پر بور ہو رہی تھی، اکیلی ہی لانگ ڈرائیو پر نکل کھڑی ہوئی کہ اس سنسان سڑک پر سے گزرتے ہوئے انہوں نے مجھے گھیر لیا وہ تو بھگوان کی کرپا ہے کہ تمہاری وجہ سے میری عزت اور جان بچ گئی۔“ ہم ہوٹل تک پہنچ چکے تھے، اسے گھر سے نکلے کافی دیر ہو چکی تھی اس لئے کل ملنے کا وعدہ کر کے مجھے ہوٹل کے پارکنگ ایریا تک چھوڑ کر واپس لوٹ گئی۔

دوسرے روز میں صبح اٹھا ہی تھا کہ وہ میرے روم میں پہنچ گئی اور آتے ہی میرے گلے کا ہار بن گئی وہ میری زندگی میں آنے والی لڑکیوں میں سب سے زیادہ پر جوش تھی ہم تین گھنٹے تک کمرے میں بند رہے اور ایک دوسرے سے سیراب ہوتے رہے۔ ویسے بھی آج میرا انڈیا میں آخری دن تھا۔

دوسرے روز ہمارے جہاز کو یہاں سے روانہ ہو جانا تھا، میں کاجل کو اپنے جانے کا بتا کر افسردہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور یہ آخری روز اس کی سنگت میں گزارنا چاہتا تھا اس لئے کھانا کھا کر میں اسے لے کر ہوٹل سے باہر نکلا جہاں کاجل کی گاڑی موجود تھی۔ ”کہاں چلنے کا ارادہ ہے ......؟“ کاجل نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”جہاں تم لے چلو۔“ میں نے اس کے گال پر چٹکی بھری اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی وہ بالکل میری کی طرح ہنستی تھی ہماری گاڑی اس وقت شہر کی معروف ترین سڑک سے گزر رہی تھی جب ایک کرولا ہمارے قریب سے گزری اور میں حیرت سے اچھل پڑا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر پجاری رام دیال موجود تھا جبکہ

اس کے برابر فارینہ بیٹھی تھی میرے چچا کی بیٹی فارینہ لیکن ہمزاد نے تو کہا تھا کہ "فارینہ مرچکی ہے رام دیال نے اسے بلی چڑھا دیا ہے یہ کیا چکر ہے......؟" میں سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" کاجل نے پوچھا۔

"کک کچھ نہیں تم ایسا کرو ہم سے آگے جو کرولا جارہی ہے اس کا پیچھا کرو۔" میں ہذیانی لہجے میں بولی۔

"مگر کیوں......؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ وقت سوال وجواب کا نہیں، یہ نہ ہو کہ وقت میرے ہاتھ سے نکل جائے تم اس کا تعاقب کرو، میں تمہیں بتاتا ہوں۔" کاجل خاموشی سے کرولا کا پیچھا کرنے لگی کرولا مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی مضافات میں داخل ہوچکی تھی۔ کاجل ایک مخلص لڑکی تھی میں نے اسے اپنی روداد سناڈالی اسے اپنی کہانی سناتے وقت میں نے میری اور دیگر حسین لڑکیوں کی سنگت میں گزارے لمحات حذف کرڈالے تھے وہ حیرت سے میری کہانی سنتی رہی پھر بولی۔ "آیان میں تم سے پریم کرتی ہوں میں نے اسی پریم کے کارن اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کردیا ہے۔ اب تمہاری خاطر جان بھی دینی پڑے تو پیچھے نہیں ہٹوں گی۔"

نہ جانے کتنی دیر ہوگئی سورج ڈھل گیا اور شام کے سائے پھیلنے لگے مگر رام دیال کی گاڑی کہیں رکنے کے بجائے چلتی جارہی تھی کاجل کافی فاصلے سے گاڑی کا پیچھا کررہی تھی اس لئے وہ اپنے تعاقب سے باخبر نہ ہوسکا تھا۔

اب ہم پہاڑی علاقے میں سفر کررہے تھے۔ "یہ تو رام گڑھ ہے۔" کاجل بے ساختہ بولی اور میں چونک پڑا ہمزاد کے کہنے کے مطابق رام دیال رام گڑھ میں ہی کہیں سکونت پذیر تھا اور مجھے ملنے والا پنڈت بھگوان داس نے بھی کہا تھا کہ اس کا استھان رام گڑھ میں ہے۔

کچھ دیر بعد کرولا رک گئی کاجل نے بھی گاڑی روک دی یہ سنسان پہاڑی علاقہ تھا دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا وہ پگڈنڈی میں چلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے یہاں سڑک ختم ہوگئی تھی اور جگہ جگہ چھوٹے بڑے ٹیلے تھے ہم مختلف ٹیلوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس تعاقب میں رات کی تاریکی بھی ہماری معاون ہوچکی تھی۔

اچانک دور سے ایک مندر دکھائی دیا، اب وہ دونوں مندر کی طرف بڑھ رہے تھے رام دیال اور فارینہ مندر کے دروازے پر چند لمحوں کے لئے رکے اور پھر اندر داخل ہوگئے۔ جبکہ ہم دونوں ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑے تھے۔ "اب کیا کریں رات بھی بہت ہوچکی ہے؟" کاجل گھبرا گئی تھی اس کا گھبرانا جائز بھی تھا ہم شہر سے کئی میل دور آچکے تھے واپسی تک صبح ہوجانی تھی اس کے گھر والے بھی اس کی غیر موجودگی سے پریشان ہوں گے ادھر مجھے بھی لازماً ہوٹل پہنچنا تھا کیونکہ میں نے صبح کی پرواز سے پاکستان جانا تھا لیکن ہمزاد ہمارا یہ مسئلہ حل کرسکتا تھا وہ لمحوں میں ہمیں شہر پہنچا سکتا تھا۔

ہمزاد کا خیال آتے ہی میرا چہرہ پرسکون ہوگیا اور میں نے ہمزاد کو طلب کیا۔ "اس مندر میں رام دیال گیا ہے اس کے ساتھ فارینہ بھی ہے میں جاننا ہوں کہ وہ اندر کیا کررہا ہے بلکہ مناسب یہی ہے کہ کسی طرح مندر میں گھس کر رام دیال کا خاتمہ کیا جائے۔" میں پرجوش لہجے میں بولا۔

کاجل کو میں راستے میں ہمزاد کے بارے میں بتاچکا تھا اس کے باوجود وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ میں کس سے باتیں کررہا ہوں کیونکہ اسے ہمزاد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"میری مانو تو اس مندر میں داخل ہونے کا خیال ترک کردو، رام دیال کوئی معمولی پجاری نہیں۔ بہت شکتی شالی ہے اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ اس کی شخصیت اور کسی بھی قسم کی حرکت میری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ورنہ میں کسی بھی انسان کا کچا چٹھا بتانے کے علاوہ اس پر حاوی ہوسکتا ہوں اور رہی فارینہ والی بات تو میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ وہ مرچکی ہے۔" ہمزاد نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر فارینہ مرچکی ہے تو پھر وہ کون تھی جو رام دیال کے ساتھ تھی؟'' میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

''رام دیال جیسے مہان پجاری کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں۔ اتنا سوچ لو کہ یہ کالی کا مندر ہے اور تم مسلمان ہو، یہ نہ ہو کسی بڑی مشکل میں پھنس جاؤ۔ کیونکہ اس مندر میں، میں تمہاری مدد کے لئے داخل نہیں ہوسکوں گا۔''

''میرا نام آیان ہے اور میں اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ تم میری فکر مت کرو اور میرے آنے تک کاجل کا خیال رکھنا میں چند ہی منٹ میں لوٹ آؤں گا۔'' میں نے کہا اور ہمزاد کے منع کرنے کے باوجود کاجل کو سمجھا کر مندر میں داخل ہوگیا۔

احاطے میں کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا مندر کے ہال نما کمرے میں پہنچ گیا۔ یہاں کالی کا قد آور بت ایستادہ تھا رام دیال اور فارینہ دونوں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ''رام دیال کہاں چھپا بیٹھا ہے باہر نکل دیکھ میں آگیا ہوں۔ آج تیرا یوم حساب ہے تجھے چاچا اور چاچی کے قتل کا حساب دینا ہے میں تجھے اسی مندر میں کتے کی موت ماروں گا۔''

میں اب تک جو رام دیال کی شکتی سے ڈرتا چلا آرہا تھا اب انجام سے بے پرواہ چیخ و چلا رہا تھا اور اسے للکار رہا تھا کہ اچانک ہال نما کمرے میں گھنٹیوں کی آواز گونجنے لگی پھر زوردار آواز کے ساتھ کمرے سے باہر جانے والا دروازہ خود بخود بند ہوگیا اور ہال نما کمرے کی بتیاں بجھ گئیں۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس اندھیرے میں مجھے جو منظر دکھائی دیا اس نے میرے رونگٹے کھڑے کردیئے۔

کالی کے دیو ہیکل بت کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں پھر میں نے کالی کا سر دائیں بائیں ہلتے دیکھا میری ساری بہادری ہوا ہوگئی اور میں دروازے کی طرف بھاگا اور اسے کھولنا چاہا۔ مگر مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ اسی وقت ہال پراسرار اور خوف ناک چیخوں سے گونج اٹھا، سچی بات تو یہ ہے کہ میں واقعی خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اسی لمحے کالی کے قد آور بت کے پیچھے سے رام دیال باہر نکلا۔ ''کیوں مہاشے ابھی تو تو بہت پھڑ پھڑا رہا تھا اب کیوں چپ ہوگیا یہ کالی کے مہان سیوک رام دیال کا چکر ویو ہے یہ جو تو مجھے دیکھ رہا ہے یہ میں نہیں، یوں سمجھ لے کہ میری ڈپلی کیٹ ہے تو اصل رام دیال تک زندگی بھر نہیں پہنچ سکتا۔'' رام دیال نے قہقہہ لگایا۔

میں ہمت کرکے آگے بڑھا اور اس کے منہ پر گھونسہ مارنا چاہا لیکن یہ دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے تھے کہ میرا ہاتھ اس کے جسم سے اس طرح آر پار ہوگیا جیسے میرے سامنے رام دیال نہیں ہوا کا بنا ہوا انسان ہو۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ یہ اصل رام دیال نہیں۔ اب اپنے چاروں طرف گھوم کر دیکھ۔'' رام دیال نے کہا اور اور میں چکرا کر رہ گیا میرے چاروں طرف درجنوں کی تعداد میں رام دیال کھڑے ہنس رہے تھے، سب ایک ہی جیسے تھے اگر میری جگہ کوئی عام انسان ہوتا تو کب کا بے ہوش ہوگیا ہوتا۔

''اب تو تجھے میری شکتی کا اندازہ ہوگیا ہوگا جب تو میرا پیچھا کررہا تھا تب بھی کار میں، میں نہیں میرا ڈپلیکیٹ تھا اور جسے تو فارینہ سمجھ رہا تھا وہ فارینہ نہیں ایک آتما تھی جو اس کے بھیس میں موجود تھی۔ فارینہ کو تو میں نے دو سال پہلے ہی دیوی کے چرنوں میں بلی چڑھا دیا تھا۔'' وہ خبیثانہ انداز میں بولا اور کوئی منتر پڑھ کر میری طرف پھونکا اس کے ساتھ ہی میں ہوش وحواس سے عاری ہوگیا، نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔

ایک وسیع وعریض کمرہ تھا اس کمرے میں کوئی کھڑکی یا دروازہ نظر نہیں آرہا تھا۔ چاروں طرف سپاٹ دیواریں تھیں اس کے باوجود نہ جانے اس کمرے میں ہوا کہاں سے آرہی تھی اور کمرے میں بلب نہ ہونے کے باوجود عجیب سی روشنی بھی تھی۔ میں کافی دیر تک ٹہلتا رہا پھر تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ کچھ ساعت بعد اچانک نہ جانے کہاں سے رام دیال نمودار ہوا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔ ''کیسا ہے بالک؟'' وہ خبیثانہ انداز

میں ہنسا۔

"تمہاری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔" میں اس پر جھپٹتے ہوئے بولا، اپنی اس کوشش میں مجھے ناکامی ہوئی وہ اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا رہا جب کہ میں دیوار سے جاٹکرایا۔

"میں نے پہلے بھی تجھ سے کہا تھا کہ تو اصل رام دیال تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر پہنچ بھی گیا تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ میں چاہوں تو تجھے ایک پل میں مار سکتا ہوں لیکن اب تو اس قید خانے میں بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرے گا اور تیرا ہمزاد بھی تیری کوئی مدد نہیں کر سکے گا یہ طلسمی مندر ہے تیرے اس مندر میں داخل ہوتے ہی یہ مندر دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔" رام دیال نے کہا اور میری نگاہوں کے سامنے سے کسی جن کی طرح غائب ہو گیا۔

دن تو جیسے تیسے گزر گیا لیکن رات کا مہیب سناٹا دیکھ کر مجھے خوف آنے لگا اس کمرے میں رات اور دن کا اس طرح اندازہ ہو جاتا تھا کہ دن کے وقت یہ کمرہ روشن ہوتا تھا اور رات کو یہاں گھپ اندھیرا چھا جاتا تھا، چوبیس گھنٹے میں میری بھوک اور پیاس سے بری حالت ہو چکی تھی میں رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور بار بار اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا، پہلی رات میرے لئے صدیوں پر محیط تھی دوسرا روز اس سے بھی برا تھا، پیاس کی شدت سے ہونٹ خشک ہو چکے تھے جبکہ بھوک سے پیٹ میں اینٹھن سی ہو رہی تھی غرض کہ اس کمرے میں مجھے بھوکا پیاسا رہتے ہوئے پانچ روز گزر گئے، پانچویں روز میں کسی کیچوے کی طرح بھوکا پیاسا فرش پر پڑا موت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ چھٹے روز مجھے اپنی دردناک موت کا اندازہ ہو چکا تھا۔

میں فرش پر پڑا ہولے ہولے کراہ رہا تھا آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا چکا تھا اور ذہن پر دھند سی چھانے لگی تھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ہل جل سکوں میں سمجھ چکا تھا کہ اب اس کمرے میں میری موت لکھی ہے کہ اچانک ایک جھما کا سا ہوا، کمرے میں سیٹی جیسی تیز آواز ابھری، میں نے نیم وا آنکھوں سے آواز کی سمت دیکھا دائیں سمت دیوار میں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جو چوپٹ کھلا ہوا تھا، یہ میرے لئے حیرت کی بات تھی حالانکہ جب مجھے اس کمرے میں ہوش آیا تھا تو یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا ہر طرف سپاٹ دیواریں تھیں کچھ دیر میں اس دروازے کو نظر کا دھوکہ سمجھ کر لیٹا رہا پھر کسی سانپ کی طرح ہمت کر کے رینگنے لگا۔

میری رفتار کچھوے سے بھی زیادہ سست تھی مجھے اس کمرے سے نکلنے میں اندازاً ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت لگا اور مندر سے نکلنے میں تو کئی گھنٹے لگے خلاف توقع راستے میں نہ کوئی رکاوٹ پیش آئی اور نہ رام دیال سمیت کوئی ذی نفس نظر آیا۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ مندر سے باہر جانے والے راستے کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے، اس طلسمی مندر سے میں جیسے ہی باہر نکلا وہ پراسرار مندر نگاہوں کے سامنے سے اس طرح غائب ہو گیا کہ جیسا اس کا وجود ہی نہ ہو۔ اور میں بے دم ہو کر زمین پر پڑا تھا بھوک اور پیاس اس قدر غالب آ چکی تھی کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا چکا تھا اور میں منہ کو کھولے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا کہ کسی نے آہستہ آہستہ شہد سے زیادہ میٹھا پانی میرے کھلے ہوئے منہ میں ڈالا وہ جو کوئی بھی تھا آہستہ آہستہ مجھے پانی پلاتا رہا کچھ ہی دیر میں میری حالت قدرے سنبھل چکی تھی لیکن بھوک کی وجہ سے نقاہت اب بھی باقی تھی لیکن آنکھوں کے سامنے چھایا ہوا اندھیرا ہٹ چکا تھا اور مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

میرے قریب میرا ہمزاد کھڑا تھا میں بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھا اور نحیف آواز میں کاجل کے بارے میں پوچھا۔ "پہلے کچھ کھا پی لو تا کہ تمہارے بدن میں جان آ جائے پھر کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یہ جگہ تمہارے لئے خطرناک ہے۔" ہمزاد نے کہا اور چشم زدن میں میرے سامنے کچھ پھل لا کر رکھے۔

شدید ترین بھوک کے باوجود کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن توانائی بحال کرنے کی غرض سے میں

نے کچھ پھل کھائے بھوک اور پیاس بجھتے ہی میری حالت میں مزید بہتری آ گئی اب میرے بدن میں اس قدر توانائی آ چکی تھی کہ میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ ہمزاد نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے آنکھیں بند کرنے کو کہا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کریں اس کے ساتھ ہی میرے جسم کو جھٹکا لگا اور میں نے محسوس کیا جیسے میں کسی پرندے کی طرح اڑ رہا ہوں، یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کچھ ہی دیر بعد میرے قدم زمین سے ٹکرائے اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔

ہم ایک گھنے جنگل میں ایک جھونپڑی کے سامنے کھڑے تھے۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ بیام پور کا جنگل ہے ہم اس وقت رام گڑھ سے سینکڑوں میل دور ہیں۔“

”یہ جھونپڑی کس کی ہے؟“ میں نے جھونپڑی میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”یہ جھونپڑی چند سیاحوں نے بنائی تھی جو کہ اس جنگل میں گھومنے پھرنے آئے تھے۔“

”کاجل کہاں ہے؟“ میں نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے مندر میں جاتے ہی وہ مندر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا کوشش کے باوجود بھی میں نہیں جان سکا کہ تم پر کیا بیتی، مجبوراً مجھے کاجل کے سامنے ظاہر ہونا پڑا وہ تو شکر ہے اسے تم پہلے ہی میرے بارے میں آگاہ کر چکے تھے ورنہ وہ ڈر جاتی میں نے چاہا کہ کاجل کو اس کے گھر چھوڑ کر واپس لوٹ آؤں لیکن وہ تمہارے بغیر اس ویرانے سے جانے سے انکار کرتی رہی، ہم رات بھر تمہاری تلاش میں وہاں بھٹکتے رہے، نہ تمہاری خبر ملی اور نہ ہی وہ طلسمی مندر نظر آیا صبح میں نے کاجل کو رائے دی کہ مہاراج بھگوان داس سے مل کر ان سے مدد کی درخواست کرے کیونکہ ان کا ٹھکانہ رام گڑھ میں ہے ہم چار روز رام گڑھ کی پہاڑیوں میں بھٹکتے رہے مگر بھگوان داس کا استھان نہیں ملا میں کوشش کے باوجود بھی اپنی قوتوں سے ان کا سراغ نہیں لگا سکا کیونکہ وہ مہان شکتی کے مالک ہیں بالآخر پانچویں روز ہمیں ان کا استھان نظر آ گیا۔ لیکن بھگوان داس کے استھان میں کسی ماورائی قوت کا جانا ناممکن ہے، جو بھی ماورائی قوت ایسا کرے گی جل کر بھسم ہو جائے گی اسی لئے کاجل نے مجھے وہیں رکنے کا کہا اور خود بھگوان داس کے استھان میں چلی گئی، میں باہر ہی اس کا انتظار کرنے لگا۔

پورا دن گزر گیا مگر وہ نہ لوٹی اور نہ ہی میں یہ جاننے میں کامیاب ہو سکا کہ اس کے ساتھ کیا بیتی۔ آج جب میں تمہارا پتہ کرنے پہنچا تھا کہ تم اچانک نظر آ گئے۔ شاید بھگوان داس نے کاجل کے کہنے پر تمہاری مدد کی تھی لیکن پھر کاجل کہاں گئی؟

اس سوال کا جواب نہ ہمزاد کے پاس تھا اور نہ میرے پاس لیکن آج مجھے اتنا احساس ہو گیا تھا کہ کاجل مجھ سے سچا پیار کرتی ہے بلکہ ایسی محبت میں نے نہ دیکھی اور سنی تھی اس نے میری خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی، اب نہ جانے کہاں تھی اور کس حال میں تھی؟ ”کہیں کسی حادثے کا شکار تو نہیں ہو گئی؟“ یہ سوچتے ہی میرا دل بیٹھنے لگا۔

دو روز میں نے اسی جھونپڑی میں قیام کیا۔ اچھی خوراک اور آرام سے میری جسمانی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ میں بھگوان داس کے استھان پر جانے کے لئے بے تاب تھا تاکہ کاجل کے بارے میں جان سکوں کہ اس پر کیا گزری۔ اس کے بے لوث پیار نے میرا دل جیت لیا تھا ہمزاد نے مجھے لمحوں میں رام گڑھ کے پہاڑی علاقے میں پہنچا دیا۔ جہاں بھگوان داس کا استھان تھا۔

کئی گھنٹوں کی کوشش کے باوجود ہمیں بھگوان داس کا استھان نہیں ملا، ہمزاد خود حیران تھا کہ بھگوان داس کا استھان کہاں غائب ہو گیا، اپنی باطنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہمزاد نے بھگوان داس کے استھان کے بارے میں جاننا چاہا مگر یہاں بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

صبح سے شام ہو گئی۔ میں رام گڑھ کی پہاڑیوں

میں گھومتا رہا اور دیوانوں کی طرح کاجل کو پکارتا رہا۔ مگر یہ سب لاحاصل تھا آخر کار تنگ آ کر میں نے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا، اگر میں چاہتا تو لمحوں میں پہلے کی طرح ہمزاد کی مدد سے اپنے ٹھکانے پر جا سکتا تھا۔ لیکن میرا دل پیدل چلنے کو چاہ رہا تھا میں نے ہمزاد کو جانے کی اجازت دی اور پیدل ہی چلتا رہا۔ یونہی چلتے رکتے مختلف گاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے میں وہاں سے کوسوں دور جا پہنچا۔

ایک بس میں سفر کے دوران میری ملاقات ایک بزرگ جوڑے سے ہوئی جو سری نگر کا باسی تھا۔ یہ بزرگ جوڑا مسلمان تھا اس کا صرف ایک دس گیارہ سالہ بیٹا شہزاد تھا باتوں باتوں میں وہ میرے بارے میں اور میں ان کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ میں نے انہیں اپنے بارے میں بتاتے وقت ہمزاد سمیت بہت سی دوسری باتیں ان سے چھپالی تھیں۔

بڑے میاں کا نام اکبر شاہ اور ان کی اہلیہ کا نام رضیہ خانم تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اصرار کیا اور میں ان کے خلوص کے سامنے انکار نہ کر سکا وہ سادہ لوح بڑے مخلص لوگ تھے۔ شہزاد ایک شریف اور ذہین بچہ تھا وہ جلد ہی مجھ سے گھل مل گیا وہ مجھے بھائی جان کہنے لگا تھا۔ ان کے خلوص کی وجہ سے میں تین مہینے وہاں رہا پھر ایک روز چپکے سے رات کے اندھیرے میں وہاں سے نکلا لیکن جانے سے پہلے ہمزاد کے ذریعے حاصل کی گئی لاکھوں کی رقم بڑے میاں کے سرہانے رکھی اور گھر سے نکل گیا ارادہ بھگوان داس کی تلاش میں جانے کا تھا۔

ہمزاد نے مجھے لمحوں میں رام گڑھ کے پہاڑی علاقے میں پہنچا دیا میرا ارادہ صبح بھگوان داس اور کاجل کی تلاش میں نکلنے کو تھا مدہوم سی امید تھی کہ شاید اس بار میں بھگوان داس کا استھان تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

ہمزاد کو میں نے جانے کی اجازت دے دی تھی اور خود ایک درخت سے ٹیک لگا کر سو گیا کسی نے سچ کہا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے میں بھی بیٹھے بیٹھے سو گیا۔

رات کے آخری پہر جب کہ میں گہری نیند میں تھا میرے دائیں پہلو میں کسی نے زوردار لات رسید کی میں کراہتا ہوا ایک طرف گرا اور آنکھیں کھول کر اٹھا ہی تھا کہ ششدر رہ گیا رام دیال میرے سامنے کھڑا کسی خونخوار درندے کی مانند مجھے گھور رہا تھا۔ ”آیان مجھے بھولا تو نہیں، میں تیرا پرانا متر رام دیال ہوں۔“

”رام دیال میں تمہارا لعنتی چہرہ کیسے بھول سکتا ہوں۔

لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ تمہاری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے۔“ میں نے تند لہجے میں کہا۔

”اس روز تو میرے طلسم کدے سے بچ نکلا تھا لیکن آج تجھے میرے ہاتھوں مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا پرنتو اس روز تو میری اور میرے بیروں کی نظر میں آئے بغیر اس طلسم کدے سے کیسے نکلا وہ کون سی شکتی ہے جس نے اس سے تیری سہائتا کی تھی؟“ رام دیال استعجاب انگیز حیرت سے بولا۔

”تم نہ جانے کس خوش فہمی کا شکار ہو۔ میں کوئی عام انسان نہیں اس بات کا اندازہ تم اس سے لگالو کہ میں تمہاری نظروں میں آئے بغیر طلسمی مندر سے نکل گیا۔“ میں نے اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر اپنا رعب جمانے کے لئے کہا۔

”آج تیری شکتی بھی دیکھ لیتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے زیر لب کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا، میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے مجھے اپنی سلامتی خطرے میں نظر آ رہی تھی وہ کوئی عام پجاری نہیں۔ جس سے میں الجھ سکتا ہمزاد بھی اس کے سامنے بے بس تھا۔ پھر کئی مواقع پر میں اس کی شکتی کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ ہمزاد کو طلب کرنا بے سود تھا۔ میں خود کو کسی بھیانک انجام سے دوچار ہونے کے لئے تیار کر چکا تھا، رام دیال نے منتر پڑھتے ہوئے جھک کر زمین سے مٹی اٹھائی اور میری طرف ہاتھ جھٹکنا چاہا مگر ناکام رہا ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کسی ماورائی قوت نے اس کا ہاتھ تھام لیا ہو۔ اس کے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے تاثرات تھے۔ ”کون

ہو تم؟ اور کیا چاہتے ہو؟ ہمت ہے تو سامنے آؤ.....؟"

اسی وقت اس کی پشت پر مہاراج بھگوان داس نمودار ہوا، وہی بھگوان داس جو مجھے فائیو اسٹار ہوٹل کے باہر ملا تھا جس کا استھان ڈھونڈنے میں ان پہاڑیوں میں آیا تھا مہاراج بھگوان داس کے چہرے پر جلال کے آثار تھے اس کی انگاروں کی طرح دہکتی آنکھیں رام دیال پر مرکوز تھیں۔"رام دیال اسے جانے دے پہلے بھی تو نے اس پر بہت ہتھیا چار کئے ہیں ہمارا دھرم کسی منش پر ہتھیا چار کی آگیا نہیں دیتا۔" اس کی آواز بھاری اور گونج دار تھی۔

"مہا پرش میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں کالی کا داس اور مہان شکتی کا مالک ہوں اس لئے تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے مداخلت کئے بغیر خاموشی سے لوٹ جاؤ۔" رام دیال نخوت زدہ لہجے میں بولا۔

"رام دیال تم مہان پجاری ہو۔ اور یہ انیائے ہے، میری مانو اور اسے جانے دو کیونکہ میں نے کسی سے اسے بچانے کا وچن کر رکھا ہے۔" مہاراج بھگوان داس نرم لہجے میں بولا۔

"نہیں مہاراج میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر تم بیچ میں آئے تو مجبوراً مجھے تمہارے خلاف بھی کچھ کرنا پڑے گا۔"

اس کی بات سنتے ہی بھگوان داس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔"تو پھر ٹھیک ہے تم سے جو ہوسکتا ہے کرو لیکن میں اسے بچاؤں گا۔"

رام دیال نے منتر پڑھنے کے لئے لب ہلائے ہی تھے کہ مہاراج بھگوان داس نے اس کی طرف دایاں ہاتھ جھٹکا۔ رام دیال کا منہ بند ہوگیا وہ کوشش کے باوجود اپنے ہونٹ تک نہیں ہلا سکا اب وہ غصے اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت سے مہاراج بھگوان داس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اسی کیفیت میں رہا پھر اپنی جگہ سے غائب ہوگیا۔

میں بھگوان داس کی طرف لپکنے ہی والا تھا کہ وہ بھی اپنی جگہ سے غائب ہوگئے اور میں آوازیں دیتا رہ گیا، اتنا تو میں اندازہ لگا ہی چکا تھا کہ وہ کاجل کے کہنے پر مجھے بچانے آئے تھے۔"لیکن وہ مجھ سے بات کئے بغیر کہاں غائب ہوگئے اور کاجل کہاں ہے.....؟" یہ سوالات میری سمجھ سے باہر تھے اور سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اب میں کہاں جاؤں.....؟" پھر میرے ذہن میں آیا۔" کیوں نہ بھگوان داس کا استھان تلاش کروں۔" میں سامنے موجود پہاڑ پر چڑھنے لگا۔

کافی دیر تک پہاڑوں کی خاک چھاننے کے بعد بھی بھگوان داس کا استھان تلاش کرنے میں ناکام رہا تو پلٹ کر واپس جانے کا سوچا۔ اسی وقت میری نظر ایک غار کے دہانے پر پڑی، میں چند قدم آگے بڑھا، غار کے دہانے پر جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔"کہیں یہی..... مہاراج بھگوان داس کا استھان تو نہیں.....؟" میں نے سوچا پھر خیال آیا۔" اگر یہ مہاراج کا استھان ہوتا تو غار کے دہانے پر اس قدر جھاڑیاں نہ اگی ہوتیں۔" یہ سوچنے کے باوجود میں محض فطری تجسس کے تحت جھاڑیاں ہٹاتا ہوا بمشکل غار کے اندر داخل ہوگیا۔

وہ کافی وسیع عریض غار تھا میں چلتا ہوا آگے بڑھا دور سے کسی کا ہیولہ سا دکھائی دیا میں مزید آگے بڑھا کچھ فاصلے پر ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص جسم پر فقط ایک لنگوٹ باندھے آلتی پالتی مارے کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر دھرے ہوئے تھے اور چہرے پر داڑھی مونچھیں جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھی ہوئی تھیں وہ ورزشی جسم کا مالک تھا اور آنکھیں بند تھیں میں اس شخص کے قریب جا پہنچا۔" آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟" مگر خاموشی چھائی رہی، میں نے اسے چار پانچ بار بلند آواز میں پکارا مگر جواب ندارد تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ شخص گونگا بہرہ ہو جب اس نے جواب نہ دیا تو میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس کے عضلات کسی ٹھوس مجسمے کی طرح ساکت تھے۔

میں نے حیران و پریشان ہوکر اس کی نبض پر ہاتھ رکھا مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ اس کی نبض ساکت تھی دل کی دھڑکن بھی ساکت لگ رہی تھی۔" کیا وہ مردہ

تھا......؟" میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ "لیکن اگر وہ مرچکا تھا تو اس کے جسم میں حرارت کیوں ہے؟ اور وہ کسی زندہ انسان کی طرح تن کر کیوں بیٹھا ہے؟" غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا وہ سانس بھی نہیں لے رہا تھا میری الجھن دوچند ہوگئی لیکن اگر وہ مرچکا تھا تو اس طرح تن کر کیوں بیٹھا تھا میں نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر اس قدر زور سے چٹکی بھری کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو ضرور چیخ پڑتا میرے ہلانے جلانے پر بھی وہ اپنی جگہ مضبوطی سے بیٹھا رہا۔

میں تھک ہار کر غار کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میں اس پراسرار مردے کا راز جانے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کیوں نہ ہمزاد کو طلب کرکے اس کے بارے میں پوچھوں یہ سوچتے ہی میں نے ہمزاد کو پکارا اور یہ دیکھ کر میری تشویش میں اضافہ ہوگیا کہ ہمزاد میرے بار بار پکارنے کے باوجود حاضر نہیں ہوا حالانکہ میری ایک ہی آواز میں وہ پلک جھپکتے میں حاضر ہوجاتا تھا یہ تیسرا موقع تھا جب ہمزاد میرے بلانے کے باوجود نہیں آیا تھا ایک بار ساغری میں جب رام دیال اور مظفر نے مجھے گھیرا تھا اور دوسری بار جب میں طلسمی مندر میں پھنسا تھا۔ اب تیسری بار اس پراسرار مردہ شخص کے غار میں بار بار پکارنے کے باوجود ہمزاد حاضر ہونے میں ناکام رہا تھا۔

"کیا یہاں بھی کوئی ماورائی قوت موجود ہے۔" یہ سوچتے ہی میں گھبرا گیا اور غار سے نکلنے کی غرض سے اٹھا ہی تھا کہ مردہ شخص نے آنکھیں کھول دیں اور سر گھما کر اپنی انگاروں جیسی دہکتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر مقناطیسی کشش تھی کہ میں نے گھبرا کر نظریں جھکالیں۔ "دوسروں کے سہارے پر جینا چھوڑ دو اور خود کو اس قدر مضبوط بناؤ کہ دنیا میں کسی کے سہارے کی ضرورت نہ ہو۔" اس کی ٹھوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی "آپ زندہ ہیں؟" میں اسے بولتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ڈر اور خوف سے میرا برا حال تھا دل تو یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح بھاگ کر اس پراسرار غار سے باہر نکل جاؤں مگر یہ میرے بس سے باہر تھا۔ میں سحرزدہ سا وہیں کھڑا رہا۔

"انسانی جسم فانی ہے کسی بھی وقت فنا ہوسکتا ہے۔ اور اس کی طاقتیں بھی محدود ہیں جب کہ اس کی نسبت روح کی طاقتیں لامحدود ہیں انسان اپنے جسم کی پاکیزگی پر زور دیتا ہے لیکن اپنی روح کو آلودہ کرلیتا ہے۔" وہ فلسفیوں کی طرح بول رہا تھا۔ اس کی بہت سی باتیں میرے سر پر سے گزر گئیں۔

"تم نے کیا سمجھا کہ سائے پر قابو پاکر اپنی تقدیر بدل دوگے؟ وہ سایہ جو کٹھن مراحل میں تمہاری مدد کرنے سے قاصر ہے۔" وہ قدرے توقف سے بولا۔

اور میں حیرت سے اچھل پڑا بلاشبہ وہ بھگوان داس کی طرح پراسرار اور شکتی شالی تھا اور سایہ غالباً وہ ہمزاد کو کہہ رہا تھا۔

"تم نے درست اندازہ لگایا میں اسی ہمزاد کی بات کررہا ہوں جسے تسخیر کرنے کے لئے تم نے اس بیچاری کی مدد سے چلہ کاٹا اور پھر تم دونوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی لڑائی شروع ہوگئی۔"

"آپ بہت پہنچے ہوئے ہیں میری مدد کریں۔" میں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا ہے کہ خود کو اتنا مضبوط بنالو کہ تمہیں دوسروں کا محتاج نہ ہونا پڑے انسانی جسم خاص کر دماغ ان گنت طاقتوں کا سرچشمہ ہے فرق صرف اتنا ہے کہ انسان اپنی ان طاقتوں اور صلاحیتوں سے آگاہ نہیں، میں تمہیں ان طاقتوں پر قابو پانا سکھاؤں گا، اس کے علاوہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔"

میں نے اسے متاثر کرنے کے لئے اپنی روداد سنا ناچاہی اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا اور کہا۔ "میں سب کچھ جانتا ہوں مجھے کچھ مت بتاؤ مجھے اس دنیا سے کچھ لینا دینا نہیں، برسوں بیت گئے ہیں میں خود انسانوں سے تنگ ویرانوں میں اپنی زندگی بسر کررہا ہوں۔"

میرے پوچھنے پر اس نے اپنے بارے میں بتایا اس کا نام جبران تھا۔ اس نے سکھ گھرانے میں جنم لیا وہ

ایک انوکھا انسان تھا اس کے ذہن میں ان گنت سوالات ابھرتے تھے، لڑکپن میں ہی اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تب وہ ہندو سادھو رام چند سے ملا اس نے اپنے مذہب کو سچا بیان کیا وہ کچھ عرصہ رام چند کے ساتھ رہا مندر میں پوجا کی مختلف قسم کے جاپ کیے مگر یہاں بھی وہ مطمئن نہ ہوا کہ ہندو جو بت خود اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے انہیں ہی پوجتے تھے اور ان ہی سے مانگتے تھے وہ وہاں سے مایوس ہو کر نکلا اور ایک بدھ مت کے پیروکار کے ساتھ چند سال رہا۔ مگر وہاں بھی وہ مطمئن نہ ہو سکا لیکن اس بدھ مت کے پیروکار سے وہ سانس روکنے کی مشق مسمریزم اور دوسرے بہت سے پراسرار علوم سیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

ان ہی دنوں اس کی ملاقات دین اسلام کے ایک عالم سے ہوئی، اسلام کی سچائی جانتے ہی وہ مسلمان ہو گیا وہ ایک سچا مسلمان تھا ہر وقت عبادت اور ریاضت میں گم رہتا۔ لیکن دنیا میں جب دھوکہ، فریب، فرقہ واریت دیکھی تو تاریک الدنیا ہو گیا۔

میں غار میں جس وقت داخل ہوا وہ سانس روک کے مراقبے میں گم تھا وہ بغیر کھائے پیئے ہفتوں سانس روک کر مراقبہ کرتا تھا۔ میں نے رات اس کے ساتھ غار میں ہی بسر کی علی الصبح وہ مجھے لے کر غار سے باہر نکلا اور ایک چٹان پر مجھے آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کا حکم دیا میں نے اس کے کہنے پر اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھے اور طلوع ہوتے ہوئے سورج پر نظریں جما دیں یہ انتہائی مشکل کام تھا۔

پہلے پہل تو میری آنکھیں سورج کی شعاعوں سے جلنے لگیں اور پانی تیزی سے بہنے لگا پھر میں عادی ہوتا چلا گیا کچھ ہفتوں بعد میں پلک جھپکائے بغیر طلوع ہوتے ہوئے آفتاب سے نظریں ملا سکتا تھا۔ میری آفتاب بینی کی مشقیں چار مہینے تک جاری رہیں پھر اسی طرح ایک روز رات کے وقت اس نے مجھے چاند پر نظریں جمانے کا حکم دیا۔ آفتاب بینی کے بعد میرے لئے یہ آسان کام تھا تین ماہ بعد اس نے ایک درخت پر خنجر کی نوک سے دائرہ بنایا اور مجھے اس پر نظریں جمانے کا حکم دیا میں اس مشق میں بھی کامیاب رہا۔ اس کے بعد اس نے مجھے غار میں ہی آسن جما کر بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق آنکھیں بند کر کے سانس روک لیا اور تصور کرنے لگا کہ مجھے نور کا ایک ہالہ نظر آ رہا ہے، شروع شروع میں دشواری لیکن کچھ ماہ بعد میں گھنٹوں ایک ہی جگہ سانس روکے بیٹھا مراقبے میں گم رہتا۔

رفتہ رفتہ میرے مراقبے کی مدت میں اضافہ ہونے لگا تقریباً دو سال بعد اس نے مجھے غار سے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں کسی انسان کے سہارے کی ضرورت نہیں تم اپنا دفاع خود کر سکتے ہو اور ہاں پلٹ کر واپس مت آنا، اب میں تمہیں نہیں ملوں گا۔''

میں اپنے استاد اپنے محسن سے مل کر غار سے باہر نکلا اور اس بلند و بالا پہاڑ سے اترنے لگا سب وقت کا ہیر پھیر ہے دو سال پہلے جب میں رام گڑھ کے اس پہاڑ پر چڑھ رہا تھا تو ایک عام انسان تھا اور اب جب اتر رہا تھا تو حبس دم کا ماہر اور مسمریزم کا عامل تھا جبران نے مجھے بہت کچھ دیا تھا کچھ دیر چلنے کے بعد میں ایک چٹان پر بیٹھ کر مراقبے میں گم ہو گیا۔ میں کاجل کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ چند ہی لمحوں میں میری بصارت کے دائرے میں آ گئی۔ اسی پہاڑ کے ایک استھان میں مالا جپتی کاجل اس وقت کسی دیوی کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پاکیزگی اور وقار تھا بالآخر دو سال بعد میں کاجل کے بارے میں جاننے میں کامیاب ہو چکا تھا میں مراقبہ ختم کر کے اٹھا اور بھگوان داس کے استھان کی طرف چل دیا۔

میں بھگوان داس کے استھان میں جیسے ہی داخل ہوا نیچے بیٹھی کاجل میرے استقبال کو اٹھی اور بولی۔ ''آج اس استھان کی شان بڑھ گئی ہے جو تم جیسی مہان ہستی یہاں آئی ہے۔''

''کاجل طنز مت کرو تم نہیں جانتی میں کتنے کٹھن راستوں سے گزر کر تم تک پہنچا ہوں۔ تمہارے غائب ہو جانے کے بعد میں تمہیں مہینوں ڈھونڈتا رہا۔'' میں اسے بے قراری سے بتا رہا تھا۔

"مجھے سب معلوم ہے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم پر اس طلسمی مندر میں کیا بیتی آیان جس سے تم مندر میں داخل ہوئے وہ طلسمی مندر ہماری نگاہوں کے سامنے سے اس طرح غائب ہوگیا تھا کہ جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو۔ میں ہمزاد کے ساتھ مہاراج کے استھان تک پہنچی اس مہاپرش نے میری بات دھیان سے سنی اور کہا۔" آیان کا جیون خطرے میں ہے تمہیں اس اس کا جیون بچانا ہے تو اپنی ساری زندگی کالی کی سیوا میں گزارنی ہوگی۔"

اور میں نے حامی بھر لی اور پھر تم طلسمی مندر سے مہاراج کی وجہ سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے دوسری بار بھی انہوں نے ہی تمہیں رام دیال سے بچایا۔ میں یہاں مہاراج کے ساتھ کڑے جاپوں اور تپسیا میں مشغول رہی۔ مجھے تمہارے پل پل کی خبر مل رہی تھی۔

پچھلے دنوں پورنماشی کی رات مہاراج کا دیہانت ہوگیا مرتے سے بھی انہوں نے مجھے میرا وچن یاد کرایا۔ اور کہا کہ "میں اسی استھان میں اپنی زندگی گزاروں اور دیوی کی پوجا کرتی رہوں۔" یہ مہاراج بھگوان داس کا پوترا استھان ہے یہاں کسی بھی انسان یا ماورائی قوت کا داخلہ ناممکن ہے تم بھی یہاں میری مرضی سے داخل ہوئے اگر میں نہ چاہتی تو تم اس استھان میں آنا تو دور اس کے بارے میں جان بھی نہیں سکتے تھے۔" اس نے اپنی بات مکمل کی پر قدرے توقف سے کہا۔" تم بیٹھو میں تمہارے کھانے کے لئے کچھ لاتی ہوں۔"

وہ میرے منع کرنے کے باوجود اٹھی اور کچھ دیر بعد کچھ پھل لے آئی۔" تم اس ویرانے میں اپنی زندگی برباد کررہی ہو چلو میرے ساتھ ہم شادی کر کے نئے سرے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔" میں آگے بڑھا اور اسے اپنی آغوش میں لینا چاہا۔

"نہیں آیان یہ پاپ ہے یہ مہاراج کا پوترا استھان ہے۔" وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو پریم کب سے پاپ ہوگیا اور ہم نے تو ایک دوسرے پر سب کچھ نچھاور کردیا تھا۔" میں تڑپ اٹھا۔

"وہ ماضی کی باتیں ہیں ایان۔ اب میں ایک داسی ہوں اور بلاشبہ دل کی گہرائیوں سے اب بھی تم سے پریم کرتی ہوں۔ میرا یہ جیون صرف تمہارے لئے ہے بلکہ میرا مشورہ ہے کہ تم بھی یہیں رہو شانت رہو گے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو میں بھلا رام دیال کو بھول کر کیسے یہاں رہ سکتا ہوں اب میں پہلے والا آیان نہیں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔"

وہ مسکرائی اور بولی۔" آیان تم رام دیال کی شکتی کے بارے میں نہیں جانتے تم کسی بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے بہتر یہی ہے کہ تم یہیں رہو اور سے کا انتظار کرو۔"

"نہیں۔ کاجل اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا میں اس شیطان کو کیفر کردار تک پہنچا کر اپنے وطن لوٹ جاؤں گا۔ تم نے بھی تو میرا دل توڑ دیا ہے دراصل اس ویرانے میں زاہدوں جیسی خشک زندگی نے تمہیں آدم بیزار بنا دیا ہے۔" میرا لہجہ تلخ ہوگیا۔

وہ دن میں نے اس کے استھان پر گزارا دوسرے روز اس کے روکنے کے باوجود میں استھان سے باہر نکل گیا اس کی سردمہری نے مجھے دلبرداشتہ کردیا تھا مزید پیدل چلنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، میں نے ہمزاد کو طلب کیا وہ دو سال بعد میرے سامنے آیا تھا۔" مجھے بمبئی شہر پہنچادو۔" میں نے اسے بے تاثر لہجے میں حکم دیا اور ہمزاد نے مجھے لمحوں میں بمبئی شہر پہنچادیا۔ میں نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کیا۔ ابھی اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے دوسرا روز تھا کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی میں دروازہ اندر سے بولٹ کر کے لیٹا ہوا تھا بیڈ سے اٹھا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر ایک پولیس انسپکٹر تین سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے مجھ پر اس طرح رائفلیں تان رکھی تھیں جیسے میں کوئی بہت بڑا ٹارگٹ کلر یا گینگسٹر ہوں۔" جی فرمایئے۔؟" میں نے انسپکٹر کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں انسپکٹر روہیت ہوں، تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔" اس نے اپنا تعارف کرواتے

ہوئے کہا۔

"مگر کس جرم میں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم پر ایک ہندو ناری کو اغوا کرنے کے الزام کے ساتھ ساتھ غیر قانونی طور پر ہمارے دیش میں رہنے کا الزام بھی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے میں نے کسی کو اغوا نہیں کیا۔"

"کیا جھوٹ ہے اور کیا سچ، اس کا فیصلہ پولیس اسٹیشن میں کریں گے۔" انسپکٹر نے کرخت لہجے میں کہا اور اس کے اشارے پر ایک سپاہی نے مجھے ہتھکڑی پہنا دی۔

میں چاہتا تو ان چاروں پولیس اہلکاروں کو با آسانی زیر کر کے یہاں سے نکل سکتا تھا لیکن میں قانون شکنی سے پرہیز کرنا چاہتا تھا اس لئے ان کی کارروائی میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ مجھے پولیس اسٹیشن لے جایا گیا انسپکٹر کے کمرے میں بیٹھے شخص کو دیکھ کر میں چونک پڑا، وہ شخص کاجل کا باپ اجے ملہوترا تھا۔

"سر ہم نے اس کو گرفتار کر لیا ہے، اب جلد ہی کاجل کو بازیاب کروا لیا جائے گا۔" انسپکٹر نے کہا اور میری طرف مڑا۔ "اب بتاؤ تم نے کاجل کو اغوا کر کے کہاں رکھا ہے۔"

"انسپکٹر صاحب یہ سچ ہے کہ کاجل اور میں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں لیکن اسے میں نے اغوا نہیں کیا وہ رام گڑھ میں سورگباشی مہاراج بھگوان داس کے استھان پر ہے اور پوجا پاٹ میں مصروف ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تم جیسے عادی مجرموں کی چالبازیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔" انسپکٹر نے آگ بگولا ہو کر میرے چہرے پر تھپڑ رسید کیا۔

"اپنے ہاتھ قابو میں رکھو انسپکٹر ورنہ مشکل میں پھنس جاؤ گے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اچھا تو تم انسپکٹر روہیت کو دھمکیاں دو گے۔" اس نے گالیاں دیتے ہوئے مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور مشتعل ہو گیا اور اسلام کے بارے میں الٹے سیدھے الفاظ کہنے لگا اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو چکا تھا وہ متعصب پولیس آفیسر تھا اور ان انتہا پسند جنونی ہندوؤں میں سے ایک تھا جو مسلمانوں سے بیر رکھتے ہیں جب حد سے تجاوز کر گیا تو میں نے اپنے ہاتھوں میں بندھی ہتھکڑی پر نظر جمادی ہتھکڑی ٹوٹ کر نیچے گر پڑی۔

انسپکٹر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، میں نے اسے جلالی نگاہوں سے دیکھا مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ میرے قابو میں آچکا تھا یہ مسمریزم کا کمال تھا جسے سیکھنے کی غرض سے میں نے دو سال اس تاریک غار میں گزارے تھے۔

میں جبران کا شاگرد تھا۔ کئی ماہ مسلسل آفتاب بینی سے میری آنکھیں اس قدر مقناطیسی قوت کی حامل ہو چکی تھی کہ اگر میں کسی شیشے کے گلاس کو مسلسل دیکھتے ہوئے اس کے ٹوٹنے کی خواہش کروں تو وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

انسپکٹر کو ذہنی طور پر قابو کرتے ہی اپنی دماغی برقی لہروں سے حکم دیا۔ "اپنے سپاہیوں سے کہو کہ مجھے جانے دیں۔" اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ ایان صاحب بے گناہ ہیں انہیں جانے دو۔" سپاہیوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ لیکن اسے ٹوکنے یا پوچھنے کی ان میں جرأت نہیں تھی البتہ ملہوترا نے احتجاج کیا۔ "یہ کیا نیائے ہے تم ایک مجرم کو چھوڑ رہے ہو۔"

"تم چپ کر کے بیٹھے رہو، یہ نردوش ہیں، میں انہیں تم سے بہتر جانتا ہوں۔" انسپکٹر نے سرد لہجے میں کہا اور میں خاموشی سے پولیس اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

میں جانتا تھا کہ اب بمبئی میں رہنا میرے لئے آسان نہیں انسپکٹر روہیت جیسے ہی میرے ٹرانس سے باہر آتا دوبارہ میری تلاش شروع کر دیتا ادھر میرا دشمن رام دیال میرے خون کا پیاسا تھا۔ بلکہ ہو سکتا تھا پولیس کو میری راہ پر لگانے میں اس کا ہاتھ ہو۔ میں چاہتا تو ہمزاد سے اس بارے میں جان سکتا تھا لیکن اب میں جان چکا تھا کہ چھوٹے چھوٹے غیر اہم کاموں کے سلسلے میں ہمزاد کو زحمت دینا بیکار ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "میں کہاں

جاؤں؟" پھر خیال آیا کیوں نہ سری نگر چلا جاؤں، وہ مہربان بزرگ جوڑا بھی خوش ہو جائے گا اور کچھ دن سکون سے گزار کر آئندہ کے لئے لائحہ عمل ترتیب دوں گا۔"

دوسرے روز میں اکبر شاہ کے گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے پچھلی بار یہاں سے رخصت ہوتے وقت میں نے جو رقم وہاں چھوڑی تھی اس کی بدولت ان کے مالی حالات بہت بہتر ہو گئے تھے اس رقم سے انہوں نے کاروبار شروع کیا، اللہ نے انہیں کامیابی دی ان دو سالوں میں شہزاد بھی قد نکال چکا تھا۔ وہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوا۔ کچھ دن میں نے سکون سے گزارے۔

ایک روز صبح ہی صبح میں گھر سے نکل گیا اور جب کئی گھنٹے بعد واپس آیا تو مجھے پتہ چلا کہ شہزاد جو کہ اکبر بابا کا بیٹا تھا اسے اغوا کر لیا گیا تھا پھر میں نے ہمزاد کو طلب کیا اور بولا۔ "شہزاد کو اغوا کر لیا گیا ہے، جلدی سے پتہ کر کے بتاؤ شہزاد اپنے بوڑھے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے اگر شہزاد نہ ملا تو وہ بے چارے صدمے سے مر جائیں گے۔" ہمزاد کے حاضر ہوتے ہی میں نے کہا۔

ہمزاد چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "وہ رام دیال تھا جس نے شہزاد کو اغوا کر کے چلتا بنا اس کا ارادہ شہزاد کی بلی چڑھانے کا ہے میں صرف اتنا ہی معلوم کر سکا ہوں۔"

"اب رام دیال کہاں ہے اور اس نے شہزاد کو کہاں رکھا ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکا۔"

میں جبران جیسی شخصیت کا شاگرد ہونے کے باوجود ایک بار پھر رام دیال کے مقابلے میں شکست کھا گیا تھا اور اس نے با آسانی شہزاد کو اغوا کر لیا تھا اور ہمزاد بھی اس کے مقابل ناکام رہا تھا۔ رام دیال نے کئی مواقع پر مجھے شکست دی تھی اسی خبیث کی وجہ سے میں اپنے خونی رشتوں سے محروم ہو کر دربدر کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ پے در پے ناکامیوں نے مجھے چڑچڑا کر دیا تھا اس لئے میری توپوں کا رخ ہمزاد کی طرف ہو گیا۔

"تم جیسی ماورائی قوت کو مجھے تسخیر کر کے کیا ملا، رام دیال کی دشمنی، چچا چچی کا قتل، کاجل کا دربدر ہونا اور اب شہزاد کا اغوا اگر اسے کچھ ہوا تو اس کے ماں باپ جیتے جی مر جائیں گے اور میں کبھی بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا اور تم تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔" میں جذباتی ہو گیا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ماورائی قوتوں کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں ہم ان سے تجاوز نہیں کر سکتے رام دیال کوئی عام پجاری نہیں۔ میں اس کے معاملے میں بے بس ہوں۔" وہ بے چارگی سے بولا اور میں نے اسے جانے کا حکم دیا۔

گھر پر رضیہ چاچی بے ہوش ہو چکی تھیں جبکہ اکبر چاچا رو رہے تھے۔ "چاچا گھبراؤ مت میرا وعدہ ہے چاہے مجھے اپنی جان بھی دینی پڑے تو شہزاد کو صحیح سلامت لے کر لوٹوں گا۔" میں نے کہا اور ان کا جواب سنے بغیر گھر سے نکل گیا۔

اب میرا ارادہ رام گڑھ جانے کا تھا مجھے معلوم تھا کہ رام دیال کا ٹھکانہ وہیں ہے اور دو تین بار رام گڑھ میں ہی میرا اس سے معرکہ ہوا تھا یقیناً اب بھی وہ مجھے رام گڑھ میں ملے گا یہی سوچ مجھے رام گڑھ چلنے پر مجبور کر رہی تھی میں پاگلوں کی طرح بنا کچھ سوچے سمجھے رام گڑھ کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ سفر پیدل طے کیا اور کچھ سفر گاڑیوں پر، غم اور غصے نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود کر ڈالی تھی حالانکہ اگر میں چاہتا تو ہمزاد کی مدد سے لمحوں میں رام گڑھ پہنچ سکتا تھا لیکن میں کسی سے بھی مدد لینا نہیں چاہتا تھا۔

جب میں رات کے اندھیرے میں رام گڑھ کی حدود میں داخل ہوا تو میں برہنہ پا تھا میرے چپل چل چل کر ٹوٹ چکے تھے اور لباس میلا کچیلا ہو چکا تھا میں بغیر کچھ کھائے پیئے رات کے اندھیرے میں اندھوں کی طرح چل رہا تھا کہ اچانک ٹھوکر لگنے کے باعث منہ کے بل گرا میرے ہاتھ خود اختیاری طور پر زمین سے ٹکرائے تھے اس لئے چہرہ زخمی ہونے سے بچ گیا۔ لیکن گھٹنے

اور کلائیاں زمین سے رگڑ لگنے سے چھل گئیں میں کراہتے ہوئے اٹھا۔

اسی وقت میری نظر اس شخص پر پڑی جو پاؤں پسارے لیٹا تھا۔ اس کا بوسیدہ لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور سر کے بال جھاڑ جھنکار کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔

میں اسے پہچان چکا تھا یہ وہی مجذوب تھا۔ جس نے مجھے ہمزاد کی تسخیر کا وظیفہ بتایا تھا۔ ''دیکھ کر چلا کرو ورنہ کسی روز کسی کھائی میں گر گئے تو واپس نہ نکل سکو گے۔'' مجذوب طیش میں آ چکا تھا۔

''بابا مجھے معاف کر دو۔'' میں اس کے قدموں میں جا بیٹھا۔

''معافی اللہ سے مانگ جس سے مانگنے کے بجائے تو لوگوں سے مانگتا رہا میں نے تجھ سے کہا تھا ناں کہ دنیا کے پیچھے مت پڑ مگر تو سائے کے حصول کے لئے پاگل بنا ہوا تھا پھر ہمزاد کو پا کر تو اللہ کو بھلا بیٹھا۔ اور موج مستیوں میں مشغول ہو گیا مفت اور حرام کی دولت جمع کرتا رہا۔ اس ہمزاد کی مدد سے تو عیش عشرت میں مشغول رہا اور تو اور دو بے گناہ لڑکیوں پر ظلم ڈھا کر تو نے ان کی بھی بددعا لی، بول اس دوران تو نے کون سا اچھا کام کیا۔'' مجذوب کی باتیں سن کر میں سناٹے میں آ گیا وہ روشن ضمیر تھا جو مجھے آئینہ دکھا رہا تھا۔

''بابا میں بہت تکلیف اور اذیت میں ہوں، رام دیال نے میرے چچا چچی کو مار ڈالا فارینہ کو کالی کے قدموں میں بلی چڑھا دی۔'' میں اپنے دکھوں کا مجذوب کے سامنے آشکارا کر رہا تھا۔

''یہ سب تیری کرنی کے پھل ہیں۔ تو نے راتوں رات امیر بننے کی خواہش میں ہمزاد کو تسخیر کیا، تجھے چاہئے تھا کہ اس ماورائی قوت کو انسانیت کی فلاح و بہبود کے کام لاتا لیکن تو ناجائز دولت کے حصول اور حسین عورتوں کے چکر میں رہا اب بھی وقت ہے سنبھل جا۔'' مجذوب کی باتیں میرے سوئے ہوئے ضمیر کو جگا رہی تھیں میں مجذوب کے قدموں میں سر رکھ کر رونے لگا۔ یہ ندامت کے آنسو تھے جو اگر سچے دل سے بہائے جائیں تو سچے موتی سے زیادہ قیمتی ہیں مجذوب جو اب تک درشت لہجے میں گفتگو کر رہا تھا، اس کا رویہ اک دم تبدیل ہو گیا۔

اس نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا ایک طرف پڑی لاٹھی مجھے تھمائی اور بولا۔ ''اسے سنبھال کر رکھنا یہ تجھے تیری منزل تک پہنچائے گی اب روح مت آنکھیں بند کر۔'' مجذوب نے کہا اور میں نے آنکھیں بند کر دیں کچھ دیر بعد مجذوب کی ٹھوس آواز ابھری۔ ''اب اپنی آنکھیں کھول دے۔'' میں نے آنکھیں کھولیں تو حیرت سے اچھل پڑا یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں مجھے مجذوب ملا تھا بلکہ یہ کوئی پہاڑی تھی۔

تقریباً پچاس فٹ نیچے دریا بہہ رہا تھا حیرت کی بات یہ تھی کہ اس پہاڑ پر نہ ہی کوئی آنے کا راستہ تھا اور نہ ہی کہیں جانے کا راستہ نہ جانے یہ کون سی جگہ اور کون سا مقام تھا، مجذوب کی دی ہوئی لاٹھی میرے قریب ہی پڑی تھی۔

اچانک میری آنکھوں نے ناقابل یقین منظر دیکھا۔ مجذوب کی دی ہوئی لاٹھی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی، میں حیرت سے چند لمحوں تک اس لاٹھی کو آگے بڑھتا دیکھتا رہا، مجھے مجذوب کی نصیحت یاد آ گئی اس نے کہا تھا کہ ''لاٹھی کو کسی بھی صورت میں خود سے جدا نہ کروں یہ مجھے میری منزل تک پہنچائے گی۔'' میں کشاں کشاں لاٹھی کے پیچھے چل پڑا لاٹھی سانپ کی طرح بل کھاتی ایک چوکور چٹان پر پہنچی اور پچاس فٹ نیچے دریا میں جا گری۔

میرا دل دھک سے رہ گیا اور میں سوچنے لگا۔

''اب کیا کروں۔'' پہاڑ سے نیچے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا، اب ایک ہی صورت تھی، پہاڑ سے پچاس فٹ نیچے دریا میں کود جاؤں، سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا کہ لاٹھی دریا میں بہتی ہوئی نہ جانے کہاں پہنچ جاتی، میں نے آنکھیں بند کیں کلمہ پڑھا اور چھلانگ لگا دی میں بہت تیزی سے دریا میں گرا اور مقام شکر یہ تھا کہ دریا بہت گہرا تھا اور میں کسی پتھر یا چٹان سے بھی نہ ٹکرایا پہلے میں دریا کی تہہ تک گیا پھر پانی نے مجھے اوپر کی طرف اچھالا بچپن میں دریا اور

نہروں میں تیرنا میرے کام آیا اور میں ایک سمت تیرنے لگا اور پھر تیرتے تیرتے دریا کے کنارے پر جا پہنچا۔

لاٹھی ایک چٹان کے ساتھ اٹکی ہوئی تھی نظر پڑتے ہی میں نے لاٹھی اٹھائی اور ایک جگہ لیٹ کر اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کو ہموار کیا اور سوچنے لگا۔ ''اب کیا کروں۔''

پھر خیال آیا کیوں نہ ہمزاد کو طلب کروں یہ سوچ کر ہمزاد کو پکارا اور یہ دیکھ کر مایوس ہوگیا کہ میرے بار بار پکارنے کے باوجود ہمزاد حاضر نہ ہوا گویا یہ نامعلوم مقام بہت ہی خطرناک تھا جہاں آنے کی ہمت ہمزاد جیسی ماورائی قوت کی بھی نہ تھی۔ آگے پیش آنے والے خطرات کا سوچ کر ایک سرد سی لہر ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔

ہمت کر کے لاٹھی ہاتھ میں تھامی اور اللہ کا نام لے کر آگے بڑھنے لگا۔ آگے گھنا جنگل تھا۔ چرند پرند اور جانور اپنی اپنی بولیوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے کبھی کبھار درندوں کی دل دہلا دینے والی آوازیں بھی جنگل میں گونج رہی تھیں مگر میں ان سب سے بے نیاز بلا کسی خوف و خطر کے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک میری سماعت سے ڈھول کی آواز سنائی دی۔ جو دور کہیں بج رہا تھا۔

میں یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ اس جنگل میں ڈھول کون بجا رہا ہے پھر رفتہ رفتہ ڈھول کی آواز قریب آنے لگی۔ اب قدموں کی چاپ بھی سنائی دے رہی تھی پتوں کی سرسراہٹ اور قدموں کی چاپ سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بہت سے افراد تھے جو آہستہ آہستہ میرے گرد گھیرا ڈال رہے تھے پھر وہ مجھے نظر آ ہی گئے وہ درجنوں افراد تھے شاید پچاس یا ساٹھ یا اس سے زائد تھے ان کا اوپری دھڑ عریاں تھا۔ جبکہ نچلے دھڑ پر لنگوٹ بندھا ہوا تھا اور ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ کچھ نے تیز دھار کلہاڑیاں اٹھا رکھی تھیں ان میں سے ایک موٹی توند والا ڈھول بجا رہا تھا۔ ان کے تیور ہرگز دوستانہ نہیں تھے۔ اگر وہ دشمن تھے تو میرے لئے ان سے جان بچانا مشکل تھا کیونکہ ہمزاد میرے بار بار پکارنے کے باوجود حاضر نہیں ہو رہا تھا۔ اور میری مسمریزم اور دیگر پراسرار صلاحیتیں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں اور رفتہ رفتہ ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

اسی وقت مجذوب کی ٹھوس آواز ابھری۔ ''تم سے بیس قدم کے فاصلے پر ایک کھائی ہے اس کھائی میں کود جاؤ۔''

میرے قدم بے اختیار آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ اور میں کھائی کے قریب جا کر رک گیا یہ بہت بڑی اور گہری کھائی تھی وہ وحشی مجھ سے بیس گز کے فاصلے پر تھے۔ مجھے کھائی کے قریب دیکھ کر چیختے ہوئے میری طرف دوڑے۔

''جلدی کرو آیان تمہارے پاس وقت بہت کم ہے اگر ان کے ہتھے چڑھے تو زندہ نہیں بچو گے۔'' مجذوب کی آواز دوبارہ ابھری، نہ جانے اس کی آواز میں کیسی کشش یا سحر تھا کہ میں بلا سوچے سمجھے کھائی میں کود پڑا، میں کھائی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر میرا جسم نیچے کی طرف جاتا رہا۔ خوف اور وحشت سے میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور موت کا یقین ہو چلا تھا۔

سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں گر کر بچنا ناممکن تھا کہ پھر میرے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔

☆......☆......☆

وہ نسوانی آواز بہت خوبصورت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی مندر کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ ہندی زبان میں اشلوک پڑھ رہی تھی جو میری سمجھ سے باہر تھے لیکن اس کی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی میں نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا مگر چاروں طرف گہری تاریکی تھی پھر میں نے محسوس کیا میرا سر کسی کی آغوش میں ہے۔ میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''اسی طرح لیٹے رہو۔'' اور پھر وہ میرے سر کے بال سہلانے لگی مجھے ایک عجیب سا سرور آ رہا تھا۔

میں نے تو کھائی میں چھلانگ لگائی تھی پھر یہاں کیسے آ پہنچا اور اس جنگل میں مجھے گھیرنے والے وہ لوگ

کون تھے اور ان کی مجھ سے کیا دشمنی تھی؟ میں نے ایک ساتھ کئی سوالات کرڈالے کیونکہ میں خود یہ سب جاننے میں ناکام رہا تھا اس پراسرار جگہ میں آتے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ جبران کی دی ہوئی پراسرار صلاحیتیں یہاں کام نہیں کررہی تھیں۔

"بابو رات کا سمے ہے اتنا سوچو مت آرام کرو یہ جادونگری ہے۔ یہاں رام دیال کی حکومت ہے یوں سمجھ لو کہ یہاں قدم قدم پر موت اپنا پہاڑ جیسا منہ کھولے بیٹھی ہے وہ وحشی اس جنگل کے باسی ہیں اور کالی کے ان بھگتوں میں سے ایک ہیں جو کالی کے لئے انسانی زندگی کی بلی چڑھاتے ہیں۔

تم جس سے کھائی میں گر رہے تھے۔ دیوی کے حکم پر تمہیں بچالیا گیا ہے۔"

"تم کون ہو اور کس دیوی کی بات کررہی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں اسی مہان دیوی کی داسی ہوں جس نے تمہیں بچایا اس سے زیادہ بتانے کی مجھے آگیا نہیں۔" وہ خاموش ہوگئی۔

"تم اس خطرناک اور بیابان جنگل میں اکیلی رہتی ہو ڈر نہیں لگتا۔" میں نے پوچھا مگر جواب میں خاموشی تھی اس نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اشلوک پڑھنا شروع کردیئے تھے اور پھر نہ جانے میں کیسے سوگیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو میرا سر بدستور اس کی آغوش میں تھا اور اس کی ریشمی زلفیں میرے چہرے پر سایہ فگن تھیں جن کی خوشبو نے مجھے پوری رات مدہوش رکھا تھا۔ میں نے صبح کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا وہ بات ہی خوبصورت تھی اور اس وقت معصومانہ انداز میں میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ "بھگوان کی کرپا ہے کہ تم بچ گئے۔ دیوی دیوتاؤں کی بھی یہی مرضی تھی اس لئے انہوں نے تمہاری رکھشا کی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

میں نے اٹھ کر گردوپیش کا جائزہ لیا، ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس میں کسی قسم کا سازوسامان نہ تھا میرے جاگتے ہی وہ خاموشی سے جھونپڑی سے باہر چلی گئی جب واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں کچھ پھل تھے میں نے اس کے کہنے پر خاموشی سے پھلوں سے ناشتہ کیا۔

اس دوران وہ مجھے دیکھتی رہی میں کھانے کے دوران اس کی اصلیت جاننے کے لئے اسے کریدتا رہا مگر وہ اپنی باتوں سے ایک عام دوشیزہ ہی لگ رہی تھی لیکن میرا دماغ اب تک الجھا ہوا تھا۔ "اس بیابان اور خطرناک جنگل میں یہ خوبصورت لڑکی کہیں کوئی چڑیل تو نہیں کوئی عام لڑکی اس جنگل میں اکیلی رہ نہیں سکتی۔" یہ سوچتے ہی میرا خون خشک ہونے لگا بچپن میں سنے گئے قصوں کہانیوں میں سنا تھا کہ چڑیلوں کے پاؤں الٹے ہوتے ہیں میں نے کن انکھیوں سے اس کے پاؤں کی طرف دیکھا اور میری جان میں جان آئی شاید وہ میرے خیالات جان چکی تھی اس لئے ہنس پڑی۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں کیا پتہ رام دیال نے شہزاد کا کیا حشر کیا ہوگا برائے مہربانی تم مجھے صرف اتنا بتادو کہ رام دیال مجھے کہاں ملے گا۔"

وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"یہاں رکو اور مجھے اپنی سیوا کا موقع دو۔" اس نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"نہیں حسین لڑکی میرے پاس وقت بالکل نہیں وہ معصوم بچہ اس شیطان کی قید میں ہے اور مجھے اس کی زندگی بچانی ہے تمہاری مہمان نوازی کا شکریہ۔" میں نے کہا اور پھر مجھے خیال آیا میں نے اتو اس کا نام بھی نہیں پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"بابو داسی کا کوئی نام نہیں ہوتا، تم مجھے مدھو کہہ سکتے ہو۔ اور ہاں تمہاری یہ لاٹھی۔" اس نے مجذوب کی دی ہوئی لاٹھی مجھے تھمائی اور میں نے اسے مشکور نگاہوں سے دیکھا، میں تو اس لاٹھی کو بھول بیٹھا تھا۔ میں اس سے رخصت ہوکر وہاں سے چل دیا۔

میں اس خوف ناک جنگل میں کئی گھنٹوں تک پیدل چلتا رہا اب اسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں کی مٹی سرخی مائل تھی یہاں کچھ دیر کے لئے میں ٹھہرا اور قدرے ستانے کے بعد آگے بڑھا، چالیس کوس بعد جنگل کی حدود ختم

ہو چکی تھی یہاں ایک طرف پتھروں کی چند شکستہ عمارتیں نظر آئیں دور بہت دور ایک مندر کے آثار دکھائی دے رہے تھے میں نے اپنے چلنے کی رفتار بڑھا دی کچھ دیر چلنے کے بعد میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ یہاں کی پتھریلی زمین اس قدر گرم تھی کہ کسی تندور کی مانند دہک رہی تھی میں چند قدم پیچھے ہٹا اور غور سے دیکھا زمین سے آگ کی لپٹیں اٹھتی محسوس ہو رہی تھی، قدم پیچھے ہٹانے کے باوجود گرمی سے میرے جسم کا پسینہ بہنے لگا تھا ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا واپس لوٹ جاؤں پھر اپنے اس خیال پر دل ہی دل میں خود کو ملامت کیا۔ سانس روکی اور ہمت کر کے آگے قدم بڑھا دیئے میری آنکھیں گرمی کی شدت سے تپنے لگیں اور جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی مگر میں سانس روکے لاٹھی ٹیکتا ہوا اس جہنم سے گزر گیا میرا چہرہ سرخ ہو چکا تھا جسم پر شعلے سے لپک رہے تھے اس کے باوجود میں آگے بڑھتا رہا اور پانچ منٹ کا سفر صدیوں پر محیط تھا کچھ دیر بعد تپش ختم ہو گئی اب میں مندر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ میں نے کسی کو مندر سے نکلتے دیکھا غور کیا تو وہ رام دیال تھا۔

وہ میرے سامنے آ کر سینہ تان کر کھڑا ہو گیا رام دیال کی آنکھوں میں اعتماد جھلک رہا تھا اور اس اعتماد میں شیطانی قوتیں بھی شامل تھیں۔ ”اچھا ہوا تم خود ہی آ گئے آج اماوس کی رات ہے، اس لڑکے کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی بلی دوں گا اور دیوی خوش ہو گی۔“ رام دیال سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولا۔

اور میرے وجود میں یکلخت شعلے سے بھڑک اٹھے میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس خبیث پجاری کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں میں نے احتیاط کے پیش نظر اپنے گرد حصار باندھا۔ ”رام دیال برسوں پہلے شروع ہونے والی ہماری لڑائی کا آج خاتمہ تمہاری موت سے ہو گا۔ میں شہزاد کو صحیح سلامت یہاں سے لے کر لوٹ جاؤں گا۔“

”یہ تمہاری بھول ہے مورکھ یہ جادو نگری ہے یہاں سے زندہ واپس جانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔“ اس نے شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور کالی کا فلک شگاف نعرہ بلند کرتے ہوئے زمین سے مٹی اٹھا کر میری طرف پھینکا تو آگ کا شعلہ لپکا اور بڑے بگولے کی صورت میں میری طرف بڑھا مگر حصار سے ٹکرا کر بجھ گیا۔ ”رام دیال خبیث ادھر دیکھ۔“ میں نے چلا کر کہا اور رام دیال نے جیسے ہی میری طرف دیکھا میں نے اس سے نظریں ملتے ہی اسے ٹرانس میں لینا چاہا مگر مجھے اپنے ارادے میں ناکامی ہوئی۔

”تیری آنکھوں کا یہ سحر مجھ پر نہیں چل سکتا مورکھ۔“ وہ ہنسا اور میں نے طیش میں آ کر مجذوب کی دی ہوئی لاٹھی اس کی طرف پھینکی، لاٹھی جیسے ہی اس کے جسم سے ٹکرائی تو وہ کربناک انداز میں چیختا ہوا گرا اور تڑپنے لگا، اسے کرب اور اذیت سے دوچار دیکھ کر میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا اور میں حصار سے نکل کر آگے بڑھا اور زوردار ٹھوکر اس کے جسم پر رسید کی یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔

جب تک میں حصار میں تھا محفوظ تھا وہ برق سرعت سے اٹھا اور کالی کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا، اگلا ہی لمحہ حیرت انگیز تھا میرے چاروں طرف درجنوں رام دیال گھیرا ڈالے کھڑے تھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان میں سے اصل کون ہے۔ میں نے مجذوب کی لاٹھی زمین سے اٹھائی اور چکراتے ہوئے ذہن سے اپنے اردگرد موجود رام دیال کے ہمشکلوں کو دیکھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس پر وار کروں وہ آپس میں گڈمڈ ہو چکے تھے اور اصل رام دیال پتہ نہیں ان میں سے کون تھا۔

بہرحال ہمت کر کے میں نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور اپنے سامنے کھڑے ایک رام دیال پر لاٹھی سے حملہ کیا اور یہ دیکھ کر بوکھلا گیا لاٹھی رام دیال کے جسم سے اس طرح گزر گئی جیسے میں نے ہوا میں لاٹھی چلائی ہو پھر دوسرے رام دیال پر بھی میں نے اسی طرح حملہ کیا لیکن یہاں بھی وہی معاملہ تھا میں کسی وحشی جنونی کی طرح اپنے سامنے آنے والے ہر رام دیال پر لاٹھی کے بھرپور وار کر رہا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں ہوا میں لاٹھیاں چلا رہا ہوں۔ میرے چاروں طرف موجود رام

دیال کے ہمشکل قہقہے لگا رہے تھے اور ہر طرف رام دیال کی
آواز گونج رہی تھی۔ ”میں یہاں ہوں میں یہاں ہوں۔“ وہ
شیطان میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

میں اس صورت حال سے گھبرا گیا اور دوبارہ
حصار باندھنا چاہا مگر اب مجھے دیر ہو چکی تھی ان میں سے
ایک رام دیال نے اپنے گلے میں پڑی مالا کا دانہ توڑا اور
میری طرف پھینک دیا، مالا کے دانے کا مجھ سے ٹکرانا تھا
کہ میرا جسم پتھر کے کسی مجسمے کی طرح ساکت ہو گیا ہلنا جلنا
تو در کنار میں تو بولنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ ”دیکھ لی میری
شکتی! تم اگر ہزار جنم بھی لو تو میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ اسنے
آگے بڑھ کر مجھے دھکا دیا میں کٹتے ہوئے شہتیر کی طرح
پشت کے بل گرا اس کے ہمشکل غائب ہو چکے تھے
اور اب وہ مجھ پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ پتھر کا بت بن جانے کے
باوجود میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اور جسم
پر پڑنے والی ٹھوکریں مجھے تکلیف دے رہی تھیں وہ چند لمحوں
تک مجھ پر ٹھوکریں برساتا رہا پھر میری دائیں ٹانگ تھامی
اور گھسیٹتے ہوئے مندر کی طرف لے جانے لگا۔ ”بس کچھ دیر
کی بات ہے میں تمہیں اس بالک کے ساتھ ساتھ کالی کے
قدموں میں بھینٹ چڑھا دوں گا۔“ وہ چند لمحوں کے لئے رکا
اور ایک ٹھوکر میرے پہلو میں رسید کی۔

اچانک دور کہیں سے شیروں کے دھاڑنے کی
آواز سنائی دی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے بہت سے
شیر دھاڑتے ہوئے اس طرف آ رہے ہوں، رام دیال
نے اواز کی سمت دیکھا میرا چہرہ رام دیال ہی کی طرف مڑا
ہوا تھا میں نے اس کے چہرے پر ثبت بے چینی کے
تاثرات دیکھے وہ بوکھلا کر چند قدم پیچھے ہٹا، اب دوڑ کر اس
طرف آتے قدموں کی آواز رک چکی تھیں لیکن شیروں
کے غرانے کی آوازیں بدستور سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

”کون ہو تم؟“ رام دیال نے گھمبیر لہجے میں
پوچھا اس کے ساتھ ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرا جسم حرکت
کرنے لگا ہو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میری نظریں اس
سمت اٹھیں جس طرف رام دیال دیکھ رہا تھا اور جہاں سے
شیروں کے غرانے کی آوازیں آ رہی تھیں میری آنکھوں
کے سامنے حیرت انگیز اور ناقابل یقین منظر تھا۔

ہم سے چند قدم کے فاصلے پر تین جسیم شیر موجود
تھے ان میں سے ایک پر کاجل بیٹھی تھی اس کے ایک ہاتھ
میں خنجر تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے شیر کی گردن کے
بڑے بڑے بال پکڑ رکھے تھے مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں
الف لیلیٰ کی کہانی کے کسی کردار کو دیکھ رہا ہوں یا کوئی دیو
مالائی فلم دیکھ رہا ہوں۔

”میں کاجل ہوں ماں کالی کی داسی ان شیروں
کو دیکھ کر سمجھ لو کہ مجھے دیوی ماں کا آشیرباد حاصل ہے۔“
فضا میں کاجل کی آواز گونجی۔

”تو کیا چاہتی ہے؟“ رام دیال نے حیرت آمیز
لہجے میں پوچھا۔

”اس لڑکے کو میرے حوالے کر دو جسے تم نے سری نگر
سے اغوا کیا ہے اور بھگوان سے اپنے پاپوں کی شما مانگنے کے
ساتھ ساتھ لیان سے بھی معافی مانگو تم نے اسے بہت کشٹ
دیئے ہیں۔“ وہ شیر کی پشت سے اترتے ہوئے بولی۔

”تیرا دماغ تو ٹھیک ہے جو ایک مسلے کے لئے کالی
کے مہان سیوک کے منہ آ رہی ہے۔“ وہ تند لہجے میں بولا۔

”پریم ذات پات اور دھرم دیکھ کر نہیں کیا جاتا۔“
وہ اطمینان سے بولی۔

”اس مسلے کے لئے تو مجھ سے لڑنے آ گئی کالی
تجھے شما نہیں کرے گی۔“ وہ بدستور تند لہجے میں بولا۔

”رام دیال صرف تو ہی کالی کا سیوک نہیں اس
دھرتی پر کالی کے انگنت سیوک اور داسیاں ہیں میں نے
آج ہی کے دن کے لئے رات دن کالی کی پوجا کی ہے
میری ایک بات اور یاد رکھ دیوی دیوتا بھی انیائے کو دیکھ
کر فیصلہ کرتے ہیں۔“ ان دونوں کے درمیان مکالمے
بازی جاری تھے اور میں یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔

رام دیال کاجل سے الجھ کر میری طرف سے
غافل ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی لمحاتی غفلت سے فائدہ
اٹھاتے ہوئے چھلانگ لگائی اور اسے لیتے ہوئے نیچے گرا
اور اس کے سنبھلنے سے پہلے پے در پے کئی گھونسے اس کے

چہرے پر رسید کردیئے اس کا چہرہ خون آلود ہوگیا۔

"آیان رک جاؤ۔" کاجل چلائی مگر میں نے اس کی بات پردھیان دیئے بغیر ایک گھونسہ مزید اس کی ناک پر جڑ دیا۔اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر کوئی منتر پڑھتا میں نے ایک پاؤں کی ایڑی پر گھوم کر ایک زوردار کک اس کی کنپٹی پر رسید کی اور دوبارہ اس پر پل پڑا اچانک پڑ جانے والی افتاد سے رام دیال اپنے سارے جنتر منتر بھول چکا تھا۔

لمحاتی جھٹکے سے سنبھلتے ہی اس نے مجھے ایک طرف دھکیلا اور زمین سے مٹی اٹھا کر میری طرف پھینکی اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں آگ لگ گئی ہو، میں تکلیف کی شدت سے چیخنے لگا۔

کاجل نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے میری سمت اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایسا لگا کہ جیسے مجھ پر کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔

مورکھ کلنکنی، پاپن یہ سب تیرے کارن ہوا ہے اس ملیچھ نے تیرے شہ پر مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے اب میں تجھے بھی نہیں چھوڑوں گا۔" رام دیال نے چیختے ہوئے کہا اور کسی مداری کی طرح گول دائرے میں گھومتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی چاروں طرف گھمائی اور کاجل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اب ہمارے چاروں طرف رام دیال کے درجنوں ہمشکل موجود تھے۔

میں گھبرا گیا میں جان جا چکا تھا کہ اب معاملہ کاجل کے بس سے باہر ہے۔ درجنوں کی تعداد میں موجود رام دیال کے ہم شکلوں میں سے اصل رام دیال کو تلاش کرنا مشکل تھا۔ لیکن وہ میری طرح گھبرائی نہیں اپنے اور میرے گرد حصار کی لکیر کھینچی اور بڑے پرسکون انداز میں شیروں کی طرف اشارہ کرکے بڑبڑائی۔ شیر اس سے کچھ فاصلے پر جا کر اطمینان سے پاؤں پسار کر بیٹھ گئے جبکہ کاجل نے خنجر حصار کے وسط میں گاڑ دیا۔

ادھر رام دیال کے شیطانی قہقہے چاروں طرف گونج رہے تھے اس صورت حال سے میں گھبرایا ہوا تھا جبکہ کاجل اطمینان سے کھڑی ادھر ادھر گھوم کر رام دیال کے ہمشکلوں کو دیکھتی رہی اور پھر چند لمحوں کے لئے زمین پر سجدے کے سے انداز میں پڑی رہی۔ چند لمحوں بعد اٹھی تو اس کا چہرہ غم اور یاس کی تصویر بنا ہوا تھا یہ دیکھ کر میں بے تاب ہو کر اس کی طرف بڑھا۔

"ایان تم اپنی جگہ کھڑے رہو، اب یہ یدھ کالی کے دو سیوکوں کے بیچ ہے تمہیں میری قسم تم ہمارے بیچ نہ آؤ گے۔" اس نے التجائیہ انداز میں کہا اور میں بے بس ہوگیا۔

رام دیال کے ہم شکلوں کے ہاتھ حرکت میں آئے میں نے چاروں طرف سے درجنوں چھوٹے چھوٹے خنجر کاجل کی طرف بڑھتے دیکھے ڈر اور خوف سے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا مجھے لگا میں اب کاجل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گا کاجل نے اپنا بایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور کسی پارے کی طرح چاروں طرف گھومی اس کی طرف آتے خنجر راستے میں ہی غائب ہوگئے اب کاجل نے اس کی طرف ہاتھ جھٹکے درجنوں تیر رام دیال کے ہم شکلوں کی طرف بڑھے اور ان کے جسموں سے گزرتے ہوئے غائب ہوگئے میں پہلے ہی جانتا تھا کہ اصل رام دیال کو شناخت کئے بغیر اس کا خاتمہ ناممکن ہے پھر رام دیال نے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے کریہہ شکل کے خوف ناک جانور کاجل کی طرف بھیجے۔ کاجل کی انگلی کی ایک ہی جنبش سے ان کے جسموں میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے کاجل کی زبان بند کرنا چاہی اسے اندھا کرنا چاہا مگر اس کا ہر وار ناکام جا رہا تھا یہ دو ماورائی طاقتوں کی جنگ تھی جو اس وقت زوروں پر تھی۔ اور میں خاموش تماشائی تھا۔

اپنے جادو کے خطرناک ترین واروں کو ناکام ہوتا دیکھ کر رام دیال کے اشتعال میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں نے اسے کاجل کے ساتھ برسرپیکار دیکھا تو انجام کی پرواہ کئے بغیر حصار سے نکلا اور اپنے سامنے موجود رام دیال پر ٹوٹ پڑا مگر وہ بھی اصل نہ نکلا پھر دوسرے رام دیال پر مجذوب کی لاٹھی سے وار کیا اس میں بھی ناکام رہا کچھ ہی دیر میں دوبارہ میں حصار میں داخل ہو چکا تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان درجنوں رام دیالوں میں سے اصل رام دیال کہاں ہے، وہ سب ایک وقت میں ایک ہی جیسی حرکتیں کر رہے تھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے کراٹے کے کھلاڑی

بیسک ٹریننگ کے وقت ایک ہی جیسی موومنٹ کر رہے ہوں پھر اس خبیث نے منتر پڑھتے ہوئے کاجل کی طرف تھوکا اس بار وہ کامیاب رہا۔

کاجل کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی تھی، آگ اس قدر خوف ناک تھی کہ جیسے کسی نے اس پر پیٹرول چھڑک کر لگائی ہو۔ کاجل کے ساتھ ساتھ میں بھی چیخ اٹھا اس کا پورا جسم شعلوں میں گھر چکا تھا کچھ دیر بعد آگ بجھی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے کاجل کا جسم کوئلے کی طرح سیاہ ہو چکا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود وہ اطمینان سے کھڑی تھی پھر میں نے ایک اور ناقابل یقین منظر دیکھا کاجل نے کالی کا نعرہ بلند کیا اور حصار سے باہر نکل آئی اس کے ساتھ ہی اس کا جسم صاف وشفاف ہوگیا سب سے حیرت کی بات اس کے جسم پر موجود لباس تھا جو پہلے ہی کی طرح بے داغ اور صاف تھا۔

"رام دیال اب سنبھل کیوں کہ اب میری باری ہے۔" کاجل نے گھمبیر لہجے میں کہا اور چند لمحے اشلوک پڑھنے کے بعد تن کر کھڑی ہوگئی۔ "پہلے یہ تو بتا کہ تو مجھ پر کیسے وار کرے گی، ہم درجنوں ہیں، اصل رام دیال کو ڈھونڈنا ناممکن ہے۔" رام دیال کے ہم شکل بولے۔

کاجل چاروں طرف گھوم کر رام دیال کے ہم شکلوں کو دیکھنے لگی اور پہچاننے کی کوشش کی کہ اصل کون ہے؟ کچھ دیر شش و پنج میں رہنے کے بعد اس نے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔

"آیان اب میں اصل رام دیال پر پہلا اور آخری حملہ کرنے جا رہی ہوں میری بات دھیان سے سنو میں جس رام دیال پر حملہ کروں اگر وہ میرے وار سے بچا تو تم زمین میں گڑے خنجر سے اس پر ٹوٹ پڑنا یہ دیوی کا دیا ہوا خنجر ہے وہ اس کے وار سے ہرگز نہیں بچے گا۔"

کاجل کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اصل رام دیال کو کیسے پہچانے گی پھر اس نے کالی کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور ایک رام دیال کے ہمشکل کی طرف رخ کر کے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا ہی تھا کہ رام دیال نے چشم زدن میں اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور ایک تیز دھار خنجر کاجل کی طرف پھینکا، کاجل کو اور مجھے اس دھوکہ دہی کی امید نہ تھی اسی لئے وہ اپنی حفاظت سے غافل رہی، خنجر سنسناتا ہوا آیا اور کاجل کے سینے میں پیوست ہوگیا تو وہ دلدوز انداز میں چیخی اور پیچھے کی طرف لڑکھڑائی مگر گری نہیں۔

کاجل کے جسم سے بہنے والا خون دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی خون اتر آیا میں نے زمین میں گڑا خنجر نکالا ادھر وہ چالاک پجاری دوبارہ اپنے ہم شکلوں میں گڈ مڈ ہو چکا تھا۔

میں خنجر اٹھائے ہوئے کاجل کے قریب چلا گیا اور اسے اپنی باہنوں میں لے لیا اس کے چہرے پر تکلیف کے شدید ترین آثار تھے اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ "کاجل یہ کیا ہوگیا۔" میں رو دیا۔

"آیان وقت کم ہے میری فکر چھوڑو......مم مجھے کچھ نہیں ہوگا۔" وہ سرگوشی میں کراہتے ہوئے بولی۔

آخری بار اپنی پریمکا سے مل لے اس کے بعد تو تو نے بھی مرنا ہے۔" رام دیال کی آواز گونجی۔

جب کہ شیرا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن اب تک انہوں نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ "کمینے پجاری تو نے ایک عورت پر دھوکے سے وار کیا ہے لیکن یاد رکھ میں بھی تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔" میں غم اور غصے سے چلایا۔

"آیان محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔" میرے چاروں طرف رام دیال کی گھمبیر آواز گونجی۔

"اس سے بحث میں وقت ضائع مت کرو میں جو کہہ رہی ہوں......اسے غور سے سنو......اصل رام دیال کی پہچان یہ ہے کہ اس کا سایہ دکھائی دیتا ہے جبکہ اس کے ہمشکلوں کا سایہ نہیں ہے اور اصل رام دیال عام انسان کی طرح پلکیں جھپکاتا ہے جبکہ اس کے ہمشکل پلکیں نہیں جھپکاتے اس سے پہلے کہ رام دیال سنبھل جائے اس پر وار کردو۔" کاجل نے کراہتے ہوئے کہا اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ متغیر ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی کاجل نے ٹھیک کہا تھا ان درجنوں ہمشکلوں میں سے صرف ایک کا سایہ دکھائی دے رہا اور وہی پلکیں بھی جھپک رہا تھا، کاجل کے شدید زخمی ہونے کی وجہ سے وہ مطمئن کھڑا تھا اور ہماری طرف سے غافل ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی لمحاتی غفلت سے فائدہ اٹھایا اور چشم زدن میں حصار سے نکل کر اس کی طرف دوڑا۔

جبکہ کاجل نے لڑکھڑاتے ہوئے اپنا ہاتھ اٹھایا اور شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کر کے کوئی منتر پڑھا اور پھر میں نے حیرت انگیز منظر دیکھا کاجل کی انگلی کے اشارے سے رام دیال کے دائیں پہلو سے خون بہنے لگا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اس کے پہلو میں خنجر گھونپ دیا ہو رام دیال کے گھائل ہوتے ہی اس کے ہمشکل غائب ہو گئے۔

رام دیال نے چیختے ہوئے جوابی کارروائی کے لئے کوئی منتر پڑھنا چاہا تو میں نے خنجر کا بھرپور وار اس کی گردن پر کیا اس کے گلے سے خون کا فوارہ بہنے لگا اور وہ چیختا ہوا گرا اور تڑپنے لگا میں نے آگے بڑھ کر پے در پے خنجر کے کئی وار اس کے جسم پر کئے۔ وہ چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو چکا تھا۔

ادھر کاجل کے جسم سے بہت زیادہ خون بہہ چکا تھا اور وہ نقاہت اور کمزوری کے باعث زمین پر گر پڑی تھی اور اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی میں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا، یہ کیا ہو گیا کاجل۔" میں روتے ہوئے بولا۔

"یہ جادونگری رام دیال کی تھی اور...... اسے مم...... مارنا...... تت تمہارے لئے ناممکن تھا...... میں نے مہاراج بھگوان داس کے استھان میں برسوں کالی ماں کی پوجا...... کی...... اور تمہارے تحفظ کے لئے کٹھن جاپ اور تپسیا میں لگی رہی...... میں کبھی تمہاری طرف سے غافل نہیں رہی...... جادونگری کے جنگل اس کھائی سے بچانے...... والی وہ بھی...... میں ہی تھی۔

برسوں کے گیان دھیان سے دیوی کی نظروں میں میرا ایک مقام بن چکا تھا اور میں جان چکی تھی کہ اصل رام دیال کی پہچان کیا ہے۔ تم اس سے میرے پاس ہو جب میں اس سنسار سے جانے والی ہوں۔" وہ دل گرفتہ لہجے میں بولتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو لڑھک رہے تھے۔

"کاجل تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی، میں تم سے پیار کرتا ہوں اور تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" میں چیختے ہوئے بولا اور اس کے گرد اپنی بانہوں کا حصار مضبوط کر لیا۔

اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور ڈوبتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آیان میں نے تم سے پریم کیا ہے اور پریم محبوب کو جسمانی طور پر پانے کا نام نہیں ہے بلکہ محبوب کے لئے خود بلیدان دینا ہوتا ہے اس خونی وادی سے تمہیں صحیح سلامت نکالنا اور رام دیال کے خاتمے کے لئے ضروری تھا کہ کسی بڑے پجاری کا بلیدان دیا جائے مجھے مہاراج بھگوان داس نے تنبیہ کیا تھا کہ اس استھان سے باہر قدم رکھتے ہی میں اپنا جیون کھو بیٹھوں گی۔ یہاں آتے ہی میں جان چکی تھی کہ میرے پاس وقت کم ہے اب تم بھی اپنے جیون کو برباد مت کرنا۔ اب آخری بار تم مجھے پیار کر لو پھر میرا وچن ہے کہ پرلوک جانے کے بعد بھی میں تت...... تم سے ملنے آؤں گی۔"

میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا میری آنکھوں سے آنسو پانی کی طرح بہہ رہے تھے اس کے تینوں شیر سر جھکائے ہمارے قریب ہی کھڑے تھے میں نے روتے ہوئے اس کے چہرے اور لبوں پر بوسے دیئے پھر اس کا جسم ایک بار تڑپا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

کاجل مر چکی تھی وفا کی دیوی، شیروں کی رانی مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر جا چکی تھی وہ جاتے جاتے مجھے سچی محبت کا درس دے کر گئی تھی اور میں پاگلوں کی طرح سرزمین پر چیخ رہا تھا ہذیانی انداز میں چلا چلا کر رو رہا تھا۔

اس کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ خشک لکڑیوں کو جمع کر کے اس کے مذہبی طریقے سے اس کا کریا کرم میں نے کیا۔ اور وہیں بیٹھ کر رونے لگا اسی وقت مجھے مجذوب کی آواز سنائی دی، وہی مجذوب جس نے مجھے

کرشماتی لاٹھی دی تھی۔ ”صبر کرو۔“

میں نے سر اٹھا کر دیکھا میرے قریب مجذوب کھڑا تھا۔ ”بابا وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور وفا کا درس دے گئی۔“ میں بلک بلک کر رو دیا۔ ”بیٹا ہر کہانی کا انجام ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوتا لیکن ہر کہانی کے انجام میں کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہوتا ہے لالچ اور ہوس انسانی زندگی کو تباہ کر ڈالتے ہیں۔“ مجذوب نے کہا۔

شہزاد مندر میں کالی کے قدموں کے پاس بے ہوش پڑا تھا مجذوب کے حکم پر میں اسے مندر سے نکال لایا پھر مجذوب نے مجھے آنکھیں بند کرنے کو کہا دوبارہ میں نے آنکھیں کھولیں تو میں سری نگر میں تھا، شہزاد ہوش میں آ چکا تھا جبکہ مجذوب غائب تھا، شہزاد کو اس کے گھر پہنچایا دونوں میاں بیوی بیٹے کو دیکھ کر جی اٹھے تھے۔ دو روز ان کی مہمان نوازی میں گزارے۔

تیسرے روز نصف شب کے قریب میں نے ہمزاد کو طلب کیا اور اس کے حاضر ہوتے ہی اسے حکم دیا کہ مجھے پاکستان پہنچا دے۔“ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور آنکھیں بند کرنے کو کہا، میں نے آنکھیں بند کیں جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں نے خود کو کسی پرندے کی طرح اڑتا ہوا سا محسوس کیا، کچھ دیر بعد جب میرے پاؤں زمین سے ٹکرائے تو میں نے آنکھیں کھول دیں میں اپنے وطن میں دینہ کے گاؤں ساغری میں موجود تھا۔

وہاں مجھے گلیوں میں ایک پاگل شخص دکھائی دیا جس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور بچے اسے پتھر مار رہے تھے غور سے دیکھا تو وہ چوہدری مظفر تھا۔ بعد میں گاؤں والوں سے معلوم ہوا کہ اس کا ذہنی مریض بیٹا مر چکا تھا حویلی کو پراسرار طور پر آگ لگ گئی تھی اور خود چوہدری پاگل ہو چکا تھا میرا گھر ویران پڑا تھا میں نے ہمزاد کو طلب کیا جو لمحوں میں حاضر ہو گیا۔“ میں تمہیں وقت سے پہلے آزاد کرتا ہوں آج سے تم آزاد ہو۔“ میں نے کہا۔

”تم نے مجھے تسخیر کرنے کے لئے کتنی مشکلات کا سامنا کیا اور اب وقت سے پہلے آزاد کیوں کر رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اس لئے کہ اب میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ اپنی امیدیں صرف اللہ سے واسطہ رکھوں اور رزق حلال حاصل کروں۔“

میں نے ہمزاد کو آزاد کر دیا۔

کاجل کی یادیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں میں پانچ وقت نماز پڑھنے لگا تھا ایک روز ظہر کی نماز پڑھ کر میں مسجد سے گھر کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ وہاں ایک جدید ماڈل کی کار دکھائی دی میں حیرت سے آگے بڑھا کار کے قریب ہی گاؤں کے کچھ لوگ کھڑے تھے ان میں میرے بچپن کے دوست رضوان اور عادل بھی تھے پھر کار کا دروازہ کھلا اور باہر نکلنے والی لڑکی کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا، وہ میری تھی جو لوگوں کی پرواہ کئے بغیر مجھ سے لپٹ گئی۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے، لوٹ کر آنے کا کہہ کر بھی واپس نہیں لوٹے، میں نے تمہارا بہت انتظار کیا مگر تم نہیں لوٹے، شکر ہے تم نے ایڈریس درست دیا تھا۔“ وہ بول رہی تھی اور میں صرف سن رہا تھا۔

اس کی لگن سچی تھی وہ میرے لئے سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ ”چپ کیوں ہو؟ اتنا عرصہ غائب رہنے کی سزا شادی ہے۔“ وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے میں بھی تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا تو مسکراتے ہوئے، میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولی۔ ”تھینک یو۔“ ہماری شادی ہو گئی۔

ہر پونم کی رات کاجل میرے خواب میں آتی ہے، اس کے ساتھ اکثر وہ تین شیر ہوتے ہیں جن پر سوار ہو کر وہ جادو نگری آئی تھی۔

اور صبح جب میری آنکھ کھلتی ہے تو میرے سرہانے ڈھیر سارے گلاب اور موتیے کے پھول موجود ہوتے ہیں اور ان پھولوں کی خوشبو سے کمرہ مہک جاتا ہے۔ ”محبت ہو تو ایسی۔“ کاجل مرنے کے بعد بھی نہیں بھولی۔ خواب اور پھولوں کے متعلق میری بھی جانتی ہے۔